أُذِنَ لِلَّذِينَ يُقَاتَلُونَ بِأَنَّهُمْ ظُلِمُوا (حج ع ۶)

سلسلۂ دار المصنفین (۳۶)

الجہاد فی الاسلام

یعنی

اسلامی جہاد کی حقیقت اور اسلام کے قوانین جنگ و صلح، معترضین کے جوابات و شکوک و شبہات کا ازالہ، اسلامی قانون کا دوسرے مذاہب اور دوسری قوموں کے قوانین جنگ سے مقابلہ و موازنہ اور موجودہ یورپین قوانین جنگ پر مفصل تبصرہ اور ان پر اسلامی قانون کی برتری

از

مولوی ابو الاعلیٰ صاحب مودودی رفیق اعزازی دار المصنفین

باہتمام مولوی مسعود علی ندوی

بمطبع معارف دار المصنفین اعظم گڈھ میں چھپی

طبع اوّل شعبان ۱۳۴۸ھ

باب اوّل

اسلامی جہاد کی حقیقت

باب دوم

مدافعانہ جنگ

باب سوم

مصلحانہ جنگ

باب چہارم

اشاعتِ اسلام اور تلوار

باب پنجم

قوانینِ جنگ

باب ششم

جنگ دوسرے مذاہب میں

باب ہفتم

جنگ اور تہذیبِ جدید

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

دیباچہ

دور جدید میں یورپ نے اپنی سیاسی اغراض کے لیے اسلام پر جو بہتان تراشے ہیں۔ اُن
میں سب سے بڑا بہتان یہ ہے کہ اسلام ایک خونخوار مذہب ہے اور اپنے پیروؤں کو خونریزی کی تعلیم دیتا ہے۔
اس بہتان کی اگرچہ کچھ بھی حقیقت ہوتی۔ تو قدرتی طور پر اسے اسوقت پیش ہونا چاہیے تھا۔ جبکہ پیروانِ اسلام
کی شمشیر خارا شگاف نے کرۂ زمین میں ایک تہلکہ برپا کر رکھا تھا۔ اور فی الواقع دنیا کو یہ شبہ ہو سکتا تھا
کہ شاید ان کے یہ فاتحانہ اقدامات کسی خونریز تعلیم کا نتیجہ ہوں۔ مگر عجیب بات ہے کہ اس بہتان کی پیدائش
آفتاب عروج اسلام کے غروب ہونے کے بہت عرصہ بعد عمل میں آئی۔ اور اس کے خیال نے ٹھیک
اسوقت روح پھونکی گئی۔ جبکہ اسلام کی تلوار زنگ کھا چکی تھی۔ مگر خود اس کے مدعی یورپ کی تلواریں انسانوں
کے خون سے سرخ ہو رہی تھیں۔ اور اس نے دنیا کی کمزور قوموں کو اس طرح نگلنا شروع کر دیا تھا جیسے کوئی
اژدہا چھوٹے چھوٹے جانوروں کو نگلتا ہے۔ اگر دنیا میں عقل ہوتی۔ تو وہ سوال کرتی کہ جو لوگ
خود امن و امان کے سب سے بڑے دشمن ہوں جنھوں نے خود خون بہا کر زمین کے چہرہ کو رنگین کیا ہو
اور جو خود قوموں کے چین و آرام پر ڈاکے ڈال رہے ہوں انہیں کیا حق ہے کہ [illegible]
[illegible] جس کی [illegible] دنیا [illegible]
[illegible]
[illegible]

جب میدان میں مغلوب ہوتا ہے تو دوسرے میدان میں بھی مغلوب ہو جاتا ہے جس کی تلوار سے شکست کھاتا ہے
اس کے قلم کا بھی مقابلہ نہیں کر سکتا۔ اسی لئے ہر عہد میں دنیا پر انہی افکار و آراء کا غلبہ رہتا ہے جو تلوار
والے ہاتھوں کے قلم سے پیش کئے جاتے ہیں۔ چنانچہ اس مسئلہ میں بھی دنیا کی آنکھوں پر پردہ ڈالنے
میں یورپ کو پوری کامیابی ہوئی۔ اور غلامانہ ذہنیت رکھنے والی قوموں نے اسلامی جہاد کے متعلق
اس کے پیش کردہ نظریہ کو بلا ادنیٰ تحقیق و تفحص اور بلا ادنیٰ غور و خوض اس طرح قبول کرلیا کہ کسی آسمانی وحی
کو بھی اس طرح قبول نہ کیا ہوگا۔

گذشتہ اور موجودہ صدی میں مسلمانوں کی طرف سے بارہا اس اعتراض کا جواب دیا گیا ہے۔
اور ان کی کثرت کا یہ حال ہے کہ اس موضوع پر اتنا لکھا جا چکا ہے کہ اب یہ ایک فرسودہ اور پامال سا مضمون معلوم ہوتا
ہے مگر ان مسلمانوں کی جوابی تحریرات میں میں نے اکثر یہ نقص دیکھا ہے کہ اسلام کے وکلا مخالفین سے مرعوب
ہو کر خود مجرموں کے کٹہرے میں جا کھڑے ہوتے ہیں۔ اور مجرموں کی طرح صفائی پیش کرنے لگتے ہیں
بعض حضرات نے تو یہاں تک کیا ہے کہ مقدمہ کو مضبوط بنانے کے لئے سرے سے اسلام کی تعلیمات
ہی میں ترمیم کر ڈالی۔ اور شدت مرعوبیت میں جن جن چیزوں کو انہوں نے اپنے
نزدیک خوفناک سمجھا انہیں ریکارڈ پر سے بالکل غائب کر دیا۔ تاکہ مخالفین کی نظر اس پر نہ پڑ سکے۔ لیکن جن
لوگوں نے یہ کمزور پہلو اختیار نہیں کیا۔ ان کے ہاں بھی کم از کم یہ نقص ضرور موجود ہے کہ وہ جہاد
و قتال کے متعلق اسلامی تعلیمات کو پوری وضاحت کے ساتھ بیان نہیں کرتے۔ اور بہت سے
پہلو اس طرح تشنہ چھوڑ جاتے ہیں کہ ان میں شک و شبہ کی بہت کچھ گنجائش باقی رہتی ہے۔ غلط فہمیوں کو
دور کرنے کے لئے سخت ضرورت اس امر کی ہے۔ کہ جہاد فی سبیل اللہ اور قتال بغرض اعلائے کلمۃ الٰہی
کے متعلق اسلام کی تعلیمات اور اس کے قوانین کو بے کم و کاست اسی طرح بیان کر دیا جائے جس طرح
وہ قرآن مجید، احادیث نبوی اور کتب فقہیہ میں درج ہیں۔ ان میں سے کسی چیز کو نہ گھٹایا جائے، نہ بڑھایا
جائے۔ اور نہ اسلام کے اصل منشاء اور اس کی تعلیم کی روح کو بدلنے کی کوشش کی جائے۔ میرا اس
[illegible] حیثیت اصولی اختلاف رکھتا ہوں کہ ہم اپنے عقائد و اصول کو دوسروں کے نقطۂ نظر کے مطابق
ڈھال کر پیش کریں۔ دنیا کا کوئی ایک مسئلہ بھی ایسا نہیں ہے جس میں تمام لوگ ایک نقطۂ نظر پر متفق ہوں۔ ہر
جماعت اپنا ایک خاص نقطۂ نظر رکھتی ہے۔ اور اسی کو صحیح سمجھتی ہے۔ كُلُّ حِزْبٍ بِمَا لَدَيْهِمْ فَرِحُونَ ۵

چاہے ہم دوسروں کے نقطۂ نظر کی رعایت سے اپنے اصول و عقائد کو خواہ کتنا ہی رنگ کر پیش کریں مگر اس کے باوجود یہ ناممکن ہے کہ تمام مختلف الخیال گروہ ہم سے متفق ہو جائیں اور سب کو ہمارا دیا ہوا رنگ پسند آجائے۔ اس لئے زیادہ بہتر طریقہ یہ ہے کہ ہم اپنے عقائد، اپنے مسائل، اپنی تعلیمات اور اپنے قوانین کو ان کے اصلی رنگ میں پیش کر دیں۔ زیادہ سے زیادہ یہ کہ بہتر سے بہتر طریقے سے دنیا کو اپنے نقطۂ نظر سے آگاہ کریں۔ اور پھر خود اسی کی عقل پر چھوڑ دیں کہ خواہ اسے قبول کرے خواہ نہ کرے۔ اگر قبول کرے تو زہے نصیب۔ اور نہ قبول کرے تو ہمیں اس کی کوئی پروا نہیں۔ یہ دعوت و تبلیغ کا صحیح اصول ہے جسے ہمیشہ سے ارباب عزم لوگوں نے اختیار کیا ہے۔ اور خود انبیاء علیہم السلام نے بھی اسی پر عمل کیا ہے۔

میں ایک عرصے سے اس ضرورت کو محسوس کر رہا تھا۔ مگر احساس ضرورت سے بڑھ کر عمل کی جانب کوئی اقدام نہ کر سکتا تھا، کیونکہ اس کام کے لئے بڑی فرصت درکار تھی۔ اور فرصت ہی ایک ایسی چیز ہے جو کسی اخبار نویس کو میسر نہیں آتی۔

لیکن دسمبر ۱۹۲۶ء کی آخری تاریخوں میں ایک ایسا واقعہ پیش آیا جس نے مجھے مشکلات سے قطع نظر کر کے اقدام عمل پر مجبور کر دیا۔ یہ واقعہ شدھی کی تاریخ کے بانی سوامی شردھانند کے قتل کا واقعہ تھا جس سے جہلا اور کم نظر لوگوں کو اسلامی جہاد کے متعلق غلط خیالات کی اشاعت کا ایک نیا موقع مل گیا۔ کیونکہ بدقسمتی سے ایک مسلمان اس فعل کے ارتکاب کے الزام میں گرفتار کیا گیا۔ اور اخبارات میں اس کی جانب یہ خیالات منسوب کئے گئے کہ اس نے اپنے مذہب کا دشمن سمجھ کر سوامی کو قتل کیا ہے اور یہ کہ اس نیک کام کے کرنے سے وہ جنت کا امیدوار ہے۔ حقیقت کا علم تو خدا کو ہے۔ مگر منظر عام پر جو کچھ آیا وہ یہی واقعات تھے۔ ان کی وجہ سے عام طور پر اسلام کے دشمنوں میں ایک ہیجان پیدا ہو گیا۔ انھوں نے علمائے اسلام کے اعلانات اور اسلامی جرائد و صحائف کی متفقہ تصریحات کے باوجود اس واقعہ کو اس کی طبعی حدود تک محدود رکھنے کے بجائے تمام امت اسلامیہ کو بلکہ خود اسلامی تعلیمات کو اس کا ذمہ دار قرار دینا شروع کر دیا۔ اور قرآن کریم کے خلاف ہر قسم کے الزامات عائد کئے گئے کہ اس کی تعلیم مسلمانوں کو خونخوار و قاتل بناتی ہے، اس کی تعلیم امن و امان اور مسالمت کے خلاف ہے۔ اس کی تعلیم نے مسلمانوں کو ایسا متعصب بنا دیا ہے کہ وہ ہر کافر کو گردن زدنی سمجھتے ہیں

... تمام [illegible] جنت میں جانے کی امید رکھتے ہیں بعض دریدہ دہنوں نے تو یہانتک کہدیا کہ دنیا میں جب تک قرآن کی تعلیم موجود ہے امن قائم نہیں ہو سکتا۔ اس لئے تمام عالم انسانی کو اس تعلیم کے مٹانے کی کوشش کرنی چاہیے۔ ان غلط خیالات کی نشر و اشاعت اس کثرت کے ساتھ کی گئی ہے کہ صحیح خیال لوگوں کی نگاہیں ہی چکرا گئیں۔ اور گاندھی جیسے شخص نے جو ہندو قوم میں سب سے بڑے صاحب رائے آدمی ہیں اس سے متاثر ہو کر بتکرار اس خیال کا اظہار کیا کہ۔

"اسلام ایسے ماحول میں پیدا ہوا ہے جس کی فیصلہ کن طاقت پہلے بھی تلوار تھی اور آج بھی تلوار ہے۔"

گرچہ یہ تمام خیالات کسی تحقیق اور علمی تفحص پر مبنی نہ تھے۔ بلکہ "طوطی" کی طرح وہی سبق دہرائے جا رہے تھے جو استاد ازل نے سکھا دیا تھا۔ مگر ایک غیر معمولی واقعہ نے ان اوہام میں حقیقت کا رنگ پیدا کر دیا تھا جس سے ناواقف لوگ آسانی کیساتھ دھوکہ کھا سکتے تھے۔ چونکہ ایسی عام بدگمانیاں اشاعت اسلام کی راہ میں ہمیشہ حائل ہوتی ہیں۔ اور ایسے ہی مواقع ہوتے ہیں جن میں اسلام کی صحیح تعلیم کو زیادہ صفائی کے ساتھ پیش کرنے کی ضرورت ہوتی ہے۔ تاکہ غبار چھنٹ جائے۔ اور آفتاب حقیقت زیادہ روشنی کے ساتھ طلوع ہو۔ اس لئے میں نے فرصت کا انتظار چھوڑ کر اپنے اسی قلیل وقت میں جو ترتیب اخبار سے باقی بچتا تھا۔ پیش نظر مضمون کی تحریر و تسوید کا کام شروع کر دیا اور ساتھ ہی ساتھ اخبار "الجمعیۃ" کے کالموں میں اس کی اشاعت بھی شروع کر دی۔ ابتداءً صرف ایک مختصر مضمون لکھنے کا ارادہ تھا۔ مگر سلسلہ کلام چھڑنے کے بعد بحث کے اس قدر گوشے سامنے آتے چلے گئے کہ اخبار کے کالموں میں ان کا سمانا مشکل ہو گیا۔ اس لئے مجبوراً ۲۳ نمبر شائع کرنے کے بعد میں نے اخبار میں اس کی اشاعت بند کر دی، اور اب اس پورے سلسلہ کو مکمل کر کے کتابی صورت میں پیش کر رہا ہوں۔ اگرچہ یہ مضمون بحث کے اکثر نقاط پر حاوی ہے۔ لیکن یہ بھی مجھے افسوس ہے۔ وقت کی کمی نے بہت سے مباحث کو تشنہ رکھنے پر مجبور کیا ہے۔ وہ ان مضامین کی توضیح کے لئے ایک مستقل باب کی ضرورت تھی۔ انہیں ایک ایک دو دو فقروں میں ختم کر دینا پڑا ہے۔ اس کتاب میں میں نے خصوصیت کیساتھ اس امر کا التزام رکھا ہے کہ کہیں اپنے یا دوسرے لوگوں کے ذاتی خیالات کو دخل نہیں دیا بلکہ تمام کلی و جزئی

مسائل خود قرآن مجید سے اخذ کر کے پیش کئے ہیں، اور جہاں کہیں ان کی توضیح کی ضرورت پیش آئی ہے۔ تو احادیث نبوی، معتبر کتب فقہیہ، اور صحیح و مستند تفاسیر سے مدد لی ہے تاکہ ہر شخص کو معلوم ہو جائے کہ آج دنیا کا رنگ دیکھ کر کوئی نئی چیز پیدا نہیں کی گئی ہے۔ بلکہ جو کچھ کہا گیا ہے سب اللہ اور اس کے رسول اور ائمہ اسلام کے ارشادات پر مبنی ہے۔

میں تمام ان غیر مسلم حضرات سے، جو تعصب کی بنا پر اسلام سے اندھی دشمنی نہیں رکھتے، درخواست کرتا ہوں کہ اس رسالہ میں اسلام کی اصلی تعلیم جنگ کا مطالعہ کریں۔ اور اس کے بعد بتائیں کہ انہیں اس تعلیم پر کیا اعتراض ہے۔ اگر اس کے بعد بھی کسی شخص کو کچھ شک باقی ہو۔ تو میں اسے رفع کرنے کی پوری کوشش کروں گا۔

ابوالاعلیٰ

۵ / جون ۱۹۳۰ء

اسلامی جہاد کی حقیقت

انسانی جان کا احترام

انسانی تمدن کی بنیاد جس قانون پر قائم ہے۔ اسکی سب سے پہلی دفعہ یہ ہے کہ انسان کی جان اور اُسکا خون محترم ہے۔ انسان کے مدنی حقوق میں اولین حق زندہ رہنے کا حق ہے، اور اُسکے مدنی فرائض میں اولین فرض زندہ رہنے دینے کا فرض ہے۔ دنیا کی جتنی شریعتیں اور مہذب قوانین ہیں۔ ان سب میں احترام نفس کا یہ اخلاقی اصول موجود ہے، اور جس قانون اور مذہب میں اسے تسلیم نہ کیا گیا ہو۔ وہ نہ تو مہذب انسانوں کا مذہب و قانون بن سکتا ہے، نہ اس کے ماتحت رہکر کوئی انسانی جماعت پرامن زندگی بسر کر سکتی ہے، اور نہ اسے کوئی فروغ حاصل ہو سکتا ہے، ہر شخص کی عقل خود سمجھ سکتی ہے کہ اگر انسان کی جان کی کوئی قیمت نہ ہو، اسکا کوئی احترام نہ ہو، اس کی حفاظت کا کوئی بندوبست نہ ہو، تو چند آدمی کیسے ملکر رہ سکتے ہیں۔ ان میں کس طرح تعاون و اشتراک عمل ہو سکتا ہے، انہیں وہ امن و اطمینان اور وہ بے خوفی و جمعیت خاطر کیونکر حاصل ہو سکتی ہے جس کی انسان کو تجارت صنعت و حرفت کرنے، دولت کمانے، گھر بنانے، سیر و سفر کرنے اور متمدن زندگی بسر کرنے کے لئے ضرورت ہے۔ پھر اگر ضرورت سے قطع نظر کر کے خالص انسانیت کی نظر سے دیکھا جائے تو انسان کا دوسرے بھی کسی ذاتی نفع کی خاطر، یا کسی ذاتی عداوت کی خاطر اپنے ایک بھائی کو قتل کرنا بدترین قساوت و بدترین سنگدلی ہے جسکا ارتکاب کر کے انسان میں کوئی خاص بلندی پیدا ہونا تو درکنار، اسکا درجۂ انسانیت پر قائم رہنا بھی محال ہے۔

دنیا کے سیاسی قوانین بس احترام حیات انسانی کو صرف سزا کے خوف اور قوت کے زور سے قائم رکھ سکتے ہیں۔ مگر ایک سچے مذہب کا کام دلوں میں اُسکی صحیح قدر و قیمت پیدا کر دیتا ہے۔ تاکہ جہاں انسانی تعزیر کا خوف نہ ہو، اور جہاں انسانی پولیس روکنے والی نہ ہو، وہاں بھی ہی

آدم ایک دوسرے کے خون ناحق سے محترز رہیں۔ اس نقطۂ نظر سے احترامِ نفس کی جیسی صحیح اور مؤثر تعلیم اسلام میں دی گئی ہے۔ وہ کسی دوسرے مذہب میں ملنی مشکل ہے۔ قرآن کریم میں جگہ جگہ مختلف پیرایوں سے اس تعلیم کو دلنشین کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ سورہ مائدہ میں آدم کے دو بیٹوں کا قصہ بیان کر کے جن میں سے ایک نے ظلماً دوسرے کو قتل کیا تھا، فرمایا ہے کہ:-

مِنْ اَجْلِ ذٰلِكَ كَتَبْنَا عَلٰى بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ اَنَّهٗ مَنْ قَتَلَ نَفْسًا بِغَيْرِ نَفْسٍ اَوْ فَسَادٍ فِي الْاَرْضِ فَكَاَنَّمَا قَتَلَ النَّاسَ جَمِيْعًا ۭ وَمَنْ اَحْيَاهَا فَكَاَنَّمَآ اَحْيَا النَّاسَ جَمِيْعًا ۭ وَلَقَدْ جَآءَتْهُمْ رُسُلُنَا بِالْبَيِّنٰتِ ثُمَّ اِنَّ كَثِيْرًا مِّنْهُمْ بَعْدَ ذٰلِكَ فِي الْاَرْضِ لَمُسْرِفُوْنَ (۵:۵)

اسی بنا پر ہم نے بنی اسرائیل کے لئے یہ لکھدیا کہ جو کوئی کسی کی جان لے بغیر اس کے کہ اس نے کسی کی جان لی ہو۔ یا زمین میں فساد کیا ہو۔ تو گویا اس نے تمام انسانوں کا خون کیا۔ اور جو کوئی کسی جان کو بچائے تو گویا اس نے تمام انسانوں کو بچایا۔ ان لوگوں کے پاس ہمارے رسول کھلی کھلی دلیلیں لیکر آئے۔ مگر اس کے بعد بھی ان میں سے ایسے ہیں۔ جو زمین میں حد سے تجاوز کر جاتے ہیں۔

ایک دوسری جگہ خدا اپنے نیک بندوں کی صفات بیان کرتے ہوئے فرماتا ہے۔

وَلَا يَقْتُلُوْنَ النَّفْسَ الَّتِيْ حَرَّمَ اللّٰهُ اِلَّا بِالْحَقِّ وَلَا يَزْنُوْنَ ۚ وَمَنْ يَّفْعَلْ ذٰلِكَ يَلْقَ اَثَامًا (۶:۲)

وہ اس جان کو جسے اللہ نے محترم قرار دیا ہے بغیر حق کے ہلاک نہیں کرتے۔ اور نہ زنا کرتے ہیں۔ اور جو کوئی ایسا کرے گا وہ گناہ کی سزا پائے گا۔

ایک اور مقام پر ارشاد ہوتا ہے۔

قُلْ تَعَالَوْا اَتْلُ مَا حَرَّمَ رَبُّكُمْ عَلَيْكُمْ اَلَّا تُشْرِكُوْا بِهٖ شَيْـًٔا وَّبِالْوَالِدَيْنِ اِحْسَانًا ۚ وَلَا تَقْتُلُوْٓا اَوْلَادَكُمْ مِّنْ اِمْلَاقٍ ۭ نَحْنُ نَرْزُقُكُمْ وَاِيَّاهُمْ ۚ وَلَا تَقْرَبُوا الْفَوَاحِشَ مَا ظَهَرَ مِنْهَا وَمَا بَطَنَ ۚ وَلَا تَقْتُلُوا النَّفْسَ الَّتِيْ حَرَّمَ اللّٰهُ اِلَّا بِالْحَقِّ ۭ ذٰلِكُمْ

اے محمد ان سے کہو کہ آؤ میں تم کو پڑھ کر سناؤں کہ اللہ نے تم پر کیا کیا حرام کیا ہے۔ تم پر واجب ہے کہ اللہ کے ساتھ کسی کو شریک نہ کرو۔ والدین سے نیک سلوک کرو۔ اپنی اولاد کو مفلسی و تنگدستی کے باعث قتل نہ کرو۔ ہم تمہیں اور تم کو رزق دیتے ہیں۔ ان کو بھی دیں گے۔ بدکاری کے قریب بھی نہ پھٹکو۔ خواہ وہ چھپی ہوئی ہو یا کھلی

...لَعَلَّكُمْ تَعْقِلُوْنَ ﴿۱۵۱﴾

...ہوئی۔ کسی جان کو جسے اللہ نے محترم قرار دیا ہے ہلاک نہ کرو۔ مگر یہ کہ حق کا تقاضا ہو۔ اللہ نے ان باتوں کی تمہیں تاکید کی۔ شاید کہ تم کو کچھ عقل آئے۔

اس تعلیم کے اولین مخاطب وہ لوگ تھے جن کے نزدیک انسانی جان کی کوئی قیمت نہیں تھی۔ اور جو اپنے ذاتی فائدہ کی خاطر اولاد تک کو بھی قتل کر دیا کرتے تھے۔ اس لئے داعیِ اسلام علیہ الصلوٰۃ والسلام ان کی طبیعتوں کی اصلاح کے لئے خود بھی ہمیشہ احترامِ نفس کی تلقین فرماتے رہتے تھے۔ اور یہ تلقین ہمیشہ نہایت موثر انداز میں ہوا کرتی تھی۔ احادیث میں کثرت سے اس قسم کے ارشادات پائے جاتے ہیں جن میں بے گناہ کے خون بہانے کو بدترین گناہ بتایا گیا ہے۔ مثال کے طور پر چند احادیث ہم یہاں نقل کرتے ہیں۔

حضرت انس بن مالک سے روایت ہے کہ حضور نے فرمایا۔

أَكْبَرُ الْكَبَائِرِ الْإِشْرَاكُ بِاللّٰهِ وَقَتْلُ النَّفْسِ وَعُقُوْقُ الْوَالِدَيْنِ وَقَوْلُ الزُّوْرِ۔

بڑے گناہوں میں سب سے بڑا گناہ اللہ کے ساتھ شرک کرنا ہے پھر قتلِ نفس۔ پھر والدین کی نافرمانی کرنا۔ پھر جھوٹ بولنا۔

حضرت ابن عمر سے روایت ہے کہ حضور نے فرمایا۔

لَنْ يَّزَالَ الْمُؤْمِنُ فِيْ فُسْحَةٍ مِّنْ دِيْنِهٖ مَا لَمْ يُصِبْ دَمًا حَرَامًا

مومن اپنے دین کی وسعت میں اسوقت تک برابر رہتا ہے جب تک وہ کسی حرام خون کو نہیں بہاتا۔

ایک اور حدیث ہے کہ۔

أَوَّلُ مَا يُحَاسَبُ بِهِ الْعَبْدُ الصَّلٰوةُ وَأَوَّلُ مَا يُقْضٰى بَيْنَ النَّاسِ يَوْمَ الْقِيَامَةِ فِي الدِّمَاءِ۔

قیامت کے دن بندے سے سب سے پہلے جس چیز کا حساب لیا جائے گا وہ نماز ہے۔ اور پہلی چیز جس کا فیصلہ لوگوں کے درمیان کیا جائے گا وہ خون کے دعوے ہیں۔

ایک مرتبہ ایک شخص نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا۔ اور عرض کیا کہ سب سے بڑا گناہ کونسا ہے؟ آپ نے فرمایا اَنْ تَجْعَلَ لِلّٰهِ نِدًّا وَّهُوَ خَلَقَكَ۔ یہ کہ تو کسی کو اللہ کا نظیر و مثیل قرار دے حالانکہ اسی نے تجھے پیدا کیا۔ اس نے پوچھا کہ اس کے بعد کونسا بڑا گناہ ہے۔ آپ نے جواب دیا کہ

اَنْ تَقْتُلَ وَلَدَكَ اَنْ يَطْعَمَ مَعَكَ یہ کہ تو اپنے بچے کو قتل کردے اس خیال سے کہ وہ تیرے کھانے میں شریک ہوگا، اس نے عرض کیا کہ اسکے بعد کونسا گناہ ہے۔ آپ نے فرمایا۔ اَنْ تُزَانِيَ حَلِيلَةَ جَارِكَ یہ کہ تو اپنے ہمسایہ کی بیوی سے زنا کرے۔

دنیا پر اسلامی تعلیم کا اخلاقی اثر

حرمت نفس کی یہ تعلیم کسی فلسفی یا مصلح کا نتیجۂ فکر نہ تھی کہ اس کا اثر صرف کتابوں اور مدرسوں تک محدود رہتا۔ بلکہ درحقیقت وہ خدا اور اسکے رسول کی تعلیم تھی، جسکا لفظ لفظ ہر مسلمان کا جزوِ ایمان تھا، اور جس کی تعمیل، تلقین اور تنفیذ ہر اس شخص پر فرض تھی جو کلمۂ اسلام کا قائل ہو۔ پس ایک چوتھائی صدی کے قلیل عرصہ ہی میں اس کی بدولت عرب جیسی خونخوار قوم کے اندر احترام نفس اور امن پسندی کا ایک ایسا مادہ پیدا ہوگیا۔ کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی پیشین گوئی کے مطابق قادسیہ سے صنعا تک ایک عورت تنہا سفر کرتی تھی، اور کوئی اس کے جان و مال پر حملہ نہیں کرتا تھا۔ حالانکہ یہ وہی ملک تھا۔ جہاں پچیس سال پہلے بڑے بڑے قافلے بھی بے خوف نہیں گذر سکتے تھے، پھر جب مہذب دنیا کا آدھے سے زیادہ حصہ حکومت اسلامیہ کے ماتحت آگیا۔ اور اسلام کے اخلاقی اثرات چاردانگِ عالم میں پھیل گئے۔ تو اسلامی تعلیم نے انسان کی بہت سی غلط کاریوں اور گمراہیوں کی طرح انسانی جان کی اس بے قدری کا بھی استیصال کردیا۔ جو دنیا میں پھیلی ہوئی تھی۔ آج دنیا کے مہذب قوانین میں حرمت نفس کو جو درجہ حاصل ہوا ہے۔ وہ اسی انقلاب کی تدریج میں سے ایک شاندار نتیجہ ہے۔ جو اسلامی تعلیم نے دنیا کے اخلاق میں برپا کیا تھا۔ ورنہ جس دور تاریک میں یہ تعلیم اتری تھی اس میں انسانی جان کی حقیقت کوئی قیمت نہ تھی۔ عرب کی خونریزیوں کا ذکر تو اس سلسلہ میں دنیا نے بہت سنا ہے۔ مگر ان ممالک کی حالت بھی کچھ بہتر نہ تھی جو اس زمانہ میں دنیا کی تہذیب و مدنیت اور علم و حکمت کے مرکز بنے ہوئے تھے۔ روما کے کولوسیم Colosseum کے افسانے اب تک تاریخ کے صفحات میں موجود ہیں جن میں انسان شمشیرزنی gladiatory کے کمالات اور وحشی درندوں کے شوقِ تماشا کی نذر ہوگئے۔ مہمانوں کی تفریح کے لئے یا دوستوں کی تواضع کے لئے غلاموں کو درندوں سے پھڑوا دینا جانوروں کی طرح ذبح کردینا ان سلطنتوں کا ایک عام تماشا تھا۔ یورپ اور ایشیا کے اکثر ممالک

میں کوئی معیوب بات نہ تھی۔ قیدیوں اور غلاموں کو مختلف طریقوں سے عذاب دیکر مار ڈالنا
اس عہد کا عام دستور تھا، جاہل و خونخوار امراء سے گذر کر یونان و روما کے بڑے بڑے حکما
و فلاسفہ کے اجتہادات میں بھی انسانی جانوں کو بے قصور ہلاک کرنے کی بہت سی وحشیانہ صورتیں
جائز تھیں۔ ارسطو و افلاطون جیسے اساتذۂ اخلاق ماں کو یہ اختیار دینے میں کوئی خرابی نہ پاتے
تھے۔ کہ اپنے جسم کے ایک حصہ (یعنی جنین) کو الگ کر دے۔ اور یونان و روما میں اسقاطِ حمل کوئی
ناجائز فعل نہ تھا۔ باپ کو اپنی اولاد کے قتل کا پورا حق تھا۔ اور رومی مقننوں کو اپنے قانون
کی اس خصوصیت پر فخر تھا کہ اسمیں اولاد پر باپ کے اختیارات اسقدر غیر محدود ہیں۔ حکمائے رواقیین
کے نزدیک خودکشی کوئی بُری چیز نہ تھی، بلکہ ایک ایسی عزت کی بات تھی کہ لوگ جلسے کر کے ان
میں خودکشیاں کیا کرتے تھے۔ حد یہ ہے کہ فلاطون جیسا حکیم بھی اسے کوئی بڑی معصیت نہ سمجھتا تھا
شوہر کے لئے اپنی بیوی کا قتل بالکل ایسا تھا۔ جیسے وہ اپنے کسی پالتو جانور کو ذبح کر دے۔ اس
لئے قانون یونان میں اسکی کوئی سزا نہ تھی۔ جینیو رکھشا کا گہوارہ ہندوستان ان سب سے بڑھا ہوا تھا۔
یہاں مرد کی لاش پر زندہ عورت کو جلا دینا ایک جائز فعل تھا۔ اور مذہبًا اس کی تاکید تھی۔ شودر کی
جان کوئی قیمت نہ رکھتی تھی۔ اور صرف اس بنا پر کہ وہ غریب برہما کے پاؤں سے پیدا ہوا ہے
اسکا خون برہمن کے لئے حلال تھا۔ وید کی آواز سن لینا شودر کے لئے اتنا بڑا گناہ تھا کہ اسکے
کان میں پگھلا ہوا سیسا ڈال کر اسے مار ڈالنا نہ صرف جائز بلکہ ضروری تھا۔ "جل پروا" کی رسم عام
تھی۔ جس کے مطابق ماں باپ اپنے پہلے بچہ کو دریائے گنگا کی نذر کر دیتے تھے۔ اور اس قساوت
کو اپنے لئے موجب سعادت سمجھتے تھے۔

ایسے تاریک دور میں اسلام نے آواز بلند کی کہ لَا تَقْتُلُوا النَّفْسَ الَّتِي حَرَّمَ اللّٰهُ إِلَّا بِالْحَقِّ
جان کو اللہ تعالیٰ نے حرام قرار دیا ہے۔ اسکو قتل نہ کرو۔ مگر اس وقت کہ حق اسکے قتل کا مطالبہ کرے
اس آواز میں ایک قو[illegible]ت تھی۔ اور قوت کے ساتھ وہ "اہنسا پرمو دہرما" کی آواز کی طرح عقل اور
فطرت کی مطابقت سے محروم نہ تھی۔ اس لئے وہ دنیا کے گوشہ گوشہ میں پہونچی۔ اس نے انسان
کو اپنی جان کی صحیح قیمت [illegible] سے آگاہ کیا۔ اور خواہ کسی قوم یا کسی ملک نے اسلام کی حلقہ بگوشی اختیار کی ہو۔
کسی حد تک اثر قبول کئے بغیر نہ رہی۔ اجتماعی تاریخ کا
ا[illegible] اخلاقی زندگی اس آواز کا کسی نہ

کوئی انصاف پسند عالم اس سے انکار نہیں کرسکتا کہ دنیا کے حقوقی قوانین میں انسانی جان کی حرمت قائم کرنیکا فخر جتنا اس آواز کو حاصل ہے اتنا "پہاڑی کے وعظ" یا "اہنسا پرمو دہرما" کی آواز کو حاصل نہیں ہے۔

قتل بالحق

مگر ذرا غور سے دیکھو کہ فقط لَا تَقْتُلُوا النَّفْسَ الَّتِي حَرَّمَ اللّٰهُ ہی نہیں فرمایا۔ بلکہ اس کے ساتھ اِلَّا بِالْحَقِّ بھی کہا ہے مَنْ قَتَلَ نَفْسًا فَكَاَنَّمَا قَتَلَ النَّاسَ جَمِيْعًا نہیں کہا۔ بلکہ اس کے ساتھ بِغَيْرِ نَفْسٍ اَوْ فَسَادٍ فِي الْاَرْضِ کا استثنا بھی کردیا ہے۔ یہ نہیں کہا کہ کسی کی جان کو کسی حال میں قتل نہ کرو۔ ایسا کہا جاتا تو تعلیم کا نقص ہوتا۔ عدل نہ ہوتا۔ بلکہ حقیقی ظلم ہوتا۔ دنیا کو اصلی ضرورت اس بات کی نہ تھی کہ انسان کو قانون کی پکڑ سے آزاد کردیا جاتا۔ اور اُسے حق دیدیا جاتا کہ جتنا چاہے فساد کرے جتنی چاہے بدامنی پھیلائے جس قدر چاہے ظلم وستم کرے۔ بلکہ اصلی ضرورت یہ تھی کہ دنیا میں امن قائم کیا جائے فتنہ وفساد کا بیخ مٹا دیا جائے اور ایسا قانون بنا دیا جائے جس کے تحت ہر شخص اپنے حدود میں آزاد ہو۔ اور کوئی شخص اپنی مقررہ حد سے تجاوز کرکے دوسروں کے مادی یا روحانی امن میں خلل انداز نہ ہو۔ پس اس کے لئے محض لَا تَقْتُلُوا النَّفْسَ کی حمایت ہی درکار نہ تھی بلکہ اِلَّا بِالْحَقِّ کی محافظ قوت بھی درکار تھی ورنہ امن کی بجائے بدامنی ہوتی۔

دنیا کا کوئی قانون جو مکافات عمل کے اصول سے خالی ہو کامیابی کا منہ نہیں دیکھ سکتا۔ انسانی فطرت اتنی اطاعت شعار نہیں ہے کہ جس چیز کا حکم دیا جائے اسے خوشی سے قبول کرے اور جس چیز سے منع کیا جائے اسکو خوشی سے ترک کردے۔ اگر ایسا ہوتا تو دنیا میں فتنہ وفساد کیوں ہوتا۔ اور ملائکہ مقربین خدا سے نہ کہتے کہ اَتَجْعَلُ فِيْهَا مَنْ يُّفْسِدُ فِيْهَا وَيَسْفِكُ الدِّمَآءَ کیا تو زمین میں اس انسان کو اپنا خلیفہ بناتا ہے جو اس میں فساد پھیلائے گا اور خونریزی کرے گا۔ پس اس کی سرکش طبیعت کو اطاعت پر مجبور کرنے کے لیے قانون کی ضرورت [illegible] حکم دینے کے ساتھ یہ بھی ہو کہ اگر تمہیں [illegible] منع کرنے کے ساتھ یہ بھی ہو کہ اگر غیر ممنوعات سے اجتناب نہ کیا جائے تو اسکا نتیجہ بھی بتادیا جائے [illegible] لَا تُفْسِدُوا فِي الْاَرْضِ بَعْدَ اِصْلَاحِهَا زمین کی اصلاح کے بعد اس میں فساد نہ کرو۔ [illegible]

اللہ۔ (جس جان کو اللہ نے حرام کیا ہے اسے قتل نہ کرو۔) کہنا کافی نہ ہوسکتا۔ جب تک کہ اس کے ساتھ یہ بھی نہ بتا دیا جائے کہ اگر اس گناہ عظیم سے کسی نے اجتناب نہیں کیا۔ اور فساد پھیلایا۔ اور قتل و خون کیا تو اسے کیا سزا دیجائے گی۔

انسانی تعلیم میں ایسا نقص رہجانا ممکن ہے۔ مگر خدائی قانون اتنا ناقص نہیں ہوسکتا۔ اس نے صاف طور پر بتلا دیا کہ انسانی خون کی حرمت صرف اسوقت تک ہی جب تک اسپر "حق" نہ قائم ہوجائے۔ اسے زندگی کا حق صرف اس کی جائز حدود کے اندر دیا جاسکتا ہے۔ مگر جب وہ ان حدود سے تجاوز کر کے فتنہ و فساد پھیلائے۔ اور دوسرے کی جان پر ناحق حملہ کرے۔ تو وہ اپنے حق حیات کو خود بخود کھو دیتا ہے۔ اس کے خون کی حرمت زائل ہوکر حلت سے بدلجاتی ہے۔ اور پھر اس کی موت ہی انسانیت کی حیات ہوجاتی ہے۔ چنانچہ فرمایا۔ اَلْفِتْنَةُ اَشَدُّ مِنَ الْقَتْلِ۔ قتل بڑی بُری چیز ہے۔ مگر اس سے زیادہ بُری چیز فتنہ و فساد ہے۔ اور جب کوئی شخص اس بڑے جرم کا مرتکب ہو تو اس کی بڑی برائی کا اس چھوٹی برائی سے خاتمہ کردینا ہی زیادہ بہتر ہے کہ جَزَآءُ سَيِّئَةٍ سَيِّئَةٌ مِّثْلُهَا۔ اسی طرح جو شخص کسی دوسرے کی ناحق جان لے۔ اس کے لئے حکم ہوا كُتِبَ عَلَيْكُمُ الْقِصَاصُ فِي الْقَتْلٰى (تم پر مقتولوں کے لئے قصاص کا حکم لکھدیا گیا ہے) اور اس کے ساتھ اس امتیاز کو بھی مٹا دیا گیا۔ جسے گمراہ قوموں نے اعلیٰ اور ادنیٰ درجہ کے لوگوں میں قائم کرلیا تھا۔ چنانچہ فرمایا۔ كَتَبْنَا عَلَيْهِمْ فِيْهَآ اَنَّ النَّفْسَ بِالنَّفْسِ یہ نہیں ہوسکتا کہ امیر غریب کو مار ڈالے یا آزاد غلام کو قتل کردے۔ تو وہ چھوڑ دیا جائے گا۔ بلکہ انسان ہونے کے لحاظ سے سب برابر ہیں۔ جان کے بدلے جان ہی لیجائے گی۔ خواہ امیر کی ہو یا غریب کی۔ پھر اس خیال سے کہ کسیکو اس ناگزیر خونریزی میں تامل نہ ہو۔ فرمایا وَلَكُمْ فِي الْقِصَاصِ حَيٰوةٌ يّٰٓاُولِي الْاَلْبَابِ ۝ اے عقلمندو! اس قصاص کو موت نہ سمجھو۔ بلکہ یہ تو فی الحقیقت سوسائٹی کی زندگی ہے۔ جو اس کے جسم سے ایک فاسد و مہلک پھوڑے کو کاٹ کر حاصل کی جاتی ہے۔ حیات فی القصاص کے اس فلسفہ کو حضور نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے ایک موقع پر خوب سمجھایا ہے۔ ارشاد ہوا کہ اُنْصُرْ اَخَاكَ ظَالِمًا اَوْ مَظْلُوْمًا اپنے بھائی کی مدد کر خواہ وہ ظالم ہو یا مظلوم۔ سننے والے کو حیرت ہوئی کہ مظلوم کی حمایت تو برحق۔ مگر یہ ظالم کی اعانت کیسی؟ پوچھا کہ یارسول اللہ ہم مظلوم کی اعانت تو ضرور کرینگے

لیکن ظالم کی اعانت کس طرح کریں؟ آپ نے فرمایا تاخذ فوق یدیہ اس طرح کہ تو اس کا ہاتھ پکڑ لے۔ اور اُسے ظلم سے باز رکھے۔ پس درحقیقت ظالم کے ظلم کو روکنے میں اس کے ساتھ جو سختی بھی کی جائے۔ وہ سختی نہیں ہے۔ بلکہ عین نرمی اور خود اس کی مدد ہے۔ اسی لئے اسلام میں حدودِ الٰہی کو قائم کرنے کی سختی کے ساتھ تاکید کی گئی ہے اور اسے رحمت و برکت کا موجب بتایا گیا ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ اقامۃ حد من حدود اللہ خیر من مطر اربعین لیلۃ فی بلاد اللہ عزوجل اللہ کی حدوں میں سے ایک حد قائم کرنے کی برکت ۴۰ دن کی بارش سے زیادہ ہے۔ بارش کی برکت یہ ہے کہ اس سے زمین سیراب ہوتی ہے، فصلیں خوب تیار ہوتی ہیں۔ خوشحالی بڑھتی ہے۔ مگر اقامتِ حدود کی برکت اس سے بڑھکر ہے کہ اس سے فتنہ و فساد اور ظلم و بدامنی کی جڑ کٹتی ہے۔ خدا کی مخلوق کو امن چین سے زندگی بسر کرنا نصیب ہوتا ہے۔ اور قیامِ امن سے وہ طمانیت میسر آتی ہے۔ جو تمدن کی جان اور ترقی کی روح ہے۔

قتل بالحق اور قتل بغیر حق کا فرق

قتل بغیر حق کی ایسی سخت ممانعت اور قتل بحق کی ایسی سخت تاکید سے شریعت الٰہیہ نے افراط و تفریط کی دونوں راہیں چھوڑ کر عدل و توسط کی سیدھی راہ کی طرف ہماری رہنمائی کی ہے۔ ایک طرف وہ مسرف اور حد سے تجاوز کرنیوالا گروہ ہے جو انسانی جان کی کوئی قیمت نہیں سمجھتا۔ اور اپنی نفسانی خواہشات پر اسے قربان کر دینا جائز سمجھتا ہے۔ دوسری طرف وہ غلط فہم اور غلط بیں گروہ ہے جو خون کے تقدس اور اس کی حرمت کا قائل ہے۔ اور کسی حال میں بھی اسے بہانا جائز نہیں سمجھتا۔ اسلامی شریعت نے ان دونوں غلط خیالوں کی تردید کر دی۔ اور اس نے بتایا کہ نفس انسانی کی حرمت نہ تو ایسی ہے جیسی ماں بہن کی حرمت کی طرح ابدی ہے کہ کسی طرح حلت سے بدل ہی نہ سکے اور نہ اس کی قیمت اس قدر کم ہے کہ نفسانی جذبات کی تسکین کی خاطر سے ہلاک کر دینا جائز ہو۔ اس نے ایک طرف یہ بتایا کہ انسان کی جان اس لئے نہیں ہے کہ تفریحِ طبع کے لئے اس کے بسمل ہونے اور تڑپنے کا تماشہ دیکھا جائے۔ اس کو جانوروں کی طرح تیر و تفنگ کا نشانہ بنایا جائے۔ کسی شخص کی خوشنودی کی بھینٹ چڑھا دیا جائے۔ [illegible] اس کی قربانی کا دیا جائے۔ [illegible] کسی کا خون بہانا یقیناً جرم و سخت

معصیت ہے۔ مگر دوسری طرف یہ بھی بتایا کہ ایک چیز انسان کی جان سے بھی زیادہ قیمتی ہے۔ اور وہ حق ہے۔ وہ جب اس کے خون کا مطالبہ کرے تو اسے بہانا نہ صرف جائز بلکہ فرض ہے اور اسکو نہ بہانا اول درجہ کی معصیت۔ انسان جب تک حق کا احترام کرتا ہے اسکا خون واجب الاحترام رہتا ہے۔ مگر جب وہ سرکشی اختیار کر کے "حق" پر دست درازی کرتا ہے تو اپنے خون کی قیمت خود کھو دیتا ہے اور پھر اس خون کی قیمت اتنی بھی نہیں رہتی جتنی پانی کی ہوتی ہے۔

ناگزیر خونریزی

یہ قتل بالحق اگرچہ صورت میں قتل بغیر حق کی طرح خونریزی ہی ہے۔ مگر یہ ناگزیر خونریزی ہے۔ جس سے کسی حال میں چھٹکارا نہیں۔ اس کے بغیر نہ دنیا میں امن قائم ہو سکتا ہے نہ شر و فساد کی جڑ کٹ سکتی ہے۔ نہ نیکوں کو بدوں کی شرارت سے نجات مل سکتی ہے۔ نہ حقدار کو حق مل سکتا ہے، نہ ایمانداروں کو ایمان اور ضمیر کی آزادی حاصل ہو سکتی ہے۔ نہ سرکشوں کو ان کے جائز حدود میں محدود رکھا جا سکتا ہے۔ اور نہ اللہ کی مخلوق کو مادی و روحانی چین میسر آسکتا ہے۔ اگر اسلام پر ایسی خونریزی کا الزام ہے تو اسے اس الزام کے قبول کرنے میں ذرہ برابر بھی عار نہیں۔ لیکن سوال یہ ہے کہ اور کون ہے جس کا دامن اس ناگزیر خونریزی کی چھینٹوں سے سرخ نہیں ہے؟ بودھ مذہب کی اہنسا اس کو ناجائز رکھتی ہے۔ مگر وہ بھی بھکشو اور گرہستی میں فرق کرنے پر مجبور ہوئی۔ اور آخر اس نے ایک قلیل جماعت کے لئے نجات (نروان) کو محفوظ رکھنے کے بعد باقی تمام دنیا کو چند اخلاقی ہدایات دیکر گرہست دھرم اختیار کرنے کے لئے چھوڑ دیا، جس میں سیاست، تعزیر، اور جنگ سب کچھ ہے۔ اسی طرح مسیحیت بھی جنگ کی کلی تحریم کے باوجود آخر کار جنگ پر مجبور ہوئی اور جب رومی سلطنت کے مظالم برداشت کرنا اس کے لئے ناممکن ہو گیا تو آخر کار اس نے خود سلطنت پر قبضہ کر کے ایسی جنگ برپا کی جو ناگزیر خونریزی کی حد سے بھی آگے نکل گئی۔ ہندو مذہب میں بھی متاخرین فلاسفہ نے "اہنسا پرمو دھرما" کا عقیدہ تجویز کیا۔ اور جیو ہتیا کو پاپ قرار دیا، مگر اسی عہد کے مقنن منوسے فتویٰ پوچھا گیا کہ "اگر کوئی شخص ہماری عورتوں پر دست درازی کرے۔ یا ہمارا مال چھینے۔ یا ہمارے دھرم کی بے آبروئی کرے تو ہم کیا کریں؟" تو اس نے جواب دیا کہ "ایسے جفاکار انسان کو ضرور مار ڈالنا چاہئے۔ عام اس سے کہ وہ گورو ہو۔ یا عالم برہمن۔ بوڑھا ہو، یا نوجوان"۔

یہاں مذاہب کا مقابلہ کر کے اس ناگزیر خونریزی کی ضرورت ثابت کرنے کا موقع نہیں ہے تقابلِ ادیان کی بحث ایک الگ چیز ہے، جو اپنے موقع پر آئے گی۔ اور اسوقت یہ ثابت ہو جائیگا کہ جو مذاہب جنگ کو برا سمجھتے ہیں وہ بھی عملی دنیا میں قدم رکھنے کے بعد اس ناگزیر چیز سے اپنے آپ کو محفوظ رکھنے میں ناکام رہے ہیں، سردست ہمارا مدعا صرف یہ دکھلانا ہے کہ نمائش اخلاق کے لئے کوئی جماعت خواہ کیسے ہی بلند مگر خیالی فلسفوں تک پہنچ جائے لیکن عالم مادی میں آ کر جو سراسر کشمکش گاہِ عمل ہے اسے دنیا کے تمام مسائل کو عملی صورتوں سے ہی حل کرنا پڑتا ہے۔ اور یہ دنیا خود اسکو مجبور کرتی ہے کہ وہ اس کی حقیقتوں کا عملی تدابیر سے مقابلہ کرے۔ خدائے اسلام کے لئے کچھ مشکل نہ تھا کہ وہ حرمت نفس کے لئے ویسے ہی خیالی لذت بخشنے والے اصول پیش کرتا۔ جیسے کہ اہنسا کے عقیدہ میں پائے جاتے ہیں، اور یقیناً وہ اپنے معجزانہ کلام میں ان کو پیش کر کے دنیا کی عقلوں کو دنگ کر سکتا تھا۔ مگر اس فاطر کائنات کو خطابت اور فصاحت کی نمائش مقصود نہ تھی بلکہ وہ اپنے بندوں کے لئے ایک صحیح اور واضح دستور العمل پیش کرنا چاہتا تھا جس پر کاربند ہو کر ان کی دنیا اور دین درست ہو سکے۔ اس لئے جب اس نے دیکھا کہ الا بالحق کے استثنا کے بغیر محض لا تقتلوا النفس کا عام حکم مفید نہیں ہو سکتا تو یہ اس کی بے عیب ذات سے بعید تھا کہ دنیا والوں کو لم تقولون ما لا تفعلون، تم وہ بات کیوں کہتے ہو جو کرتے نہیں ہو، کا طعنہ دینے کے باوجود انہیں زبان سے اہنسا پرمود هرم کی آواز بلند کرنے اور ہاتھ سے تلوار چلانے کی تعلیم دیتا۔ پس یہ اللہ کی حکمت بالغہ ہی تھی کہ اس نے حرمت نفس کی تعلیم کے ساتھ قصاص کا قانون بھی مقرر کیا۔ اور اسطرح اس قوت کے استعمال کو ضروری قرار دیا جسکا استعمال حرمت نفس کی حفاظت کے لئے ناگزیر ہے۔

اجتماعی فتنہ

یہ قصاص کا قانون بہ نسبت افراد کے ہے۔ اسی طرح جماعتوں کے لئے بھی ہے جس طرح افراد سرکش ہوتے ہیں، اسی طرح بعض اوقات قومیں بھی سرکش ہوتی ہیں، جس طرح افراد خبث نفس سے مغلوب ہو کر اپنی حد سے تجاوز کر جاتے ہیں، اسی طرح جماعتوں اور قوموں میں بھی یہ خبیث مرض پیدا ہو جایا کرتا ہے۔ اور جس طرح افراد کو قابو میں رکھنے اور تعدی سے باز رکھنے کے لئے خونریزی ناگزیر ہوتی ہے، اسی طرح قوموں

اور قوموں کی بڑھتی ہوئی حرص و طمع اور بڑھتی ہوئی بدکاری کو روکنے کے لئے بھی جنگ ناگزیر
ہو جاتی ہے۔ نوعیت کے اعتبار سے انفرادی اور اجتماعی فتنہ میں کوئی فرق نہیں ہے مگر
کیفیت کے اعتبار سے عظیم الشان فرق ہے۔ افراد کا فتنہ ایک تنگ دائرے میں محدود ہوتا ہے
انسانوں کی ایک قلیل جماعت کو اس سے آزار پہنچتا ہے۔ اور گز بھر زمین رنگین کر کے اسکا استیصال
کیا جا سکتا ہے۔ مگر جماعتوں کا فتنہ ایک غیر محدود مصیبت ہوتا ہے جس سے بیشما انسانوں
کی زندگی دوبھر ہو جاتی ہے۔ پوری کی پوری قوموں پر عرصۂ حیات تنگ ہو جاتا ہے۔ تمدن کے
سارے نظام میں ایک ہل چل برپا ہو جاتی ہے۔ اور اسکا استیصال خون کی ندیاں بہائے
بغیر نہیں ہو سکتا جسے قرآن مجید میں اثخان فی الارض کے معنی خیز لفظ سے تعبیر کیا گیا ہے،

جماعتیں جب سرکشی پر آتی ہیں تو کوئی ایک فتنہ نہیں ہوتا جو وہ برپا کرتی ہوں، ان میں طرح
طرح کے شیطان شامل ہوتے ہیں۔ اس لئے طرح طرح کی شیطانی قوتیں ان کے طوفان میں
ابھر آتی ہیں، اور ہزاروں قسم کے فتنے ان کی بدولت اٹھ کھڑے ہوتے ہیں بعض ان میں دھن
دولت کے لالچی ہوتے ہیں۔ تو وہ غریب قوموں پر ڈاکے ڈالتے ہیں۔ ان کی تجارت پر قبضہ
کرتے ہیں۔ ان کی صنعتوں کو برباد کرتے ہیں۔ ان کی محنت سے کمائے ہوئے روپے کو قسم
قسم کی چالاکیوں سے لوٹتے ہیں اور قوت کے حق کی بنا پر اس دولت سے اپنے خزانے
بھرتے ہیں جس کی جائز حقدار وہ فاقہ کش مظلوم قومیں ہوتی ہیں، بعض ان میں ہوائے نفسانی
کے بندے ہوتے ہیں تو وہ اپنے جیسے انسانوں کے خدا بن بیٹھتے ہیں اپنی خواہشات
پر کمزوروں کے حقوق قربان کرتے ہیں۔ عدل و انصاف کو مٹا کر ظلم و جفا کے علم بلند کرتے ہیں۔
شریفوں اور نیکوکاروں کو دبا کر سفیہوں اور کمینوں کو سربلند کرتے ہیں۔ ان کے ناپاک اثر سے
قوموں کے اخلاق تباہ ہو جاتے ہیں۔ محاسن اور فضائل کے چشمے سوکھ جاتے ہیں، اور ان
کی جگہ خیانت، بدکاری، بے حیائی، سنگدلی، بے انصافی اور بے شمار دوسرے اخلاقی
مفاسد کی بدروئیں جاری ہو جاتی ہیں۔ پھر ان میں سے بعض وہ ہیں جن پر جہانگیری و کشورستانی
کا بھوت سوار ہوتا ہے۔ تو وہ بے بس اور کمزور قوموں کی آزادیاں سلب کرتے ہیں، خدا کے
بیگناہ بندوں کے خون بہاتے ہیں، اپنی خواہش اقتدار کو پورا کرنے کے لئے زمین میں فساد

پھیلاتے ہیں۔ اور آزاد انسانوں کو اس غلامی کا طوق پہناتے ہیں جو تمام خلائق مقدس کی حر
ہے۔ ان شیطانی صفات کے ساتھ جب اکراہ فی الدین بھی شامل ہو جاتا ہے۔ اور ان ظالم
جماعتوں میں سے کوئی جماعت اپنی اغراض کے لئے مذہب کو استعمال کر کے بندگانِ خدا کو مذہبی
آزادی سے بھی محروم کر دیتی ہے۔ اور دوسرے مذہب والوں پر اس وجہ سے ظلم وستم توڑتی ہے کہ وہ
اس کے مذہب کے بجائے دوسرے مذہب کی پیروی کیوں کرتے ہیں تو یہ مصیبت اور بھی زیادہ شدید
ہو جاتی ہے۔ اور اس وقت مُسْتَضْعَفِيْنَ مِنَ الرِّجَالِ وَالنِّسَاۗءِ وَالْوِلْدَانِ (کمزور عورتیں مرد
اور بچے) ظلم وستم سے عاجز آکر پکار اٹھتے ہیں کہ رَبَّنَآ اَخْرِجْنَا مِنْ هٰذِهِ الْقَرْيَةِ الظَّالِمِ اَهْلُهَا۔
(اے خدا! تو ہمیں اس ملک سے نکال جہاں کے لوگ بڑے ہی ظالم وجفاکار ہیں) اور وہ کلپ کلپ کر کسی
ایسی طاقت کے بھیجنے کی خدا سے دعا کرتے ہیں جو ان کی مدد کرے۔ اور اس سے کہتے ہیں کہ وَاجْعَلْ لَّنَا
مِنْ لَّدُنْكَ وَلِيًّا وَّاجْعَلْ لَّنَا مِنْ لَّدُنْكَ نَصِيْرًا (تو اپنی طرف سے کسی کو ہمارا سرپرست اور مددگار
بنا کر بھیج۔

جنگ ایک اخلاقی فرض

ایسی حالت میں جنگ جائز ہی نہیں بلکہ فرض ہو جاتی ہے؛
اس وقت انسانیت کی سب سے بڑی خدمت یہی ہوتی ہے کہ ان
ظالموں کے خون سے زمین کو سرخ کر دیا جائے۔ اور ان مفسدوں اور فتنہ پردازوں کے شر سے اللہ
کے مظلوم وبےبس بندوں کو نجات دلائی جائے جو شیطان کی امت بن کر اولادِ آدم پر اخلاقی، روحانی
اور مادی تباہی کی مصیبتیں نازل کرتے ہیں۔ وہ لوگ در اصل انسان نہیں ہوتے کہ انسانی ہمدردی کے مستحق ہوں بلکہ انسان
کے لباس میں شیطان اور انسانیت کے حقیقی دشمن ہوتے ہیں جن کے ساتھ اصلی ہمدردی یہی ہے
کہ انہیں اور ان کے شر کو صفحۂ ہستی سے حرف غلط کی طرح مٹا دیا جائے۔ وہ اپنے کرتوتوں سے
اپنے حق حیات کو خود کھو دیتے ہیں۔ انہیں اور ان لوگوں کو جو ان کے شر کو باقی رکھنے کے لئے ان کی
مدد کریں دنیا میں زندہ رہنے کا کوئی حق باقی نہیں رہتا۔ اور وہ در حقیقت انسانیت کے جسم کا
ایسا عضو ہوتے ہیں جس میں زہر پڑ گیا ہو۔ اور جو سڑ کر بگڑ گیا ہو۔ اور جس کے باقی رہنے سے تمام جسم
کے ہلاک ہو جانے کا اندیشہ ہو۔ اس سے عقل و صحت کا مقتضا یہی ہوتا ہے کہ اس فاسد و
مفسد عضو کو کاٹ پھینکا جائے۔ بہت ممکن ہے کہ دنیا میں کوئی انتہا پسند اخلاقی معلم یا متعلم

ایسا بھی ہو جس کے نزدیک ایسے ظالموں کا قتل بھی ناجائز ہو۔ اور اس کی بزدل روح اس خون کے سیلاب کے تصور سے کانپ اٹھتی ہو۔ جو ان کا شر دفع کرنے میں بہتا ہے۔ مگر ایسا معلم دنیا کی اصلاح نہیں کرسکتا۔ وہ جنگلوں۔ اور پہاڑوں میں جاکر تقویٰ و ریاضت سے اپنی روح کو تو ضرور تسکین پہنچا سکتا ہے۔ مگر اس کی تعلیم دنیا کو بدی سے پاک کرنے اور ظلم و سرکشی سے محفوظ رکھنے میں کبھی کامیاب نہیں ہوسکتی۔ وہ نفس کش انسانوں کی ایسی جماعت تو ضرور مہیا کر سکتا ہے۔ جو مظلوموں کے ساتھ ظلم سہنے میں خود بھی شریک ہوجائے۔ مگر بلند حوصلہ انسانوں کی ایسی جماعت پیدا کرنا اس کے بس کی بات نہیں ہے جو ظلم کو مٹا کر عدل قائم کردے۔ اور خلقِ خدا کے لئے امن و چین سے رہنے اور انسانیت کے اعلیٰ نصب العین تک پہنچنے کے وسائل مہیا کردے۔

عملی اخلاق جس کا مقصد تمدن کا صحیح نظام قائم کرنا ہے۔ در اصل ایک دوسرا ہی فلسفہ ہے جس میں خیالی لذت کے سامان ڈھونڈنا بیکار ہے۔ جس طرح علم کا مقصد لذتِ کام و دہن نہیں بلکہ اصلاحِ بدن ہے۔ خواہ کڑوی دوا سے ہو یا میٹھی سے اسی طرح اخلاق کا مقصد بھی لذتِ ذوق و نظر نہیں ہے۔ بلکہ دنیا کی اصلاح ہے خواہ سختی سے ہو۔ خواہ نرمی سے۔ کوئی سچا اخلاقی مصلح تلوار اور قلم میں سے ایک چیز کو اختیار کرنے اور ایک ہی ذریعے فریضۂ اصلاح کو انجام دینے کا فیصلہ نہیں کرسکتا۔ اس کو اپنا کام پورا کرنے کے لئے دونوں چیزوں کی یکساں ضرورت ہے۔ جب تک زبانی تلقین و تبلیغ شوریدہ سر جماعتوں کو اخلاق و انسانیت کے حدود کا پابند بنانے میں کارگر ہوسکتی ہو۔ تو ان کے خلاف تلوار استعمال کرنا ناجائز بلکہ حرام ہے۔ مگر جب کسی جماعت کی شرارت و بد باطنی اس حد سے گذر چکی ہو کہ اسے وعظ و تلقین سے راہِ راست پر لایا جا سکے اور اس کو دوسری جماعتوں اور قوموں پر دست درازی کرنے اور ان کے حقوق غصب کرنے ان کی عزت و شرافت کو پامال کرنے اور ان کی اخلاقی و روحانی اور مادی زندگی کو تباہ کرنے سے باز رکھنے کی کوئی صورت باقی نہ رہی تو ہر سچے بہی خواہِ انسانیت کا یہ اولین فرض ہے کہ اس کے خلاف تلوار اُٹھائے۔ اور اس وقت تک آرام نہ لے جب تک خدا کی مخلوق کو اس کے کھوئے ہوئے حقوق واپس نہ مل جائیں۔

جنگ کی مصلحت

جنگ کی اسی مصلحت و ضرورت کو خدائے حکیم و خبیر نے اپنے حکیمانہ ارشاد میں ظاہر فرمایا ہے:۔

وَلَوْلَا دَفْعُ اللّٰهِ النَّاسَ بَعْضَهُمْ بِبَعْضٍ لَّهُدِّمَتْ صَوَامِعُ وَبِيَعٌ وَّصَلَوٰتٌ وَّمَسَاجِدُ يُذْكَرُ فِيهَا اسْمُ اللّٰهِ كَثِيرًا ۔ (۲۲ : ٦)	اگر خدا لوگوں کو ایک دوسرے کے ذریعہ دفع نہ کرتا تو صومعے اور گرجے اور معبد اور مسجدیں جن میں اللہ کا ذکر کثرت سے کیا جاتا ہے مسمار کردی جاتیں۔

اس آیۂ مبارکہ میں صرف مسلمانوں کی مسجدوں ہی کا ذکر نہیں فرمایا۔ بلکہ تین اور چیزوں کا بھی ذکر فرمایا ہے، یعنی صوامع، بیع اور صلوات۔ صوامع سے مراد عیسائیوں کے راہب خانے، مجوسیوں کے معابد اور صابیوں کے عبادت خانے ہیں۔ اور بیع کے لفظ میں عیسائیوں کے گرجے۔ اور یہودیوں کے کنائس دونوں داخل ہیں۔ یہ جامع الفاظ استعمال کرنے کے بعد پھر صلوات کا ایک اور وسیع لفظ استعمال کیا جس کا اطلاق ہر موضع عبادت الٰہی پر ہوتا ہے۔ اور ان سب کے آخر میں مساجد کا ذکر کیا ہے۔ اس سے یہ بتانا مقصود ہے۔ کہ اگر اللہ عادل انسانوں کے ذریعہ ظالم انسانوں کو دفع نہ کرتا رہتا تو اتنا فساد ہوتا کہ عبادت گاہیں تک بربادی سے نہ بچتیں۔ جن سے ضرر کا کسی کو اندیشہ نہیں ہو سکتا۔ اس کے ساتھ ہی یہ بھی بتا دیا کہ فساد کی سب سے زیادہ مکروہ صورت یہ ہے کہ ایک قوم عداوت کی راہ سے دوسری قوم کے معبدوں تک کو برباد کرے۔ اور پھر نہایت بلیغ انداز میں اپنے اس منشا کا بھی اظہار کردیا کہ جب کوئی قوم ایسا فساد برپا کرتی ہے تو ہم دوسری قوم کے ذریعہ اس کی شرارت کا استیصال کردینا ضروری سمجھتے ہیں ۔

جنگ کی اسی مصلحت کو دوسری جگہ جالوت کی سرکشی اور حضرت داؤدؑ کے ہاتھ سے اس کے مارے جانے کا ذکر کرتے ہوئے یوں بیان فرمایا ہے کہ:-

وَلَوْلَا دَفْعُ اللّٰهِ النَّاسَ بَعْضَهُمْ بِبَعْضٍ لَّفَسَدَتِ الْأَرْضُ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ ذُوْ فَضْلٍ عَلَى الْعٰلَمِيْنَ ([illegible])	اگر اللہ لوگوں کو ایک دوسرے کے ذریعہ دفع نہ کرتا تو زمین فساد سے بھر جاتی مگر اللہ تو دنیا پر بڑا فضل کرتا ہے ۔

ایک اور جگہ قوموں کی باہمی عداوت و دشمنی کا ذکر کرکے اس طرح ارشاد ہوتا ہے کہ:-

كُلَّمَا أَوْقَدُوا نَارًا لِّلْحَرْبِ أَطْفَأَهَا اللّٰهُ وَيَسْعَوْنَ فِي الْأَرْضِ فَسَادًا وَاللّٰهُ لَا يُحِبُّ الْمُفْسِدِيْنَ ([illegible])	یہ لوگ جب کبھی جنگ کی آگ بھڑکاتے ہیں تو اللہ اس کو بجھا دیتا ہے۔ یہ زمین میں فساد پھیلانے کی کوشش کرتے ہیں مگر اللہ مفسدوں کو پسند نہیں کرتا۔

جہاد فی سبیل اللہ

یہی فساد اور بدامنی اور طمع و ہوس، بغض و عداوت، تعصب و تنگ نظری کی جنگ ہے جس کی آگ کو فرو کرنے کے لئے اللہ تعالےٰ نے اپنے نیک بندوں کو تلوار اٹھانے کا حکم دیا ہے۔ چنانچہ فرمایا۔

اُذِنَ لِلَّذِيْنَ يُقٰتَلُوْنَ بِاَنَّهُمْ ظُلِمُوْا، وَ اِنَّ اللّٰهَ عَلٰى نَصْرِهِمْ لَقَدِيْرُ الَّذِيْنَ اُخْرِجُوْا مِنْ دِيَارِهِمْ بِغَيْرِ حَقٍّ اِلَّآ اَنْ يَّقُوْلُوْا رَبُّنَا اللّٰهُ:- (۲۲ : ۶)

جن لوگوں سے جنگ کی جارہی ہے انہیں لڑنے کی اجازت دیجاتی ہے کیونکہ ان پر ظلم ہوا ہے اور اللہ انکی مدد پر یقیناً قدرت رکھتا ہے۔ یہ وہ لوگ ہیں جو اپنے گھروں سے بے قصور نکالے گئے ہیں۔ ان کا قصور صرف یہ تھا کہ یہ اللہ کو اپنا پروردگار کہتے تھے،

یہ اسلام میں پہلی آیت ہے جو قتال کے بارے میں اتری ہے۔ اور اس میں جن لوگوں کے خلاف جنگ کا حکم دیا گیا ہے ان کا قصور یہ نہیں بتایا کہ ان کے پاس ایک زرخیز ملک ہے، یا وہ تجارت کی ایک بڑی منڈی کے مالک ہیں۔ یا وہ ایک دوسرے مذہب کی پیروی کرتے ہیں۔ بلکہ ان کا جرم صاف طور پر یہ بتایا گیا ہے کہ وہ ظلم کرتے ہیں۔ لوگوں کو بے قصور ان کے گھروں سے نکالتے ہیں۔ اور اس قدر متعصب ہیں کہ محض اللہ کو پروردگار کہنے پر تکلیفیں پہنچاتے ہیں اور مصیبتیں توڑتے ہیں۔ ایسے لوگوں کے خلاف صرف اپنی مدافعت ہی میں جنگ کا حکم نہیں دیا گیا۔ بلکہ دوسرے مظلوموں کی اعانت و حمایت کا بھی حکم دیا گیا ہے اور تاکید کی گئی ہے کہ کمزور و بے بس لوگوں کو ظالموں کے پنجہ سے چھڑاؤ:-

وَمَا لَكُمْ لَا تُقَاتِلُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَالْمُسْتَضْعَفِيْنَ مِنَ الرِّجَالِ وَالنِّسَآءِ وَالْوِلْدَانِ الَّذِيْنَ يَقُوْلُوْنَ رَبَّنَآ اَخْرِجْنَا مِنْ هٰذِهِ الْقَرْيَةِ الظَّالِمِ اَهْلُهَا وَاجْعَلْ لَّنَا مِنْ لَّدُنْكَ وَلِيًّا وَّاجْعَلْ لَّنَا مِنْ لَّدُنْكَ نَصِيْرًا۔ (۴ : ۱۰)

تمہیں کیا ہو گیا ہے کہ اللہ کی راہ میں ان کمزور مردوں، عورتوں اور بچوں کی خاطر نہیں لڑتے جو کہتے ہیں کہ اے خدا ہمیں اس بستی سے نکال۔ جہاں کے لوگ بڑے ظالم و جفا کار ہیں۔ اور ہمارے لئے خاص اپنی طرف سے ایک محافظ و مددگار مقرر فرما۔

⁂ ⁂ ⁂ ⁂

اس جنگ کو جو ظالموں اور مفسدوں کے مقابلہ پر کمزوروں بے بسوں اور مظلوموں کی اعانت کے لئے کی جائے اللہ نے خاص راہِ خدا کی جنگ قرار دیا ہے جس سے یہ ظاہر کرنا مقصود ہے کہ یہ جنگ بندوں کے لئے نہیں بلکہ خدا کے لئے ہے۔ اور بندوں کی اغراض کے لئے نہیں۔ بلکہ خاص خدا کی خوشنودی کے لئے لڑی جاتی ہے۔ اس جنگ کو اس وقت تک جاری رکھنے کا حکم دیا گیا ہے جب تک خدا کے بیگناہ بندوں پر نفسانی اغراض کے لئے دست درازی اور جبر و ظلم کرنے کا سلسلہ بند نہ ہو جائے۔ جیسا کہ فرمایا قَاتِلُوهُمْ حَتّٰى لَا تَكُوْنَ فِتْنَةٌ ان سے لڑے جاؤ یہاں تک کہ فتنہ باقی نہ رہے۔ اور حَتّٰى تَضَعَ الْحَرْبُ اَوْزَارَهَا یہاں تک کہ جنگ اپنے ہتھیار رکھ دے اور فساد کا نام و نشان اس طرح مٹ جائے کہ اس کے مقابلہ پر جنگ کی ضرورت ہی باقی نہ رہے۔ اس کے ساتھ ہی یہ بھی بتا دیا ہے کہ اس مبنی برحق جنگ کو خونریزی سمجھ کر چھوڑ دینے یا اس میں جان و مال کا نقصان دیکھ کر تامل کرنے کا نتیجہ کس قدر خراب ہے۔

حق و باطل کی حد بندی

اس طرح خدا نے حمایتِ حق کی جنگ کی مصلحت و ضرورت ظاہر کرنے اور تاکید فرمانے ہی پر قناعت نہیں کی۔ بلکہ یہ تصریح بھی فرما دی ہے کہ:۔

اَلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا يُقَاتِلُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا يُقَاتِلُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ الطَّاغُوْتِ فَقَاتِلُوْا اَوْلِيَاۗءَ الشَّيْطٰنِ اِنَّ كَيْدَ الشَّيْطٰنِ كَانَ ضَعِيْفًا۔ (۴ : ۱۰)	جو لوگ ایماندار ہیں وہ اللہ کی راہ میں جنگ کرتے ہیں اور جو کافر و نافرمان ہیں وہ ظلم و سرکشی کی خاطر لڑتے ہیں پس شیطان کے دوستوں سے لڑو کہ شیطان کی جنگ کا پہلو کمزور ہے۔

یہ ایک قولِ فیصل ہے جس میں حق اور باطل کے درمیان پوری حد بندی کر دی گئی ہے جو لوگ ظلم و سرکشی کی راہ سے جنگ کریں وہ شیطان کے دوست ہیں اور جو ظلم نہیں بلکہ ظلم کو مٹانے کے لئے جنگ کریں وہ راہِ خدا کے مجاہد ہیں۔ ہر وہ جنگ جس کا مقصد حقوق انسانی کے خلاف بندگانِ خدا کو تکلیف پہنچانا ہو جس کا منتہی مقصد بندگانِ خدا کو بے حق کرنا اور انہیں انکی جائز ملکیتوں سے بیدخل کرنا ہو جس کا مقصد بندگانِ خدا میں بسنے والے لوگوں کو بے قصور ستانا ہو، وہ سبیلِ طاغوت کی جنگ ہے۔ اسے خدا سے کچھ واسطہ نہیں اور ایسی جنگ کرنا ایمانداروں کا کام نہیں ہے۔ البتہ جو لوگ ایسے ظالموں کے مقابلہ میں مظلوموں کی حمایت و مدافعت کرتے ہیں جو دنیا سے ظلم و طغیان کو مٹا کر عدل و انصاف قائم کرنا چاہتے ہیں جو سرکشی اور فساد کی جڑ کاٹتے

بندگانِ خدا کو امن و اطمینان سے زندگی بسر کرنے اور انسانیت کے اعلیٰ نصب العین کی طرف ترقی کرنے کا موقع دیتے ہیں۔ ان کی جنگ راہِ خدا کی جنگ ہے، وہ مظلوموں کی کیا مدد کرتے ہیں گویا خود خدا کی مدد کرتے ہیں۔ اور اللہ کی نصرت کا وعدہ انہی کے لئے ہے۔

جہاد فی سبیل اللہ کی فضیلت

یہی وہ جہاد فی سبیل اللہ ہے جس کی فضیلت سے قرآن کے صفحے بھرے پڑے ہیں جس کے متعلق فرمایا ہے کہ:۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا هَلْ أَدُلُّكُمْ عَلَىٰ تِجَارَةٍ تُنْجِيكُمْ مِنْ عَذَابٍ أَلِيمٍ ؟ تُؤْمِنُونَ بِاللَّهِ وَتُجَاهِدُونَ فِي سَبِيلِ اللَّهِ بِأَمْوَالِكُمْ وَأَنْفُسِكُمْ ذَٰلِكُمْ خَيْرٌ لَكُمْ إِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُونَ ۝ (۲:۶۱)

اے ایمان والو! کیا میں تمہیں ایسی تجارت بتاؤں جو تمہیں دردناک عذاب سے بچائے؟ وہ تجارت یہ ہے کہ تم اللہ پر ایمان لاؤ اور اس کی راہ میں اپنی جان اور مال سے جہاد کرو، یہ تمہارے لئے بہترین کام ہے۔ اگر تم علم رکھتے ہو۔

* * *

جس کے لڑنے والوں کی تعریف میں فرمایا کہ:۔

إِنَّ اللَّهَ يُحِبُّ الَّذِينَ يُقَاتِلُونَ فِي سَبِيلِهِ صَفًّا كَأَنَّهُمْ بُنْيَانٌ مَرْصُوصٌ۔ (۶۱:۱)

اللہ ان لوگوں سے محبت کرتا ہے جو اسکی راہ میں اس طرح صف باندھے ہوئے جم کر لڑتے ہیں۔ گویا وہ ایک سیسہ پلائی ہوئی دیوار ہیں۔

جس کی بلندی و عظمت کی گواہی اس شان سے دی ہے کہ:۔

أَجَعَلْتُمْ سِقَايَةَ الْحَاجِّ وَعِمَارَةَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ كَمَنْ آمَنَ بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ وَجَاهَدَ فِي سَبِيلِ اللَّهِ لَا يَسْتَوُونَ عِنْدَ اللَّهِ وَاللَّهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الظَّالِمِينَ الَّذِينَ آمَنُوا وَهَاجَرُوا وَجَاهَدُوا فِي سَبِيلِ اللَّهِ بِأَمْوَالِهِمْ وَأَنْفُسِهِمْ أَعْظَمُ دَرَجَةً عِنْدَ اللَّهِ وَأُولَٰئِكَ هُمُ الْفَائِزُونَ

کیا تم نے حاجیوں کو پانی پلانے اور مسجد حرام کے آباد کرنے کو ان لوگوں کے کام کے برابر ٹھہرایا ہے جو اللہ اور یوم آخر پر ایمان لائے اور اللہ کی راہ میں لڑے؟ اللہ کے نزدیک یہ دونوں برابر نہیں ہو سکتے۔ اللہ ظالم لوگوں کو ہدایت نہیں کرتا۔ جو لوگ ایمان لائے جنہوں نے حق کی خاطر گھر بار چھوڑا اور اللہ کی راہ میں جان و مال سے لڑے ان کا درجہ اللہ کے

نزدیک سب سے بڑا ہے، اور وہی لوگ ہیں جو حقیقت میں کامیاب ہیں۔

پھر یہی وہ حق پرستی کی جنگ ہے جس میں ایک رات کا جاگنا ہزار راتیں جاگ کر عبادت کرنے سے بڑھ کر ہے جس کے میدان میں جم کر کھڑے ہونا گھر بیٹھ کر ۶۰ برس تک نمازیں پڑھنے سے افضل بتایا گیا ہے جس میں جاگنے والی آنکھ پر دوزخ کی آگ حرام کر دی ہے جس کی راہ میں غبار آلود ہونے والے قدموں سے وعدہ کیا گیا ہے کہ وہ کبھی آتشِ دوزخ کی طرف نہ گھسیٹے جائیں گے۔

اور اس کے ساتھ ہی ان لوگوں کو جو اس سے بچ کر گھر بیٹھ جائیں اور اس کی پکار سن کر کسمسانے لگیں ایسے غضبناک لہجہ میں تنبیہ کی گئی ہے کہ :-

قُلْ إِنْ كَانَ آبَاؤُكُمْ وَأَبْنَاؤُكُمْ وَإِخْوَانُكُمْ وَأَزْوَاجُكُمْ وَعَشِيرَتُكُمْ وَأَمْوَالٌ اقْتَرَفْتُمُوهَا وَتِجَارَةٌ تَخْشَوْنَ كَسَادَهَا وَمَسَاكِنُ تَرْضَوْنَهَا أَحَبَّ إِلَيْكُمْ مِنَ اللَّهِ وَرَسُولِهِ وَجِهَادٍ فِي سَبِيلِهِ فَتَرَبَّصُوا حَتَّىٰ يَأْتِيَ اللَّهُ بِأَمْرِهِ وَاللَّهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الْفَاسِقِينَ

(۹ : ۳)

ان سے کہدو اگر تمہیں اپنے باپ بیٹے۔ بھائی بیویاں رشتہ دار اور وہ مال جو تم نے کمائے ہیں۔ اور وہ تجارت جس کے مندے پڑ جانے کا تمہیں ڈر لگا ہوا ہے اور وہ گھر جنہیں تم پسند کرتے ہو۔ تمہیں اللہ اور اس کے رسول اور اس کی راہ میں جہاد کرنے سے زیادہ عزیز ہیں تو بیٹھے انتظار کرتے رہو۔ یہاں تک کہ خدا اپنا کام پورا کرے۔ یقین رکھو کہ اللہ فاسقوں کو کبھی ہدایت نہیں بخشتا۔

* * *

فضیلتِ جہاد کی وجہ

غور کرو کہ جہاد فی سبیل اللہ کی اتنی فضیلت اور تاکید کس لئے ہے؟ جہاد کرنے والوں کو بار بار کیوں کہا جاتا ہے کہ وہی کامیاب ہیں اور انہی کا درجہ بلند ہے؟ اور اس سے بچ کر بیٹھنے والوں کو ایسی تنبیہیں کیوں کی جاتی ہیں؟ اس سوال کو حل کرنے کے لئے ذرا ان آیات پر پھر ایک نظر ڈال جاؤ جنہیں جہاد کا حکم اور اس کی فضیلت اور اس سے بھاگنے کی برائی لکھی ہے۔ ان آیات میں کامیابی اور عظمتِ درجہ کے معنی کسی جگہ مال و دولت اور ملک و سلطنت کا حصول نہیں بتائے گئے جس طرح کرشن جی نے ارجن سے کہا تھا کہ اگر تو اس جنگ (مہابھارت) میں کامیاب ہوا تو دنیا کے راج کو بھوگے گا (گیتا ۲:۳۷) ..... اسی طرح قرآن میں کہیں یہ کہہ کر قتال فی سبیل اللہ کی جانب رغبت نہیں دلائی گئی کہ اس کے

نہیں تمہیں دنیا کی دولت اور حکومت ملے گی۔ بلکہ اس کے برخلاف ہر جگہ جہاد فی سبیل اللہ کے عوض
جنت خدا کی خوشنودی اور صرف اللہ کے ہاں بڑا درجہ ملنے اور عذاب الیم سے محفوظ رہنے کی توقع
دلائی گئی ہے۔ سقایۃ حاج اور عمارۂ مسجد حرام سے جو عرب میں بڑے رسوخ و اثر اور بڑی آمدنی
کا ذریعہ تھا۔ گھر بار چھوڑ کر نکلجانے اور جہاد فی سبیل اللہ کرنے کو افضل بتایا۔ اور پھر اس کے عوض
اَعْظَمُ دَرَجَةً عِنْدَ اللّٰهِ (اللہ کے نزدیک بڑے درجے) کے سوا اور کسی کامیابی کی راہ بھی
نہیں بتائی۔ دوسری جگہ ایک تجارت کا گر سکھایا ہے جس سے خیال ہوتا ہے کہ شاید یہاں کچھ دھن
دولت کا ذکر ہو گا۔ مگر پڑھکر دیکھیے تو اس تجارت کی حقیقت یہ نکلتی ہے کہ اللہ کی راہ میں جان
اور مال کھپاؤ۔ اور اس کے عوض عذاب سے نجات حاصل کرو۔ ایک اور جگہ لڑائی سے جی چرانے
والوں کو ڈانٹا جا رہا ہے۔ وہ بیوی بچوں کی محبت کے علاوہ اپنے کمائے ہوئے مال اور اپنی تجارت
کے کساد اور اپنے محبوب مکانوں کے چھٹنے کا خوف کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ حالانکہ دنیا میں جنگ
کرکے جو لوگ ملک فتح کرتے ہیں انہیں روپیہ بھی خوب ملتا ہے۔ ان کی تجارت بھی خوب چمکتی ہے۔
اور انہیں مفتوح قوم سے چھینی ہوئی قلعہ معلیٰ جیسی عالیشان عمارتیں بھی رہنے کو ملتی ہیں۔

پھر جب اس جہاد سے دنیا کی دولت اور ملک گیری مقصود نہیں ہے۔ تو آخر اس خون
بہانے سے اللہ کو کیا ملتا ہے۔ کہ وہ اس کے عوض اتنے بڑے بڑے درجے دے رہا ہے؟ آخر
اس خونریزی کی تگ و دو میں کیا رکھا ہے کہ اس کی بھاگ دوڑ سے گرد آلود ہونے والے قدموں
تک کو الطاف و عنایات کا مورد بنایا جاتا ہے؟ اور آخر اس میں وہ کونسی کامیابی مضمر ہے کہ اس
خشک و بے مزہ جہاد کے لڑنے والوں کو بار بار اُولٰٓئِكَ هُمُ الْفَآئِزُوْنَ کہا جا رہا ہے؟ اس کا
جواب اسی لَوْلَا دَفْعُ اللّٰهِ النَّاسَ بَعْضَهُمْ بِبَعْضٍ لَّفَسَدَتِ الْاَرْضُ اور اِلَّا تَفْعَلُوْهُ تَكُنْ
فِتْنَةٌ فِي الْاَرْضِ وَفَسَادٌ كَبِيْرٌ میں پوشیدہ ہے۔ اللہ یہ نہیں چاہتا کہ اس کی زمین پر فتنہ
و فساد پھیلایا جائے۔ اسے یہ گوارا نہیں ہے کہ اس کے بندوں کو بے قصور ستایا اور تباہ و برباد
کیا جائے۔ اسے یہ پسند نہیں ہے کہ طاقتور کمزوروں کو کھا جائیں۔ ان کے امن و چین پر ڈاکے
ڈالیں۔ اور ان کی اخلاقی روحانی اور مادی زندگی کو ہلاکت میں مبتلا کریں۔ اسے یہ منظور نہیں ہے
کہ زمین میں سہ کاری [illegible] قائم رہے وہ پسند نہیں

رتا کہ جو خاص اس کے غلام ہیں۔ ان کو مخلوق کا غلام بنا کر ان کی انسانی شرافت پر ذلت کا داغ لگایا
جائے۔ پس جو گروہ بغیر کسی معاوضہ کی خواہش، بغیر کسی دھن دولت کے لالچ، بغیر کسی ذاتی نفع کی تمن
ے، محض خدا کی خوشنودی کے لئے دنیا کو اس فتنہ سے پاک کرے، اور اس فساد کو دور کرکے اس کی جگہ
عدل قائم کرنے کے لئے کھڑا ہو جائے۔ اور اس نیک کام میں اپنی جان و مال اپنی تجارت کے فوائد
نے جورو بچوں اور ماں باپ بھائیوں کی محبت۔ اور اپنے گھر بار کے عیش و آرام سب کو قربان کردے۔ اس سو
یادہ اللہ کی محبت اور اللہ کی رضامندی کا مستحق کون ہو سکتا ہے؟ اور ایسا ے کامرانی کی آغوش
ں کے سوا اور کس کے لئے کھل سکتی ہے؟

جہاد فی سبیل اللہ کی یہی فضیلت ہے جس کی بنا پر اسے تمام انسانی اعمال میں ایمان باللہ
بعد سب سے بڑا درجہ دیا گیا ہے۔ اور غور سے دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ درحقیقت یہی چیز تمام فضائل
مکارم اخلاق کی روح ہے۔ انسان کی یہ اسپرٹ کہ وہ بدی کو کسی حال میں برداشت نہ کرے
راسے دفع کرنے کے لئے ہر قسم کی قربانی دینے کے لئے تیار ہو جائے۔ انسانی شرافت کی سب سو
ی اسپرٹ ہے۔ اور عملی زندگی کی کامیابی کا راز اسی اسپرٹ میں مضمر ہے۔ جو شخص دو سروں کے
بدی کو برداشت کرتا ہے۔ اس کی اخلاقی کمزوری اسے بہت جلدی اس پر بھی آمادہ کر دیتی ہے
خود اپنے لئے بدی کو برداشت کرے اور جب اس میں برداشت کا یہ مادہ بھی پیدا ہو جاتا ہے
مراس پر ذلت کا وہ درجہ آتا ہے جسے خدا نے اپنے غضب سے تعبیر کیا ہے۔ ضُرِبَتْ عَلَيْهِمُ الذِّلَّةُ
الْمَسْكَنَةُ وَبَاءُوا بِغَضَبٍ مِّنَ اللَّهِ اور اس درجہ میں پہونچ کر اس کے اندر شرافت و انسانیت کا
احساس باقی نہیں رہتا، وہ جسمانی و مادی غلامی ہی میں نہیں بلکہ ذہنی و روحانی غلامی میں
مبتلا ہو جاتا ہے۔ اور کمینگی کے ایسے گڑھے میں گرتا ہے۔ جہاں سے اس کا نکلنا محال ہو جاتا ہے۔
کے برخلاف جس شخص میں یہ اخلاقی قوت موجود ہو کہ وہ بدی کو محض بدی ہونے کے باعث
مٹائے۔ اور انسانی برادری کو اس سے نجات دلانے کے لئے انتھک جدوجہد کرتا رہے وہ ایک
نہایت اعلیٰ درجہ کا انسان ہوتا ہے۔ اور اس کا وجود تمام انسانیت کے لئے رحمت ہوتا ہے۔ ایسے
کو چاہے دنیا میں کسی معاوضہ کی خواہش نہ ہو۔ مگر دنیا ان تمام ثمروں کے وجود جن کے
اس کی پیشانی پر موجود ہیں۔ اتنی احسان ناشناس نہیں ہے کہ وہ اس کی عظمت انسانیت کو

اپنا سرتاج، اپنا امام اور اپنا سردار تسلیم نہ کرلے جو بے لاگ اور بے امید اجر و بے تمنائے مزد اسے بدی کے تسلط سے چھڑانے اور اسے اخلاقی، روحانی، و مادی، آزادی عطا کرنے کے لئے اپنا سب کچھ قربان کر دیتا ہو۔ یہی معنی ہیں اَنَّ الْاَرْضَ يَرِثُهَا عِبَادِيَ الصّٰلِحُوْنَ (زمین کے وارث میرے نیکو کار بندے ہوتے ہیں) کے اور یہیں سے یہ بات نکلتی ہو کہ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْفَآئِزُوْنَ سے محض آخرت ہی کی کامیابی مراد نہیں ہے بلکہ دنیا کی کامیابی بھی حقیقۃً انہی لوگوں کے لئے ہے جو نفسانی اغراض سے پاک ہو کر خالصۃً اللہ کی خوشنودی اور اللہ کے بندوں کی بھلائی کے لئے جہاد کرتے ہیں۔

نظامِ تمدن میں جہاد کا درجہ

جہاد کی اس حقیقت کو جان لینے کے بعد یہ سمجھ لینا بہت آسان ہے کہ قوموں کی زندگی میں اس روح کو کیا درجہ حاصل ہے اور نظامِ تمدن کو درست رکھنے کے لئے اس کی کس قدر ضرورت ہے۔ اگر دنیا میں کوئی ایسی قوت موجود ہو جو بدی کے خلاف پیہم جہاد کرتی رہے۔ اور تمام سرکش قوتوں کو اپنی اپنی حدود کی پابندی پر مجبور کرے۔ تو نظامِ تمدن میں یہ بے اعتدالی ہرگز نظر نہ آئے کہ آج سارا عالمِ انسانی ظالموں اور مظلوموں۔ آقاؤں اور غلاموں میں بٹا ہوا ہو۔ اور تمام دنیا کی اخلاقی و روحانی زندگی کہیں غلامی و مظلومی کے باعث اور کہیں غلام سازی و جفا پیشگی کے باعث تباہ و برباد ہو رہی ہے۔ بدی کو دوسروں سے دفع کرنا تو ایک بڑا درجہ ہے اگر اسے خود اپنے سے دفع کرنے کا احساس بھی ایک قوم میں موجود ہو اور اس کے مقابلہ میں وہ اپنے عیش و آرام۔ اپنی دولت و ثروت۔ اپنی نفسانی لذات اور اپنی جان کی محبت غرض کسی چیز کو عزیز نہ رکھے۔ تو وہ کبھی ذلیل و خوار ہو کر نہیں رہ سکتی اور اس کی عزت کو کوئی قوت پامال نہیں کر سکتی۔ حق کے آگے سر جھکانا اور ناحق کے آگے جھکانے پر موت کو ترجیح دینا ایک شریف قوم کا خاصہ ہونا چاہئے۔ اور اگر وہ اعلائے حق اور اعانتِ حق کی قوت نہ رکھتی ہو تو اسے کم از کم تحفظِ حق پر سختی کے ساتھ ضرور قائم رہنا چاہئے۔ یہ شرافت کا کم سے کم درجہ ہے۔ لیکن اس درجے سے گر کر جو قوم حق کی حفاظت بھی نہ کر سکے اور اس میں ایثار و قربانی کا فقدان اس قدر بڑھ جائے کہ بدی و شرارت جب اس پر چڑھ کر آئے تو وہ اسے مٹانے یا خود مٹ جانے کے بجائے اس کے ماتحت زندہ رہنے کو قبول کرلے

تو ایسی قوم کے لئے دنیا میں کوئی عزت نہیں ہے۔ اور اس کی زندگی یقیناً موت سے بدتر ہے۔ اسی رمز کو سمجھانے کے لئے خدا نے بار بار اپنی حکیمانہ کتاب میں ان قوموں کا ذکر کیا ہے۔ جنہوں نے بدی کے خلاف جہاد کرنے میں جان و مال اور لذات نفسانی کا ٹوٹا دیکھکر اس سے جی چرایا۔ اور بدی کا تسلط قبول کرکے اپنے اوپر ہمیشہ کے لئے خسران و نامرادی کا داغ لگالیا۔ ایسی قوموں کو خدا ظالم قومیں کہتا ہے یعنی انہوں نے اپنے اعمال سے خود اپنے اوپر ظلم کیا۔ اور حقیقتہً وہ اپنے ہی ظلم سے تباہ ہوئیں۔ چنانچہ ایک جگہ اس طرح انکی مثال دی ہے :-

أَلَمْ يَأْتِهِمْ نَبَأُ الَّذِينَ مِن قَبْلِهِمْ قَوْمِ نُوحٍ وَعَادٍ وَثَمُودَ وَقَوْمِ إِبْرَاهِيمَ وَأَصْحَابِ مَدْيَنَ وَالْمُؤْتَفِكَاتِ أَتَتْهُمْ رُسُلُهُم بِالْبَيِّنَاتِ فَمَا كَانَ اللَّهُ لِيَظْلِمَهُمْ وَلَٰكِن كَانُوا أَنفُسَهُمْ يَظْلِمُونَ وَالْمُؤْمِنُونَ وَالْمُؤْمِنَاتُ بَعْضُهُمْ أَوْلِيَاءُ بَعْضٍ يَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنكَرِ

(۹ : ۹)

کیا ان لوگوں کو ان قوموں کی خبر نہیں پہنچی جو ان سے پہلے ہو گذری ہیں۔ یعنی نوح کی قوم اور عاد ثمود اور قوم ابراہیم اور اصحاب مدین اور موتفکات ان کے پاس ان کے قومی پیغمبر کھلی کھلی ہدایتیں لیکر آئے۔ مگر اللہ نے ان پر ظلم نہیں کیا۔ بلکہ انہوں نے خود اپنے اوپر ظلم کیا جو ایماندار مرد۔ اور ایماندار عورتیں ہیں وہ باہم ایک دوسرے کے مددگار ہیں وہ نیکی کا حکم کرتے اور بدی کو روکتے ہیں :-

یہاں پچھلی قوموں کے ظلم برنفس خود کا ذکر کرتے ہی جو ایمانداروں کی یہ صفت بتائی ہے کہ وہ ایک دوسرے کے یار و مددگار ہیں اور نیکی کو قائم کرتے اور بدی کو روکتے ہیں تو اس سے صاف یہی بتلانا مقصود ہے کہ ان مٹنے والی قوموں نے نیکی کا حکم کرنا۔ اور بدی کو روکنا چھوڑ دیا۔ اور یہی ان کا وہ ظلم تھا جس نے آخر ان کو تباہ کیا۔

ایک اور جگہ بنی اسرائیل کی بزدلی اور جہاد سے جی چرانے کا نہایت عبرتناک انجام بیان کیا ہے۔ فرمایا کہ موسیٰ علیہ السلام نے اپنی قوم کو اللہ کی نعمتیں یاد دلا کر حکم دیا کہ تم ارض مقدس میں داخل ہو جسے اللہ نے تمہاری میراث میں دیا ہے۔ اور ہرگز ہمت مت چھوڑو کیونکہ پیٹھ پھیرنے والے ہمیشہ نامراد رہا کرتے ہیں۔ مگر بنی اسرائیل پر دہشت بیٹھی ہوئی تھی۔ انہوں نے کہا۔

یا موسیٰ اِنَّ فِیہَا قَوماً جَبَّارِیْنَ وَاِنَّا لَن نَّدخُلَہَا حَتّٰی یَخرُجُوا مِنہَا فَاِن یَّخرُجُوا مِنہَا فَاِنَّا دَاخِلُوْنَ	اے موسیٰ! اس زمین میں تو ایک قوی بازو قوم ہے، ہم اس میں ہرگز نہ داخل ہونگے۔ جب تک کہ وہ وہاں سے نکل نہ جائیں۔ ہاں اگر وہ نکل گئے تو ہم ضرور داخل ہو جائیں گے۔

قوم کے دو جوانمردوں نے جن پر اللہ نے انعام فرمایا تھا۔ قوم کو مشورہ دیا کہ تم بخوف داخل ہو جاؤ، تم ہی غالب رہوگے۔ اور اگر تمہیں دولتِ ایمان حاصل ہے تو اللہ پر توکل کرنا چاہئے۔ مگر وہ ڈرپوک اور ذلت پر قانع رہنے والی قوم انسانوں کے خوف سے کانپتی ہی رہی اور اس نے صاف کہدیا کہ

یا موسیٰ اِنَّا لَن نَّدخُلَہَا اَبَداً مَّا دَامُوا فِیہَا فَاذہَب اَنتَ وَرَبُّکَ فَقَاتِلَا اِنَّا ھٰہُنَا قَاعِدُوْنَ	اے موسیٰ! جب تک وہ لوگ وہاں موجود ہیں ہم تو اس میں ہرگز داخل نہ ہونگے۔ پس تو اور تیرا خدا وہاں جائے اور تم دونوں لڑو۔ ہم تو یہیں بیٹھے ہیں۔

آخر اس بزدلی کی بدولت قدرت الٰہی نے یہ فیصلہ صادر کیا کہ وہ چالیس برس تک دربدر کی خاک چھانتے پھریں اور کہیں ان کو ٹھکانا نصیب نہو:۔

قَالَ فَاِنَّہَا مُحَرَّمَۃٌ عَلَیہِم اَربَعِیْنَ سَنَۃً یَتِیہُوْنَ فِی الاَرضِ (۵ : ۷)	اللہ نے کہا کہ جو زمین ان کے حق میں لکھی گئی تھی وہ اب چالیس سال کے لئے اپنر حرام کردی گئی۔ اب وہ زمین میں بھٹکتے پھرینگے۔

ایک دوسری جگہ بڑی تفصیل کے ساتھ بنی اسرائیل کی اس محبتِ نفس ومال اور بزدلی وخوفِ موت کا ذکر کیا ہے، جس کے باعث انہوں نے جہاد فی سبیل اللہ کو چھوڑ دیا۔ اور جس کی بدولت وہ آخر کار قومی ہلاکت میں مبتلا ہوئے۔ ارشاد ہوتا ہے:۔

اَلَم تَرَ اِلَی الَّذِیْنَ خَرَجُوا مِن دِیَارِہِم وَہُم اُلُوفٌ حَذَرَ المَوتِ فَقَالَ لَہُمُ اللّٰہُ مُوتُوا ثُمَّ اَحیَاہُم اِنَّ اللّٰہَ لَذُو	کیا تم نے ان لوگوں کا حال نہیں دیکھا جو اپنے گھروں سے نکلے اور باوجودیکہ وہ ہزاروں کی تعداد میں تھے۔ مگر ان پر موت کا خوف غالب تھا۔ اس لئے اللہ نے اپنر موت ہی کا حکم صادر کیا اور پھر انہیں زندہ کر دیا۔ اللہ

فَضْلٍ عَلَى النَّاسِ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَشْكُرُوْنَ۔	لوگوں پر بڑا فضل کرتا ہے۔ اکثر لوگ اس کا شکر ادا نہیں کرتے۔

اس کے بعد ہی اس طرح مسلمانوں کو قتال کا حکم دیا ہے کہ۔

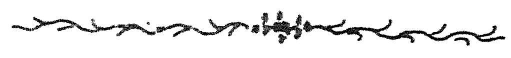
وَقَاتِلُوْا فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ وَاعْلَمُوْا اَنَّ اللّٰهَ سَمِیْعٌ عَلِیْمٌ۔	اللہ کی راہ میں جنگ کرو اور جان لو کہ وہ خوب سننے اور جاننے والا ہے۔

اور اس کے بعد دوبارہ بنی اسرائیل کے ایک گروہ کا ذکر کیا ہے کہ۔

اَلَمْ تَرَ اِلَى الْمَلَاِ مِنْۢ بَنِیْٓ اِسْرَآءِیْلَ مِنْۢ بَعْدِ مُوْسٰىۘ اِذْ قَالُوْا لِنَبِیٍّ لَّهُمُ ابْعَثْ لَنَا مَلِكًا نُّقَاتِلْ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِؕ قَالَ هَلْ عَسَیْتُمْ اِنْ كُتِبَ عَلَیْكُمُ الْقِتَالُ اَلَّا تُقَاتِلُوْاؕ قَالُوْا وَمَا لَنَآ اَلَّا نُقَاتِلَ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ وَقَدْ اُخْرِجْنَا مِنْ دِیَارِنَا وَاَبْنَآىٕنَاؕ فَلَمَّا كُتِبَ عَلَیْهِمُ الْقِتَالُ تَوَلَّوْا اِلَّا قَلِیْلًا مِّنْهُمْؕ وَاللّٰهُ عَلِیْمٌۢ بِالظّٰلِمِیْنَ۔ (۲ : ۳۲)	کیا تو نے بنی اسرائیل کے ایک گروہ کا حال نہیں دیکھا جس نے موسیٰ کے بعد اپنے زمانہ کے نبی سے کہا کہ ہمارے لئے ایک بادشاہ مقرر کردو تاکہ ہم اللہ کی راہ میں جنگ کریں۔ نبی نے ان سے کہا کہ تم سے کچھ بعید نہیں ہے کہ اگر تم پر جنگ فرض کردی گئی تو تم نہ لڑو۔ انہوں نے کہا کہ ہم کیسے نہ لڑیں گے۔ جبکہ ہم اپنے گھروں سے نکالے گئے ہیں اور اپنی اولاد سے چھڑائے گئے ہیں۔ مگر جب ان کو جنگ کا حکم دیا گیا تو ان میں سے ایک چھوٹی سی جماعت کے سوا سب نے منہ پھیر لیا۔ اللہ ظالموں کو خوب جانتا ہے۔

٭ ٭ ٭ ٭

یہ اور ایسی بہت سی مثالیں بار بار اسی حقیقت کو سمجھانے کے لئے دی گئی ہیں کہ نیکی کے قیام و بقا کے لئے سب سے زیادہ ضروری چیز اس کی حفاظت کرنیوالی سچی قربانی کی روح ہے۔ اور جس قوم سے یہ روح نکل جاتی ہے وہ بہت جلدی بدی سے مغلوب ہوکر فنا ہو جاتی ہے۔



مدافعانہ جنگ

گذشتہ بحث سے یہ امر اچھی طرح واضح ہو گیا کہ قرآن کی تعلیم اپنے پیروؤں میں ایسی جاں فروشی اور حمایتِ حق کی ناقابلِ تسخیر روح پیدا کرنا چاہتی ہے۔ جس سے ان کے اندر کسی حال میں بدی و شرارت کے آگے سر جھکانے اور ظلم و طغیان کے تسلط کو قبول کرنے کی کمزوری پیدا نہ ہونے پائے۔ قرآنی تعلیم کے مطابق انسان کی سب سے بڑی ذلت یہ ہے کہ وہ اپنے عیش و آرام یا مال و دولت یا اہل و عیال کی محبت میں مبتلا ہو کر حفاظتِ حق کی سختیوں سے ڈرنے لگے اور باطل کو طاقتور دیکھ کر اس کی غلامی قبول کرنے کے لیے آمادہ ہو جائے۔ یہ ضعف جو درحقیقت جسم و جان کا ضعف نہیں بلکہ قلب و ایمان کا ضعف ہے جب کسی قوم میں پیدا ہو جاتا ہے تو اس کے اندر سے عزت و شرافت کے تمام احساسات خود بخود دور ہو جاتے ہیں۔ اور اعلائے حق کی عملی خدمت کو انجام دینا تو درکنار وہ خود اپنے آپ کو بھی حق کے راستہ پر قائم رکھنے میں کامیاب نہیں رہ سکتی۔ جسم کی غلامی کو لوگ سمجھتے ہیں کہ اس کی بندشیں صرف اوپر ہی اوپر رہتی ہیں۔ اور قلب و روح تک ان کا اثر نہیں پہنچتا۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ جسم کے غلام ہونے سے پہلے روح غلام ہو چکتی ہے۔ اور جسم غلامی کا غیرت شکن و ذلت انگیز لباس پہنتا ہی اس وقت ہے جب روح غیرت و حمیت کے جوہر سے عاری ہو جاتی ہے۔ اور عزت و شرافت کا احساس اس سے رخصت ہو چکا ہوتا ہے۔ پس جو قوم اپنی کمزوری و بزدلی کے باعث اپنے حقوق کے تحفظ میں کوتاہی برتتی ہو اور شرارت کو قوی بازو دیکھ کر اس کی اطاعت قبول کرنے پر آمادہ ہو جاتی ہے۔ اس میں یہ قوت کبھی باقی نہیں رہتی اور رہ نہیں سکتی کہ اپنے شعائر، اپنے آداب، اپنے قوانین اور اپنے دینی و اخلاقی اصولوں پر سختی سے قائم رہے۔ اور اپنے قومی نظام کو ٹوٹنے نہ دے۔ پھر جبکہ حق اور باطل دونوں باہم ضد ہیں۔ اور ایک جگہ جمع نہیں ہو سکتے۔ تو یہ کیونکر ممکن ہے کہ ایک قوم باطل کی غلامی قبول کرنے کے بعد بھی حق کی بندگی پر قائم رہے اور ایک سے عبدیت کا رشتہ جوڑ کر دوسرے کے رشتۂ عبدیت

کو تسلیم [illegible] فطرت تو یکتائی پسند ہے وہ باطل کو، یا تیسرے و شریک بنا کر بھی
ایسی تقسیم نہیں کرسکتا کہ آدھا میرا ہے۔ اور آدھا تیرا۔ اس لئے جس کسی کو اس کی بندگی کرنی ہو اسے
باطل کی بندگی چھوڑنی پڑے گی۔ اور اپنی گردن کو دوسری تمام بندگیوں کے طوق و زنجیر سے
خالی رکھنا پڑیگا۔

قرآن جو درحقیقت صحیفۂ فطرت ہے۔ فطرت کے اس راز سے خوب واقف ہے اور
اسی راز کو مدِنظر رکھ کر اس نے انسان کو صرف دو راہیں بتائی ہیں یا موت، یا شرف زندگی۔ بے شرف
کی تیسری راہ اس نے نہیں بتائی۔ اگرچہ اس کے بدنصیب پیرؤوں نے اپنے ایمان کی کمزوری اور
حوصلہ کی پستی سے اس کو خود اختیار کر لیا ہے۔ وہ تو اس زندگی کو "ذلت" و "مسکنت" قرار دیتا ہے
اور اللہ کے غضب سے تعبیر کرتا ہے۔ اسے ان قوموں کی خصوصیت بتاتا ہے۔ جو اپنی بزدلی اور
خشیت ماسوا اللہ کے باعث اپنے تئیں قہر الٰہی کا مستوجب بنا لیتی ہیں۔ اور اس کی زبان میں
اس ذلیل زندگی کو اختیار کر لینا اپنے اوپر آپ ظلم کرنا ہے قرآن نے ایسے لوگوں کو جو اس زندگی پر
راضی ہو جائیں خسران و نامرادی کی یہ وعید سنائی ہے :-

اِنَّ الَّذِيْنَ تَوَفّٰىهُمُ الْمَلٰٓئِكَةُ ظَالِمِيْٓ اَنْفُسِهِمْ قَالُوْا فِيْمَ كُنْتُمْ ؕ قَالُوْا كُنَّا مُسْتَضْعَفِيْنَ فِى الْاَرْضِ ؕ قَالُوْٓا اَلَمْ تَكُنْ اَرْضُ اللّٰهِ وَاسِعَةً فَتُهَاجِرُوْا فِيْهَا ؕ فَاُولٰٓئِكَ مَاْوٰىهُمْ جَهَنَّمُ ؕ وَسَآءَتْ مَصِيْرًا (۴ : ۱۴)

جن لوگوں کی روح فرشتے اس حال میں قبض کریں کہ وہ خود اپنے نفس پر ظلم کر رہے ہوں تو ان سے وہ پوچھیں گے کہ تم یہ کس حال میں گرفتار رہتے تھے؟ وہ کہیں گے کہ ہم زمین میں کمزور تھے۔ مگر فرشتے کہیں گے کیا اللہ کی زمین وسیع نہ تھی کہ تم باطل کے گھر کو چھوڑ کر نکل جاتے؟ پس ایسے لوگوں کا ٹھکانا جہنم ہوگا۔ اور وہ بہت ہی بری جگہ ہے۔

غور کرو کہ یہ غیرت ملی کی کیسی روشن تعلیم ہے۔ اپنے آپ کو کمزور سمجھ کر اعدائے اسلام کی غلامی قبول
کرنے والوں کو اپنے اوپر آپ ظلم کرنے والا کہا ہے۔ ان سے پوچھا جاتا ہے کہ تم نے یہ ذلت کیوں قبول
کی؟ وہ کمزوری و ضعف کا عذر پیش کرتے ہیں تو قبول نہیں ہوتا۔ جواب ملتا ہے کہ اگر تم کمزور ہو نہ
تھے تو اس ذلت کے قبول کرنے سے بہتر تھا کہ گھر چھوڑ کر نکل جاتے۔ [illegible] تمام
بندگی باطل کی ذلت کیوں گوارا کر لی؟ آخر اسی جرم کی پاداش میں انہیں ذلت و نامرادی [illegible] گزرنی

کی طرف پھینک دیا جاتا ہے جس کا نام جہنم ہے۔ اور یقیناً اس سے زیادہ بری جائے بازگشت اور کوئی نہیں ہے:۔

فریضۂ دفاع

یہی وجہ ہے کہ قرآن حکیم نے سب معاملات میں تحمل و برداشت کی تعلیم دی ہے مگر ایسے کسی حملہ کی برداشت کرنے کی تعلیم نہیں دی جو دین اسلام کو مٹانے یا مسلمانوں کے حقوق اور ان کی آزادی کو سلب کرنے کے لئے کیا جائے۔ اس معاملہ میں تو اس نے سختی کے ساتھ حکم دیا ہے کہ جو کوئی تمہارے انسانی حقوق چھیننے کی کوشش کرے۔ تم پر ظلم و ستم ڈھائے تمہاری جائز ملکیتوں سے تم کو بے دخل کرے۔ تمہارے دین اور تمہاری قومی طاقت کو مٹانے کی خفیہ یا علانیہ تدبیریں کرے اور اس وجہ سے تمہارے درپے آزار ہو کہ تم مسلمان ہو تو اس کے فتنہ سے ہرگز تغافل اور تسامح نہ برتو بلکہ اسے ایسی سخت سزا دو کہ یا تو راہ راست پر آ جائے یا پیوند خاک ہو جائے۔

وَقَاتِلُوا فِي سَبِيلِ اللَّهِ الَّذِينَ يُقَاتِلُونَكُمْ وَلَا تَعْتَدُوا إِنَّ اللَّهَ لَا يُحِبُّ الْمُعْتَدِينَ وَاقْتُلُوهُمْ حَيْثُ ثَقِفْتُمُوهُمْ وَأَخْرِجُوهُمْ مِنْ حَيْثُ أَخْرَجُوكُمْ وَالْفِتْنَةُ أَشَدُّ مِنَ الْقَتْلِ وَلَا تُقَاتِلُوهُمْ عِنْدَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ حَتَّى يُقَاتِلُوكُمْ فِيهِ فَإِنْ قَاتَلُوكُمْ فَاقْتُلُوهُمْ كَذَلِكَ جَزَاءُ الْكَافِرِينَ فَإِنِ انْتَهَوْا فَإِنَّ اللَّهَ غَفُورٌ رَحِيمٌ وَقَاتِلُوهُمْ حَتَّى لَا تَكُونَ فِتْنَةٌ وَيَكُونَ الدِّينُ لِلَّهِ فَإِنِ انْتَهَوْا فَلَا عُدْوَانَ إِلَّا عَلَى الظَّالِمِينَ

جو لوگ تم سے لڑتے ہیں ان سے خدا کی راہ میں جنگ کرو مگر لڑنے میں حد سے تجاوز نہ کرو (یعنی ظلم پر نہ اتر آؤ) کیونکہ اللہ زیادتی کرنے والوں کو پسند نہیں کرتا۔ ان ظالموں کو جہاں پاؤ قتل کرو۔ اور جہاں سے انہوں نے تمہیں نکالا ہے وہاں سے انہیں نکال باہر کرو۔ کیونکہ یہ فتنہ قتل سے زیادہ بری چیز ہے۔ پھر جب تک وہ تم سے مسجد حرام میں قتال نہ کریں تم بھی اس کے پاس ان سے قتال نہ کرو۔ لیکن اگر وہ تم سے وہاں جنگ کریں تو تم بھی انہیں مارو اور کافروں کی یہی سزا ہے۔ پھر اگر وہ باز آ جائیں تو اللہ بخشنے والا مہربان ہے۔ تم ان سے برابر جنگ کئے جاؤ یہاں تک کہ فتنہ باقی نہ رہے اور دین صرف اللہ کے لئے ہو۔ پس اگر وہ (فتنہ برپا کرنے اور دین کے معاملہ میں زیادتی کرنے سے) باز آ جائیں تو جان لو

اَلشَّهْرُ الْحَرَامُ بِالشَّهْرِ الْحَرَامِ وَالْحُرُمٰتُ
قِصَاصٌ فَمَنِ اعْتَدٰى عَلَيْكُمْ فَاعْتَدُوْا عَلَيْهِ
بِمِثْلِ مَا اعْتَدٰى عَلَيْكُمْ وَاتَّقُوا اللّٰهَ
وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ مَعَ الْمُتَّقِيْنَ ۲ : ۱۹۴

کیسر انہ امور کے سوا کوئی سے نہیں ہے۔ ماہ
حرام کا عوض ماہ حرام ہے۔ اور تمام آداب اور حرمتوں
کے بدلے ہیں۔ پس جو کوئی تم پر زیادتی کرے اُس پر تم بھی
اتنی ہی زیادتی کرو۔ مگر اللہ سے ڈرتے رہو۔ اور جان لو
کہ اللہ صرف متقیوں کے ساتھ ہے (جو حد سے تجاوز نہیں کرتے)

یہ حفاظتِ دین اور مدافعتِ دیارِ اسلام کا حکم ایسا سخت ہے کہ جب کوئی قوت اسلام کو مٹانے اور
اور اسلامی قومیت کو فنا کرنے کے لئے حملہ آور ہو تو تمام مسلمانوں پر فرض عین ہو جاتا ہے کہ سب
کام چھوڑ کر اُسکے مقابلہ پر نکل آئیں۔ اور جب تک اسلام اور اسلامی قومیت کو اس خطرہ سے محفوظ نہ کریں
اس وقت تک چین نہ لیں چنانچہ فقہ کی تمام کتابوں میں یہ حکم موجود ہے کہ جب دشمن دار الاسلام پر چڑھ کر
آئے تو ہر مسلمان پر فرداً فرداً دفاع کا فرض اسی قطعیت کے ساتھ عائد ہو جاتا ہے کہ جیسے نماز اور روزہ۔ فقہ کی
مشہور کتاب بدائع الصنائع میں لکھا ہے۔

اما اذا عم النفير بان هجم العدو على بلد
فهو فرض عين يفترض على كل واحد من
آحاد المسلمين ممن هو قادر عليه فاذا
عم النفير لا يتحقق القيام به الا بالكل فبقي
فرضا على الكل عينا بمنزلة الصوم
والصلوٰة فيخرج العبد بغير اذن مولاه
والمرأة بغير اذن زوجها لان منافع العبد
والمرأة في حق العبادات المفروضة عينا
مستثناة عن ملك المولى والزوج شرعا كما
في الصوم والصلوٰة وكذا يباح للولد ان
يخرج بغير اذن والديه لان حق الوالدين
لا يظهر في فروض الاعيان كالصوم والصلوٰة

مگر جب اعلان عام ہو جائے کہ دشمن نے ایک اسلامی
ملک پر حملہ کیا ہے تو پھر جہاد فرض عین ہو جاتا ہے اور
ہر مسلمان پر جو جہاد کی قدرت رکھتا ہو فرداً فرداً اس کی
فرضیت عائد ہو جاتی ہے ..... نفیر عام ہونے کے بعد
تو ادائے فرض کا حق بغیر اسکے پورا ہوتا ہی نہیں کہ سب کے
سب جہاد کرنے کے لئے کھڑے ہو جائیں۔ اس وقت وہ
سب مسلمانوں پر اسطرح فرض عین ہو جاتا ہے جیسے روزہ
نماز۔ پس غلام کو بغیر آقا کی اجازت کے اور عورت کو بغیر اپنے
شوہر کی اجازت کے نکل جانا چاہئے کیونکہ ان عبادات میں
جو فرض عین ہیں غلام و بیوی کی خدمت آقا و شوہر کی
ملک سے مستثنٰی ہے جیسے نماز روزہ۔ اسی طرح بیٹے کے لئے
مباح ہو جاتا ہے کہ وہ بغیر والدین کی اجازت کے نکل کھڑا ہو

(جلد ۶ صفحہ ۹۸)

کیونکہ روزہ نماز جیسے فرض اعیان میں والدین کا حق اثر انداز نہیں ہو سکتا۔

بان ھجم العدو علی بلد کے الفاظ صاف طور پر بتلا رہے ہیں کہ یہ فرضیت عینیہ صرف اسی صورت پر موقوف نہیں ہے کہ خاص مذہبی جذبے سے متاثر ہو کر کوئی قوم اسلام کو مٹا دینے پر آمادہ ہو جائے۔ بلکہ حکومت اسلامیہ اور دیار اسلام پر ہر غاصبانہ حملہ کے مقابلہ میں مدافعت اسی قطعیت کے ساتھ فرض ہے۔ اسلام میں مسلمانوں کی قومی زندگی کے لئے حریت و استقلال سب سے زیادہ ضروری چیز ہے۔ اپنی آزادی کو کھو دینے کے بعد صرف یہی نہیں کہ مسلمانوں میں انسانیت کی اس اعلیٰ خدمت کو ادا کرنے کی قوت باقی نہیں رہتی جسے ادا کرنے کے لیے وہ پیدا کئے گئے ہیں۔ بلکہ وہ اپنے شرعی نظام کو قائم رکھنے کے قابل بھی نہیں رہتے جس پر ان کی مذہبی زندگی کا دارو مدار ہے۔ اس لئے اسلامی حکومت اور اسلامی قومیت پر حملہ کرنا در اصل عین اسلام پر حملہ کرنا ہے۔ اور خواہ کسی دشمن کا مقصد اسلام کا مٹانا نہ ہو۔ بلکہ محض مسلمانوں کی سیاسی قوت ہی کو مٹانا ہو۔ تب بھی اس سے جنگ کرنا مسلمانوں کے لئے ویسا ہی فرض ہوگا جیسا اسلام کو مٹانیوالے سے جنگ کرنا ہے۔ اسی وجہ سے صرف اس شہر یا اس ملک ہی کے مسلمانوں پر دفاع کا فرض عائد نہیں کیا گیا جس پر حملہ کیا گیا ہو۔ بلکہ روے زمین کے تمام مسلمانوں کے لئے لازم کر دیا گیا ہے کہ وہ اس ملک یا شہر کے مسلمانوں کو غلبۂ اعداء سے بچائیں۔ جیسا کہ صاحب بدائع کے اس قول سے ظاہر ہوتا ہے کہ یفترض علی کل واحد من احاد المسلمین ادر کالا یتحقق القیام به الا بالکل۔

صاحب نہایہ نے ذخیرہ سے اس اجمال کی تفصیل اسطرح نقل کی ہے کہ۔

الجہاد اذا جاء النفیر انما یصیر فرض عین علی من یقرب من العدو فاما من وراءھم یبعد من العدو فھو فرض کفایة علیھم حتی یسعھم ترکه اذا لم یحتج الیھم فان احتیج الیھم بان عجز من کان یقرب من العدو عن المقاومة مع العدو او لم یعجز عنھا

جہاد کی جب نفیر عام ھو تو جو کوئی دشمن سے قریب ہو اسپر وہ فرض عین ہو جاتا ہے۔ مگر جو لوگ دشمن سے دور ہوں ان پر فرض کفایہ رہتا ہے یعنی اگر ان کی مدد کی ضرورت نہو تو وہ شرکت جہاد سے باز بھی رہ سکتے ہیں لیکن اگر ان کی مدد کی ضرورت ہو جائے اس طرح کہ جو لوگ دشمن سے قریب ہوں وہ مقابلہ سے عاجز ہو جائیں یا عاجز تو نہ ہوں،

لکنہم تکاسلوا و لم یجاھد وافتہ یفترض علی من یلیہم فرض عین کالصلوٰۃ والصوم لایسعھم ترکہ ثم و ثم الی ان یفترض علی جمیع اھل الاسلام شرقا وغربا علی ھذا التدریج نظیرہ الصلوٰۃ علی المیت ..... ان کان الذی سعد مرالمیت یعلم ان اھل محلتہ یضیعون حقوقہ اولیعجزون عنہ کان علیہ ان یقوم بحقوقہ کذا ھنا۔

(شامی ج ۳ ص ۲۴۰)

نگر سستی کریں۔ اور پوری کوشش سے مقابلہ نہ کریں تو ان سے قریب کے لوگوں پر فرض عین ہوجاتا ہے۔ جیسے نماز اور روزہ کہ اسے چھوڑنا کسی طرح جائز نہیں ہوسکتا۔ پھر ان لوگوں پر جو ان سے قریب ہوں پھر ان پر جو ان سے قریب ہوں۔ یہانتک کہ از شرق تا غرب تمام اہل اسلام پر اسی تدریج کیساتھ فرض ہوجاتا ہے۔ اس کی نظیر نماز جنازہ ہے کہ جو شخص میت سے دور رہو۔ اگر اُسے معلوم ہو کہ اس کے اہل محلہ اس کے حقوق ادا نہیں کرتے یا ادا کرنے سے عاجز ہیں تو اس کے لئے ضروری ہوجاتا ہے کہ خود اس کے حقوق ادا کرے (یعنی اس کی تجہیز و تکفین کرے)۔ یہی صورت یہاں بھی ہے۔

اسلام میں دفاع کے اس فریضۂ عظیمہ کی جو کچھ اہمیت ہے۔ اسکا اندازہ صرف اسی سے نہیں نا کہ اسے ایک عبادت اور فرض عین کا درجہ دیا گیا ہے۔ اور اس کی فضیلت نماز روزہ سے بھی زیادہ ی گئی ہے بلکہ سورہ توبہ کی ان آیات سے جو غزوۂ تبوک کے بارہ میں نازل ہوئی ہیں معلوم ہوتا ہے کہ جب کوئی قوت اسلام اور مسلمانوں کے استقلال قومی کو مٹانے کے لیے حملہ آور ہو اور نفیر م ہوجائے تو اسوقت یہ ایمان کے صدق و کذب کی کسوٹی بن جاتا ہے۔ چنانچہ ان لوگوں کے ق جنھوں نے رومیوں کی زبردست طاقتور سلطنت کے مقابلہ پر حفاظت اسلام کے لیے جنگ ، جانے سے جی چرایا تھا۔ اور جن کی ایمانی کمزوری کو دیکھکر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں گھر رہنے کی اجازت دیدی تھی۔ یہ الفاظ فرمائے گئے ہیں کہ۔

اللّٰہُ عَنْكَ لِمَ اَذِنْتَ لَهُمْ حَتّٰى يَتَبَيَّنَ الَّذِيْنَ صَدَقُوْا وَتَعْلَمَ الْكٰذِبِيْنَ ٥ تَاْذِنُكَ الَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ ترِ اَنْ يُّجَاهِدُوْا بِاَمْوَالِهِمْ وَاَنْفُسِهِمْ

اے محمد خدا تمہیں معاف کرے تم نے انہیں کیوں گھر بیٹھ رہنے کی اجازت دیدی تم ہیں چاہیئے تھا کہ اجازت نہ دیتے تا کہ پھر وہ لوگ بھی ظاہر ہوجاتے جو سچے ہیں اور ان کا حال بھی معلوم ہوجاتا جو جھوٹے ہیں وہ لوگ

عَلَيْمٌ بِالْمُتَّقِيْنَ إِنَّمَا
اذنُكَ الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ
وَالْيَوْمِ الْآخِرِ وَارْتَابَتْ
بُهُمْ فَهُمْ فِيْ رَيْبِهِمْ
دُوْنَ (۹۰۷)

جو اللہ پر ایمان رکھتے ہیں۔ اور جنھیں یوم قیامت کے آنیکا یقین ہے۔ تم سے ہرگز یہ رخصت نہ مانگیں گے کہ اپنے مال اور اپنی جان سے جہاد نہ کریں، اللہ ان متقیوں کو خوب واقف ہے، یہ رخصت تو تم سے وہی لوگ طلب کریں گے جو نہ اللہ پر ایمان رکھتے ہیں، اور نہ یوم قیامت کے آنے کا یقین، ان کے دلوں میں شک پڑ گیا ہے۔ اسلئے وہ اپنے شک ہی میں ڈگر بگر ہو رہے ہیں۔

...انہ جنگ کی صورتیں

دفاع کے ان احکام سے معلوم ہوتا ہے کہ مسلمانوں کے ان دینی فرائض میں جو ان کی دنیا سے تعلق رکھتے ہیں سب سے بڑا ...ب اہم فرض یہ ہے کہ وہ اپنے مذہب اور اپنے قومی استقلال کی سختی کیساتھ حفاظت کریں اور ...قومی و دینی وجود کو کسی حال میں فتنہ سے مغلوب نہ ہونے دیں۔ اسکے لئے اسلام نے اپنے ...ں کو جنگ کی محض اجازت ہی نہیں دی، بلکہ تاکید کی ہے، اور تاکید بھی ایسی سخت جس کی کیفیت ...یان کی گئی ہے۔ مگر حملہ کی صرف یہی ایک صورت نہیں ہے کہ ایک سلطنت باقاعدہ اعلان ...کرکے دارالاسلام پر حملہ آور ہو اور اس کو فتح کرکے مسلمانوں کو مٹانے یا غلام بنانے، یا ...مذہبی آزادی کو سلب کرنے کی کوشش کرے۔ بلکہ اس کے علاوہ اور بھی بہت سی صورتیں ...ہے ایک قوم کے امن و اطمینان اور اس کی دینی و سیاسی زندگی کو خطرہ میں مبتلا ...سکتا ہے پس اب ہم یہ دکھانا چاہتے ہیں کہ وہ صورتیں کیا ہیں، اور ان کے متعلق قرآن مجید ...حکم دیتا ہے۔ اس قصد کے لئے ہم ان تمام آیات کو جمع کریں گے جن میں مدافعانہ جنگ ...دیا گیا ہے۔ اور ان کے حل طلب مسائل کو بھی قرآن سے یا اسکے بعد حدیث سے حل کرینگے ...ی آراء کے دخل سے شک و شبہ کی گنجائش ہی نہ رہے۔

...و تعدی کا جواب

بقول اکابر مفسرین اسلام میں پہلی آیت جو قتال کے متعلق اتری وہ سورۂ حج کی یہ آیت ہے۔

...ن لِلَّذِيْنَ يُقَاتَلُوْنَ بِأَنَّهُمْ ظُلِمُوْا

جن لوگوں سے جنگ کیجاتی ہے۔ انہیں جنگ کی

اِنَّ اللّٰہَ عَلٰی نَصْرِہِمْ لَقَدِیْرُ ۙالَّذِیْنَ اُخْرِجُوْا مِنْ دِیَارِہِمْ بِغَیْرِ حَقٍّ اِلَّآ اَنْ یَّقُوْلُوْا رَبُّنَا اللّٰہُ۔

(۲۲:۴۰)

اجازت دی گئی ہے۔ اور اللہ ان کی مدد پر یقیناً قدرت رکھتا ہے۔ یہ وہ لوگ ہیں جو اپنے گھروں سے ناحق نکالے گئے ہیں۔ صرف اس قصور پر کہ وہ اللہ کو اپنا پروردگار کہتے تھے۔

دوسری آیت جسکو علامہ ابن جریر اور بعض دوسرے مفسرین جنگ کی پہلی آیت قرار دیتے ہیں سورہ بقرہ کی یہ آیت ہے۔

وَقَاتِلُوْا فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ الَّذِیْنَ یُقَاتِلُوْنَکُمْ وَلَا تَعْتَدُوْا اِنَّ اللّٰہَ لَا یُحِبُّ الْمُعْتَدِیْنَ ۝ وَاقْتُلُوْھُمْ حَیْثُ ثَقِفْتُمُوْھُمْ وَاَخْرِجُوْھُمْ مِّنْ حَیْثُ اَخْرَجُوْکُمْ وَالْفِتْنَۃُ اَشَدُّ مِنَ الْقَتْلِ (۲:۲۴)

اللہ کی راہ میں ان لوگوں سے لڑو جو تم سے لڑتے ہیں اور حد سے نہ بڑھ جاؤ کیونکہ اللہ زیادتی کرنے والوں کو پسند نہیں کرتا۔ اور ان کو مارو جہاں پاؤ۔ اور ان کو نکالو جہاں سے انھوں نے تم کو نکالا ہے۔ کیونکہ فتنہ زیادہ بری چیز ہے قتل سے۔

ان دونوں آیات سے حسب ذیل احکام نکلتے ہیں۔

۱) جب مسلمانوں سے جنگ کی جائے اور ان پر ظلم و ستم کیا جائے۔ تو ان کے لئے مدافعت میں جنگ کرنا جائز ہے۔

۲) جو لوگ مسلمانوں کے گھر بار چھینیں، ان کے جائز حقوق سلب کریں، اور انہیں ان کی ملکیتوں سے بیدخل کریں، ان کے ساتھ مسلمانوں کو جنگ کرنی چاہیے۔

۳) جب مسلمانوں پر ان کے مذہبی عقائد کے باعث تشدد کیا جائے۔ اور انہیں محض اس بات پر ستایا جائے کہ وہ مسلمان ہیں۔ تو ان کے لئے اپنی مذہبی آزادی کی خاطر جنگ کرنا جائز ہے،

۴) دشمن غلبہ حاصل کر کے جس سرزمین سے مسلمانوں کو نکال دیں یا مسلمانوں کے قبضہ سے وہاں سے نکال دیں اسے دوبارہ حاصل کرنے کی کوشش کرنی چاہیے۔ اور جب بھی مسلمانوں کو طاقت حاصل ہو تو انہیں ان تمام مقامات پر دشمن کا قبضہ لینا چاہیئے جہاں سے اس نے مسلمانوں کو نکالا ہے۔

(۲) راہِ حق کی حفاظت

سورہ انفال میں جن کافروں کے خلاف جنگ کرنے اور ان کی جڑ کاٹ دینے کا حکم دیا گیا ہے۔ ان کا ایک قصور یہ بتایا گیا ہے کہ

اِنَّ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا یُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَهُمْ لِیَصُدُّوْا عَنْ سَبِیْلِ اللّٰهِ فَسَیُنْفِقُوْنَهَا ثُمَّ تَکُوْنُ عَلَیْهِمْ حَسْرَةً ثُمَّ یُغْلَبُوْنَ ۵ (۸:۴)

جو لوگ کافر ہیں وہ اپنی مالی و اقتصادی قوت اللہ کے راستہ سے روکنے میں صرف کرتے ہیں اور صرف کئے جائیں گے۔ یہانتک کہ ان پر حسرت ہوگی۔ اور وہ مغلوب کئے جائیں گے۔

آگے چلکر قریش کی اس فوج کا جو بدر میں مسلمانوں سے لڑنے نکلی تھی۔ اور جس کے مقابلہ میں اللہ نے حق کو حق اور باطل کو باطل کر کے دکھانے کے لئے خاص اپنی فوج بھیجی تھی اس طرح ذکر کیا ہے:۔

وَلَا تَکُوْنُوْا کَالَّذِیْنَ خَرَجُوْا مِنْ دِیَارِهِمْ بَطَرًا وَّرِئَآءَ النَّاسِ وَیَصُدُّوْنَ عَنْ سَبِیْلِ اللّٰهِ۔ (۸:۶)

اور تم ان لوگوں کی طرح نہ ہو جاؤ جو اپنے گھروں سے تفاخر کے طور پر دنیا کو دکھانے کے لئے لڑنے کو اپنے گھروں سے نکلے اور وہ اللہ کے راستہ سے روک رہے ہیں۔

سورہ توبہ میں پھر ان مشرکین کا جرم جن سے قتال کا حکم دیا گیا تھا یہ بتایا ہے کہ۔

اِشْتَرَوْا بِاٰیٰتِ اللّٰهِ ثَمَنًا قَلِیْلًا فَصَدُّوْا عَنْ سَبِیْلِهٖ اِنَّهُمْ سَآءَ مَا کَانُوْا یَعْمَلُوْنَ (۹:۲)

ان لوگوں نے آیات الٰہی کا سودا بڑی ہی کم قیمت پر کیا اور وہ اس کی راہ سے روکنے لگے۔ یہ بہت برا کام ہے جو وہ کرتے ہیں۔

آگے چلکر اہل کتاب سے لڑنے کا حکم دیا ہے کہ قَاتِلُوا الَّذِیْنَ لَا یُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَلَا بِالْیَوْمِ الْاٰخِرِ ... اور پھر ان کے جرائم کی تفصیل اس طرح دی ہے کہ۔

یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْۤا اِنَّ کَثِیْرًا مِّنَ الْاَحْبَارِ وَالرُّهْبَانِ لَیَاْکُلُوْنَ اَمْوَالَ النَّاسِ بِالْبَاطِلِ وَیَصُدُّوْنَ عَنْ سَبِیْلِ اللّٰهِ (۹:۵)

اے ایمان والو! (اہل کتاب کے) بہت سے احبار اور راہب لوگوں کے مال ناجائز طور پر کھاتے ہیں اور اللہ کی راہ سے روکتے ہیں۔

سورہ محمد میں زیادہ وضاحت کے ساتھ فرمایا کہ۔

اَلَّذِیْنَ کَفَرُوْا وَصَدُّوْا عَنْ سَبِیْلِ اللّٰهِ

جن لوگوں نے کفر اختیار کیا اور اللہ کی راہ سے روکنے لگے

اَضَلَّ اَعْمَالَهُمْ ۔ ۔ ۔ ۔ فَاِذَا لَقِیْتُمُ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا فَضَرْبَ الرِّقَابِ حَتّٰۤی اِذَاۤ اَثْخَنْتُمُوْهُمْ فَشُدُّوا الْوَثَاقَ فَاِمَّا مَنًّۢا بَعْدُ وَاِمَّا فِدَآءً حَتّٰی تَضَعَ الْحَرْبُ اَوْزَارَهَا (۴۷: ۱)

ان کے اعمال اللہ نے ضائع کر دیے ۔ ۔ ۔ ۔ پس جب تمہاری ان کافروں سے مڈبھیڑ ہو تو گردنیں مارو یہاں تک کہ ان کی طاقت کو کچل ڈالو۔ اس کے بعد قید کی گرفت کو مضبوط کرو۔ اور انہیں گرفتار کر لو۔ پھر تمہیں اختیار ہے کہ خواہ احسان کے طور پر چھوڑ دو۔ یا فدیہ لے لو یہ عمل اسوقت تک جاری رکھو جب تک جنگ اپنے ہتھیار ڈال نہ دے اور اس کی ضرورت ہی باقی نہ رہے ۔

ان تمام آیات سے معلوم ہوا کہ صد عن سبیل اللہ یعنی اللہ کی راہ سے روکنا بھی ایک ایسا جرم ہے جسکے خلاف جنگ ضروری ہے۔ اللہ کی راہ سے مراد وہی دین حق ہے جسکو قرآن مجید میں صراط مستقیم بھی کہا گیا ہے۔ اور یہ قرآن مجید کا انداز بیان کی انتہائی خوبی ہے کہ اسنے دین کو راستہ سے تعبیر کیا۔ گویا وہ ایک طریق ہے جو سیدھا منزل تک لیجاتا ہے۔ اور جسپر شیطان و اولیائے شیطان رہزنی کرتے ہیں بعض لوگوں نے سبیل کے معنی یہی معمولی چلنے پھرنے کی سڑک کے لئے ہیں اور صد عَنْ سَبِیْلِ اللّٰہِ کا مطلب قطاع الطریق قرار دیا ہے۔ مگر قرآن مجید میں سَبِیْلِ اللّٰہِ اور سَبِیْلِ رَبِّ کے الفاظ ایسے نہیں ہیں جنکا مفہوم سمجھنے میں ذرا بھی دقت ہو۔ اُدْعُ اِلٰی سَبِیْلِ رَبِّکَ بِالْحِکْمَةِ وَالْمَوْعِظَةِ الْحَسَنَةِ اِنَّ رَبَّکَ هُوَ اَعْلَمُ بِمَنْ ضَلَّ عَنْ سَبِیْلِهٖ وَهُوَ اَعْلَمُ بِالْمُهْتَدِیْنَ ۝ میں موٹروں اور بائسکلوں کی سڑک مراد نہیں ہو سکتی۔ بلکہ وہی سڑک مراد ہے جو خدا تک لیجاتی ہے وَمَنْ یَّتَبَدَّلِ الْکُفْرَ بِالْاِیْمَانِ فَقَدْ ضَلَّ سَوَآءَ السَّبِیْلِ میں بھی سیدھی راہ سے مراد وہی ایمان کی راہ ہے اور اس کی ضد کفر کی راہ قرار دی گئی ہے۔ لَا تَقُوْلُوْا لِمَنْ یُّقْتَلُ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ اَمْوَاتٌ بَلْ اَحْیَآءٌ میں بھی ان مارے جانے والوں کو زندہ نہیں کہا گیا ہے جو مٹی اور پتھروں کی سڑکوں پر جان دیتے ہیں۔ بلکہ یہ شرف ان لوگوں کے سوا کسی کے لئے نہیں ہے۔ جو اللہ کے دربار تک جانے والی راہ میں جان دیں پس اس میں کسی شک کی گنجائش نہیں ہے کہ سبیل اللہ سے روکنا دراصل اسلام سے روکنا ہے

اب غور کیجئے کہ اسلام سے روکنے کا کیا مطلب ہے؟ اسلام کو جب راستہ کہا گیا۔ تو ضرور

ہے کہ ... سے روکنے کی بھی وہی صورت ہوں جو ایک رہگذر سے روکنے کی ہوتی ہے کسی راستہ کو روکنے کی قدرۃ تین صورتیں ہو سکتی ہیں۔ ایک یہ کہ جو لوگ دوسرے رستہ پر چل رہے ہیں۔ انہیں اس راستہ پر نہ آنے دیا جائے۔ دوسرے یہ کہ جو اسپر چل رہے ہیں انہیں اس سے ہٹا دیا جائے۔ اور تیسرے یہ کہ اسپر چلنے والوں کے راستہ میں کانٹے بچھا دئیے جائیں اور رہزنی و قطع طریق سے انہیں اسطرح دق کیا جائے کہ وہ چلنے سے عاجز آجائیں۔ کتاب مبین کا کمال بیان یہ ہے کہ اس میں یہ تینوں صورتیں پوری تفصیل کے ساتھ موجود ہیں۔ اور صد عن سبیل اللہ ان تینوں معنوں میں بولا گیا ہے۔ اسلئے ہمیں اس کی تفصیل معلوم کرنے کے لئے کسی اور کتاب کیطرف رجوع کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔

(۱) سورہ منافقون میں راہ الٰہی کے رہزنوں کا ذکر اسطرح فرمایا ہے۔

وَاِذَا قِيْلَ لَهُمْ تَعَالَوْا يَسْتَغْفِرْ لَكُمْ رَسُوْلُ اللّٰهِ لَوَّوْا رُءُوْسَهُمْ وَرَاَيْتَهُمْ يَصُدُّوْنَ وَهُمْ مُّسْتَكْبِرُوْنَ ۝ (۶۳:۱)

جب ان سے کہا جاتا ہے کہ آؤ رسول تمہارے لئے بخشش کی دعا کریگا تو وہ اپنے سر پھیر لیتے ہیں اور تو نے دیکھا کہ وہ دوسروں کو بھی روکتے ہیں اور وہ بڑے متکبر ہیں۔

ہدہد سبا کے لوگوں کی خبر جب دربار سلیمانی میں لاتا ہے تو کہتا ہے۔

وَجَدْتُّهَا وَقَوْمَهَا يَسْجُدُوْنَ لِلشَّمْسِ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَزَيَّنَ لَهُمُ الشَّيْطٰنُ اَعْمَالَهُمْ فَصَدَّهُمْ عَنِ السَّبِيْلِ فَهُمْ لَا يَهْتَدُوْنَ ۝ اَلَّا يَسْجُدُوْا لِلّٰهِ الَّذِيْ يُخْرِجُ الْخَبْءَ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ (۲۷:۲)

میں نے ملکہ اور اس کی قوم کو دیکھا کہ وہ لوگ اللہ کو چھوڑ کر سورج کو سجدہ کرتے ہیں۔ اور شیطان نے ان کے اعمال بد کو ان کے سامنے اسطرح زینت دیکر پیش کیا ہے کہ انہیں راہ راست پر آنے سے روکدیا اور اب وہ سیدھی راہ اختیار نہیں کرتے کہ اس خدا کو سجدہ کریں۔ جو زمین و آسمان کی چھپی ہوئی چیزوں کو نکالتا ہے۔

سورہ عنکبوت میں عاد و ثمود کی نامرادی کا ذکر اس طرح فرمایا ہے کہ۔

وَزَيَّنَ لَهُمُ الشَّيْطٰنُ اَعْمَالَهُمْ فَصَدَّهُمْ عَنِ السَّبِيْلِ وَكَانُوْا مُسْتَبْصِرِيْنَ (۲۹:۴)

شیطان نے ان کے اعمال بد کو ان کے سامنے اسطرح زینت دیکر پیش کیا ہے کہ انہیں سیدھے راستہ پر آنے سے روکدیا۔ حالانکہ وہ راستہ دیکھ چکے تھے۔

سورۂ زخرف میں فرمایا۔

هٰذَا صِرَاطٌ مُّسْتَقِيمٌ ۝ وَلَا يَصُدَّنَّكُمُ الشَّيْطٰنُ ۚ اِنَّهٗ لَكُمْ عَدُوٌّ مُّبِيْنٌ ۝ (۴۳ : ۶۲)	یہ سیدھا راستہ ہے سو کہیں ایسا نہ ہو کہ شیطان تمہیں اس پر آنے سے روک دے۔ کیونکہ وہ تمہارا کھلا دشمن ہے۔

دوسری جگہ فرمایا۔

وَمَنْ يَّعْشُ عَنْ ذِكْرِ الرَّحْمٰنِ نُقَيِّضْ لَهٗ شَيْطٰنًا فَهُوَ لَهٗ قَرِيْنٌ ۝ وَاِنَّهُمْ لَيَصُدُّوْنَهُمْ عَنِ السَّبِيْلِ وَيَحْسَبُوْنَ اَنَّهُمْ مُّهْتَدُوْنَ ۝ (۴۳ : ۳۷)	جو کوئی ذکر رحمن سے اعراض کرتا ہے اس پر ہم ایک شیطان مقرر کر دیتے ہیں۔ جو اس کا ساتھی ہو جاتا ہے یہ شیاطین ان لوگوں کو راہ حق پر آنے سے روکتے ہیں۔ اور وہ سمجھتے ہیں کہ ہم راہ حق پر ہیں۔

ان تمام آیات میں اللہ کے راستہ سے روکنا یا راہ حق سے روکنا اس معنی میں استعمال ہوا ہے کہ لوگوں کو اس پر آنے سے باز رکھا جائے۔ اور اس کو اختیار کرنے سے منع کیا جائے۔

(۲) اب صد عن سبیل اللہ کی دوسری صورت کے متعلق قرآن سے استفسار کیجئے۔

مدین والوں سے حضرت شعیب علیہ السلام فرماتے ہیں

وَتَصُدُّوْنَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ مَنْ اٰمَنَ بِهٖ وَتَبْغُوْنَهَا عِوَجًا ۚ (۷ : ۸۶)	اور تم اللہ کے راستے سے ان لوگوں کو روکتے ہو۔ جو اس پر ایمان لائے ہیں۔ اور اس راہ کو ان کے لئے ٹیڑھا کرنا چاہتے ہو۔

سورۂ ہود میں ارشاد ہوتا ہے کہ۔

اَلَا لَعْنَةُ اللّٰهِ عَلَى الظّٰلِمِيْنَ ۝ الَّذِيْنَ يَصُدُّوْنَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَيَبْغُوْنَهَا عِوَجًا ۭ (۱۱ : ۱۹)	ان ظالموں پر اللہ کی لعنت ہو۔ جو اللہ کی راہ سے روکتے ہیں اور اسے ٹیڑھا کرنا چاہتے ہیں۔

سورۂ آل عمران میں سب پردے اٹھا دیئے ہیں۔ اور صاف صاف حکم ہوتا ہے کہ۔

قُلْ يٰٓاَهْلَ الْكِتٰبِ لِمَ تَصُدُّوْنَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ مَنْ اٰمَنَ تَبْغُوْنَهَا عِوَجًا وَّاَنْتُمْ شُهَدَاۗءُ ۭ وَمَا اللّٰهُ بِغَافِلٍ عَمَّا	اے محمد ان سے کہو کہ اے اہل کتاب تم کیوں ان لوگوں کو جو ایمان لاتے ہیں اللہ کے راستے سے روکتے ہو۔ تم اسے ٹیڑھا کرنا چاہتے ہو۔ حالانکہ تم اس کے

تَعْمَلُوْنَ ۝ يٰاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا اِنْ تُطِيْعُوْا فَرِيْقًا مِّنَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ يَرُدُّوْكُمْ بَعْدَ اِيْمَانِكُمْ كٰفِرِيْنَ ۝ (۳:۱۰۰)

سے ہوئے پر تم خود گواہ ہو۔ (کہ تمہاری کتابوں میں پیش گوئیاں موجود ہیں۔) یہ جو کچھ تم کرتے ہو۔ اللہ اس سے غافل نہیں ہے۔ اے ایمان والو اگر تم ان اہل کتاب کے کسی فریق کی اطاعت کروگے۔ تو یہ تمہیں ایمان سے پھیر کر دوبارہ کافر بنالیں گے۔

یاد کیجئے کہ یہ وہی اہل کتاب ہیں جن کے متعلق اس سے پہلے سورہ بقرۂ میں ارشاد ہو چکا ہے کہ

وَدَّ كَثِيْرٌ مِّنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ لَوْ يَرُدُّوْنَكُمْ مِّنْ بَعْدِ اِيْمَانِكُمْ كُفَّارًا حَسَدًا مِّنْ عِنْدِ اَنْفُسِهِمْ مِّنْ بَعْدِ مَا تَبَيَّنَ لَهُمُ الْحَقُّ فَاعْفُوْا وَاصْفَحُوْا حَتّٰى يَاْتِيَ اللّٰهُ بِاَمْرِهٖ اِنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ۝ (۲:۱۰۹)

اہل کتاب میں سے بہتوں نے چاہا کہ تمہارے ایمان لانے کے بعد دوبارہ تمہیں کافر بنالیں، اپنے اس حسد کی بنا پر جو ان کے دلوں میں ہے اور ان کی یہ کوشش اس کے بعد ہے کہ ان پر حق ظاہر ہو چکا ہے پس اس وقت تک کیلئے انہیں معاف کرو۔ اور ان سے درگذر و جب تک اللہ اپنا حکم نازل کرے۔ (جو بعد میں حکم قتال کی صورت میں نازل ہوا) اور اللہ ہر چیز پر قادر ہے۔

اسی طرح جن اہل قریش کے متعلق تم ابھی سن چکے ہو۔ کہ وہ اللہ کی راہ سے روکنے کے لئے نکلے تھے۔ ان کی جنگ کا مدعا دوسری جگہ اسطرح بیان کیا ہے۔ کہ۔

وَلَا يَزَالُوْنَ يُقَاتِلُوْنَكُمْ حَتّٰى يَرُدُّوْكُمْ عَنْ دِيْنِكُمْ اِنِ اسْتَطَاعُوْا (۲:۲۱۷)

وہ برابر تم سے لڑتے جائیں گے۔ یہانتک کہ اگر ان کا بس چلے تو تمہیں تمہارے دین سے پھیر دیں۔

اور دوسری جگہ ان تمام کفار محاربین کا جن سے ترک موالات کا حکم دیا گیا۔ منشائے عنادیہ بیان کیا ہے کہ۔

اِنْ يَّثْقَفُوْكُمْ يَكُوْنُوْا لَكُمْ اَعْدَآءً وَّيَبْسُطُوْٓا اِلَيْكُمْ اَيْدِيَهُمْ وَاَلْسِنَتَهُمْ بِالسُّوْٓءِ وَوَدُّوْا لَوْ تَكْفُرُوْنَ ۝ (۶۰:۲)

اگر وہ تمہیں پالیں تو تمہارے ساتھ دشمنی کریں۔ اور تم پر اپنے ہاتھ چھوڑیں۔ اور اپنی زبانیں بدگوئی کے لئے کھول دیں وہ تو چاہتے ہیں کہ کسی طرح تم کافر ہو جاؤ۔

یہ تمام آیات بصراحت بتلاتی ہیں۔ کہ اللہ کے راہ سے روکنے کی ایک یہ بھی صورت ہے کہ

جو مسلمان اسلام پر قائم ہیں انہیں مرتد کیا جائے۔ اور راہ راست سے ہٹا کر ٹیڑھے رستہ پر ڈالنے کی کوشش کی جائے۔

(۳) اب رہی تیسری صورت سو اسکے متعلق سورہ بقرہ کی یہ آیت پڑھو کہ۔

يَسْئَلُوْنَكَ عَنِ الشَّهْرِ الْحَرَامِ قِتَالٍ فِيْهِ قُلْ قِتَالٌ فِيْهِ كَبِيْرٌ وَصَدٌّ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَكُفْرٌ بِهٖ وَالْمَسْجِدِ الْحَرَامِ (۲:۲۷)	تجھ سے ماہ حرام کے متعلق پوچھتے ہیں کہ اس میں جنگ کرنا کیسا ہے۔ کہہ کہ اسمیں جنگ کرنا بڑا گناہ ہے۔ اور اللہ کی راہ سے روکنا ہے۔ اور اس کے ساتھ کفر کرنا۔ اور مسجد حرام کی حق تلفی کرنا ہے۔

اور اسکے بعد سورہ حج کی اس آیت پر غور کرو کہ۔

اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَيَصُدُّوْنَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَالْمَسْجِدِ الْحَرَامِ الَّذِيْ جَعَلْنٰهُ لِلنَّاسِ سَوَآءَ ۨالْعَاكِفُ فِيْهِ وَالْبَادِ (۲۲:۲)	جو لوگ کافر ہیں اور اللہ کے راستہ اور مسجد حرام سے روکتے ہیں جسکو ہمنے سب لوگوں کے واسطے یکساں بنایا ہے۔ خواہ وہ وہیں رہتے ہوں۔ یا باہر سے آتے ہوں الخ

ان آیات میں اسلام کے ایک رکن یعنی حج سے روکنے کو صد عن سبیل اللہ کہا گیا اور جب کہ اسلام کے سب ارکان و فرائض یکساں ہیں۔ اور سب کی تعمیل مسلمانوں کے لئے ضروری ہے تو اس سے صاف طور پر یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ جسطرح ایک فریضہ کو ادا کرنے سے روکنے کو خدا کی راہ سے روکنا کہا گیا ہے۔ اسی طرح دوسرے تمام فرائض سے روکنا بھی اللہ کی راہ سے روکنا ہے۔ اور اس لحاظ سے ہر وہ رکاوٹ جو مسلمانوں کے راستہ میں ان کے مذہبی احکام کی تعمیل سے باز رکھنے کے لئے ڈالی جائے۔ وہ قرآن کے اس فیصلہ کے مطابق صد عن سبیل اللہ کی تعریف میں آتی ہے

پس دوسری صورت جس میں مسلمانوں کو جنگ کا حکم دیا گیا ہے۔ یہ نکلی کہ۔

(۱) یا تو اسلام کی ترقی کو تلوار یا اقتصادی و سیاسی قوت یا اور کسی شیطانی طاقت سے روکا جائے۔

(۲) یا مسلمانوں کو مرتد بننے کے لئے مجبور کیا جائے۔

(۳) یا ان کو اپنے مذہبی فرائض ادا کرنے اور مذہبی احکام کی تعمیل کرنے سے روکا جائے

دغابازی و عہد شکنی کی سزا

سورہ انفال میں ایک اور جرم جس کے خلاف جنگ کرنے کا حکم ہے یہ بتایا گیا ہے کہ

اِنَّ شَرَّ الدَّوَآبِّ عِنْدَ اللّٰہِ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا فَھُمْ لَا یُؤْمِنُوْنَ الَّذِیْنَ عٰھَدْتَّ مِنْھُمْ ثُمَّ یَنْقُضُوْنَ عَھْدَھُمْ فِیْ کُلِّ مَرَّۃٍ وَّھُمْ لَا یَتَّقُوْنَ فَاِمَّا تَثْقَفَنَّھُمْ فِی الْحَرْبِ فَشَرِّدْ بِھِمْ مَّنْ خَلْفَھُمْ لَعَلَّھُمْ یَذَّکَّرُوْنَ وَاِمَّا تَخَافَنَّ مِنْ قَوْمٍ خِیَانَۃً فَانْۢبِذْ اِلَیْھِمْ عَلٰی سَوَآءٍ اِنَّ اللّٰہَ لَا یُحِبُّ الْخَآئِنِیْنَ (۸:۷)

اللہ کے نزدیک زمین پر چلنے والے جانداروں میں بدترین وہ لوگ ہیں جنھوں نے کفر کیا ہے۔ اور ایمان نہیں لاتے، جسے تو نے معاہدہ کیا تھا۔ مگر وہ بار بار اپنے عہد کو توڑتے ہیں اور بدعہدی سے پرہیز نہیں کرتے پس اگر تو جنگ میں ان کو پالے۔ تو انہیں سخت سزا دے کر ان لوگوں کو خوف زدہ و پراگندہ کر دے۔ جو ان کے پیچھے ہیں (یعنی انہیں ایسی سزا دے جو ان کے بعد والوں کے لئے موجب عبرت ہو) شاید کہ وہ کچھ سبق حاصل کریں۔ اور اگر تجھے کسی قوم سے دغا کا خوف ہو تو برابری کو ملحوظ رکھکر علی الاعلان ان کا عہد ان کی طرف پھینکدے۔ اللہ یقیناً دغابازوں کو پسند نہیں کرتا۔

اسی طرح سورہ توبہ میں زیادہ سختی کے ساتھ ان کافروں کے متعلق جنہوں نے مسلمانوں سے بار بار عہد توڑے۔ فرمایا ہے کہ۔

بَرَآءَۃٌ مِّنَ اللّٰہِ وَرَسُوْلِہٖٓ اِلَی الَّذِیْنَ عٰھَدْتُّمْ مِّنَ الْمُشْرِکِیْنَ فَسِیْحُوْا فِی الْاَرْضِ اَرْبَعَۃَ اَشْھُرٍ وَّاعْلَمُوْٓا اَنَّکُمْ غَیْرُ مُعْجِزِی اللّٰہِ وَاَنَّ اللّٰہَ مُخْزِی الْکٰفِرِیْنَ

اللہ اور اسکے رسول کی طرف سے اعلان براءۃ ہے ان مشرکوں کی طرف جن سے تو نے معاہدہ کیا تھا (اور جنھوں نے بار بار اس کی خلاف ورزی کی) پس چار مہینے اور زمین میں چل پھر لو۔ اس کے بعد خوب سمجھ لو کہ تم اللہ کو عاجز کرنے والے نہیں ہو۔ مگر اللہ کافروں کو رسوا کرنے والا ضرور ہے۔

اسکے بعد ان مشرکوں کے متعلق جنھوں نے عہد نہیں توڑا تھا حکم دیا کہ فَاَتِمُّوْٓا اِلَیْھِمْ عَھْدَھُمْ اِلٰی مُدَّتِھِمْ ان کے معاہدہ کی مدت مقررہ تک عہد کی پابندی کرو۔ اور پھر دوبارہ نقض عہد

فَإِذَا انسَلَخَ الْأَشْهُرُ الْحُرُمُ فَاقْتُلُوا الْمُشْرِكِينَ حَيْثُ وَجَدتُّمُوهُمْ وَخُذُوهُمْ وَاحْصُرُوهُمْ وَاقْعُدُوا لَهُمْ كُلَّ مَرْصَدٍ فَإِن تَابُوا وَأَقَامُوا الصَّلَاةَ وَآتَوُا الزَّكَاةَ فَخَلُّوا سَبِيلَهُمْ إِنَّ اللَّهَ غَفُورٌ رَّحِيمٌ

جب وہ چار حرمت والے مہینے (جن کی مہلت ادی دی گئی تھی) گذر جائیں تو ان کو قتل کرو جہاں پاؤ۔ اور انہیں گرفتار کرو۔ اور انہیں گھیر کر محصور کرو۔ (تاکہ بلاد مسلمین میں نہ گھسیں) اور ان کے لئے ہر کمین گاہ میں بیٹھو۔ پس اگر وہ توبہ کریں نماز ادا کریں اور زکوٰۃ دیں تو ان کی راہ چھوڑ دو (یعنی پھر ان سے تعرض نہ کرو) کیونکہ اللہ بخشنے والا مہربان ہے۔

آگے چلکر پھر انہی بدعہد اور دغاباز مشرکوں کے متعلق فرمایا ہے کہ۔

كَيْفَ يَكُونُ لِلْمُشْرِكِينَ عَهْدٌ عِندَ اللَّهِ وَعِندَ رَسُولِهِ إِلَّا الَّذِينَ عَاهَدتُّمْ عِندَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ فَمَا اسْتَقَامُوا لَكُمْ فَاسْتَقِيمُوا لَهُمْ إِنَّ اللَّهَ يُحِبُّ الْمُتَّقِينَ كَيْفَ وَإِن يَظْهَرُوا عَلَيْكُمْ لَا يَرْقُبُوا فِيكُمْ إِلًّا وَلَا ذِمَّةً يُرْضُونَكُم بِأَفْوَاهِهِمْ وَتَأْبَىٰ قُلُوبُهُمْ وَأَكْثَرُهُمْ فَاسِقُونَ (۹:۲)

ان مشرکوں سے اللہ اور اس کے رسول کا عہد کیسے رہ سکتا ہے سوائے ان لوگوں کے جن سے تم نے مسجد حرام کے پاس معاہدہ کیا تھا۔ سو وہ جب تک عہد پر قائم رہیں تم بھی قائم رہو۔ کیونکہ اللہ پرہیزگاروں کو پسند کرتا ہے۔ مگر (ان بدعہدوں) سے کیونکر عہد ہو سکتا ہے جن کی کیفیت یہ ہے کہ جب تم پر غلبہ و فتح حاصل کرلیں تو نہ تم سے قرابت کا لحاظ رکھیں اور نہ عہد و اقرار کا۔ وہ (عدم ظفر کی حالت میں) تم کو زبانی خوش کرتے ہیں۔ مگر ان کے دل انکار کرتے ہیں (یعنی وہ دل میں تمہیں نقصان پہنچانے کی فکر رکھتے ہیں۔) اور ان میں اکثر بدکردار و سرکش ہیں۔

اسکے بعد پھر انہی بدعہدوں کے متعلق فرمایا ہے۔

لَا يَرْقُبُونَ فِي مُؤْمِنٍ إِلًّا وَلَا ذِمَّةً وَأُولَٰئِكَ هُمُ الْمُعْتَدُونَ فَإِن تَابُوا وَأَقَامُوا الصَّلَاةَ وَآتَوُا الزَّكَاةَ فَإِخْوَانُكُمْ فِي الدِّينِ وَنُفَصِّلُ الْآيَاتِ لِقَوْمٍ يَعْلَمُونَ وَإِن نَّكَثُوا أَيْمَانَهُم مِّن بَعْدِ عَهْدِهِمْ

یہ دغاباز مشرکین کسی مومن کے ساتھ قرابت یا عہد و اقرار کا لحاظ نہیں کرتے۔ اور وہی ہیں جو حد سے زیادتی کرتے ہیں۔ پس اگر وہ توبہ کریں۔ نماز ادا کریں۔ اور زکوٰۃ دیں تو تمہارے دینی بھائی ہیں۔ اور یہ آیات ہم کھول کر بیان کرتے ہیں ان لوگوں کے لئے جو کچھ سمجھ رکھتے ہیں۔ لیکن اگر وہ اپنی قسموں کو توڑ دیں عہد کرنے کے بعد اور تمہارے دین میں طعن کریں۔

وَطَعَنُوا فِي دِيْنِكُمْ فَقَاتِلُوا أَئِمَّةَ الْكُفْرِ إِنَّهُمْ لَا أَيْمَانَ لَهُمْ لَعَلَّهُمْ يَنْتَهُونَ - أَلَا تُقَاتِلُونَ قَوْمًا نَّكَثُوا أَيْمَانَهُمْ وَهَمُّوا بِإِخْرَاجِ الرَّسُولِ وَهُمْ بَدَءُوكُمْ أَوَّلَ مَرَّةٍ ؕ أَتَخْشَوْنَهُمْ فَاللّٰهُ أَحَقُّ أَنْ تَخْشَوْهُ إِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ قَاتِلُوْهُمْ يُعَذِّبْهُمُ اللّٰهُ بِأَيْدِيْكُمْ وَيُخْزِهِمْ وَيَنْصُرْكُمْ عَلَيْهِمْ وَيَشْفِ صُدُوْرَ قَوْمٍ مُّؤْمِنِيْنَ

تو کفر کے لیڈروں کے ساتھ جنگ کرو کیونکہ (اس کے بعد معلوم ہو گیا کہ) ان کی قسم کا کچھ اعتبار نہیں۔ شاید کہ وہ اپنی حرکات سے باز آئیں۔ کیا تم ایسے لوگوں سے جنگ نہیں کرتے جنھوں نے اپنی قسموں کو توڑ دیا۔ اور رسول کو نکال دینے کا اہتمام کیا۔ اور انہوں نے ہی اول مرتبہ تم پر پیش دستی کی؟ کیا تم ان سے ڈرتے ہو؟ حالانکہ اللہ اس کا زیادہ حقدار ہے کہ اس سے ڈرو۔ بشرطیکہ تم ایماندار ہو۔ ان سے تم ضرور جنگ کرو۔ اللہ انہیں تمہارے ہاتھوں سے عذاب دیگا۔ اور انہیں رسوا کرے گا۔ اور تم کو ان پر نصرت بخشیگا۔ اور مومنوں کے قلوب کو شفا بخشیگا۔

ان تمام آیات اور ان کی شان نزول پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ۔

(۱) جو لوگ مسلمانوں سے عہد کر کے توڑیں۔ ان سے جنگ کرنی چاہئے۔ اس حکم میں وہ کفار بھی آجاتے ہیں جو مسلمانوں سے اطاعت کا معاہدہ کر کے پھر حکومت اسلامیہ کے خلاف بغاوت کریں۔

(۲) جن سے معاہدہ تو ہو مگر ان کا رویہ ایسا مخالفانہ و معاندانہ ہو کہ اسلام اور مسلمانوں کو ان سے نقصان پہنچنے کا اندیشہ رہے تو انہیں علی الاعلان فسخ معاہدہ کا نوٹس دیدینا چاہئے اور ان کی دشمنی کا منہ توڑ جواب دینا چاہئے۔

(۳) جو لوگ بار بار بدعہدی و دغا بازی کریں۔ اور جن کے عہد و اقرار کا کوئی اعتبار نہ رہے اور جو مسلمانوں کو نقصان پہنچانے میں اخلاق و انسانیت کے کسی آئین کا لحاظ نہ کریں ان سے دائمی جنگ کا حکم ہے۔ اور صرف اسی صورت سے ان کے ساتھ صلح ہو سکتی ہے کہ وہ توبہ کریں۔ اور اسلام لے آئیں۔ ورنہ ان کے اثر سے اسلام اور دارالاسلام کو محفوظ رکھنے کے لئے قتل، گرفتاری، محاصرہ اور ایسی ہی دوسری جنگی تدابیر اختیار کرتے رہنا ضروری ہے۔

(۴) گھر کے بھیدیوں اور اندرونی دشمنوں کا استیصال

ان بیرونی دشمنوں کے علاوہ کچھ اندرونی

دشمن بھی ہیں۔ جو ظاہر میں دوست مگر باطن میں اسلام کی جڑ کاٹنے والے ہیں۔ یہ لوگ اس جماعت میں داخل ہیں جس کے لئے قرآن حکیم نے منافق کا جامع لفظ استعمال کیا ہے۔ اور ان کے باب میں یہ حکم دیا ہے کہ

يَا أَيُّهَا النَّبِيُّ جَاهِدِ الْكُفَّارَ وَالْمُنَافِقِينَ وَاغْلُظْ عَلَيْهِمْ وَمَأْوَاهُمْ جَهَنَّمُ وَبِئْسَ الْمَصِيرُ۔ ۹:۱۰

اے نبی منافقوں اور کافروں سے جہاد کرو۔ اور ان پر سختی کرو۔ ان کا ٹھکانا دوزخ ہے۔ اور وہ بہت ہی بری جائے قرار ہے۔

لَئِنْ لَمْ يَنْتَهِ الْمُنَافِقُونَ وَالَّذِينَ فِي قُلُوبِهِمْ مَرَضٌ وَالْمُرْجِفُونَ فِي الْمَدِينَةِ لَنُغْرِيَنَّكَ بِهِمْ ثُمَّ لَا يُجَاوِرُونَكَ فِيهَا إِلَّا قَلِيلًا ۝ مَلْعُونِينَ أَيْنَمَا ثُقِفُوا أُخِذُوا وَقُتِّلُوا تَقْتِيلًا۔ ۳۳:۸

اگر منافقین اور وہ لوگ جن کے دلوں میں بیماری ہے اور مدینہ میں بری خبریں اڑانے والے اپنی معاندانہ حرکات سے باز نہ آئے تو ہم تجھے ان پر مسلط کر دینگے۔ اور پھر وہ اس شہر میں تیرے ہمسایہ نہ رہ سکیں گے مگر تھوڑے دن۔ ان پر پھٹکار پڑے گی۔ جہاں ملیں گے پکڑے جائیں گے۔ اور خوب قتل کیے جائیں گے

وَدُّوا لَوْ تَكْفُرُونَ كَمَا كَفَرُوا فَتَكُونُونَ سَوَاءً فَلَا تَتَّخِذُوا مِنْهُمْ أَوْلِيَاءَ حَتَّىٰ يُهَاجِرُوا فِي سَبِيلِ اللَّهِ فَإِنْ تَوَلَّوْا فَخُذُوهُمْ وَاقْتُلُوهُمْ حَيْثُ وَجَدْتُمُوهُمْ وَلَا تَتَّخِذُوا مِنْهُمْ وَلِيًّا وَلَا نَصِيرًا۔

یہ لوگ چاہتے ہیں کہ تم بھی اسی طرح کافر ہو جاؤ جس طرح یہ خود کافر ہوئے۔ تاکہ تم اور وہ برابر ہو جائیں پس تم ان میں سے کسی کو اپنا دوست نہ بناؤ جب تک کہ یہ اللہ کی راہ میں اپنے گھروں سے نہ نکلیں۔ اگر وہ انحراف کریں (اور اظہار اعانت کفر سے باز نہ آئیں) تو انہیں پکڑو۔ اور جہاں پاؤ مارو اور ان میں سے کسی کو اپنا دوست و مددگار نہ بناؤ۔

سَتَجِدُونَ آخَرِينَ يُرِيدُونَ أَنْ يَأْمَنُوكُمْ وَيَأْمَنُوا قَوْمَهُمْ كُلَّمَا رُدُّوا إِلَى الْفِتْنَةِ أُرْكِسُوا

کچھ دوسرے لوگ بھی پاؤ گے جو چاہتے ہیں کہ تم سے بھی امن میں رہیں اور اپنی قوم کے کافروں سے بھی۔ اس سے جب تمہارے پاس آتے ہیں تو فوراً اسلام کرتے ہیں اور

فِيهَا فَإِن لَّمْ يَعْتَزِلُوكُمْ وَ — جب فتنہ کیطرف لوٹائے جاتے ہیں تو اسمیں اوندھے گر پڑتے ہیں

يُلْقُوا إِلَيْكُمُ السَّلَمَ وَيَكُفُّوا أَيْدِيَهُمْ فَخُذُوهُمْ وَاقْتُلُوهُمْ حَيْثُ ثَقِفْتُمُوهُمْ وَأُولَٰئِكُمْ جَعَلْنَا لَكُمْ عَلَيْهِمْ سُلْطَانًا مُّبِينًا۔ ۴:۹۱

(یعنی خود بھی فتنہ میں شامل ہو جاتے ہیں) پس اگر تم سے کنارہ کش نہ ہوں۔ اور نہ تم سے صلح کی طرح ڈالیں۔ اور نہ تمہارے ساتھ جنگ و دشمنی سے ہاتھ روکیں۔ تو انہیں پکڑو۔ اور جہاں پاؤ قتل کرو۔ ان لوگوں پر ہم نے تمہیں یہ واضح دلیل دیدی ہے۔

ان آیات میں منافقین کی اس جماعت کا جرم بھی بیان کر دیا گیا ہے جسکے باعث وہ واجب القتل ہوئے ہیں لیکن مزید وضاحت کے لئے ہم قرآن مجید ہی کی چند آیات پیش کرتے ہیں جن سے معلوم ہو سکتا ہے کہ یہ کس قسم کے لوگ ہیں۔ سورہ نساء میں فرمایا ہے کہ۔

وَيَقُولُونَ طَاعَةٌ فَإِذَا بَرَزُوا مِنْ عِندِكَ بَيَّتَ طَائِفَةٌ مِّنْهُمْ غَيْرَ الَّذِي تَقُولُ وَاللَّهُ يَكْتُبُ مَا يُبَيِّتُونَ۔ ۴:۸۱

وہ تجھ سے تو کہتے ہیں کہ تابعدار ہیں۔ مگر جب تیرے پاس سے نکلتے ہیں تو ان میں سے ایک گروہ جو کچھ تو کہتا ہے اس کے خلاف رات کو منصوبے گانٹھتا ہے۔ اور جو کچھ یہ لوگ راتوں کو منصوبے گانٹھا کرتے ہیں۔ اللہ ان سے خبردار ہے۔

سورہ توبہ میں فرمایا۔

لَوْ خَرَجُوا فِيكُم مَّا زَادُوكُمْ إِلَّا خَبَالًا وَلَأَوْضَعُوا خِلَالَكُمْ يَبْغُونَكُمُ الْفِتْنَةَ وَفِيكُمْ سَمَّاعُونَ لَهُمْ وَاللَّهُ عَلِيمٌ بِالظَّالِمِينَ۔ لَقَدِ ابْتَغَوُا الْفِتْنَةَ مِن قَبْلُ وَقَلَّبُوا لَكَ الْأُمُورَ حَتَّىٰ جَاءَ الْحَقُّ وَظَهَرَ أَمْرُ اللَّهِ وَهُمْ كَارِهُونَ۔

اگر وہ تمہارے ساتھ ملکر لڑنے کو نکلتے تو تمہارے اندر فساد کے سوا اور کسی چیز کا اضافہ نہ کرتے۔ اور تمہارے درمیان (جھوٹی خبریں) پھیلا کر اور چغلخوریاں کر کے فتنہ برپا کرنے کی کوشش کرتے۔ اور تم میں ان کی باتیں سنکر دشمنوں تک پہنچانے والے بھی ہیں۔ اور اللہ ظالموں سے خوب واقف ہے۔ انھوں نے اس سے پہلے بھی (غزوۂ احد میں) فتنہ برپا کرنا چاہا تھا۔ اور تجھے مکائد و حیل سے دھوکہ دینے کی تدبیریں کی تھیں یہانتک کہ حق کی نصرت آگئی۔ اور اللہ کا حکم ہوا۔ اگرچہ وہ انہیں بہت ہی ناگوار تھا۔

وَيَحْلِفُونَ بِاللَّهِ إِنَّهُمْ لَمِنكُمْ

اور وہ خدا کی قسم کھا کر کہتے ہیں کہ ہم تم ہی میں سے ہیں۔ حالانکہ

وَلَٰكِنَّهُمْ قَوْمٌ يَفْرَقُونَ ۔ لَوْ يَجِدُونَ مَلْجَأً أَوْ مَغَارَاتٍ أَوْ مُدَّخَلًا لَّوَلَّوْا إِلَيْهِ وَهُمْ يَجْمَحُونَ ۞

(۹ : ۷)

وہ ہرگز تم میں سے نہیں ہیں بلکہ یہ وہ لوگ ہیں جو ڈر رہے ہیں کہ ہمارا حشر بھی مشرکین کا سا نہ ہو۔ اگر انہیں کوئی جائے پناہ یا غار یا گھس بیٹھنے کا مقام مل جائے تو فوراً اس کی طرف پھر جائیں اور دوڑ کر جائیں۔

اَلْمُنٰفِقُوْنَ وَالْمُنٰفِقٰتُ بَعْضُهُمْ مِّنْ بَعْضٍ يَأْمُرُوْنَ بِالْمُنْكَرِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمَعْرُوْفِ وَيَقْبِضُوْنَ اَيْدِيَهُمْ نَسُوا اللّٰهَ فَنَسِيَهُمْ اِنَّ الْمُنٰفِقِيْنَ هُمُ الْفٰسِقُوْنَ (۹ : ۶)

منافق مرد و منافق عورتیں سب ایک تھیلی کے چٹے بٹے ہیں۔ بری باتوں کا حکم کرتے ہیں اچھی باتوں سے روکتے ہیں اور اپنے ہاتھوں کو نیک کاموں سے روکتے ہیں، وہ اللہ کو بھول گئے ہیں، اسی لئے اللہ بھی ان سے بے پرواہ ہو گیا ہے، بے شک منافق بڑے ہی بدکار اور نافرمان ہیں۔

سورہ احزاب میں فرمایا:-

وَاِذْ يَقُوْلُ الْمُنٰفِقُوْنَ وَالَّذِيْنَ فِيْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ مَّا وَعَدَنَا اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗٓ اِلَّا غُرُوْرًا ۔ وَاِذْ قَالَتْ طَّآئِفَةٌ مِّنْهُمْ يٰٓاَهْلَ يَثْرِبَ لَا مُقَامَ لَكُمْ فَارْجِعُوْا وَيَسْتَاْذِنُ فَرِيْقٌ مِّنْهُمُ النَّبِيَّ يَقُوْلُوْنَ اِنَّ بُيُوْتَنَا عَوْرَةٌ وَمَا هِيَ بِعَوْرَةٍ اِنْ يُّرِيْدُوْنَ اِلَّا فِرَارًا ۔ وَلَوْ دُخِلَتْ عَلَيْهِمْ مِّنْ اَقْطَارِهَا ثُمَّ سُئِلُوا الْفِتْنَةَ لَاٰتَوْهَا وَمَا تَلَبَّثُوْا بِهَآ اِلَّا يَسِيْرًا ۞

(۳۳ : ۱۲)

اور جب جنگ احزاب کے موقع پر منافقین اور وہ لوگ جن کے دلوں میں شک کی بیماری ہے کہنے لگے کہ اللہ اور اس کے رسول نے جو وعدہ ہم سے کیا تھا۔ وہ دھوکہ اور فریب کے سوا کچھ نہ تھا۔ اور جب ان میں سے ایک گروہ بولا کہ اے اہل یثرب اب تمہارے ٹھہرنے کا موقع نہیں ہے، پس اب بھاگ نکلو۔ اور ان میں سے ایک فریق نبی سے اجازت لینے لگا۔ یہ کہکر کہ ہمارے گھر کھلے پڑے ہیں حالانکہ وہ کھلے ہوئے (غیر محفوظ) نہ تھے۔ اور ان کا مطلب بجز بھاگ جانے کے کچھ نہ تھا۔ اگر مدینے کے اطراف سے دشمن گھس پڑتے اور ان کو درخواست کی جاتی کہ تم بھی مسلمانوں کا قتل و غارت کرنے کے فتنے میں شریک ہو جاؤ تو وہ فوراً شریک ہو جاتے اور اس میں ذرا تامل نہ کرتے

سورہ منافقون میں فرمایا:-

إِذَا جَاءَكَ الْمُنَافِقُونَ قَالُوا نَشْهَدُ إِنَّكَ لَرَسُولُ اللَّهِ وَاللَّهُ يَعْلَمُ إِنَّكَ لَرَسُولُهُ وَاللَّهُ يَشْهَدُ إِنَّ الْمُنَافِقِينَ لَكَاذِبُونَ اتَّخَذُوا أَيْمَانَهُمْ جُنَّةً فَصَدُّوا عَنْ سَبِيلِ اللَّهِ إِنَّهُمْ سَاءَ مَا كَانُوا يَعْمَلُونَ (۶۳: ۱)	جب منافق تیرے پاس آتے ہیں تو کہتے ہیں کہ ہم گواہی دیتے ہیں کہ تو یقیناً خدا کا رسول ہے۔ ہاں اللہ بھی جانتا ہے کہ تو ضرور اسکا رسول ہے۔ مگر اللہ گواہی دیتا ہے کہ یہ منافق یقیناً جھوٹے ہیں۔ انھوں نے اپنی قسموں کو (اپنی دشمنی کے لئے) ڈھال بنایا ہے۔ اور یہ اللہ کے راستہ سے روکتے ہیں اور یہ بہت ہی برا کام ہے جو وہ کرتے ہیں۔

یہ آیات بتاتی ہیں کہ منافقین کا ایک گروہ ایسا بھی ہے جس کے ساتھ ظاہر میں مسلمانوں کا سا معاملہ نہیں کیا جا سکتا۔ اور اس گروہ کی خصوصیت یہ ہے کہ یا تو وہ اسلام قبول کرنے کے بعد علانیہ اظہار کفر کرتا ہے، یا زبان سے بدستور اسلام کا اقرار کرتا ہے، مگر اس کی حرکات یہ ہوتی ہیں کہ ہر وقت مسلمانوں کے درپے آزار رہتا ہے، انہیں نقصان پہونچانے کی تدبیریں کرتا ہے ان کے دشمنوں سے ساز باز رکھتا ہے، ان کی خفیہ خبریں دشمنوں کو پہونچایا کرتا ہے۔ انکا ایمان بگاڑنے اور انہیں گمراہ کرنے کی کوششیں کرتا ہے، ان کی جماعت میں ریشہ دوانیاں کر کے تفرقہ برپا کرتا ہے، ان کے دشمنوں کو اخلاقی و عملی مدد پہنچاتا ہے، اور اسلام پر جب مصیبت کا وقت آئے تو اس کی حفاظت کی بجائے اسے مٹانے کی کوشش کرتا ہے۔ یہ گروہ اسلام کے لئے اسکے بیرونی دشمنوں سے زیادہ خطرناک ہے، اس لئے جو لوگ اس گروہ سے تعلق رکھتے ہیں، خواہ وہ ہر وقت کلمہ لا الہ الا اللہ پڑھتے رہیں، اور خواہ ظاہری حیثیت سے ان کے اسلام میں کسی شک کی گنجائش نہ ہو، مگر ان کیساتھ قطعاً کوئی رعایت نہ کرنی چاہئے اور جب ان سے ان جرائم کا صدور ہو تو جسم اسلام کے ان پھوڑوں پر سختی کے ساتھ اصلاح کا نشتر استعمال کرنا چاہئے۔

حفاظتِ امن

دشمنوں کی ایک اور قسم وہ ہے جو دار الاسلام کے اندر رہکر یا باہر سے آکر اس میں فساد پھیلاتی ہے، ڈاکے ڈالتی اور قتل و غارت کا بازار گرم کرتی ہے اور امن و امان میں خلل برپا کرتی ہے۔ ان کے متعلق قرآن مجید میں یہ حکم دیا گیا ہے کہ:۔

إِنَّمَا جَزَاءُ الَّذِينَ يُحَارِبُونَ اللَّهَ وَرَسُولَهُ وَيَسْعَوْنَ	جو لوگ اللہ اور اس کے رسول سے لڑتے ہیں، اور زمین میں

(لوٹ مارے) فساد پھیلانے کی کوشش کرتے ہیں ان کی سزا یہ ہے کہ وہ قتل کئے جائیں یا صلیب پر چڑھائے جائیں۔ یا ان کے ہاتھ پاؤں مخالف سمتوں سے کاٹ دیئے جائیں۔ یا وہ زمین سے نکالدئے جائیں (خواہ قید کی صورت میں خواہ اخراج کی صورت میں) یہ رسوائی توان کے لئے دنیا میں ہے۔ اور اسکے علاوہ آخرت میں بھی انکے لئے بڑا عذاب ہے۔ سوائے ان لوگوں کے جو اس سے پہلے کہ تم ان پر قدرت پاؤ۔ (یعنی گرفتار کرو) توبہ کرلیں تو جان لو کہ اللہ بخشنے والا مہربان ہے۔	فِي الْأَرْضِ فَسَادًا أَنْ يُقَتَّلُوا أَوْ يُصَلَّبُوا أَوْ تُقَطَّعَ أَيْدِيهِمْ وَأَرْجُلُهُمْ مِنْ خِلَافٍ أَوْ يُنْفَوْا مِنَ الْأَرْضِ ذَٰلِكَ لَهُمْ خِزْيٌ فِي الدُّنْيَا وَلَهُمْ فِي الْآخِرَةِ عَذَابٌ عَظِيمٌ۔ إِلَّا الَّذِينَ تَابُوا مِنْ قَبْلِ أَنْ تَقْدِرُوا عَلَيْهِمْ فَاعْلَمُوا أَنَّ اللَّهَ غَفُورٌ رَحِيمٌ۔ (۵: ۳۴)

اس آیت میں یحاربون اللہ ورسولہ کے الفاظ سے جہاں کو یہ دھوکہ ہوا ہے کہ اس سے مراد وہ کفار ہیں جن سے مسلمانوں کی قاعدہ لڑائی ہو لیکن دراصل خدا اور رسول کے ساتھ محاربہ کرنے سے مراد وہی سعی فساد فی الارض ہے جسکا ذکر تشریح کے طور پر اس فقرہ کے بعد ہی کیا گیا ہے۔ یہ آیت جس موقع پر اتری تھی اس سے بھی یہی معلوم ہوتا ہے کہ اسکا حکم فسادیوں اور امن وآئین کے خلاف ہنگامہ کرنے والوں کے لئے ہے چنانچہ حضرت انس بن مالک سے روایت ہے کہ قبیلہ عرینہ کے کچھ لوگ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور مسلمان ہو کر مدینہ میں رہنے لگے۔ مگر وہاں کی آب وہوا انہیں موافق نہ آئی۔ اور وہ بیمار پڑ گئے۔ ایک روایت کے مطابق ان کے رنگ زرد پڑ گئے۔ اور پیٹ بڑھ گئے تھے۔ آنحضرت صلعم نے ان سے فرمایا۔ لو خرجتم الی ذودلنا فشربتم من ... البانها وابوالها۔ اگر تم ہمارے اونٹوں میں جا کر رہو اور ان کے دودھ اور ... کے طور پر پیو تو تمہاری صحت درست ہو جائے گی۔ چنانچہ وہ مدینہ سے باہر اونٹوں کی چراگاہ میں جا پہنچے۔ اور جب تندرست ہو گئے تو رسول اللہ کے چرواہوں کو قتل کر کے اونٹوں کو ہانک لے گئے۔ اور اسلام سے پھر گئے۔ ان کی اس حرکت کی جب آپ کو خبر ہوئی تو آپ نے لوگوں کو بھیجا ... پکڑ منگایا۔ ... ہاتھ پاؤں کٹوائے۔ ان کی آنکھیں نکلوائیں۔ اور انہیں دھوپ میں چھوڑ دیا۔ یہاں تک کہ وہ مر گئے۔ صحیح بخاری ...

ترمذی میں بھی اسی مضمون کی روایتیں درج ہیں۔ اور امام علیہ الرحمہ نے ان کو قول اللہ عز وجل انما جزاء الذین یحاربون اللہ ورسولہ الآیہ کے زیر عنوان درج کیا ہے۔ صحیح مسلم میں حضرت انسؓ کے حوالے سے آنکھیں اندھی کرانے کی وجہ یہ بتائی گئی ہے کہ انھوں نے آنحضرتؐ کے چرواہوں کی آنکھیں سلائی پھیر کر پھوڑ دی تھیں۔ اس لئے آپ نے ان سے آنکھوں کا قصاص لیا تھا۔ ابوداؤد اور نسائی میں ابوالزناد کے طریقہ سے حضرت عبداللہ ابن عمرؓ کی یہ روایت نقل کی گئی ہے کہ یہ آیت انہیں عرنیوں کے باب میں نازل ہوئی تھی۔ اور حضرت ابوہریرہؓ کا بھی یہی بیان ہے۔ اگرچہ علمائے مجتہدین کی ایک جماعت اس طرف بھی گئی ہے کہ یہ آیت ان عرینہ والوں کے حق میں نہیں اتری لیکن یہ امر متفق علیہ ہے کہ قرآن مجید میں یہ عبرتناک سزائیں جو تجویز کی گئی ہیں۔ یہ انہیں لوگوں کے لئے ہیں جو دارالاسلام کے امن میں لوٹ مار اور قتل و غارت سے خلل برپا کریں۔ اور سزاؤں کے مختلف مدارج نوعیت جرم کے مختلف مدارج سے تعلق رکھتے ہیں جس کی تفصیل فقہائے اعلام نے بوضاحت بیان فرمائی ہے۔

مظلوم مسلمانوں کی حمایت

مدافعانہ جنگ کی ایک اور صورت جس میں مسلمانوں کو تلوار اٹھانے کی اجازت دی گئی ہے یہ ہے کہ مسلمانوں کی کوئی جماعت اپنی کمزوری و بیچارگی کے باعث دشمنوں کے پنجہ میں گرفتار ہو جائے۔ اور اس میں اتنی قوت نہ ہو کہ اپنے آپ کو چھڑا سکے۔ ایسی حالت میں دوسرے مسلمانوں پر جو آزاد ہوں اور جنگ کی قوت رکھتے ہوں یہ فرض عائد ہوتا ہے کہ اُسے اس ظلم سے نجات دلانے کے لئے جنگ کریں چنانچہ فرمایا ہے کہ:۔

وَمَا لَكُمْ لَا تُقَاتِلُونَ فِي سَبِيلِ اللَّهِ وَالْمُسْتَضْعَفِينَ مِنَ الرِّجَالِ وَالنِّسَاءِ وَالْوِلْدَانِ الَّذِينَ يَقُولُونَ رَبَّنَا أَخْرِجْنَا مِنْ هَٰذِهِ الْقَرْيَةِ الظَّالِمِ أَهْلُهَا وَاجْعَل لَّنَا مِن لَّدُنكَ وَلِيًّا وَاجْعَل لَّنَا مِن لَّدُنكَ نَصِيرًا (النساء: ۷۵)

اور تمہیں کیا ہوگیا ہے کہ اللہ کی راہ میں ان کمزور مردوں، عورتوں اور بچوں کے لئے جنگ نہیں کرتے جو کہتے ہیں کہ اے ہمارے رب ہمیں اس بستی سے نکال جہاں کے لوگ بڑے ظالم ہیں اور ہمارے لئے اپنی طرف سے کسی کو ولی اور اپنی ہی طرف سے کسی کو مددگار بنا۔

دوسری جگہ وضاحت کے ساتھ اس اعانت کی ضرورت بیان کی ہے اور سختی کی تاکید فرمائی ہے:۔

وَالَّذِينَ آمَنُوا وَلَمْ يُهَاجِرُوا مَا لَكُم مِّن وَلَايَتِهِم مِّن شَيْءٍ حَتَّىٰ يُهَاجِرُوا ۚ وَإِنِ اسْتَنصَرُوكُمْ فِي الدِّينِ فَعَلَيْكُمُ النَّصْرُ إِلَّا عَلَىٰ قَوْمٍ بَيْنَكُمْ وَبَيْنَهُم مِّيثَاقٌ ۗ وَاللَّهُ بِمَا تَعْمَلُونَ بَصِيرٌ وَالَّذِينَ كَفَرُوا بَعْضُهُمْ أَوْلِيَاءُ بَعْضٍ ۚ إِلَّا تَفْعَلُوهُ تَكُن فِتْنَةٌ فِي الْأَرْضِ وَفَسَادٌ كَبِيرٌ

([illegible])

جو لوگ ایمان تو لائے ہیں مگر دار الکفر چھوڑ کر دار الاسلام میں نہیں آئے ان کی ولایت کا کوئی تعلق تم سے نہیں ہے جب تک کہ وہ ہجرت نہ کریں۔ البتہ اگر وہ دین کے بارے میں تم سے مدد طلب کریں تو تم پر ان کی مدد کرنا لازم ہے۔ سوائے اس صورت کے جبکہ وہ ایسی قوم کے خلاف مدد مانگیں جن سے تمہارا معاہدہ ہو۔ اور حدود الٰہی کا خیال رکھو کیونکہ اللہ جو کچھ تم کرتے ہو۔ اسے خوب دیکھتا ہے۔ جو لوگ کافر ہیں وہ ایک دوسرے کے ولی و مددگار ہیں پس اگر تم مسلمانوں کی مدد نہ کرو گے تو زمین میں فتنہ اور بڑا فساد ہوگا۔

اس آیت مبارکہ میں آزاد مسلمانوں اور غلام مسلمانوں کے تعلقات کو نہایت وضاحت کے ساتھ بیان کر دیا ہے۔ پہلے وما لکم من ولایتہم من شیء سے یہ بتایا کہ جب تک جو مسلمان دار الکفر میں رہنا قبول کریں یا رہنے پر مجبور ہوں ان سے دار الاسلام کے مسلمانوں کے تمام تعلقات ٹوٹ جاتے ہیں یعنی نہ وہ باہم رشتہ قائم کر سکتے ہیں نہ ایک دوسرے کا ورثہ پا سکتا ہے۔ نہ فے اور غنیمت سے ان کو کوئی حصہ پہنچتا ہے۔ ورنہ صدقات کے مصارف میں وہ داخل ہو سکتے ہیں لیکن ولایت کے یہ تمام تعلقات منقطع کر دینے کے باوجود ایک تعلق یعنی نصرت و مددگاری کا تعلق پھر بھی منقطع نہیں کیا اور ان استنصروکم فی الدین کے صاف الفاظ میں برقرار رکھا۔ یہ نصرت کا تعلق دینی ہے اور قائم ہے جب تک کوئی شخص مسلمان ہے خواہ وہ دنیا کے کسی کونے میں ہو۔ اس سے مسلمانوں کا تعلق نصرت و مددگاری کسی حال میں منقطع نہیں ہو سکتا۔ اگر اس کے دینی حقوق پر حملہ ہو یا وہ اسیر ظلم ہو اور وہ دینی رشتہ کا واسطہ دے کر مدد مانگے تو مسلمانوں پر فرض ہے کہ اس کی مدد کو پہنچیں بشرطیکہ جس کے خلاف مدد مانگی گئی ہو اس سے مسلمانوں کا معاہدہ نہ ہو۔ کیونکہ معاہدہ کی حفاظت

میں مسلمانوں کے لئے عہد کی پابندی اپنے مسلمان بھائی کی مدد سے زیادہ ضروری ہے اور ان کیلئے جائز نہیں ہے کہ معاہدہ کی مدت منقضی ہونے سے پہلے اس کی مدد کریں۔ یہ حکم بیان کرنے کے بعد اس نصرت و اعانت کی ضرورت جتائی ہے۔ اور فرمایا ہے کہ دیکھو یہ کفار اسلام کے مٹانے میں ایک دوسرے کی کیسے مدد کرتے ہیں۔ اور اپنی آپس کی مخالفتوں اور دشمنیوں کے باوجود مسلمانوں کے مقابلہ میں کس طرح ایک ہو جاتے ہیں پس اگر تم بھی دینی رشتہ کو ملحوظ رکھکر آپس میں ایک دوسرے کے مددگار نہ بنو تو زمین میں کیسا فتنہ و فساد عظیم برپا ہو۔ فتنہ کا لفظ جیسا کہ آگے چلکر ہم بتشریح بیان کرینگے، قرآنی اصطلاح میں غلبہ کفر اور پیروان دین حق کے مبتلائے مصیبت و ذلت ہونے کے معنی میں استعمال ہوتا ہے۔ اور اسی طرح فساد بھی ہدایت پر ضلالت کے غالب ہونے اور نیکی و صلاح کار کے مٹ جانے کے معنی میں بولا جاتا ہے۔ پس اللہ تعالے مسلمانوں کی کسی جماعت کے مٹائے جانے یا اسکے راہ حق سے پسپا کر دئے جانے کو فتنہ و فساد سے تعبیر کرتا ہے۔ اور اس فتنہ کا مقابلہ کرنے کو مسلمانوں کا فرض قرار دیتا ہے۔

دفاع کی غرض و غایت

اب دفاعی جنگ کی ان تمام صورتوں پر جو سطور بالا میں بیان کی گئی ہیں۔ ایک غائر نظر ڈالو تو تمہیں معلوم ہوگا کہ ان سب کے اندر ایک ہی جذبہ کام کر رہا ہے۔ اور وہ یہ ہے کہ مسلمان اپنے دین اور اپنے قومی وجود کو کسی حال میں بدی و شرارت سے مغلوب نہ ہونے دیں، اور یہ بدی جس راہ سے بھی خروج کرے۔ خواہ باہر سے خواہ اندر سے، اسکا سر کچلنے کے لئے ہر وقت مستعد رہیں۔ اللہ کو مسلمانوں سے جو خدمت لینی ہے اسکے لئے اولین ضرورت ان کا فتنوں اور رخنوں سے محفوظ رہنا اور ان کی دینی و سیاسی طاقت کا مضبوط رہنا ہے۔ اگر وہ خود اپنے آپ کو مٹنے سے نہ بچائیں اور اندرونی و بیرونی دشمنوں کی فتنہ پردازیوں سے غفلت برت کر اپنے تئیں ان قومی امراض کا شکار ہو جانے دیں جنھوں نے اگلی ظالم قوموں کو ذلت و مسکنت اور غضب الٰہی میں مبتلا کیا۔ تو ظاہر ہے کہ وہ صرف خود اپنے آپ ہی کو ہلاکت میں نہ ڈالیں گے، بلکہ انسانیت کی اس خدمت عظیم کو بھی انجام دینے کے قابل نہ رہیں گے۔ جس کے لئے وہ پیدا کئے گئے ہیں۔ اور

یہ ان کا صرف اپنے اوپر ہی نہیں بلکہ تمام نوع انسانی پر ظلم ہوگا۔ پس ان کو کھول کھول کر نہایت وضاحت کے ساتھ ان دشمنوں کے نشانات بتائے گئے ہیں جو ان کی بربادی کا موجب بنتے ہیں یا بن سکتے ہیں، اور ایک ایک کا دھڑ توڑ دینے کی تاکید کی گئی ہے تاکہ وہ دنیا سے ہدایت کے نور کو مٹانے اور عالمگیر اصلاح کے کام میں روک پیدا کرنے کے قابل نہ رہیں۔ پھر اسکے لئے صرف اسی وقت تلوار اٹھانے کی ہدایت نہیں کی گئی جبکہ بدی اپنا سر نکالے۔ اور فتنہ پردازی شروع کر دے، بلکہ اسکے مقابلہ پر ہر وقت کمربستہ و مستعد رہنے کی تاکید کی گئی ہے۔ تاکہ اسے سر نکالنے کی جرأت ہی نہ رہے۔ اور اس پر حق کی ایسی ہیبت بیٹھی رہے کہ اسکا دف اندر ہی اندر مر جائے۔

وَاَعِدُّوْا لَهُمْ مَّا اسْتَطَعْتُمْ مِّنْ قُوَّةٍ وَّمِنْ رِّبَاطِ الْخَيْلِ تُرْهِبُوْنَ بِهٖ عَدُوَّ اللّٰهِ وَعَدُوَّكُمْ وَاٰخَرِيْنَ مِنْ دُوْنِهِمْ لَا تَعْلَمُوْنَهُمْ اَللّٰهُ يَعْلَمُهُمْ وَمَا تُنْفِقُوْا مِنْ شَيْءٍ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ يُوَفَّ اِلَيْكُمْ وَاَنْتُمْ لَا تُظْلَمُوْنَ

(۸ : ۸)

اور ان کے مقابلہ کے لئے جسقدر تمہارے امکان میں ہو۔ سامانِ جنگ اور ہمیشہ محافظت کرنیوالے گھوڑے یعنی سوار مستعد رکھو اس سے تم اللہ کے دشمن اور اپنے دشمن اور انکے سوا دوسرے اعدا کو جنہیں تم نہیں جانتے۔ مگر اللہ انہیں جانتا ہے۔ مرعوب و خوفزدہ کرو گے۔ اس کام میں جو کچھ تم فی سبیل اللہ خرچ کرو گے وہ تمہیں دنیا میں امن و امان اور ترقی اسلام کی صورت میں اور آخرت میں خوشنودی الٰہی کی صورت میں پورا کا پورا واپس ملجائیگا۔ اور تم پر ہرگز ظلم نہیں کیا جائیگا۔

یہ آیت بتلاتی ہے کہ مسلمانوں کی جنگی ضروریات کے لئے اس قسم کی عارضی فوج ([illegible]) کافی نہیں ہوسکتی جو خاص ضرورت کے موقع پر جمع کی جائے اور ضرورت رفع ہونیکے بعد منتشر کر دیجائے بلکہ انہیں مستقل فوج مرتبہ ([illegible]) رکھنی چاہیے جو ہمیشہ کیل کانٹے سے لیس رہے۔ اس کے الفاظ پر غور کرنے سے عجیب عجیب معانی ظاہر ہوتے ہیں۔ سامانِ جنگ کی نوعیت کو صرف لفظ **قوۃ** سے بیان کیا جو پہلی صدی ہجری کے تیروں اور دبابوں پر چودھویں صدی کی توپوں، ہوائی جہازوں، اور آبدوز کشتیوں پر اور اسکے بعد آنے والی صدیوں کی بہترین حربی اختراعات پر یکساں حاوی ہے۔ ما استطعتم کے لفظ نے قوۃ کی کمیت کو مسلمانوں کی قدرت و استطاعت پر موقوف کر دیا یعنی اگر وہ ایک فوج گراں مہیب

کرنے کی طاقت رکھتے ہوں تو ان کو وہی کرنی چاہئے لیکن اگر ان میں اتنی قوت نہ ہو۔ اور وہ بڑی
بڑی توپیں بڑے بڑے جنگی جہاز۔ بڑے بڑے مہلک آلات جنگ حاصل نہ کر سکیں تو ان سے یہ
فرض ساقط نہیں ہوجاتا۔ بلکہ انہیں ہر اس وسیلۂ جنگ کو اختیار کرنا چاہئے۔ جو دشمنان حق سے مقابلہ
کرنے میں کام آسکے۔ اور جسے حاصل کرنا مسلمانوں کے لئے ممکن ہو پھر "رباط الخیل" کے مستعد رکھنے کی
مصلحت بتلاتے ہوئے ترھبون بہ عدو اللہ وعدوکم کے بعد واخرین من دونہم لا تعلمونہم اللہ یعلمہم
کے الفاظ جو فرمائے۔ ان میں سیاست کا یہ نکتہ سمجھایا ہے کہ اگر کوئی قوم اپنی فوجی طاقت کو مضبوط
رکھتی ہے تو اس سے صرف یہی فائدہ نہیں ہوتا کہ جو طاقتیں اس کی علانیہ دشمن ہوں وہ اس سے
مرعوب و خوف زدہ رہتی ہیں، بلکہ رفتہ رفتہ لوگوں پر اس کی ایسی دھاک جم جاتی ہے کہ اس کے
ساتھ دشمنی کرنے کا خیال بھی دلوں میں نہیں آتا۔ ورنہ وہ سرکش قوتیں جو اسے کمزور اور غافل دیکھکر حملہ
کر دینے میں ذرا تامل نہ کریں۔ اس کی اسطرح مطیع اور دوست بنی رہتی ہیں کہ اسے ان کی طبیعت
میں چھپی ہوئی سرکشی کا علم بھی نہیں ہوتا۔ اسکے بعد علم الاقتصاد کی اس حقیقت کو ذہن نشین کیا ہے۔
کہ اس حفظ ما تقدم کی تیاری میں جو روپیہ صرف ہوتا ہے اسے یہ نہ سمجھو کہ وہ تم سے ہمیشہ کے لئے
ضایع ہوگیا اور اسکے فوائد سے تم محروم ہوگئے۔ بلکہ درحقیقت وہ تمہیں واپس ملتا ہے اور اس
صورت میں واپس ملتا ہے کہ تم پر ظلم نہیں ہوسکتا۔ اور ظلم سے محفوظ رہنے کی صورت میں تمہیں پرُ
امن زندگی کے فوائد حاصل ہوتے ہیں۔ یوف الیکم وانتم لا تظلمون میں دنیا و آخرت دونوں
میں فوائد حاصل ہونے اور دونوں میں ظلم سے بچے رہنے کا وعدہ مضمر ہے۔ اور درحقیقت اس جملہ
سے دونوں مقصود ہیں۔ کیونکہ مسلمانوں کے دین کی بہتری وہی ہے جو دنیا کی بہتری ہے۔ اور
ان کی دنیا کی بدتری وہی ہے جسکا نتیجہ دین کی بدتری ہے۔

مصلحانہ جنگ اور اس کی حقیقت

اب غور کرنا چاہیے کہ مدافعانہ جنگ کے اِن احکام سے مسلمانوں کی جس قومی قوت کو مٹنے اور تباہ ہونے سے بچایا گیا ہے اس کا مصرف کیا ہے؟ آیا اس قوت کو بچانا فی نفسہٖ مقصود ہے؟ یا درحقیقت اس سے کچھ اور کام لینا ہے جس کے لئے اس کا فتنوں سے محفوظ رہنا ضروری ہے؟ گذشتہ صحبتوں میں جو ہم بار بار اس حقیقت کی طرف اشارہ کرتے رہے ہیں کہ مسلمان اپنی قومی طاقت کو کھو کر "اصلی خدمت" کو انجام دینے کے قابل نہیں رہ سکتے جس کے لئے انہیں پیدا کیا گیا ہے، تو اس سے ہمارا مقصود دراصل اسی سوال کا جواب دینا تھا۔ وہ مواقع کسی تفصیلی گفتگو کے متحمل نہ تھے اسلئے صرف اشارات پر اکتفا کیا گیا۔ مگر اب ہم بحث کی اس منزل پر پہنچ گئے ہیں جہاں اس گرہ کو کھولنے سے سوءِ فہم کی گنجائش نہیں ہے۔

قرآن مجید، جو کتاب مجمل ہونے کے باوجود اسلامی تعلیم کے ایک ایک پہلو کی تفصیل کا حامل ہے۔ وہ مقصد بھی بیان کرتا ہے جس کے لئے مسلمان پیدا کئے گئے ہیں اور وہ "اصلی خدمت" بھی بیان کرتا ہے جس کو انجام دینے کے لئے ان کی قوت کے تحفظ میں یہ سارا اہتمام کیا گیا ہے۔ چنانچہ ارشاد فرمایا ہے:-

كُنْتُمْ خَيْرَ اُمَّةٍ اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَتُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ (۳: ۱۲)	تم ایک بہترین امت ہو جسے لوگوں کی خدمت و ہدایت کے لئے پیدا کیا گیا ہے تم نیکی کا حکم کرتے ہو اور بدی کو روکتے ہو اور اللہ پر ایمان رکھتے ہو۔

اس ارشاد میں اُخرجت للعرب یا اُخرجت للعجم یا اُخرجت للشرق نہیں کہا گیا ہے بلکہ اُخرجت للناس کہا گیا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ مسلمان کسی خاص نسل یا خاص ملک کے لئے نہیں بلکہ تمام بنی نوع انسان کی خدمت کیلئے پیدا کئے گئے ہیں۔ اور وہ بنی نوع انسان کی خدمت یہ ہے کہ وہ نیکی کا حکم دیں اور بدی سے روکیں۔

ایک قوم کی زندگی کا مقصد تمام بنی نوع انسان کی خدمت ہو، یہ ایک ایسی [illegible] ہے [illegible] تخیل سے قومیت و وطنیت کی فضا میں پرورش پانے والے تنگ [illegible]

یا "وطن پروری" کو تو خوب جانتے ہیں۔ اور "قوم پرستی" تو گویا ان کے تخیل کی معراج ہے، مگر جغرافی و نسلی حد بندیوں سے بالاتر ہو کر سارے عالم انسانی کی عملی خدمت انجام دینا اور اسی کو پوری قوم کا مقصد حیات قرار دینا اس کی رسائی سے بہت دور ہے اس لئے سب سے پہلے ہمیں اس کی تشریح کرنی چاہئے کہ یہ اخرجت للناس کیا چیز ہے۔

اجتماعی فرائض کا اخلاقی تخیل

اگر انسان کی جبلی خواہشات کا تجزیہ کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ اصلیت کے اعتبار سے اس کی کوئی خواہش ایسی نہیں ہے جو ادنیٰ سے ادنیٰ درجہ کے حیوانات میں بھی موجود نہ ہو جس طرح ایک انسان اچھی اچھی خوش ذائقہ غذائیں کھانے کی خواہش رکھتا ہے اسی طرح ایک گھوڑے کی بھی یہ خواہش ہوتی ہے کہ اُسے خوب ہری ہری گھاس کھانے کو ملے جس طرح ایک انسان اپنے ابنائے جنس پر غلبہ و قوت حاصل کرنے سے خوش ہوتا ہے اسی طرح ایک مینڈھے کے لئے بھی اس سے زیادہ خوشی کا موقع اور کوئی نہیں ہوتا کہ کوئی مینڈھا اس کی ٹکر کا مقابلہ نہ کر سکے جس طرح ایک انسان اپنی جان کی حفاظت کے لئے مدافعت اور بچاؤ کی تدبیریں کرتا ہے۔ اسی طرح ایک چھوٹے سے چھوٹے کیڑے میں بھی یہ بات پائی جاتی ہے۔ پس مجرد خواہشات کے اعتبار سے انسان اور حیوان میں کوئی خاص فرق نہیں ہے۔ البتہ جو چیز اسے ادنیٰ درجہ کے حیوانات سے ممتاز کرتی ہے وہ یہ ہے۔ کہ حیوانات کی زندگی کا منتہائے مقصود ان خواہشات کا پورا کر لینا ہے۔ مگر انسان کی زندگی کا مقصد اُن خواہشات کا حصول نہیں ہے بلکہ وہ ایک بلند تر نصب العین کے لئے ایک لازمی وسیلہ کے طور پر انکو پورا کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ اگر انسان کے سامنے فی الحقیقت حیوانی مقاصد سے بلند کوئی انسانی نصب العین نہ ہو اور وہ اپنی ذہانت اور اُس عقل کو جو خدا نے اسے عطا کی ہے۔ صرف ایسے وسائل اور طریقے تلاش کرنے میں صرف کرے جن سے وہ زیادہ اچھی طرح اپنی حیوانی خواہشات کو پورا کر سکتا ہو۔ تو وہ ایک اعلیٰ درجہ کا حیوان تو ضرور بن سکتا ہے۔ مگر ایک اعلیٰ درجہ کا انسان نہیں بن سکتا۔

انسان اپنے بقائے حیات کے لئے روزی کمانے پر مجبور ہے کہ نہ کمائیگا تو بھوکوں مر جائے گا، عوارض طبعی سے محفوظ رہنے کے لئے مکان بنانے، کپڑے پہننے، اور دیگر وسائلِ حفاظت مہیا کرنے پر مجبور ہے کہ نہ کرے گا تو ہلاک ہو جائے گا۔ اور اسی طرح وہ اپنے دشمنوں سے اپنے آپ کو بچانے پر بھی مجبور ہے کہ اس کوشش میں دریغ کرے گا تو ذلت و مصیبت میں مبتلا ہو جائے گا۔ لیکن محض ان ضروریات

کو پورا کرلینا فی نفسہ کوئی مقصود نہیں ہے بلکہ وہ ذریعہ ہے اس بلند مقصد کے حصول کا جس تک پہنچنا انسانی زندگی کا اصلی مطمحِ نظر ہے۔ پس سچا انسان وہ ہے جو اپنی ذات کے حقوق صرف اس لئے ادا کرتا ہے کہ وہ اپنے خاندان، اپنے شہر، اپنی قوم، اپنے ملک، اپنے ابنائے نوع اور اپنے خدا کے حقوق ادا کرنے کے قابل ہو جائے، اور اپنے ان فرائض کو بہتر طریقہ سے انجام دے سکے جو کائنات اور خالقِ کائنات کی طرف سے اُس پر عائد ہوتے ہیں۔ انسانیت کا اصلی معیار انہی حقوق اور فرائض کو سمجھنا اور پوری طرح ادا کرنا ہے۔ اور انسان پر اپنی ذات کے حقوق ادا کرنا اسی لئے فرض کیا گیا ہے کہ اسکے ذمہ صرف اسکے اپنے ہی حقوق نہیں ہیں۔ بلکہ دوسروں کے حقوق بھی ہیں اور اگر وہ اپنا حق ادا نہ کرے گا تو دوسروں کے حقوق بھی ادا کرنے سے قاصر رہیگا۔

جب افراد کے لئے انسانیت کا یہ معیار صحیح ہے تو کوئی وجہ نہیں ہے۔ کہ مجموعۂ افراد کے لئے بھی یہی معیار صحیح نہ ہو۔ جماعت بنجانے سے آدمیت میں کوئی کمی یا زیادتی نہیں ہوتی، اس لئے بنی آدم کی اجتماعی شرافت کا معیار بھی وہی ہونا چاہئے جو انفرادی شرافت کا ہے۔ اگر ایک ایسا آدمی جس کی زندگی کا نصب العین اپنی تن پروری اور اپنی خدمتِ نفس کے سوا کچھ نہ ہو۔ ہماری نظروں میں ایک ذی عقل حیوان سے زیادہ وقعت نہیں پا سکتا۔ تو یقیناً ایک ایسی انسانی جماعت بھی متمدن جانوروں سے زیادہ وقعت کی مستحق نہیں ہے جس کی کوششوں کا دائرہ صرف اپنی صلاح و فلاح، اپنی ترقی و بہبود، اور اپنے امن و چین تک محدود ہو اور عام انسانی فلاح سے اسکو کچھ مطلب نہ ہو۔ اگر ایک ایسے آدمی کو جو اپنے گھر کی آگ بجھانے، اپنے حقوق کی حفاظت کرنے، اور اپنی جان و مال اور عزت و آبرو کی مدافعت کرنے میں تو خوب مستعد ہو۔ لیکن دوسرے کا گھر جلتا دیکھ کر، دوسرے کے حقوق پامال ہوتے اور دوسرے کی جان و مال اور عزت و آبرو مٹتے دیکھکر اس سے مس نہ ہوتا ہو۔ ہم ایک بہترین آدمی کہنا تو درکنار ایک اچھا آدمی، بلکہ "آدمی" کہنے میں بھی تامل کرتے ہیں۔ تو ایک ایسی قوم یا ایسی جماعت کو ہم بہترین یا کم از کم شریف قوم کیونکر کہہ سکتے ہیں۔ جو اپنا گھر بچانے، اپنی حفاظت کرنے اور اپنے سے بدی و شرارت کو دفع کرنے کے لئے تو سب کچھ کرنے پر تیار ہو۔ مگر جب دوسری قوموں پر بدی کا غلبہ ہو۔ دوسری قومیں شیطانی قوتوں کی سرکشی سے تباہ ہو رہی ہوں اور دوسری قوموں کی اخلاقی، مادی، اور روحانی زندگی برباد ہو رہی ہو۔ تو وہ ان کی نجات، ان کی آزادی اور ان کی صلاح و فلاح کے لئے کوشش کرنے سے انکار کر دے جس طرح افراد پر اپنے نفس ہی

کے نہیں بلکہ اپنے ابنائے نوع اور اپنے خدا کے بھی کچھ حقوق ہوتے ہیں جنھیں ادا کرنا ان کا فرض ہوتا ہے اسی طرح ایک قوم پر بھی اپنے خالق اور اپنی وسیع انسانی برادری کی طرف سے کچھ حقوق عائد ہوتے ہیں اور وہ ہرگز ایک شریف قوم کہلانے کی مستحق نہیں ہوسکتی۔ جب تک کہ وہ ان حقوق کو ادا کرنے میں اپنی جان و مال اور زبان و دل سے جہاد نہ کرے۔ اپنی آزادی کو محفوظ رکھنا، اپنے استقلال کی حمایت کرنا، اور اپنے آپکو شرارت کے تسلط سے بچانا یقیناً ایک قوم کا پہلا فرض ہے لیکن صرف یہی ایک فرض نہیں ہے جس کو ادا کرکے اسے مطمئن ہوجانا چاہئے بلکہ اسکا اصلی فرض یہ ہے کہ وہ اپنی حاصل کردہ قوت سے تمام نوع بشری کی نجات کے لئے کوشش کرے۔ انسانیت کی راہ سے ان تمام رکاوٹوں کو دور کرے جو اسکی اخلاقی و مادی اور روحانی ترقی میں حائل ہیں۔ اور ظلم۔ طغیان بدی و شرارت۔ اور فتنہ و فساد کے خلاف اس وقت تک برابر جنگ کرتی رہے جب تک یہ شیطانی قوتیں دنیا میں باقی ہیں۔

اجتماعی فرائض کے متعلق اسلام کی اعلیٰ تعلیم

افسوس ہے کہ دنیا کے کم نظر گیانیوں نے اجتماعی شرافت کے اس بلند معیار اور اجتماعی زندگی کے اس اعلیٰ نصب العین کو سمجھنے کی کوئی کوشش نہیں کی اور اگر کسی نے کوشش کی بھی تو اس کی نظر کچھ زیادہ دور تک نہیں جاسکی۔ یہ لوگ افراد کے اخلاقی فرائض پر جب بحث کرتے ہیں تو انسانیت ہی کے نہیں بلکہ عالم مادی کے ذرہ ذرہ کے حقوق بھی گنا جاتے ہیں۔ مگر جب اجتماعی زندگی کا سوال ان کے سامنے آتا ہے تو انسانیت کے وسیع تخیل کے لئے انکے دماغ تنگ ہوجاتے ہیں اور اجتماعی فرائض کو قومیت یا وطنیت کے ایک محدود دائرے میں سمیٹ کر وہ اسس قوم پرستی یا وطن پرستی کی بنیاد ڈالدیتے ہیں جو تھوڑے سے تغیر کے بعد آسانی کے ساتھ قومی و وطنی عصبیت کی صورت اختیار کرلیتی ہے اور یہ تنگ نظری ہی دراصل انسانیت کی اس غیر طبعی تقسیم کی ذمہ دار ہے جس کی بدولت ایک نسل یا ایک زبان یا ایک قومیت رکھنے والے انسان اپنے دوسرے ابنائے نوع کو دائرہ انسانیت سے خارج سمجھتے ہیں، اور انکے حقوق کو سمجھنا اور ادا کرنا تو درکنار، انہیں انکے پامال کرنے میں بھی اخلاق و شرافت کا کچھ ٹوٹا نظر نہیں آتا۔

قرآن مجید نے اپنے ارشاد اخرجت للناس سے دراصل اسی انسانیت کی غیر طبعی تقسیم کو منسوخ کیا ہے اور اجتماعی شرافت کے اس بلند معیار کو پیش کرکے عالمگیر خدمت انسانی کے اس اعلےٰ نصب العین کی طرف ...ت سلمہ کی رہنمائی کی ہے جو ہر قسم کے امتیازات سے بالاتر ہے۔ وہ کہتا ہے کہ ایک حق پرست قوم کی فرض

شناسی کے لئے قومیت کا میدان بہت تنگ ہے، وہ ایک نسل یا ایک زبان یا ایک ملک کی قید بھی برداشت نہیں کر سکتی اسکے لئے خشکی و تری کی حد بندیاں، سمتوں اور جہتوں کی تقسیمیں بھی بے معنی ہیں کہ ایشیا اور یورپ یا شرق و غرب کا امتیاز اس کے ادائے فرض میں حائل ہو سکے اس کے نزدیک تو تمام انسان آدم کے تمام بیٹے بیٹیاں برابر ہیں اس لئے ان سب کی خدمت کرنا یعنی ان سب کو نیکی کا حکم کرنا اور سب کو بدی سے روکنا اور شر سے بچانا اسکا فرض ہے۔ اس اعلیٰ تعلیم کو اس نے مختلف موثر پیرایوں میں پیش کیا ہے۔ اور تنگ خیالی کے طلسم کو توڑ کر فرض شناسی کے ایک وسیع عالم کی راہیں کھولدی ہیں۔

چنانچہ دوسری جگہ ارشاد ہوتا ہے:۔

وَكَذٰلِكَ جَعَلْنٰكُمْ اُمَّةً وَّسَطًا لِّتَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ وَيَكُوْنَ الرَّسُوْلُ عَلَيْكُمْ شَهِيْدًا (٢:١٤٣)

اس طرح ہم نے تم کو ایک بہترین عادل امت بنایا تاکہ تم دنیا کے لوگوں پر نگراں رہو، اور رسول تم پر نگراں رہے۔

اور اسی مضمون کی تشریح سورۂ حج میں اس طرح کی گئی ہے کہ:۔

وَجَاهِدُوْا فِي اللّٰهِ حَقَّ جِهَادِهٖ هُوَ اجْتَبٰىكُمْ وَمَا جَعَلَ عَلَيْكُمْ فِي الدِّيْنِ مِنْ حَرَجٍ مِلَّةَ اَبِيْكُمْ اِبْرٰهِيْمَ هُوَ سَمّٰىكُمُ الْمُسْلِمِيْنَ مِنْ قَبْلُ وَفِيْ هٰذَا لِيَكُوْنَ الرَّسُوْلُ شَهِيْدًا عَلَيْكُمْ وَتَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ فَاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتُوا الزَّكٰوةَ وَاعْتَصِمُوْا بِاللّٰهِ (٢٢:١٠)

اور اللہ کی راہ میں ایسا جہاد کرو جو جہاد کرنے کا حق ہے اس نے تم کو اسی کام کے لئے مخصوص کر لیا ہے اور تم پر دین کے دائرہ کو تنگ نہیں کیا اور یہ وہی ملت ہے جو تمہارے باپ ابراہیم کی تھی اللہ نے تمہارا نام اس سے پہلے بھی اور اس کتاب میں بھی مسلم (اطاعت گذار) رکھا ہے تاکہ رسول تم پر نگراں رہے اور تم دنیا کے لوگوں پر نگراں رہو پس نماز کو قائم کرو، زکوٰۃ دو، اور اللہ کے دامن پر مضبوطی کے ساتھ قائم رہو۔

ان دونوں آیات کو جو ایک دوسری کی تشریح و تفسیر کرتی ہیں۔ ملا کر پڑھو۔ تو حقیقت واضح ہو جائے گی یہاں بھی مسلمانوں کی زندگی کا مقصد اسی عالمگیر خدمت انسانی کو بتایا ہے۔ فرمایا کہ تم ایک ایسا گروہ ہو جسے افراط و تفریط سے ہٹا کر عدل و توسط کی راہ حق پر قائم کیا گیا ہے یقیناً اللہ نے خدمت کے لئے منتخب فرمایا ہے کہ اس کی خاطر حق کی حفاظت حق کی اعانت اور حق کی بلند سازی کے لئے کوشش کرنے میں اپنی ساری قوتیں وقف کردو۔ اور اسی کو اپنی زندگی کا مقصد بناؤ۔ تمہارے دین کو تنگ نہیں کیا۔ بلکہ اس میں احکام کے اعتبار سے آسانیاں اور حدود کے اعتبار سے فراخیاں بھی ہیں

پھر اسکا دائرہ اتنا وسیع رکھا ہے کہ نسل، رنگ، زبان، قومیت اور وطنیت کی قیود اس کی برکتوں کو عام ہونے سے باز نہیں رکھ سکتیں۔ اور اس میں کوئی چھوت چھات یا درن آشرم کی قید نہیں رکھی گئی۔ اور نہ اسرائیل کی کھوئی ہوئی بھیڑوں یا اسرائیل کے بھٹکے ہوئے اونٹوں کی کوئی تخصیص کی گئی ہے۔ کہ وہ اعلائے کلمۃ اللہ کا حق ادا کرنے سے روک سکے۔ پس اب تمہارا کام یہ ہے کہ تمام دنیا والوں کی دیکھ بھال کرو، ان کے اعمال کی نگرانی رکھو اور ان پر اللہ کے گواہ، اس کے محتسب اور اس کے دیدبان بنے رہو۔ کیونکہ تمہیں اسی عام نگرانی کے لئے پیدا کیا گیا ہے۔

پھر ایک دوسرے طریقہ سے اسی مضمون کو یوں ادا کیا ہے کہ:۔

اَلَّذِیْنَ اِنْ مَّكَّنّٰهُمْ فِی الْاَرْضِ اَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتَوُا الزَّكٰوةَ وَاَمَرُوْا بِالْمَعْرُوْفِ وَنَهَوْا عَنِ الْمُنْكَرِ (۲۲: ۶)	اگر ہم ان کو زمین میں طاقت بخشیں گے۔ تو وہ نماز قائم کرینگے زکوٰۃ دیں گے نیکی کا حکم کریں گے۔ اور بدی کو روکیں گے۔

یہاں الناس کی بجائے الارض کا لفظ استعمال کیا۔ اور مسلمانوں کی طاقت و قوت کا فائدہ یہ بتایا کہ وہ زمین میں نیکی کو قائم کریں گے۔ اور بدی کو مٹائیں گے۔ سو اس سے بھی یہی بتانا مقصود ہے۔ کہ مسلمانوں کا کام صرف عرب، یا صرف عجم، یا صرف ایشیا، یا صرف مشرق ہی میں اقامت صلوۃ، ایتائے زکوۃ، امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کرنا نہیں ہے بلکہ کرۂ زمین کے چپہ چپہ اور گوشہ گوشہ میں ان کو پہنچنا چاہیے۔ معمورۂ ارضی کے ہر دشت وجبل اور بحر و بر میں نیکی کا جھنڈا لیے ہوئے بدی کے لشکروں کا تعاقب کرنا چاہیے۔ اور اگر دنیا کا کوئی ایک کونہ بھی ایسا باقی رہ گیا ہو جہاں منکر (یعنی برائی) موجود ہو تو وہاں پہنچ کر اسکو مٹانا۔ اور معروف (نیکی) کو اس کی جگہ قائم کرنا چاہیے۔ اللہ کو کسی خاص ملک یا خاص نسل سے واسطہ نہیں ہے وہ اپنی تمام مخلوق کا یکساں خالق اور رب، یکساں خالقیت کا تعلق رکھتا ہے اس لئے وہ کسی خاص ملک میں فتنہ و فساد پھیلنے کو برا نہیں سمجھتا۔ بلکہ زمین میں خواہ کسی جگہ بھی فساد ہو اس کے لئے یکساں ناراضی کا موجب ہوتا ہے چنانچہ قرآن مجید میں فساد فی العرب یا فتنہ فی العجم کہیں نہیں آیا بلکہ ہر جگہ ارض کا لفظ استعمال کیا گیا ہے لَفَسَدَتِ الْاَرْضُ یَسْعَوْنَ فِی الْاَرْضِ فَسَادًا۔ تَكُنْ فِتْنَةٌ فِی الْاَرْضِ بس وہ اپنے لشکر حق یعنی امت مسلمہ کی خدمت کو قومیت ونسل کی حدود میں مقید نہیں کرتا۔ بلکہ اس خدمت کو تمام روئے زمین کے بسنے والوں کے لئے عام کرتا ہے۔

امر بالمعروف و نہی المنکر کی حقیقت

اس سے معلوم ہوا کہ مسلمانوں کے خیرِ امت ہونے کی وجہ یہ ہے کہ وہ صرف اپنی ذات کی خدمت کے لیے پیدا نہیں ہوئے ہیں۔ بلکہ ان کی زندگی کا نصب العین "اُخرِجَت لِلنّاس" میں پوشیدہ ہے۔ یعنی جس طرح ان کے سردار نے زبانِ وحی سے اعلان کیا تھا کہ یا ایھا الناس انی رسول اللہ الیکم جمیعا۔ "اے لوگو! میں موسیٰ و عیسیٰ اور ہود و صالح وغیرہم کی طرح صرف اپنی قوم کے لئے نہیں بلکہ تم سب کے لئے اللہ کا پیغام لیکر آیا ہوں" اسی طرح مسلمان بھی آسمانی ہدایت کے مطابق اعلان کرتے ہیں کہ ہم قوم پروری یا وطن پرستی کے لئے پیدا نہیں کئے گئے ہیں بلکہ ہماری زندگی کا مقصد تمام عالم انسانی کی خدمت ہے۔ اور ہماری خدمت گذاری کا دائرہ تمام کرۂ زمین کو محیط ہے۔

اب دیکھنا چاہیئے کہ مسلمانوں کی اصلی خدمت جس کو امر بالمعروف و نہی عن المنکر کے جامع الفاظ میں بیان کیا گیا ہے۔ کس قسم کی خدمت ہے۔ اور اس کی حقیقت کیا ہے؟

معروف لغت میں اس چیز کو کہتے ہیں جو جانی پہچانی ہو۔ اور اصطلاحاً اس سے مراد ہر وہ فعل لیا جاتا ہے جس سے عقل صحیح آشنا ہو اور جس کی خوبی کو فطرت سلیمہ جانتی اور سمجھتی ہو۔ اسی طرح منکر لغت میں اس چیز کو کہتے ہیں جو معروف کی ضد یعنی جانی پہچانی نہ ہو۔ اور اصطلاحاً اسکا اطلاق اس فعل پر ہوتا ہے جسکو فطرت سلیمہ پسند نہ کرتی ہو۔ اور عقل صحیح جس کی برائی کا حکم لگا دے۔ پس معروف تمام نیکیوں پر حاوی ہے۔ کیونکہ نیکی اسی چیز کا نام ہے جسے فطرت سلیمہ پسند کرتی ہو۔ اور منکر تمام برائیوں پر حاوی ہے۔ کیونکہ برائی نام ہی اس چیز کا ہے جو فطرت سلیمہ کے خلاف ہو۔ ایمانداری۔ راستبازی۔ پرہیزگاری، فرض شناسی، ضعیفوں کی حمایت، مظلوموں کی مدد۔ محتاجوں کی اعانت۔ عدل و انصاف قیام۔ خدا اور بندوں کے اور خود اپنے حقوق کو سمجھنا اور انہیں ادا کرنا۔ یا ایسے ہی دوسرے اخلاقی فضائل معروف ہیں اور ان پر خود عمل کرنے اور دوسروں کو آمادہ کرنے کا نام امر بالمعروف ہے۔ اسی طرح خیانت، بدکاری، دروغ بافی، فتنہ پردازی، فساد انگیزی، اپنے حدود سے تجاوز کرنا۔ دوسروں کے حقوق کو چھینا۔ باطل کی حمایت کرنا حق و صداقت کو دبانا، کمزوروں اور ضعیفوں کو ستانا یہ اور ایسے ہی دوسرے تمام خلاف عقل و خلاف فطرت اعمال منکر ہیں اور ان سے خود احتراز کرنا اور دوسروں کو باز رکھنا نہی عن المنکر ہے۔

اس میں خود نیک بننا اور بدی سے پرہیز کرنا مقدم رکھا گیا اور نیک بنانا اور بدی سے روکنا موخر رکھا گیا۔

امروا بالمعروف ونہوا عن المنکر سے پہلے اقاموا الصلوٰۃ وآتوا الزکوٰۃ کا ذکر کرنے سے معلوم ہوتا ہے اور حقیقت بھی یہی ہے کہ نیک بنانے سے پہلے نیک بننا ضروری ہے لیکن جس طرح اپنا پیٹ بھرنے سے دوسرے کا پیٹ بھرنا زیادہ افضل ہے۔ اسی طرح نفسیات کے اعتبار سے نیکی کو پھیلانے اور بدی کو روکنے کا درجہ بھی نیک بننے اور بدی کو ترک کرنے سے زیادہ ہے کیونکہ ایک اپنے نفس کی خدمت ہے اور دوسری اپنے ابنائے نوع کی خدمت ایک محض انسانیت کے درجہ میں ہے اور دوسری انسانیت کاملہ کے درجہ میں نیکی پر خود عمل کرنا اور بدی سے خود پرہیز کرنا یقیناً ایک اچھی صفت ہے اور ایک شریف آدمی کا شیوہ مگر شرافت کا کمال اور بزرگی کا اعلیٰ درجہ اس وقت تک کسی انسان کو نصیب نہیں ہوسکتا جب تک دوسرے لوگوں کو بھی نیکوکار بنانے اور بدکاری سے روکنے کی کوشش نہ کرے انسان کی فطرت ہے کہ اگر اسے کوئی چیز ناپسند ہوتی ہے تو چھوڑ دیتا ہے اگر ناپسندی سے ایک درجہ بڑھ کر نفرت ہوتی ہے تو اسے دیکھنا یا سننا بھی برداشت نہیں کرسکتا اگر نفرت سے ایک درجہ بڑھ کر دشمنی ہو جاتی ہے تو وہ اسے مٹانے کے درپے ہو جاتا ہے۔ اور اگر دشمنی سے بھی بڑھ کر اس کے دل میں بغض وعناد کے شدید جذبات پیدا ہو جاتے ہیں تو پھر وہ اس کے مٹانے کو اپنی زندگی کا مشن بنا لیتا ہے، اور اس طرح ہاتھ دھو کر اس کے پیچھے پڑ جاتا ہے کہ جب تک اسے صفحہ ہستی سے محو نہ کردے چین نہیں لیتا۔ اسی طرح جب وہ کسی چیز کو پسند کرتا ہے تو خود اختیار کر لیتا ہے جب محبت کرتا ہے تو آنکھوں میں اس کا نظارہ اور کانوں میں اس کا ذکر سننے اور دیکھنے سے اسے خوشی ہوتی ہے جب محبت سے بڑھ کر عشق کا درجہ آتا ہے تو چاہتا ہے کہ دنیا کے ذرہ ذرہ میں اسی کا جمال ہو اور زندگی کا کوئی لمحہ بھی اس کے غیر کو دیکھنے اور غیر کا ذکر سننے اور غیر کا تصور کرنے میں ضائع نہ ہو۔ پھر اگر یہ عشق فدائیت کی حد تک بڑھ جائے تو وہ اپنی زندگی کو اسی کی خدمت کے لئے وقف کردیتا ہے۔ اور اپنی جان ومال عیش وآرام عزت وآبرو غرض سب کچھ اس پر نثار کردیتا ہے پس امر بالمعروف جس چیز کا نام ہے وہ دراصل نیکی سے انتہائی شیفتگی اور والہانہ عشق ہے اور نہی عن المنکر سے جس چیز کو تعبیر کیا گیا ہے وہ دراصل بدی سے انتہائی بغض وعناد ہے۔ آمر بالمعروف صرف نیک ہی نہیں ہوتا بلکہ نیکی کا عاشق اور فدائی ہوتا ہے اور ناہی عن المنکر صرف بدی سے محترز ہی نہیں ہوتا بلکہ اس کا دشمن اور اس کے خون کا پیاسا ہوتا ہے۔

ایک دوسرا جذبہ جس پر امر بالمعروف ونہی عن المنکر کی بنیاد قائم ہے حب انسانیت اور ہمدردی بنی نوع کا جذبہ ہے۔ خود غرض آدمی کو اللہ جو نعمت دیتا ہے اس میں وہ منفرد رہنا چاہتا ہے اور دوسرے کو شریک

نہیں کرتا۔ اسی طرح اس کی ذات پر کوئی مصیبت آئے تو اُس کے دفع کرنے میں تو پوری کوشش کرتا ہے
مگر دوسروں کو مصیبت میں دیکھ کر اُن کی مدد نہیں کرتا۔ برخلاف اس کے جو شخص ہمدرد اور محب انسانیت
ہو۔ وہ اپنی راحت میں سب کو شریک کرتا ہے اپنی نعمتیں سب پر بانٹتا ہے اور دوسرے کو درد و مصیبت
میں دیکھ کر اسی طرح بیتاب ہو جاتا ہے۔ جس طرح خود اپنے لئے ہو سکتا ہے۔ اس خود غرضی و ہمدردی
کو ہم عموماً محسوسات اور مادیات کے عالم تک محدود سمجھتے ہیں لیکن اخلاق و روحانیت کے عالم میں
ان صفات کا مقابلہ زیادہ سختی کے ساتھ ہوتا ہے اور چونکہ انسان کی مادی بھلائی اور بُرائی اس کی اخلاقی
و روحانی زندگی کے تابع ہوتی ہے اسلئے ان صفات کا اصلی مقابلہ حقیقۃً اسی عالم میں ہوتا ہے۔
ایک سچا ہمدردِ بنی نوع اور محب انسانیت خود نیک بنجانے پر قانع نہیں ہو سکتا جب تک وہ اپنی
انسانی برادری کے دوسرے افراد کو بھی بدی کے پنجے سے چھڑا کر نیکی کا رستہ نہ دکھا دے اُسے اطمینان
نصیب نہیں ہوتا اس کی روح اپنے دوسرے بھائی کو بدی میں مبتلا دیکھ کر بے چین ہو جاتی ہے۔
وہ دوسرے انسان کو نیکی کے لباس سے عاری دیکھکر اسی طرح بیقرار ہو جاتا ہے جیسے کوئی ماں
اپنے بچے کو سردی میں سکڑتے دیکھکر بیقرار ہو جایا کرتی ہے۔ اسکو جب کسی چیز کی اچھائی معلوم ہو جاتی
ہے تو اسکا جی چاہتا ہے کہ اسکے جنگل میں ایک شخص بھی گرفتار نہ رہے۔ وہ سمجھتا ہے کہ ایک چیز اگر اچھی ہو
تو وہ صرف میرے ہی لئے اچھی نہیں ہے بلکہ ہر انسان کے لئے اچھی ہے اور میرا فرض ہے کہ اس کو
آدم کے ہر بیٹے اور بیٹی تک پہنچاؤں۔ اگر ایک چیز فی الحقیقت بری ہے تو وہ صرف میرے ہی لئے بری
نہیں ہے۔ بلکہ سب کے لئے اس کی بُرائی یکساں ہے۔ اور لوگوں کو اس سے بچانا میرا فرض ہے۔ اپنی بھلائی
پر قناعت کر کے دوسروں کی بھلائی نہ چاہنا اور اپنے سے بدی کو دور کر کے مطمئن ہو جانا اور دوسروں کو
اس سے بچانے کی کوشش نہ کرنا سب سے بڑی خود غرضی اور سب سے بڑی انانیت ہے

لیکن یہ صرف خود غرضی ہی نہیں بلکہ خودکشی بھی ہے انسان ایک متمدن حیوان ہے وہ جماعت
سے الگ ہو کر زندگی نہیں بسر کر سکتا۔ اس کی بھلائی اور بُرائی سب اجتماعی ہے جماعت بری ہوگی تو بُری
برائی سے وہ بھی نہ بچ سکے گا۔ اگر ایک شہر میں عام طور پر غلاظت پھیلی ہوئی ہو اور اس سے وبا پھیل جائے
تو ہوا کی خرابی صرف اسی شخص کو ہلاک نہیں کرے گی جس کے گھر میں غلاظت موجود ہو۔ بلکہ وہ صاف
ستھرا روز نہلانے والا، روز گھر کو صاف رکھنے والا۔ اور حفظان صحت کا پورا لحاظ رکھنے والا آدمی بھی

اس سے متاثر ہوگا۔ جو اس شہر میں رہتا ہو۔ اسی طرح اگر کسی بستی کا عام اخلاق بگڑا ہوا ہو اور وہاں کے لوگ عموماً بدکار ہوں تو اسپر جو تباہی نازل ہوگی وہ صرف بدکاروں ہی تک محدود نہ ہوگی۔ بلکہ ان چند نیکوکاروں کی عزت و شرافت پر بھی اس کی زد پہنچے گی جو اس بستی میں مقیم ہوں وَاتَّقُوْا فِتْنَةً لَّا تُصِيْبَنَّ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا مِنْكُمْ خَاصَّةً (۸: ۳) کے یہی معنی ہیں کہ کسی بستی کی عام تباہی سے صرف بدکار ہی تباہ نہیں ہوتے۔ بلکہ نیکوکار بھی اس کی لپیٹ میں آجاتے ہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس مضمون کو ایک حدیث میں نہایت وضاحت کیساتھ بیان فرمایا ہے۔

ان اللہ لا یعذب العامة بعمل خاصة حتی یروا المنکر بین ظهرانیهم وهم قادرون علی ان ینکروه فلا ینکروه فاذا فعلوا ذلك عذب اللہ الخاصة والعامة (رواہ امام احمد)	اللہ عام لوگوں پر خاص لوگوں کے عمل کے باعث اسوقت تک عذاب نازل نہیں کرتا جب تک ان میں یہ عیب پیدا نہ ہو جائے کہ اپنے سامنے برے اعمال ہوتے دیکھیں اور انہیں روکنے کی قدرت رکھتے ہوں مگر نہ روکیں جب وہ ایسا کرنے لگتے ہیں تو پھر اللہ عام اور خاص سب پر عذاب نازل کرتا ہے

پس امر بالمعروف و نہی عن المنکر صرف دوسروں ہی کی خدمت نہیں بلکہ اپنی خدمت بھی ہے اور در حقیقت مجموعی بہتری میں اپنی بہتری چاہنے کی دانشمندانہ حکمت عملی کا دوسرا نام ہے۔

حیات اجتماعی میں امر بالمعروف و نہی عن المنکر کا درجہ

پھر یہی وہ چیز ہے جسپر اجتماعی فلاح و بہبود کا دارومدار ہے، جو ایک قوم اور ایک جماعت کو ہلاکت میں مبتلا ہونے سے بچاتی ہے، جس کے بغیر انسانیت کی حفاظت نہیں کی جا سکتی۔ جب تک ایک قوم میں یہ اسپرٹ موجود رہتی ہے۔ کہ اس کے افراد ایک دوسرے کو نیکی کا حکم کرنے اور بدی سے روکنے کا اہتمام کریں یا کم از کم اس قوم میں ایک جماعت ہی ایسی موجود رہے، جو اس فرض کو مستعدی کیساتھ انجام دیتی رہے تو وہ قوم کبھی تباہ نہیں ہو سکتی۔ لیکن اگر یہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کی اسپرٹ اس میں سے نکل جائے اور اس میں کوئی جماعت بھی ایسی نہ رہے، جو اس فرض کو انجام دینے والی ہو تو رفتہ رفتہ بدی کا شیطان اسپر مسلط ہو جاتا ہے، اور آخر وہ اخلاقی و روحانی اور مادی تباہی کے گڑھے میں ایسی گرتی ہے کہ ابھر نہیں سکتی، اسی حقیقت کو قرآن مجید میں بیان کیا گیا ہے :-

فَلَوْلَا كَانَ مِنَ الْقُرُوْنِ مِنْ قَبْلِكُمْ أُولُوْا بَقِيَّةٍ يَّنْهَوْنَ عَنِ الْفَسَادِ فِي الْأَرْضِ إِلَّا قَلِيْلًا مِّمَّنْ أَنْجَيْنَا مِنْهُمْ وَاتَّبَعَ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا مَا أُتْرِفُوْا فِيْهِ وَكَانُوْا مُجْرِمِيْنَ ٥ وَمَا كَانَ رَبُّكَ لِيُهْلِكَ الْقُرٰى بِظُلْمٍ وَّأَهْلُهَا مُصْلِحُوْنَ (١١: ١٠)

تم سے پہلے زمانہ کی قوموں پر جو عذاب نازل ہوئے اس کی وجہ یہ تھی کہ ان میں ایسے نیکوکار لوگ نہیں تھے جو انہیں زمین میں فساد پھیلانے سے روکتے سوائے ان تھوڑے آدمیوں کے جنہیں ہم نے ان میں سے بچا لیا ورنہ ظالم لوگ تو ان لذتوں کے پیچھے پڑے رہے جن کے سامان انہیں عطا کئے گئے تھے اور وہ بڑے خطاکار تھے سو تیرا رب ظالم نہیں ہے کہ بستیوں کو یونہی ہلاک کر دے۔ حالانکہ ان کے باشندے نیکوکار ہوں۔

ایک دوسری جگہ بنی اسرائیل کے مبتلائے لعنت ہونے کی وجہ یہ بیان کی ہے کہ۔

لُعِنَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ بَنِيْ إِسْرَائِيْلَ عَلٰى لِسَانِ دَاوُدَ وَعِيْسَى ابْنِ مَرْيَمَ ذٰلِكَ بِمَا عَصَوْا وَّكَانُوْا يَعْتَدُوْنَ ٥ كَانُوْا لَا يَتَنَاهَوْنَ عَنْ مُّنْكَرٍ فَعَلُوْهُ لَبِئْسَ مَا كَانُوْا يَفْعَلُوْنَ (٥: ١١)

بنی اسرائیل میں کفر کرنیوالے لوگوں پر داؤد اور عیسٰی ابن مریم کی زبان سے لعنت کی گئی کیونکہ انہوں نے نافرمانی کی اور اور وہ حد سے بڑھ جاتے تھے وہ ایک دوسرے کو ان بری باتوں سے نہ روکتے جو وہ کیا کرتے تھے۔ اور یہ بہت بری بات تھی جو وہ کرتے تھے۔

اس آیت کی تفسیر میں امام احمد، ترمذی، ابوداؤد اور ابن ماجہ رضی اللہ عنہم نے جو احادیث نقل کی ہیں ان سب میں تھوڑے اختلاف کے ساتھ یہ بیان کیا گیا ہے کہ بنی اسرائیل میں پہلا نقص جو پیدا ہوا وہ یہ تھا کہ ان کے دلوں سے برائی کی نفرت دور ہو گئی تھی۔ اور وہ جھوٹی رواداری پیدا ہو گئی تھی۔ جو برائی کو برداشت کرتے کرتے خود برائی میں مبتلا ہو جانے پر انسان کو آمادہ کر دیتی ہے۔ كان الرجل يلقى الرجل فيقول يا هذا اتق الله ودع ما تصنع فانه لا يحل لك ثم يلقاه من الغد فلا يمنعه ذلك ان يكون اكيله وشريبه وقعيده۔ جب ان میں کا ایک آدمی دوسرے سے ملتا تو کہتا کہ اے شخص اللہ سے ڈر۔ اور یہ فعل چھوڑ دے جو تو کرتا ہے۔ کیونکہ یہ تیرے لئے جائز نہیں ہے مگر دوسرے دن جب اس سے ملتا تو اسی کا ہم پیالہ و ہم نوالہ اور ہم نشین بننے سے کوئی چیز اسے باز نہ رکھتی۔ آخر انہیں ایک دوسرے کی برائی کا اثر پڑ گیا اور ان سے

ضمیر مردہ ہو گئے ضرب اللہ قلوب بعضہم ببعض جس وقت حضورؐ یہ فرما رہے تھے تو دفعۃً لیٹے لیٹے اٹھ بیٹھے اور جوش میں آ کر فرمایا۔

والذی نفسی بیدہ لتامرن بالمعروف ولتنھن عن المنکر ولتاخذن علی ید المسئی ولتطرنہ علی الحق اطراً او لیضربن اللہ قلوب بعضکم علی بعض او لیلعنکم کما لعنہم	اس کی قسم جس کے ہاتھ میں میری جان ہے تمہیں لازم ہے کہ نیکی کا حکم کرو۔ اور برائی سے روکو۔ اور بدکار کا ہاتھ پکڑ لو۔ اور اسے حق کی طرف موڑ دو۔ ورنہ اللہ تمہارے دلوں پر بھی ایک دوسرے کا اثر ڈال دے گا۔ یا تم پر بھی اسی طرح لعنت کرے گا جس طرح ان لوگوں پر کی تھی۔

اسی مثال پر تمام دنیا کو بھی قیاس کر لینا چاہئے جس طرح ایک قوم کی فلاح و بہبود اور نجات کا انحصار امر بالمعروف و نہی عن المنکر کی عملی روح پر ہے۔ اسی طرح تمام عالم انسانی کی نجات و فلاح بھی اسی چیز پر منحصر ہے دنیا میں کم از کم ایک گروہ ایسا ضرور ہونا چاہئے۔ جو بدکاروں کا ہاتھ پکڑنے والا، بدی کو روکنے والا، اور نیکوکاری کا حکم دینے والا ہو۔ اللہ کی طرف سے اس کی زمین پر شہید ہو۔ لوگوں کی دیکھ بھال کرتا رہے۔ شرارت کے عناصر کو قابو میں رکھے۔ عدل و انصاف کو قائم کرے اور بدی کو کبھی سر نکالنے کا موقع نہ دے۔ اللہ کی مخلوق کو عام تباہی سے بچانے اور اس کی زمین کو شر و فساد اور سفک دماء سے محفوظ رکھنے کے لئے ایسے گروہ کا وجود نہایت ضروری ہے۔

وَلْتَكُنْ مِّنْكُمْ اُمَّةٌ يَّدْعُوْنَ اِلَى الْخَيْرِ وَيَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ (۳: ۱۰۴)	اور تم میں ایک گروہ ایسا ضرور ہونا چاہئے جو نیکی کی طرف بلائے نیکوکاری کا حکم دے اور بدکاری سے روکے،

پس امر بالمعروف و نہی عن المنکر کی حقیقت صرف یہی نہیں ہے کہ وہ فی نفسہ ایک اچھی چیز ہے، اور ہمدردی بنی نوع کا ایک بہترین جذبہ ہے بلکہ درحقیقت وہ نظام تمدن کو فساد سے محفوظ رکھنے کی ایک بہترین اور ناگزیر تدبیر ہے اور وہ ایک خدمت ہے جو دنیا میں امن قائم کرنے بدنیا کو شریف انسانوں کی بستی کے قابل بنانے اور دنیا والوں کو حیوانیت کے درجہ سے انسانیت کاملہ کے درجہ تک پہنچانے کے لئے اللہ نے ایک بہترین گروہ کے سپرد کی ہے۔ اور یقیناً انسانیت کی اس سے بڑی

خدمت اور کوئی نہیں ہے۔

امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا فرق

یہ عالمگیر انسانی خدمت جو مسلمانوں کے سپرد کی گئی ہے دو اجزا پر مشتمل ہے ایک امر بالمعروف اور دوسرے نہی عن المنکر ان دونوں کا مقصود و مدعا اگرچہ ایک ہے یعنی آدمی کو انسان بنانا لیکن دونوں کے مدارج مختلف ہیں۔ اور اس لئے دونوں کے طریقوں میں بھی اختلاف ہے۔ آیندہ مباحث کو سمجھنے کے لئے اس اختلاف کو سمجھ لینا ضروری ہے۔

علم الاخلاق میں انسان کے فرائض کو دو حصوں پر تقسیم کیا گیا ہے ایک وہ فرائض جن کے کرنیکا اس سے مطالبہ کیا جا سکتا ہے اور دوسرے وہ فرائض جنکا کرنا نہ کرنا خود اس کی مرضی پر موقوف ہے۔ سوسائٹی کا ایک اچھا رکن بننے کے لئے انسان کا کم سے کم فرض یہ ہے۔ کہ وہ بُرے کاموں سے بچے۔ دوسروں کے حقوق نہ چھینے۔ دوسروں پر ظلم نہ کرے۔ دوسروں کے امن و اطمینان میں خلل نہ ڈالے۔ اور ایسے اعمال سے پرہیز کرے جو اس کے وجود کو سائٹی کے لئے نقصان دہ یا غیر مفید بناتے ہوں۔ ان فرائض کے ادا کرنے کا ہر سوسائٹی اپنے ہر رکن سے مطالبہ کرتی ہے۔ اور اگر وہ انہیں ادا نہ کرے تو اسکے لئے ضروری ہو جاتا ہے کہ ان کے ادا کرنے پر اسے مجبور کرے۔ فرائض کی دوسری قسم وہ ہے جو فضائل اخلاق سے تعلق رکھتی ہے اور جنہیں ادا کرنے سے انسان سوسائٹی کا ایک معزز اور اعلےٰ درجہ کا رکن بن سکتا ہے۔ مثلاً خدا اور بندوں کے حقوق پہچاننا، اور انہیں ادا کرنا، خود نیک بننا اور دوسروں کو نیک بنانا اپنے خاندان اور اپنی قوم اور اپنے ابنائے نوع کی خدمت کرنا اور حق کی حمایت و حفاظت کرنا۔ وغیر ذالک۔ اس دوسری قسم کے فرائض کو انجام دینے کے لئے انسانی شعور کی تکمیل ضروری ہے۔ اور کوئی شخص انہیں اسوقت تک ادا نہیں کر سکتا جب تک ان کی حقیقت کو اچھی طرح سمجھ نہ لے اور اس کے نفس میں اتنی پاکیزگی پیدا نہ ہو جائے کہ وہ انہیں ادا کرنے پر آمادہ ہو۔ اس لئے یہ فرائض اجباری نہیں بلکہ اختیاری ہیں، اور انسان کی مرضی پر منحصر ہے کہ خود معزز اور اعلیٰ درجہ کا انسان بنے یا نہ بنے۔ اگرچہ ایک سوسائٹی کا اخلاقی نظام ایسا ہی ہونا چاہئے کہ اس کے افراد میں اعلیٰ درجہ پر پہنچنے کی خواہش طبعاً پیدا ہو۔

امر بالمعروف ونہی عن المنکر کا فرق بھی تقریباً اسی تقسیم پر مبنی ہے آدمی کو حیوانیت کے درجہ سے نکالکر انسانیت کی سطح پر لاتا اور اسے انسانی سوسائٹی کا ایک غیر مفید اور نقصان دہ رکن بننے سے روکنا نہی عن المنکر سے تعلق رکھتا ہے۔ اور پھر اسکو انسانیت کی سطح سے اٹھاکر انسانیت کاملہ کے درجہ میں لیجانا۔ اور اسے انسانی سوسائٹی کا ایک مفید اور معزز رکن بنانا امر بالمعروف سے متعلق ہے۔

امر بالمعروف نہی عن المنکر سے افضل ہے لیکن ترتیب کے اعتبار سے نہی عن المنکر پہلے ہے اور امر بالمعروف بعد میں، جس طرح ایک کسان کا اصل مقصد اناج پیدا کرنا ہے۔ لیکن اس کے لیے بیج ڈالنے سے پہلے ہل چلاکر زمین کو نرم کر دینا ضروری ہے اسی طرح اسلام کا اصل مقصد تو انسان کو انسان اعلیٰ بنانا ہے مگر معروف کا بیج ڈالنے سے پہلے اس کی فطرت کو منکر سے پاک کر کے ہموار کر دینا ضروری ہے۔ اسلام ہر شخص کو معروف کی طرف دعوت دیتا ہے اور انسان کو اس کی خوبیاں دکھا کر اسے اختیار کرنے پر آمادہ کرتا ہے۔ لیکن منکر ایک پردہ ہے جو اس کی آنکھ کو معروف کا جمال دیکھنے سے باز رکھتا ہے۔ اور ایک زنگ ہے جو اسکے آئینۂ قلب کو معروف کا پرتو قبول کرنے کے قابل نہیں رہنے دیتا۔ اس لئے منکر کے پردہ کو ہر ممکن طریقہ سے چاک کرنا اور اسکے زنگ کو ہر ممکن طریقہ سے کھرچ دینا سب سے پہلی اور ضروری تدبیر ہے۔ اسکے بعد اگر کوئی شخص معروف کی دعوت کو قبول کرلے تو اسکے لئے فضائل اخلاق کا ایک بڑا حصہ اختیاری نہیں رہتا۔ بلکہ اجباری ہوجاتا ہے۔ کیونکہ انسانیت کاملہ کے درجہ میں پہنچکر اس کے لئے وہ آسانیاں باقی نہیں رہ سکتیں جو انسانیت محضہ کے درجہ میں اسے حاصل تھیں۔ لیکن اگر یہ زنگ چھوٹ جانے کے بعد اور یہ پردہ اُٹھ جانے کے بعد بھی کوئی آنکھ معروف کا جمال نہ دیکھے اور کوئی قلب اسکا پرتو قبول نہ کرے تو اسلام اسے صرف منکر سے روکنے پر اکتفا کرتا ہے اور آگے اسکا معاملہ خدا پر چھوڑ دیتا ہے کہ چاہے اسے بصیرت عطا کرے چاہے نہ کرے۔ مَنْ يَّشَاِ اللّٰهُ يُضْلِلْهُ وَمَنْ يَّشَاْ يَجْعَلْهُ عَلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ۔

ایک دوسری حیثیت سے امر بالمعروف ونہی عن المنکر کا فرق اُس فرق پر مبنی ہے جو خود اسلام کی دو مختلف حیثیتوں کے درمیان ہے۔ اسلام ایک حیثیت میں تو محض دعوت ہے نیکی اور تقویٰ کی جانب اور دوسری حیثیت میں وہ اللہ کا قانون ہے تمام دنیا کے لئے جب کوئی شخص اسلام قبول کرلیتا ہے تو اسکے لئے یہ دونوں حیثیتیں جمع ہوجاتی ہیں اور دعوت کی دفعات بھی اسکے حق میں قانون کی دفعات

بنجاتی ہیں۔ مگر اسلام نہ قبول کرنے کی صورت میں دعوت الگ رہتی ہے۔ اور قانون الگ۔ دعوت کا منشا یہ ہے کہ انسان اس منصب خلافت کا اہل بنجائے۔ جو اللہ نے اسے زمین پر بھیجتے وقت سپرد کیا تھا اور ان ذمہ داریوں کو پورا کرے جو خلیفۃ اللہ فی الارض کی حیثیت سے اسپر عائد ہوتی ہیں۔ قانون کا منشا یہ ہے کہ انسان اگر منصب خلافت کی خدمات کو انجام نہ دے تو کم ازکم فساد و خونریزی تو نہ کرے جس کا طعنہ فرشتوں نے اسکو دیا تھا۔ اگر وہ اشرف المخلوقات نہ بنے تو کم ازکم ارذل المخلوقات تو نہ بن جائے اگر وہ دنیا کو نیکی و تقویٰ سے روشن نہ کرے تو کم ازکم بدی و شرارت سے اسکے امن و سکون کو تو غارت نہ کرے۔ پہلی چیز باطن کی روشنی اور طبیعت کی صلاحیت پر منحصر ہے جو ظاہر ہے کہ مارے کوٹے سے پیدا نہیں ہوتی۔ لیکن دوسری چیز حدود کی تعیین اور نگہداشت سے تعلق رکھتی ہے جسکا پاس و لحاظ کرنے پر اس کی سرکش طبیعت کو صرف وعظ و تلقین ہی سے آمادہ نہیں کیا جا سکتا۔ بلکہ بعض حالات میں اسے مجبور کرنے کے لئے قوت کا استعمال بھی ضروری ہوتا ہے۔

نہی عن المنکر کا طریقہ

اس مضمون کے بعض پہلو مزید روشنی کے محتاج ہیں جنھیں آگے چلکر ہم ایک دوسرے موقع پر بوضاحت بیان کریں گے۔ یہاں صرف اسقدر بتلانا مقصود ہے کہ اسلام نے غیر مسلم دنیا کو معروف کا حکم کرنے کے لئے تو صرف دعوت و تبلیغ کا طریقہ بتلایا ہے۔ لیکن منکر سے روکنے کے لئے اس کی قید نہیں رکھی۔ بلکہ اس کی مختلف انواع کے لئے مختلف طریقے تجویز کئے ہیں قلب و ذہن کی گندگی اور خیال و رائے کی ناپاکی کو وعظ و تلقین کے ذریعہ سے دور کرنے کی ہدایت کی چنانچہ فرمایا۔

اُدْعُ اِلٰی سَبِیْلِ رَبِّکَ بِالْحِکْمَۃِ وَالْمَوْعِظَۃِ الْحَسَنَۃِ وَجَادِلْھُمْ بِالَّتِیْ ھِیَ اَحْسَنُ (۱۶:۱۶)

اللہ کے راستہ کی طرف حکمت اور عمدہ نصیحت کے ذریعہ بلا۔ اور ان سے ایسے طریقہ پر بحث و مناظرہ کر جو بہترین ہو (یعنی سختی و بدکلامی اس میں نہ ہو)۔

وَلَا تُجَادِلُوْا اَھْلَ الْکِتٰبِ اِلَّا بِالَّتِیْ ھِیَ اَحْسَنُ اِلَّا الَّذِیْنَ ظَلَمُوْا مِنْھُمْ (۲۹:۵)

اور اہل کتاب سے بحث و مناظرہ نہ کر۔ مگر ایسے طریقے سے جو بہترین ہو۔ سوائے ان لوگوں کے جو ان میں ظالم و بدکار ہیں۔

فَقُوْلَا لَهٗ قَوْلًا لَّيِّنًا لَّعَلَّهٗ يَتَذَكَّرُ اَوْ يَخْشٰى (۲۰ : ۲)	پس اس سرکش سے نرم گفتگو کرو شاید کہ وہ نصیحت پکڑے اور اللہ سے ڈرے۔

فعل و عمل کی برائی کو طاقت وقوت کے زور سے روکنے کا حکم دیا۔ چنانچہ اوپر وہ حدیث گذر چکی ہے جس میں حضور نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے ولتأخذن علے ید المسئ ولتطرنہ علے الحق اطرا۔ تم پر لازم ہے کہ بدکار کا ہاتھ پکڑ لو۔ اور اس کو حق کی طرف موڑ دو۔ اسکے علاوہ اور بہت سی احادیث ہیں جن میں منکر کو روکنے کیلئے قوت کے استعمال کا حکم ہے ایک موقع پر حضور نے فرمایا ہے۔

من رای منکم منکرا فلیغیرہ بیدہ فان لم یستطع فبلسانہ فان لم یستطع فبقلبہ وذلك اضعف الایمان (رواہ مسلم)	تم میں سے جو کوئی بدی کو دیکھے تو اسکو ہاتھ سے درست کر دے اگر اس کی قدرت نہ رکھتا ہو۔ تو زبان سے۔ اور اگر اس کی بھی قدرت نہ رکھتا ہو تو دل سے اور یہ ایمان کا ضعیف ترین درجہ ہے

ان احادیث میں ید کا لفظ جسمانی ہاتھ کے معنی میں استعمال نہیں ہوا ہے۔ بلکہ مجازاً قوت کے معنی میں بولا گیا ہے۔ بدکار کا ہاتھ پکڑنے سے مراد دراصل یہ ہے کہ اسکو اسطرح مجبور کر دیا جائے کہ وہ بدی و شرارت کا ارتکاب کر ہی نہ سکے۔ اسی طرح تغییر بالید سے مراد یہ ہے کہ تم اپنی قوت و طاقت کو منکر کے مٹانے اور روکنے میں استعمال کرو۔ ایک اور حدیث میں ہے کہ۔

ان اللہ لا یعذب العامۃ بعمل الخاصۃ حتی یروا المنکر بین ظہرانیہم وھم قادرون علی ان ینکروہ فلا ینکروہ (رواہ احمد)	اللہ عام لوگوں کو خاص لوگوں کے عمل کی سزا اسوقت تک نہیں دے گا جب تک ان میں یہ رواداری پیدا نہ ہو جائے کہ بدی کو اپنے سامنے ہوتے ہوئے دیکھیں۔ اور اسکو روکنے کی قدرت رکھتے ہوں مگر نہ روکیں۔

رسول اللہ کا ارشاد اللہ کے ارشاد کی تفسیر کرتا ہے۔ پس ان احادیث سے قرآن پاک کے حکم نھی عن المنکر کے معنی صاف معلوم ہوتے ہیں کہ اس سے مراد صرف زبان ہی سے منکر کو روکنا اور اسکی برائی بیان کرنا نہیں ہے۔ بلکہ حسب ضرورت بزور وقوت اسکو روک دینا اور دنیا کو اسکے وجود سے پاک کر دینا بھی ہے۔ اور یہ مسلمانوں کی قدرت و استطاعت پر موقوف ہے۔ اگر مسلمانوں میں اتنی قوت

ہو کہ تمام دنیا کو منکر سے روک کر اسے قانون عدل کا مطیع بنالیں تو ان کا فرض ہے کہ اس قوت کو استعمال کریں اور جب تک اس کام کو پایۂ تکمیل تک پہنچا نہ دیں چین نہ لیں لیکن اگر اتنی قوت نہ رکھتے ہوں تو جس حد تک ممکن ہو انہیں اس خدمت کو انجام دینا چاہیے۔ اور تکمیل مدعا کے لئے مزید قوت حاصل کرنے کی کوشش کرنی چاہیئے

فتنہ وفساد کے خلاف جنگ

منکر کی اس دوسری قسم کو جس کے خلاف اسلام میں قوت استعمال کرنے کا حکم دیا گیا ہے پہلی قسم سے ممتاز کرنے اور اسکی نوعیت کو زیادہ واضح کر دینے کے لئے اللہ تعالیٰ نے فتنہ اور فساد سے تعبیر فرمایا ہے چنانچہ ان تمام آیات میں جنمیں منکر کے خلاف جنگ کی اجازت دی گئی ہے یا اس کی ضرورت ظاہر فرمائی گئی ہے یا اسے بزور شمشیر مٹانے کا حکم دیا گیا ہے تم کو منکر کے بجائے یہی فتنہ اور فساد کے الفاظ ملیں گے۔

قَاتِلُوْهُمْ حَتّٰى لَا تَكُوْنَ فِتْنَةٌ ۔	ان سے جنگ کرو یہانتک کہ فتنہ باقی نہ رہے۔
لَوْلَا دَفْعُ اللّٰهِ النَّاسَ بَعْضَهُمْ بِبَعْضٍ لَفَسَدَتِ الْاَرْضُ ۔	اللہ اگر لوگوں کو ایک دوسرے کے ذریعہ دفع نہ کرتا تو زمین فساد سے بھر جاتی۔
اِلَّا تَفْعَلُوْهُ تَكُنْ فِتْنَةٌ فِي الْاَرْضِ وَفَسَادٌ كَبِيْرٌ ۔	اگر تم ایسا نہ کروگے تو زمین میں فتنہ اور بڑا فساد ہوگا،
وَالْفِتْنَةُ اَشَدُّ مِنَ الْقَتْلِ ۔	اور فتنہ قتل سے زیادہ بری چیز ہے،
مَنْ قَتَلَ نَفْسًا بِغَيْرِ نَفْسٍ اَوْ فَسَادٍ فِي الْاَرْضِ فَكَاَنَّمَا قَتَلَ النَّاسَ جَمِيْعًا	جو کوئی کسی شخص کو بغیر اس قصور کے قتل کرے کہ اسنے کسی کی جان لی ہو یا زمین میں فساد پھیلایا ہو تو گویا اس نے تمام انسانوں کو قتل کر دیا
لَقَدِ ابْتَغَوُا الْفِتْنَةَ ۔	انھوں نے فتنہ پھیلانا چاہا۔
كُلَّمَا رُدُّوْا اِلَى الْفِتْنَةِ اُرْكِسُوْا فِيْهَا	جب فتنہ کیطرف واپس جاتے ہیں تو سیمیں خود بھی شامل ہوجاتے ہیں

ان تمام آیات میں اسی منکر کو فتنہ اور فساد کے الفاظ سے تعبیر کیا گیا ہے درحقیقت یہ ہے کہ تمام منکرات میں یہ فتنہ وفساد ہی ایک چیز ہے جس کا استیصال بغیر تلوار کے نہیں ہوسکتا۔

فتنہ کی تحقیق

عام طور پر فتنہ وفساد کے معنی یہ سمجھے جاتے ہیں کہ کسی بات پر دو جماعتوں میں جھگڑا ہو جائے، پہلے گالم گلوچ ہو پھر فریقین کے مستعد آدمی اینٹ پتھر یا لاٹھی پونگے، یا تلوار بندوق سے مسلح ہو کر میدان میں کود پڑیں۔ ایک دوسرے کے سر پھوڑیں اور خوب قتل وغارت کر کے آتش غضب کو ٹھنڈا کر لیں۔ اگرچہ فتنہ وفساد کا اطلاق اس مشغلہ پر بھی ہوتا ہے لیکن قرآنی اصطلاح میں ان الفاظ کا مفہوم اسقدر تنگ نہیں ہے بلکہ اور بہت سے اخلاقی جرائم بھی ان کے تحت آتے ہیں جن کی تفصیل دوسری کتابوں میں تلاش کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ خود قرآن ہمکو بتائیگا کہ اس کی مراد فتنہ وفساد سے کیا ہے۔

لغت میں فتن کہتے ہیں سونے کو تپا کر اسکا میل چھانٹ دینے کو۔ اسی لغوی معنی کے اعتبار سے یہ لفظ انسان کے آگ میں ڈالے جانے پر بولا جاتا ہے۔ جیسا کہ قرآن مجید میں آیا ہے یَوْمَ هُمْ عَلَى النَّارِ يُفْتَنُونَ (جس روز وہ آگ پر بھونے جائینگے) اور پھر مجازاً اس سے ہر وہ چیز مراد لی گئی ہے جو انسان کو دکھ اور مصیبت اور آزمایش میں ڈالنے والی ہو۔ چنانچہ مال ودولت اور اہل وعیال کو بھی فتنہ کہا کہ وہ انسان کو حق سے غافل کر کے غلط کاریوں میں مبتلا کر دیتی ہے وَاعْلَمُوا أَنَّمَا أَمْوَالُكُمْ وَأَوْلَادُكُمْ فِتْنَةٌ اور راحت ومصیبت کو بھی جو اللہ کی طرف سے ہے فتنہ کہا کہ وہ آزمایش ہے انسان کے لئے۔ وَنَبْلُوكُمْ بِالشَّرِّ وَالْخَيْرِ فِتْنَةً۔ قدرتی حالات کے تغیر اور انسان پر ان کے اثرات کو بھی فتنہ کہا کہ ان کے مصائب سے آدمی کو عبرت حاصل ہوتی ہے أَوَلَا يَرَوْنَ أَنَّهُمْ يُفْتَنُونَ فِي كُلِّ عَامٍ مَرَّةً أَوْ مَرَّتَيْنِ ثُمَّ لَا يَتُوبُونَ وَلَا هُمْ يَذَّكَّرُونَ (کیا نہیں دیکھتے کہ وہ ہر سال ایک یا دو مرتبہ آزمایش میں ڈالے جاتے ہیں۔ مگر پھر بھی توبہ نہیں کرتے اور نہ نصیحت حاصل کرتے ہیں) کسی کی طاقت سے زیادہ اسپر بار ڈالنے کو بھی فتنہ کہتے ہیں کہ وہ اسکے لئے تکلیف کا موجب ہوتا ہے وَمِنْهُمْ مَنْ يَقُولُ ائْذَنْ لِي وَلَا تَفْتِنِّي (اور کوئی ان میں سے کہتا ہے کہ مجھے قیام کی اجازت دیدے اور تکلیف وپریشانی میں مبتلا نہ کر) خالص کفر کے معنی میں بھی استعمال کیا ہے کیونکہ وہ انجام کار انسان کو دکھ اور مصیبت میں مبتلا کرتا ہے۔ يَوْمَ هُمْ عَلَى النَّارِ يُفْتَنُونَ۔ ذُوقُوا فِتْنَتَكُمْ هَٰذَا الَّذِي كُنْتُمْ بِهِ تَسْتَعْجِلُونَ۔ (جس دن وہ آگ پر بھونے جائینگے اور ان سے کہا جائے گا۔ کہ اپنے کفر کا مزہ چکھو۔ یہ وہی چیز ہے جسکے لئے تم جلدی کر رہے تھے) لیکن قوت کے زور سے جس فتنہ کو مٹانے کا حکم دیا گیا ہے اس سے یہ وسیع المعنی

فتنہ مراد نہیں ہے۔ بلکہ وہ فتنہ ہے جو اپنی حدود سے تجاوز کرنے والوں کی سرکشی سے بندگان خدا کی اخلاقی و روحانی اور مادی زندگی پر تباہی لاتا ہے اور اس کی مختلف صورتیں قرآن مجید میں بیان کی گئی ہیں۔

(۱) کمزوروں پر ظلم و ستم کرنا، ان کے جائز حقوق سلب کرنا، ان کے گھر بار چھین لینا، اور انہیں تکلیفیں پہنچانا، چنانچہ فرمایا:۔

ثُمَّ اِنَّ رَبَّكَ لِلَّذِيْنَ هَاجَرُوْا مِنْۢ بَعْدِ مَا فُتِنُوْا ثُمَّ جٰهَدُوْا وَصَبَرُوْٓا (۱۶:۱۴)

پھر تیرا رب ان لوگوں کے لئے جو بہت دکھ دیئے جانے کے بعد گھر بار چھوڑ کر نکل گئے۔ اور جنھوں نے حق کی خاطر سخت جد و جہد کی۔ اور راہ حق میں ثابت قدم رہے (مغفرت کرنیوالا ہے)

وَاِخْرَاجُ اَهْلِهٖ مِنْهُ اَكْبَرُ عِنْدَ اللّٰهِ وَالْفِتْنَةُ اَكْبَرُ مِنَ الْقَتْلِ (۲:۲۷)

(حرمت والے مہینوں میں جنگ کرنا یقینا مسجد حرام کی حق تلفی ہے) لیکن اس کے باشندوں کو وہاں سے نکالنا اللہ کے نزدیک اس سے زیادہ برا ہے۔ اور یہ فتنہ قتل سے زیادہ بری چیز ہے۔

اِنَّ الَّذِيْنَ فَتَنُوا الْمُؤْمِنِيْنَ وَالْمُؤْمِنٰتِ ثُمَّ لَمْ يَتُوْبُوْا فَلَهُمْ عَذَابُ جَهَنَّمَ وَلَهُمْ عَذَابُ الْحَرِيْقِ (۸۵:۱)

جن لوگوں نے مومن مردوں اور عورتوں پر ظلم و ستم کئے اور اس گناہ سے توبہ نہ کی ان کے لئے دوزخ اور آتش دوزخ میں جلائے جانے کی سزا ہے۔

اَخْرِجُوْهُمْ مِّنْ حَيْثُ اَخْرَجُوْكُمْ وَالْفِتْنَةُ اَشَدُّ مِنَ الْقَتْلِ (۲:۲۴)

انہیں نکالو جہاں سے انھوں نے تمہیں نکالا ہے۔ کیونکہ فتنہ قتل سے زیادہ بری چیز ہے۔

(۲) جبر و استبداد کی بنا پر حق کو دبانا، اور قبول حق سے لوگوں کو روکنا۔ چنانچہ سورہ یونس میں فرمایا ہے کہ:۔

فَمَآ اٰمَنَ لِمُوْسٰٓى اِلَّا ذُرِّيَّةٌ مِّنْ قَوْمِهٖ عَلٰى خَوْفٍ مِّنْ فِرْعَوْنَ وَمَلَا۟ئِهِمْ اَنْ يَّفْتِنَهُمْ (۱۰:۹)

پس موسیٰ پر ان کی قوم میں سے کوئی ایمان نہ لایا۔ سوائے ایک قلیل جماعت کے کیونکہ انہیں فرعون اور اپنے سرداروں سے جو فرعون کے خوشامدی تھے، خوف تھا کہ انہیں عذاب میں مبتلا کر دیں گے۔

(۳) صد عن سبیل اللہ جس کی تشریح گذشتہ باب میں کی جا چکی ہے۔ چنانچہ سورہ انفال میں پہلے تو کافروں کا یہ جرم بتایا ہے کہ وہ صد عن سبیل اللہ کی کوشش کرتے ہیں اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا يُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَهُمْ لِيَصُدُّوْا عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ پھر ان کے مغلوب ہونے کی پیش گوئی کی ہے (ثم یغلبون) اور اسکے بعد انکے اسی فعل کو فتنہ قرار دیکر جنگ کا حکم دیا ہے وَقَاتِلُوْهُمْ حَتّٰى لَا تَكُوْنَ فِتْنَةٌ وَّيَكُوْنَ الدِّيْنُ كُلُّهٗ لِلّٰهِ۔

(۴) لوگوں کو گمراہ کرنا اور حق کے خلاف خدع و فریب اور طمع و اکراہ کی کوششیں کرنا چنانچہ فرمایا

وَاِنْ كَادُوْا لَيَفْتِنُوْنَكَ عَنِ الَّذِيْٓ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ لِتَفْتَرِيَ عَلَيْنَا غَيْرَهٗ وَاِذًا لَّاتَّخَذُوْكَ خَلِيْلًا (۱۷: ۸)

اور انہوں نے ارادہ کر لیا تھا کہ تجھے طمع و اکراہ کے ذریعہ اس وحی سے پھیر دیں جو ہم نے تیری طرف بھیجی ہے تاکہ تو اسے چھوڑ کر ہم پر افترا باندھنے لگے (اگر تو ایسا کرتا) تو اسوقت وہ تجھے دوست بنا لیتے

فَاِنَّكُمْ وَمَا تَعْبُدُوْنَ مَآ اَنْتُمْ عَلَيْهِ بِفٰتِنِيْنَ اِلَّا مَنْ هُوَ صَالِ الْجَحِيْمِ (۳۷: ۵)

یقین رکھو کہ تم اور تمہارے معبودان باطل جنھیں تم پوجتے ہو کسی کو گمراہ نہیں کر سکتے۔ سوائے اس شخص کے جو خود ہی دوزخ کی طرف جانے والا ہے۔

وَاحْذَرْهُمْ اَنْ يَّفْتِنُوْكَ عَنْ بَعْضِ مَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ اِلَيْكَ اَفَحُكْمَ الْجَاهِلِيَّةِ يَبْغُوْنَ (۵: ۷)

اور ان سے بچ کہ کہیں تجھے ان احکام میں سے کسی سے نہ پھیر دیں جو اللہ نے تیرے اوپر اتارے ہیں کیا وہ جاہلیت کا فیصلہ چاہتے ہیں

(۵) غیر حق کے لئے جنگ کرنا۔ اور ناجائز اغراض کے لیے قتل و خون اور جتھہ بندی کرنا چنانچہ فرمایا:

وَلَوْ دُخِلَتْ عَلَيْهِمْ مِّنْ اَقْطَارِهَا ثُمَّ سُئِلُوا الْفِتْنَةَ لَاٰتَوْهَا وَمَا تَلَبَّثُوْا بِهَآ اِلَّا يَسِيْرًا (۳۳: ۲)

اور جنگ احزاب میں اگر دشمن مدینہ کے اندر گھس آتے اور ان (منافقین) سے قتل و غارت کے فتنہ میں شریک ہونے کی درخواست کی جاتی تو یہ ضرور اسمیں جا ملتے اور ذرا تامل نہ کرتے

سَتَجِدُوْنَ اٰخَرِيْنَ يُرِيْدُوْنَ اَنْ يَّاْمَنُوْكُمْ وَيَاْمَنُوْا قَوْمَهُمْ كُلَّمَا رُدُّوْٓا اِلَى الْفِتْنَةِ اُرْكِسُوْا فِيْهَا

تم (منافقوں) میں سے کچھ دوسرے لوگ پاؤ گے جو تم سے بھی امن میں رہنا چاہتے ہیں اور اپنی قوم سے بھی مگر جب فتنہ کی طرف واپس جاتے ہیں تو اس میں اوندھے گر جاتے ہیں (یعنی خود بھی فتنہ برپا کرنیوالوں کے ساتھ شریک ہو جاتے ہیں)

(۶) پیروانِ حق پر باطل پرستوں کا غلبہ

اِلَّا تَفْعَلُوْهُ تَكُنْ فِتْنَةٌ فِي الْاَرْضِ وَفَسَادٌ كَبِيْرٌ (۸: ۱۰)	اگر تم پیروانِ حق کی مدد نہ کرو گے۔ تو زمین میں فتنہ اور بڑا فساد برپا ہوگا۔ (یعنی غلبہ باطل سے حق پرستوں پر زمین تنگ ہو جائے گی۔)

فساد کی تحقیق

اب دیکھیے کہ قرآن مجید میں فساد کس معنی میں استعمال کیا گیا ہے۔

لغت میں فساد کہتے ہیں کسی چیز کے حدِ اعتدال سے نکل جانے کو اور صلاح اس کی ضد ہے۔ لغوی معنی کے اعتبار سے تو ہر وہ فعل جو عدل و صلح کے خلاف ہے۔ فساد ہے۔ لیکن عموماً اسکا اطلاق بدکاری کی شدت و کثرت پر ہوتا ہے۔ اور اللہ تعالیٰ نے اسی کو بزور مٹانے کا حکم دیا ہے۔

قرآن مجید میں یہ لفظ خاص طور پر فرعون، عاد اور ثمود کے متعلق استعمال ہوا ہے چنانچہ فرمایا:-

اَلَمْ تَرَ كَيْفَ فَعَلَ رَبُّكَ بِعَادٍ اِرَمَ ذَاتِ الْعِمَادِ الَّتِيْ لَمْ يُخْلَقْ مِثْلُهَا فِي الْبِلَادِ وَثَمُوْدَ الَّذِيْنَ جَابُوا الصَّخْرَ بِالْوَادِ وَفِرْعَوْنَ ذِي الْاَوْتَادِ الَّذِيْنَ طَغَوْا فِي الْبِلَادِ فَاَكْثَرُوْا فِيْهَا الْفَسَادَ (۸۹: ۱۱)	کیا نہیں دیکھا تو نے کہ تیرے رب نے کیا کیا ستونوں والے عادِ ارم کے ساتھ جن کے مثل ملکوں میں کوئی پیدا نہیں کیا گیا اور ثمود کے ساتھ جنھوں نے وادی میں پتھر تراشے اور لشکر والے فرعون کے ساتھ۔ ان لوگوں نے ملکوں میں سرکشی کی اور ان میں بہت فساد پھیلایا۔

قرآن مجید میں فرعون، عاد اور ثمود کے ان تمام اعمال کی تشریح ملتی ہے جنھیں فساد سے تعبیر کیا گیا ہے۔

(۱) فرعون کے متعلق فرمایا کہ وہ متکبر تھا۔ اپنی رعیت کے درمیان نسلی امتیاز قائم کرتا اور ان میں پھوٹ ڈالکر ان پر حکومت کرتا تھا۔ اور کمزوروں کو ناحق قتل و غارت کرتا تھا۔

اِنَّ فِرْعَوْنَ عَلَا فِي الْاَرْضِ وَجَعَلَ اَهْلَهَا شِيَعًا يَّسْتَضْعِفُ طَائِفَةً مِّنْهُمْ يُذَبِّحُ اَبْنَاءَهُمْ وَيَسْتَحْيِيْ نِسَاءَهُمْ اِنَّهُ كَانَ مِنَ	فرعون نے زمین میں تکبر کیا تھا اور باشندوں کو فرقوں میں تقسیم کر دیا۔ اور ایک جماعت کو کمزور کر کے ان کے لڑکوں کو ذبح کرتے تھے۔ اور ان کی عورتوں کو زندہ رکھنے دیتے تھے

مُفْسِدِيْنَ (۲۸ : ۱) | وہ مفسدوں میں سے تھا۔

وہ قبول حق سے لوگوں کو جبراً باز رکھتا تھا۔ چنانچہ جب حضرت موسیٰ کا معجزہ دیکھکر جادوگر ایمان لے آئے تو اس نے کہا:-

اٰمَنْتُمْ لَهٗ قَبْلَ اَنْ اٰذَنَ لَكُمْ ۚ اِنَّهٗ لَكَبِيْرُكُمُ الَّذِيْ عَلَّمَكُمُ السِّحْرَ ۚ فَلَاُقَطِّعَنَّ اَيْدِيَكُمْ وَاَرْجُلَكُمْ مِّنْ خِلَافٍ وَّلَاُصَلِّبَنَّكُمْ فِيْ جُذُوْعِ النَّخْلِ ۡ وَلَتَعْلَمُنَّ اَيُّنَآ اَشَدُّ عَذَابًا وَّاَبْقٰى (۲۰:۳)	تم اسپر ایمان لے آئے قبل اسکے کہ میں تمہیں اجازت دیتا یقیناً وہ تمہارا سردار ہے اور اسی نے تمہیں یہ جادو سکھایا ہے پس اب میں تمہارے ہاتھ پاؤں مخالف سمتوں سے کٹواؤنگا اور تمہیں کھجور کے تنوں پر صلیب دوں گا۔ اور تم دیکھلوگے کہ ہم میں سے کون زیادہ سخت اور دیرپا عذاب دینے والا ہے۔

اس نے ایک قوم کو کمزور پاکر اپنا غلام بنالیا تھا۔ چنانچہ جب اسنے حضرت موسیٰؑ پر احسان جتایا تو آپ نے جواب دیا کہ:-

وَتِلْكَ نِعْمَةٌ تَمُنُّهَا عَلَيَّ اَنْ عَبَّدْتَّ بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ (۲۶:۲)	اور تیری وہ نعمت جسکا تو مجھ پر احسان جتا رہا ہے یہ ہے کہ تونے میری قوم بنی اسرائیل کو غلام بنالیا ہے۔

وہ اپنی قوت کے نشہ میں اپنے جیسے انسانوں کا خدا بنتا تھا اور محض طاقت کے حق کی بنا پر حکومت و پادشاہی کرتا تھا۔ حالانکہ اصلی حق عدل و انصاف اور خدا ترسی کا حق ہے۔

وَقَالَ فِرْعَوْنُ يٰٓاَيُّهَا الْمَلَاُ مَا عَلِمْتُ لَكُمْ مِّنْ اِلٰهٍ غَيْرِيْ ...... وَاسْتَكْبَرَ هُوَ وَجُنُوْدُهٗ فِي الْاَرْضِ بِغَيْرِ الْحَقِّ وَظَنُّوْٓا اَنَّهُمْ اِلَيْنَا لَا يُرْجَعُوْنَ (۲۸:۴)	اس نے کہا کہ اے لوگو میں تو اپنے سوا تمہارے کسی خدا کو نہیں جانتا .... اس نے اور اسکے لشکروں نے زمین میں بغیر کسی حق کے بڑائی کی اور سمجھ بیٹھے کہ گویا انہیں کبھی ہمارے پاس واپس آنا ہی نہیں ہے۔

اس نے اپنی رعایا کی اخلاقی حالت کو بگاڑ کر اتنا ذلیل کر دیا تھا کہ وہ اسکی غلامانہ اطاعت پر راضی ہوگئی:-

فَاسْتَخَفَّ قَوْمَهٗ فَاَطَاعُوْهُ ۚ اِنَّهُمْ كَانُوْا قَوْمًا فٰسِقِيْنَ (۴۳:۵)	اس نے اپنی قوم میں جہالت و کمینگی پیدا کی جس کے باعث انہوں نے اس کی اطاعت اختیار کی۔ یقیناً وہ بدکار قوم تھی۔

اُس کی حکومت کی بنیاد ناجائز اور غلط قوانین پر قائم تھی

فَاتَّبَعُوْٓا اَمْرَ فِرْعَوْنَ وَمَآ اَمْرُ فِرْعَوْنَ بِرَشِيْدٍ (۱۱:۹)

ان لوگوں نے فرعون کے احکام کی تعمیل کی۔ حالانکہ فرعون کا حکم راستی پر نہ تھا۔

(۲) اسی طرح عاد کا جرم یہ بتایا گیا کہ وہ جابر و سرکش حاکموں کی پیروی کرتے تھے۔

وَاتَّبَعُوْٓا اَمْرَ كُلِّ جَبَّارٍ عَنِيْدٍ (۱۱:۶)

انہوں نے ہر جبار دشمن حق کے حکم کی پیروی کی۔

وہ جابر و ظالم تھے۔ اور عدل و انصاف سے انہیں واسطہ نہ تھا۔ چنانچہ حضرت ہودؑ انہیں ملامت کرتے ہوئے کہتے ہیں۔

وَاِذَا بَطَشْتُمْ بَطَشْتُمْ جَبَّارِيْنَ (۲۶:۷)

جب تم کسی کی گرفت کرتے ہو تو جبر کے ساتھ کرتے ہو۔ (یعنی حق و انصاف کے ساتھ نہیں کرتے)

وہ اپنی قوت کے گھمنڈ میں بغیر کسی حق کے کمزور قوموں پر حکومت قائم کرتے تھے۔

فَاسْتَكْبَرُوْا فِي الْاَرْضِ بِغَيْرِ الْحَقِّ وَقَالُوْا مَنْ اَشَدُّ مِنَّا قُوَّةً (۴۱:۲)

انہوں نے زمین میں حق کے خلاف تکبر کیا۔ اور کہا کہ ہم سے زیادہ طاقت والا کون ہو سکتا ہے۔

(۳) ثمود کے مفسدانہ اعمال کی تشریح قرآن مجید میں یہ ملتی ہے کہ ان کے حاکم اور سردار ظالم و بدکار تھے۔ اور وہ لوگ انہی سرداروں کی اطاعت کرتے تھے۔ چنانچہ حضرت صالحؑ ان کو نصیحت کرتے ہیں۔

وَلَا تُطِيْعُوْٓا اَمْرَ الْمُسْرِفِيْنَ الَّذِيْنَ يُفْسِدُوْنَ فِي الْاَرْضِ وَلَا يُصْلِحُوْنَ (۲۶:...)

تم ان حد سے گذر جانے والوں کے حکم کی اطاعت نہ کرو۔ جو زمین میں فساد پھیلاتے ہیں اور اصلاح نہیں کرتے۔

وہ ایسے سرکش تھے کہ ایک حق گو انسان کو بے قصور قتل کرنے کے لئے آمادہ ہو گئے تھے اور اس ظالمانہ فعل کے ارتکاب کے لئے کذب و فریب کے بدترین حیلے اختیار کرنے میں بھی انہیں باک نہ تھا۔

وَكَانَ فِي الْمَدِيْنَةِ تِسْعَةُ رَهْطٍ يُّفْسِدُوْنَ فِي الْاَرْضِ وَلَا يُصْلِحُوْنَ قَالُوْا تَقَاسَمُوْا بِاللّٰهِ لَنُبَيِّتَنَّهٗ وَاَهْلَهٗ ثُمَّ لَنَقُوْلَنَّ لِوَلِيِّهٖ مَا شَهِدْنَا مَهْلِكَ اَهْلِهٖ وَاِنَّا لَصٰدِقُوْنَ (۲۷:۴...)

اور اس شہر میں ۹ آدمی جتھوں کے سردار تھے۔ جو زمین میں فساد پھیلاتے تھے اور اصلاح نہ کرتے تھے انہوں نے کہا۔ یار و قسم کھاؤ کہ رات صالح اور اسکے گھر والوں پر چھاپہ ماریں گے اور پھر اسکے وارث سے کہدیں گے کہ ہم کو اس کی اور اسکے گھر والوں کی ہلاکت کا کچھ حال معلوم نہیں اور ہم بالکل سچ بولتے ہیں۔

۴۔ قرآن مجید میں قوم لوط کو بھی مفسد کہا گیا ہے اور اسکے فساد کی تشریح اس طرح کی ہے۔

اَتَاْتُوْنَ الْفَاحِشَةَ مَا سَبَقَكُمْ بِهَا مِنْ اَحَدٍ مِّنَ الْعٰلَمِيْنَ اَئِنَّكُمْ لَتَاْتُوْنَ الرِّجَالَ وَتَقْطَعُوْنَ السَّبِيْلَ وَتَاْتُوْنَ فِیْ نَادِيْكُمُ الْمُنْكَرَ (۲۹:۲۹)	تم وہ بدکاری کرتے ہو جو دنیا میں تم سے پہلے کسی نے نہیں کی۔ کیا تم مردوں کے پاس جاتے ہو رہزنی کرتے ہو اور اپنی مجلسوں میں بُرے کام کرتے ہو۔

اس سے معلوم ہوا کہ حضرت لوطؑ کی قوم مردوں سے وہ فعل کرتی تھی جو وضع فطرت کے خلاف تھا اور راستوں میں ڈاکے ڈالتی تھی اس وجہ سے عوام میں اسقدر بے حیائی بڑھ گئی تھی کہ مجلسوں میں علانیہ بدکاریاں کرتے تھے اور یہی ان کے وہ اعمال تھے جنہیں فساد سے تعبیر کیا گیا۔

۵۔ مدین کے لوگ بھی مفسد کہے گئے ہیں۔ اور حضرت شعیبؑ کی زبان سے انہیں اسطرح نصیحت کی جاتی ہے:۔

فَاَوْفُوا الْكَيْلَ وَالْمِيْزَانَ وَلَا تَبْخَسُوا النَّاسَ اَشْيَآءَهُمْ وَلَا تُفْسِدُوْا فِی الْاَرْضِ بَعْدَ اِصْلَاحِهَا ذٰلِكُمْ خَيْرٌ لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ وَلَا تَقْعُدُوْا بِكُلِّ صِرَاطٍ تُوْعِدُوْنَ وَتَصُدُّوْنَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ مَنْ اٰمَنَ بِهٖ وَتَبْغُوْنَهَا عِوَجًا (۷:۱۱)	پس ناپ تول کو پورا کرو۔ ترازو میں ٹھیک تولو۔ لوگوں کو چیزیں گھٹا کر نہ دو۔ اور زمین کی اصلاح کے بعد اس میں فساد نہ پھیلاؤ یہ تمہارے لئے اچھا ہے۔ اگر تم ایماندار ہو۔ اور راستوں پر بیٹھکر لوگوں کو نہ ڈراؤ۔ (یعنی رہزنی نہ کرو۔ تم اللہ کے راستہ سے ان لوگوں کو روکتے ہو۔ جو ایمان لائے ہیں۔ اور اُسے ٹیڑھا کرنا چاہتے ہو۔

پھر جب حضرت شعیبؑ نے انہیں نیکوکاری کی ہدایت کی تو انہوں نے کہا کہ:۔

وَلَوْلَا رَهْطُكَ لَرَجَمْنٰكَ وَمَآ اَنْتَ عَلَيْنَا بِعَزِيْزٍ۔ (۱۱:۸)	اگر تیری برادری کے لوگ نہ ہوتے تو ہم تجھے پتھراؤ کرکے مار ڈالتے۔ تو ہم پر غالب نہیں ہو سکتا۔

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ مدین والوں کا فساد یہ تھا کہ وہ عام طور پر خائن تھے۔ ان کے تجارتی کاروبار میں بے ایمانی بہت بڑھ گئی تھی۔ راستوں پر ڈاکے ڈالتے تھے۔ ایمان داروں کو راہ الٰہی سے روکتے اور انہیں گمراہ کرتے تھے اور انہیں حق سے اسقدر دشمنی تھی کہ ایک نیکوکاری کی طرف بلانے والے آدمی کو سنگسار کرنے کے لئے آمادہ ہو گئے تھے۔

اسکے علاوہ چوری کو بھی فساد سے تعبیر کیا گیا ہے۔ چنانچہ حضرت یوسفؑ کے بھائیوں پر جب گلاس

چرانے کا الزام رکھا گیا تو انھوں نے کہا کہ تَاللّٰهِ لَقَدْ عَلِمْتُمْ مَّا جِئْنَا لِنُفْسِدَ فِي الْأَرْضِ وَمَا كُنَّا سَارِقِينَ (۱۲: ۷۳) خدا کی قسم تم جانتے ہو کہ ہم زمین میں فساد پھیلانے نہیں آئے اور ہم چور نہیں ہیں۔

(۷) بادشاہوں کی ملک گیری ہی جو تباہی پھیلتی ہے اور اسکے اثر سے مفتوح قوموں کے اخلاق میں جو دنائت پیدا ہو جاتی ہے اسکو فساد کہا گیا ہے۔ چنانچہ حضرت سلیمانؑ کا خط وصول ہونے پر ملکہ سبا اپنے درباریوں سے کہتی ہے۔ إِنَّ الْمُلُوكَ إِذَا دَخَلُوا قَرْيَةً أَفْسَدُوهَا وَجَعَلُوا أَعِزَّةَ أَهْلِهَا أَذِلَّةً وَكَذَٰلِكَ يَفْعَلُونَ (۲۷: ۳۴) بادشاہ جب کسی بستی میں داخل ہوتے ہیں تو اسے فساد سے بھر دیتے ہیں اسکے عزت والوں کو ذلیل کر دیتے ہیں اور وہ ایسی ہی حرکتیں کرتے ہیں۔

(۸) بدعہدی و غابازی اور انسانیت، تعلقات، اخوت و ہمدردی و محبت کو قطع کرنا بھی فساد سے تعلق رکھتا ہے۔ چنانچہ ارشاد ہوتا ہے کہ:

وَالَّذِينَ يَنقُضُونَ عَهْدَ اللَّهِ مِن بَعْدِ مِيثَاقِهِ وَيَقْطَعُونَ مَا أَمَرَ اللَّهُ بِهِ أَن يُوصَلَ وَيُفْسِدُونَ فِي الْأَرْضِ أُولَٰئِكَ لَهُمُ اللَّعْنَةُ وَلَهُمْ سُوءُ الدَّارِ (۱۳: ۲۵)

جو لوگ اللہ کے عہد کو مضبوط باندھنے کے بعد توڑ دیتے ہیں اور ان تعلقات کو قطع کرتے ہیں جنہیں جوڑنے کا اللہ نے حکم دیا ہے اور زمین میں فساد پھیلاتے ہیں انہی پر اللہ کی لعنت ہے۔ اور وہی ہیں جن کے لئے برا ٹھکانا ہے۔

+

يقطعون ما امر الله به ان يوصل کے معنی عام مفسرین نے بہت محدود دئیے ہیں وہ اکثر صرف قطع رحم کے معنی ہی لیتے ہیں۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ اس سے وہ تمام جائز تعلقات مراد ہیں۔ جو مختلف تمدنی اور عمرانی حیثیات سے بنی نوع انسانی کے افراد اور جماعتوں میں قائم ہوتے ہیں۔ مثلاً عزیزوں اور رشتہ داروں کے تعلقات میاں اور بیوی کے تعلقات۔ دوستوں اور ہمسایوں کے تعلقات، مختلف قوموں اور جماعتوں کے تعلقات، مختلف ملکوں اور حکومتوں کے تعلقات۔ چونکہ یہی روابط انسانی تمدن کی بنیاد ہیں انہی کے بہترین طریقے سے قائم رہنے پر دنیا کے امن و خوشحالی کا انحصار ہے اور انہی کو منافرت اور عداوت سے بدل کر قطع کرنے سے دنیا میں لڑائی جھگڑے پھیلتے ہیں۔ اور خاندانوں بستیوں اور ملکوں پر تباہی نازل ہوتی ہیں اس لئے اللہ تعالیٰ نے ان کے قطع کرنے کو فساد سے تعبیر کیا اور اس پر لعنت کی وعید فرمائی۔

(۹) اُس طرزِ حکومت کو بھی فساد سے تعبیر کیا گیا ہے۔ جس کے ماتحت رعایا کی اصلاح اور رفاہ وحال ہونے کے بجائے تباہی و بربادی ہو۔ اس کے وسائل ثروت مٹائے جائیں۔ اور اس کو بے گناہ قتل وغارت کیا جائے۔ چنانچہ فرمایا۔ وَإِذَا تَوَلَّىٰ سَعَىٰ فِي الْأَرْضِ لِيُفْسِدَ فِيهَا وَيُهْلِكَ الْحَرْثَ وَالنَّسْلَ وَاللَّهُ لَا يُحِبُّ الْفَسَادَ (۲: ۲۵) اور جب وہ حاکم بنتا ہے تو زمین میں فساد پھیلانے کی کوشش کرتا ہے اور کھیتیوں اور نسلوں کو تباہ کرتا ہے اور اللہ فساد کو ہرگز پسند نہیں کرتا۔

(۱۰) صدعن سبیل اللہ کے لئے بھی جس کی تشریح اوپر گذر چکی ہے۔ فساد کا لفظ استعمال کیا ہے، چنانچہ فرمایا الَّذِينَ كَفَرُوا وَصَدُّوا عَن سَبِيلِ اللَّهِ زِدْنَاهُمْ عَذَابًا فَوْقَ الْعَذَابِ بِمَا كَانُوا يُفْسِدُونَ (۱۶: ۱۲) جن لوگوں نے کفر اختیار کیا اور اللہ کے راستہ سے روکا۔ ان پر ہم اس فساد کے باعث جو وہ کرتے تھے عذاب پر عذاب نازل کریں گے۔

(۱۱) سورۂ مائدہ میں جن لوگوں کی طرف فساد کو نسبت دی گئی ہے کہ وَيَسْعَوْنَ فِي الْأَرْضِ فَسَادًا وہ زمین میں فساد پھیلانے کی کوشش کرتے ہیں۔ اور جن کے متعلق فرمایا ہے کہ وَاللَّهُ لَا يُحِبُّ الْمُفْسِدِينَ اللہ مفسدوں کو پسند نہیں کرتا ان کی خصوصیات یہ بیان کی ہیں۔

وَتَرَىٰ كَثِيرًا مِّنْهُمْ يُسَارِعُونَ فِي الْإِثْمِ وَالْعُدْوَانِ وَأَكْلِهِمُ السُّحْتَ لَا ... وَأَلْقَيْنَا بَيْنَهُمُ الْعَدَاوَةَ وَالْبَغْضَاءَ إِلَىٰ يَوْمِ الْقِيَامَةِ كُلَّمَا أَوْقَدُوا نَارًا لِّلْحَرْبِ أَطْفَأَهَا اللَّهُ (۵: ۹)	اور تو ان میں سے اکثر کو دیکھے گا کہ وہ گناہ اور حد سے تجاوز کرنے میں اور حرام کا مال کھانے میں جلدی کرتے ہیں ✕ اور ہم نے ان کے درمیان بغض و عداوت کا بیج قیامت تک کے لئے ڈال دیا۔ اور جب کبھی انہوں نے جنگ کیلئے آگ بھڑکائی ہم نے اسے بجھا دیا۔

اس سے معلوم ہوا کہ اثم یعنی وہ گناہ جو آدمی کے ذاتی اخلاق کو غارت کرتے ہیں اور عدوان یعنی وہ گناہ جن کا برا اثر دوسروں پر بھی پڑتا ہے اور اکل سحت یعنی رشوت اور سود خواری جیسے ناجائز طریقوں سے لوگوں کے مال کھانا اور نفسانی اغراض کے لئے باہم بغض و عداوت رکھنا اور ان کی خاطر جنگ کی آگ بھڑکانا یہ سب اعمال فساد ہیں۔



فتنہ و فساد کو مٹانے کیلئے حکومت الٰہی کی ضرورت

اس تشریح سے اچھی طرح معلوم ہوگیا کہ قرآن مجید کی زبان میں **فتنہ** اور **فساد** کے کیا معنی ہیں۔ اب اگر ان تمام برائیوں پر دوبارہ ایک غائر نظر ڈالی جائے جن کو فتنہ و فساد سے تعبیر کیا گیا ہے، تو اس سے یہ حقیقت واضح ہوجائے گی۔ کہ وہ سب کی سب ایک ناحق شناس، ناخدا ترس، اور ظالم و جابر حکومت سے پیدا ہوتی ہیں۔ اور اگر کسی برائی کی پیدائش میں ایسی حکومت کا براہ راست کوئی اثر نہیں ہوتا تو اس کا باقی رہنا اور اصلاح کے اثر سے محفوظ ہونا یقیناً اسی کے باطل پرور اثرات کا رہین منت ہوتا ہے۔ اول تو ایسی حکومت فی نفسہٖ ایک فتنہ ہے۔ کیونکہ وہ حکومت کے منشائے اصلی کے خلاف ہوتی ہے۔ مگر اس کی برائی کسی ایک دائرہ تک محدود نہیں رہتی۔ بلکہ وہ تمام برائیوں کا سرچشمہ اور فتنہ و فساد کے تمام اصول و فروع کا منبع بن جاتی ہے۔ اسی سے صد عن سبیل اللہ ہوتا ہے اسی سے حق و انصاف کا سر کچلا جاتا ہے۔ اسی سے بدکاروں اور ظالموں کو اپنے برے اعمال کی قوت حاصل ہوتی ہے اسی سے اخلاق کو تباہ کرنے والے اور نظام عدل کو غارت کرنے والے قوانین نافذ ہوتے ہیں۔ اسی کی خاطر بنی آدم کی جمعیت میں نفاق و شقاق کی تخم ریزی کی جاتی ہے۔ اسی کی بدولت جنگ و خونریزی کی آگ بھڑکتی ہے، اسی سے قوموں اور ملکوں پر بلائیں نازل ہوتی ہیں۔ اور خلاصۂ کلام یہ کہ یہی وہ چیز ہے جس کی قوت کسی نہ کسی حیثیت سے ہر بدی و بدکاری کا وسیلہ یا اسکے باقی رہنے کا ذریعہ بنتی ہے۔ پس اسلام نے بدی کے استیصال اور بدکاری کے دفع و انسداد کے لئے یہ کارگر تدبیر بتلائی کہ تلوار کے زور سے ایسی تمام حکومتوں کو مٹا دیا جائے، اور ان کی جگہ وہ عادلانہ و منصفانہ نظام حکومت قائم کیا جائے جس کی بنیاد الٰہی قوانین پر ہو، جو غلو و فساد فی الارض اور جبر و استکبار کے ناپاک عناصر سے پاک ہو، جس کا اساس تقویٰ و پرہیزگاری اور حق پرستی و حق شناسی پر ہو۔ جس کے قیام کا مقصد ہر نیکی کو باقی رکھنا اور ہر بدی کو مٹانا ہو اور جس کے کارکن وہی لوگ ہوں جو امر بالمعروف و نہی عن المنکر کو اپنی زندگی کا واحد نصب العین سمجھتے ہوں۔

قرآن مجید کو اٹھا کر دیکھو۔ جگہ جگہ تمہیں یہی نظر آئیگا کہ ظالم و جابر حکومتوں کی اطاعت سے روکا گیا ہے۔ اور انسان کو تاکید کی گئی ہے کہ وہ باطل کے اتباع اور جبر و استکبار کی اطاعت سے

اپنے آپ کو ہلاکت میں مبتلا نہ کرے۔ کہیں حکم ہوتا ہے کہ:-

لَا تُطِيعُوٓا أَمْرَ الْمُسْرِفِينَ الَّذِينَ هُمْ يُفْسِدُونَ فِي الْأَرْضِ وَلَا يُصْلِحُونَ (۲۶:۹)

ان حد سے گذر جانے والے لوگوں کی اطاعت نہ کرو جو زمین میں فساد پھیلاتے ہیں۔ اور اصلاح نہیں کرتے۔

کہیں ارشاد ہوتا ہے کہ:-

لَا تُطِعْ مَنْ أَغْفَلْنَا قَلْبَهُ عَنْ ذِكْرِنَا وَاتَّبَعَ هَوَاهُ وَكَانَ أَمْرُهُ فُرُطًا (۱۸:۴)

اس کی اطاعت نہ کر جس کے قلب کو ہم نے اپنے ذکر سے غافل رکھا ہے، جو اپنی نفسانی خواہشات کی پیروی کرتا ہے۔ اور جس کا حکم زیادتی پر مبنی ہے۔

کہیں ایک قوم کی بربادی کی وجہ یہ بتائی جاتی ہے کہ:-

اِتَّبَعُوٓا أَمْرَ كُلِّ جَبَّارٍ عَنِيدٍ وَأُتْبِعُوا فِي هَٰذِهِ الدُّنْيَا لَعْنَةً وَيَوْمَ الْقِيَامَةِ (۱۱:۵)

انہوں نے ہر جبار دشمن حق کی پیروی کی پس ان پر اس دنیا میں بھی لعنت پڑی اور یوم قیامت کو بھی پڑے گی۔

کہیں صاف طور پر بتلا دیا کہ ایک ملک ہلاک ہی اس وقت ہوتا ہے جب اسکی دولت اور حکومت کی باگیں بدکار لوگوں کے ہاتھ میں چلی جاتی ہیں:-

وَإِذَآ أَرَدْنَآ أَنْ نُّهْلِكَ قَرْيَةً أَمَرْنَا مُتْرَفِيهَا فَفَسَقُوا فِيهَا فَحَقَّ عَلَيْهَا الْقَوْلُ فَدَمَّرْنَاهَا تَدْمِيرًا (۱۷:۲)

جب ہم کسی بستی کو برباد کرنیکا ارادہ کرتے ہیں تو اس کے دولت و حکومت والے لوگوں کو (طاعۃ و خیر کا) حکم بھیجتے ہیں مگر وہ نافرمانی کرکے بدکاریاں کرتے ہیں۔ پس وہ بستی حکم سزا کی مستحق ہو جاتی ہے۔ اور ہم اسکو تباہ و برباد کر دیتے ہیں۔

اس کی وجہ بالکل ظاہر ہے۔ اجتماعی زندگی میں جتنے عوامل انسان کے اخلاق و تمدن پر اثر انداز ہوتے ہیں۔ ان میں سب سے زیادہ قوی اور موثر عامل حکومت ہے۔ حکومت کا نظام اگر غلط ہو اور اس کی باگیں ایسے لوگوں کے ہاتھ میں ہوں جو حاکمانہ طاقت کو اصلاح اور خدمت الناس کے بجائے افساد اور خدمت نفس کے لئے استعمال کرتے ہوں تو ایسی

حالت میں کسی نیکی کا سرسبز ہونا کسی اصلاحی تحریک کا بارآور ہونا اور کسی قسم کے اخلاقی محاسن کا پھلنا پھولنا محال ہے کیونکہ وہ حکومت طبعاً بدی و شرارت کی سرپرست ہوگی اور بذات خود بدکار ہوگی۔ بلکہ اس کی قوت تمام اخلاقی مفاسد کی آبیاری کریگی۔ بخلاف اس کے اگر حکومت ایک صحیح اور عادلانہ دستور و آئین پر قائم ہو اس کا مقصدِ حیات نظامِ عدل کا قیام ہو، اس کے عمال نیکوکار و پرہیزگار ہوں اور وہ اپنی قوت کو اپنی ذاتی خواہشات کے حصول کے لیے نہیں بلکہ جماعت کی صلاح و فلاح کے لئے استعمال کرتے ہوں۔ تو اس کی اصلاحی قوت کا اثر صرف اسی دائرہ تک محدود نہ رہیگا جو حکومت سے بلا واسطہ تعلق رکھتا ہے، بلکہ اجتماعی و انفرادی زندگی کے تمام شعبے اس کے نیک اثرات کو قبول کریں گے۔ مذہب، معیشت، معاشرت، اخلاق، تہذیب، علوم و افکار غرض ہر شعبہ میں اصلاح کی تحریک بارور ہوگی اور صرف بدکاری کی روک تھام ہی نہ ہوگی بلکہ خود بدی کے چشمے بھی سوکھ جائیں گے۔ پس درحقیقت فتنہ و فساد کو مٹانے اور انسانی زندگی کو منکرات سے پاک کرنے کے لئے سب سے زیادہ ضروری اور مفید تدبیر یہی ہے کہ تمام جابر و بدکار حکومتوں کا استیصال کردیا جائے اور ان کی جگہ ایسی حکومت قائم کی جائے جو اصول اور عمل دونوں کے لحاظ سے نیکی اور نیکوکاری پر مبنی ہو۔

حکمِ قتال

یہ وہ دوسرا مقصد عظیم و جلیل ہے جس کے لئے اللہ تعالیٰ نے اپنے نیک بندوں کو تلوار اٹھانے کا حکم دیا ہے۔ پہلا مقصد یہ تھا کہ خود اپنی قوت کو مٹنے سے محفوظ رکھو، اور دوسرا مقصد یہ ہے کہ اس محفوظ شدہ طاقت کو تمام دنیا سے فتنہ و فساد کے مٹانے اور مفسدوں سے فساد کی قوت چھین کر انہیں نیکی کا تابع بنانے میں استعمال کرو۔ چنانچہ یہ حکم نہایت مختصر الفاظ میں اس طرح دیا گیا ہے کہ :-

قَاتِلُوا الَّذِينَ لَا يُؤْمِنُونَ بِاللَّهِ وَلَا بِالْيَوْمِ الْآخِرِ وَلَا يُحَرِّمُونَ مَا حَرَّمَ اللَّهُ وَرَسُولُهُ وَلَا يَدِينُونَ دِينَ الْحَقِّ مِنَ الَّذِينَ	اہل کتاب میں سے جو لوگ نہ اللہ پر ایمان لاتے ہیں، نہ یوم آخر پر، نہ ان چیزوں کو حرام سمجھتے ہیں جو اللہ اور اس کے رسول نے حرام ٹھیرائی ہیں، اور نہ دین حق کو اختیار کرتے ہیں ان سے لڑو یہاں تک کہ

أُوتُوا الْكِتٰبَ حَتّٰى يُعْطُوا الْجِزْيَةَ عَنْ يَّدٍ وَّهُمْ صٰغِرُوْنَ۔ (۲۹)

وہ ہاتھ سے جزیہ دیں اس حال میں کہ وہ عاجزی و محکومی پر راضی ہوں۔

اس آیۃ میں قتال کا حکم جن لوگوں کے خلاف دیا گیا ہے ان کی خصوصیات یہ بتائی ہیں کہ وہ اہل کتاب ہیں۔ اللہ اور یوم آخر پر ایمان نہیں لاتے جن چیزوں کو اللہ اور اس کی رسول نے حرام کیا ہے انہیں حرام نہیں سمجھتے۔ اور دین حق کو قبول نہیں کرتے۔ ان کے جرائم کی یہ ترتیب بے معنی نہیں ہے بلکہ اس پر غور کرنے سے حکم قتال کی وجہ خود بخود سمجھ میں آجاتی ہے۔ فرمایا کہ پہنچ ان کی طرف کتابیں بھیجیں جن میں انہیں عقائد اور معاملات کی صحیح صحیح تعلیم دی گئی تھی اور ان کے لئے ایک صحیح اور کامل قانون وضع کر دیا گیا تھا۔ لیکن انہوں نے ان کتابوں کو چھوڑ دیا۔ اپنی آراء و اہوار اور اپنے ظنوں و اوہام کے مطابق خود اپنے لئے الگ الگ مذاہب اور قوانین گھڑ لئے جو حق کے خلاف اور جادۂ استقامت سے ہٹے ہوئے ہیں۔ اس انحراف کی بدولت ایک طرف ان کے عقائد بگڑ گئے کہ اللہ اور جزاء و سزاء کے دن پر ان کا ایمان نہ رہا اور دوسری طرف ان کے اعمال بھی بگڑ گئے کہ حلال و حرام کی تمیز انہیں باقی نہ رہی اور فتنہ و فساد برپا کرنے لگے جس سے اللہ نے اور ان رسولوں نے جو ان کی طرف بھیجے گئے تھے انہیں منع کیا تھا، پھر جب اللہ نے ان کی ہدایت کے لئے دین حق بھیجا تو اسے بھی انہوں نے اختیار نہ کیا اور اپنی پچھلی غلط کاریوں اور غلط فہمیوں پر اڑے رہے۔ حالانکہ اگر وہ اسے اختیار کر لیتے تو پھر ایک کتاب محکم ایک مذہب صحیح اور ایک قانون عدل کے پابند ہو جاتے۔ جس سے ان کے عقائد اور اعمال دونوں کی اصلاح ہو جاتی اور فتنہ و فساد کا نام و نشان مٹ جاتا۔ لیکن ایسی صورت میں جبکہ انہوں نے دین حق قبول نہیں کیا ہے اور ایک غلط اور خود ساختہ مذہب و قانون کی پابندی کر رہے ہیں۔ تو انہیں اس امر کی آزادی تو دی جا سکتی ہے کہ جزیہ دیکر اپنے عقائد باطلہ پر قائم رہیں لیکن اس امر کی آزادی نہیں دی جا سکتی کہ اپنے باطل قوانین کی تنفیذ سے اللہ کی زمین میں فتنہ و فساد برپا کریں۔

قتال کی غرض و غایت

حتی یعطوا الجزیۃ میں اس قتال کی غایت کو صاف طور پر بیان کر دیا ہے۔ اگر حتی یسلموا کہا جاتا

تو غایت قتال یہ ہو سکتی تھی کہ انہیں تلوار کے زور سے مسلمان بنایا جائے۔ لیکن حتیٰ یعطوا الجزیۃ نے بتلا دیا کہ ان کا اعطائے جزیہ پر راضی ہو جانا قتال کی آخری حد ہے۔ اور اس کے بعد پھر ان کی جان و مال پر کوئی حملہ نہیں کیا جا سکتا خواہ وہ اسلام قبول کریں یا نہ کریں جیسا کہ صاحب بدائع نے لکھا ہے۔

نهی سبحانه وتعالیٰ اباحة القتال الی غاية قبول الجزية واذا انتهت الاباحة تثبت العصمة ضرورة (ج، ص ۱۱)

اللہ تعالیٰ نے قبول جزیہ کو اباحت قتال کی حد مقرر کیا ہے۔ پس جب اس غایت کے حصول پر اباحت ختم ہو گئی تو لازمی طور پر ذمیوں کے اعراض و اموال کا تحفظ بھی ثابت ہو گیا۔

اسی بنا پر ذمیوں کے متعلق سختی کے ساتھ تاکید ہے کہ ان کی جان و مال اور عزت و آبرو کی تمام حملوں سے حفاظت کی جائے۔ ان کے بچاؤ کے لئے جنگ کرنا اور اپنا خون بہانا مسلمانوں پر لازم کر دیا گیا ہے چنانچہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کا ارشاد ہے کہ

انما قبلوا عقد الذمة لتكون اموالهم كاموالنا ودماؤهم كدمائنا۔

انہوں نے عقد ذمہ اسی لئے قبول کیا ہے کہ ان کے مال ہمارے مال کی طرح اور ان کے خون ہمارے خون کی طرح محترم ہو جائیں۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ

اوصيه بذمة الله وذمة رسوله ان يوفی لهم لعهدهم وان يقاتل من ورائهم ولا يكلفوا الا طاقتهم

میں وصیت کرتا ہوں کہ اللہ اور اس کے رسول کے ذمہ کا لحاظ رکھا جائے۔ اس طرح کہ ذمیوں کے ساتھ عہد کو پورا کیا جائے۔ ان کی حفاظت کے لئے جنگ کیجئے اور ان کی طاقت سے زیادہ ان پر خراج کا بار نہ ڈالا جائے۔

حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ان کی جان کے احترام کی تاکید سخت سختی کے ساتھ فرماتے ہیں کہ

من قتل معاهدا لم يرح رائحة الجنة وان ريحها توجد من

"جو کوئی کسی معاہد کو قتل کرے گا اسے جنت کی خوشبو تک نصیب نہ ہوگی۔ حالانکہ جنت کی خوشبو ... سال کی

مسیرة اربعین عاماً۔ مسافت تک پہونچتی ہے۔

اس کے متعلق یہ کہنا صحیح نہیں ہوسکتا کہ یہ احترام جان و مال محض احترام عہد و پیمان کی بنا پر ہے۔ کیونکہ یہ حکم تمام ذمیوں کے لئے عام ہے اور عقد ذمہ کی صرف یہی صورت نہیں ہے کہ حکومت اسلامیہ کے ساتھ باقاعدہ صلح و معاہدہ ہو بلکہ نص کے علاوہ دلالت بھی ایک رکن عقد ہے۔ اگر مسلمان کسی ملک کو بزور شمشیر فتح کریں اور اس کے باشندوں سے ان کا کوئی معاہدہ نہ ہوا ہو تب بھی مفتوح غیر مسلموں کو ذمی ہی قرار دیا جائیگا۔ اور مسلمانوں کا امام ان پر جزیہ عائد کرکے ان کو اللہ اور رسول کے ذمہ میں لے لے گا۔ (دیکھو بدائع الصنائع ج ۷ ص ۱۱۰ و ۱۱۲)

اس سے ظاہر ہے کہ قتال کا یہ حکم کسی مذہبی عداوت کی بنا پر نہیں ہے ورنہ یہ نہ ہوتا کہ اطاعت کرنے سے پہلے جن کے ساتھ جنگ کرنا ضروری ہے انہی کی جان و مال اطاعت قبول کرنے کے بعد اس طرح قابل احترام ہو جائے۔ حالانکہ اطاعت کرنے والوں کے ساتھ مذہبی عداوت کی بھڑاس نکالنا زیادہ آسان ہے۔ علیٰ ہذا القیاس یہ بات بھی بعید از عقل ہے کہ اس حکم قتال کا مقصد محض جزیہ حاصل کرنا ہو۔ کیونکہ چند درہم سالانہ کے عوض اتنی بڑی ذمہ داری اپنے اوپر لے لینا کہ ان کی حفاظت کے لئے ہر دشمن کے سامنے اپنا سینہ سپر کر دیا جائے کسی طمع پر مبنی نہیں ہوسکتا۔ یہ بات کسی کی سمجھ میں نہیں آسکتی کہ ایک کافر تو جزیہ دیکر اطمینان کے ساتھ اپنی تجارت اپنے کاروبار اپنے عیش و آرام اور اپنے اہل و عیال کی معیت سے مستفید ہو اور مسلمان ملک کی حفاظت کے لئے میدان جنگ کی مصیبتیں اٹھائے اور اپنی جان جوکھوں میں ڈالدے درآنحالیکہ اس کو یہ قدرت حاصل ہو کہ اس کافر کو ادائے جزیہ کے باوجود جنگی خدمت پر مجبور کرے۔ اور خود لطف و مسرت کی زندگی بسر کرے۔

پس اعطائے جزیہ پر قتال کی اباحت ختم کر دینے اور قبول جزیہ کے بعد قیام عدل و امن کی تمام ذمہ داریاں اپنے اوپر لے لینے سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ اس جنگ کا مقصد ان لوگوں کو فتنہ و فساد سے روکنا اور امن و آئین کا پابند بنانا ہے۔ اور اس کے لئے ان پر جزیہ کے نام سے ٹیکس عائد کرنا صرف اس لئے ہے کہ وہ اس حفاظت و صیانت کے مصارف میں شرکت کریں جو انہیں بہم پہنچائی جاتی ہے۔ اور اطاعت و انقیاد پر قائم رہیں۔

جزیہ کی حقیقت

علامہ ابن تیمیہ نے حتی یعطوا الجزیۃ کی تفسیر میں لکھا ہے۔ کہ والمراد باعطائہا التزامہا بالعقد اس سے مراد صرف یہ ہے کہ وہ عقد معاہدہ پر قائم رہیں جس طرح تمام حکومتوں کے قوانین میں ٹیکس دیتے رہنا وفاداری و پابندی قانون کی دلیل ہے اور نہ ادا کرنا بیوفائی و غداری کی اسی طرح جزیہ دیتے رہنا بھی پابندی عہد کی دلیل ہے۔اور اس کا نہ ادا کرنا نقض عہد کا ہم معنی یہی وجہ ہے کہ جزیہ صرف اہل قتال پر عائد کیا گیا ہے۔ اور عورتیں نابالغ بچے مجانین۔ از کار رفتہ بوڑھے اندھے اور اپاہج وغیرہ اس سے مستثنے ہیں۔ بدائع الصنائع میں ہے کہ

لان اللہ سبحانہ وتعالیٰ اوجب الجزیۃ علی من ھو من اھل القتال لقولہ تعالیٰ قَاتِلُوا الَّذِينَ لَا يُؤْمِنُونَ بِاللَّهِ وَلَا بِالْيَوْمِ الْآخِرِ الآیہ والمقاتلۃ مفاعلۃ من القتال فتستدعی اھلیۃ القتال من الجانبین فلا تجب علی من لیس من اھل القتال (ج ۷ص ۱۱۱)

اللہ تعالیٰ نے جزیہ صرف ان لوگوں پر مقرر کیا ہو جو اہل قتال ہیں۔ جیسا کہ آیۂ قاتلوا الذین میں لفظ قاتلوا سے معلوم ہوتا ہے۔ مقاتلہ کے لئے جانبین سے قتال کی اہلیت شرط ہے۔ پس جن لوگوں میں یہ اہلیت نہیں ہے وہ قتال اور جزیہ دونوں سے مستثنےٰ ہیں۔

* * *

عن ید کا لفظ اس مضمون کی تشریح کرتا ہے ید سے مراد یہاں ہاتھ نہیں ہے۔ بلکہ درحقیقت یہ کنایہ ہے اطاعت و انقیاد سے چنانچہ کہتے ہیں اعطی فلان بیدہ اذا اسلم وانقاد پس حتی یعطوا الجزیۃ عن ید کے معنی یہ ہیں کہ وہ طیب نفس و انقیاد کے ساتھ جزیہ ادا کریں۔ بغیر اس کے کہ ان کو اس کی ادائیگی پر مجبور کیا جائے۔ اگر ان میں اس قدر پابندی آئین اور اتنی امن پسندی موجود نہ ہو کہ اپنے واجب ادا ٹیکس کو رضامندی کے ساتھ ادا کریں۔ بلکہ انہیں مجبور کرنے کے لئے ہمیشہ فوجی قوت استعمال کرنیکی ضرورت ہو تو پھر نہ اعطاے جزیہ کا اصلی منشا یعنی نظم و آئین کا قیام پورا ہو سکتا ہے

نعقد ذمہ باقی رہ سکتا ہے جس کے لئے اطاعت و انقیاد لازمی شرط ہے۔

اسی لئے جزیہ کی رقم ایسی قلیل مقرر کی گئی ہے کہ اس کا دینا بار نہ ہو اس کے وصول کرنے کے طریقوں میں نرمی و رفق کی تاکید کی گئی ہے۔ حبس و تعذیب وغیرہ سے انہیں تکلیف دینا۔ اور ان پر ناقابل برداشت بوجھ ڈالنا جائز نہیں رکھا گیا۔ چنانچہ اس کے متعلق کثرت سے تاکیدی احکام اور روایات موجود ہیں۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے پاس ایک مرتبہ جزیہ ایک بڑی رقم لائی گئی۔ آپ نے اُسے غیر معمولی دیکھ کر فرمایا "مجھے گمان ہے کہ تم نے لوگوں کو برباد کر دیا" محصلین نے جواب دیا کہ خدا کی قسم ہم نے بہت نرمی سے وصول کیا ہے" آپ نے پھر پوچھا "بلا سوط و لا نوط؟ بغیر مارے باندھے"؟ انہوں نے عرض کی کہ بغیر مارے باندھے تب آپ نے اس مال کو خزانہ میں داخل کرنے کی اجازت دی۔ اسی طرح حضرت علی رضی اللہ عنہ نے ایک مرتبہ ایک شخص کو عکبری پر عامل مقرر کرتے ہوئے ہدایت فرمائی تھی کہ خراج کی تحصیل میں ان پر ایسی سختی نہ کرنا کہ وہ اپنے گدھے یا اپنی گائیں یا اپنے کپڑے یا دوسری چیزیں بیچنے پر مجبور ہو جائیں۔ بلکہ ان کے ساتھ نرمی کرنا۔ حضرت ابن حکیمؓ نے فلسطین کے کچھ لوگوں کو دیکھا کہ وہ تحصیل جزیہ میں سختی کرتے ہیں تو انہوں نے اس سے منع کیا اور کہا کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے کہ ان اللہ یعذب یوم القیمۃ الذین یعذبون الناس فی الدنیا (جو لوگ دنیا میں لوگوں کو تکلیف دیتے ہیں انہیں اللہ قیامت کے دن تکلیف دیگا)

ان باتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ غیر مسلموں پر جو جزیہ عائد کیا جاتا ہے وہ درحقیقت کوئی سزا نہیں ہے۔ بلکہ اس کا مدعا صرف یہ ہے کہ وہ امن و آئین کے پابند ہوں۔ رضا و رغبت کے ساتھ قانون عدل کی اطاعت کریں۔ اور اپنی استطاعت کے مطابق اس حکومت کے مصارف ادا کریں۔ جو انہیں پر امن زندگی بسر کرنے کا موقع دیتی ہے ظلم و تعدی سے محفوظ رکھتی ہے۔ انصاف کے ساتھ حقوق تقسیم کرتی ہے۔ قوت والوں کو کمزوروں پر ظلم کرنے سے روکتی ہے کمزوروں کو قوت والوں کا غلام بننے سے بچاتی ہے۔ اور تمام سرکش عنصر کو اخلاق و انسانیت کے حدود کا پابند بناتی ہے۔

وھم صاغرون کے الفاظ اس مطلب کی مزید وضاحت کرتے ہیں۔ جیسا کہ علامہ ابن قیمؒ نے تصریح کی ہے:-

الصغار ھو التزامھم لجریان احکام اللہ تعالیٰ علیھم واعطاء الجزیۃ ھو الصغار۔	اس آیت میں صغار سے مراد ان کا قانون الٰہی کے احکام کی تنفیذ پر راضی ہونا۔ آئینِ عدل کی پابندی کرنا اور اس اطاعت و انقیاد کی علامت کے طور پر جزیہ ادا کرتے رہنا ہے۔

خود قرآن مجید میں مختلف مواقع پر جنگ کے مقصد اور اس کے مفید نتیجہ کو جس طرح بیان کیا گیا ہے اس سے صاغرون کا مطلب صاف طور پر یہی معلوم ہوتا ہے کہ کافروں کا اپنے قوانین باطلہ کی تنفیذ سے فتنہ و فساد برپا نہ کرسکنا۔ اور ان کا بدکاری و شرارت سے عاجز ہو جانا۔ اور قانون الٰہی کے عادلانہ احکام کا پابند رہنا ہی ان کا صغار ہے۔ نے تو ھم حتی لاتکون فتنۃ میں قتال کا مقصد یہ بتلایا ہے کہ فتنہ باقی نہ رہے حتی تضع الحرب اوزارھا میں اسی مقصد کو اس طرح بیان کیا ہے کہ دنیا سے جنگ و فساد کا نام و نشان مٹ جائے۔ عَسَى اللّٰهُ اَنْ يَّكُفَّ بَاْسَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا میں وہی مفہوم ان الفاظ میں ادا کیا جاتا ہے کہ قریب ہے کہ اللہ کافروں کی قوتِ جنگ و جدال کو توڑ دے جَعَلَ كَلِمَةَ الَّذِيْنَ كَفَرُوا السُّفْلٰى وَكَلِمَةُ اللّٰهِ هِيَ الْعُلْيَا میں اسی جنگ کا نتیجہ یوں بیان کیا جاتا ہے کہ کافروں کا بول نیچا ہوا۔ اور اللہ کا کلمہ سربلند ہو گیا۔ پس درحقیقت فتنہ کا باقی نہ رہنا فساد کا مٹ جانا۔ ہوائے نفس کے لئے قتل و غارت اور جنگ و پیکار کا بند ہو جانا۔ کفر کی شیطانی قوت کا اس حد تک ٹوٹ جانا کہ وہ دنیا کے امن و سکون کو برباد نہ کرسکے اور دنیا کی اخلاقی و روحانی اور مادی ترقی میں رکاوٹیں نہ ڈال سکے۔ نیز کافروں کے خود ساختہ قوانین کا منسوخ ہو جانا اور ان کی جگہ اللہ کے اس قانون عدل کا بول بالا ہونا جو تمام بنی نوع انسان میں ہر قسم کے شیطانی امتیازات کو مٹا کر صرف حق و باطل اور بدی و تقوی کا امتیاز قائم کرتا ہے اور ظالموں کے سوا ہر شخص کو امن و آزادی کی خوشخبری دیتا ہے۔ یہی کافروں کا صغار ہے اور آیت قتال میں حتی یعطوا الجزیۃ عن ید وھم صاغرون سے یہی صغار مراد ہے۔

پس معلوم ہوا کہ اس آیت میں حکم قتال کا منشا اس کے سوا کچھ نہیں ہے کہ دنیا سے فتنہ و فساد کی آزادی چھین لی جائے۔ اور زندگی کے تمام شعبوں میں اس کو حقیقی اور انسانیت پرور آزادی عطا کی جائے۔ ایسی آزادی جو اخلاقی حدود کی پابندی پر مبنی ہو۔ اور نارو اقید اور نارو ا بے قیدی دونوں سے پاک ہو۔ اسلام کی تلوار صرف ظلم و سرکشی اور فتنہ و فساد کے خلاف اٹھتی ہے خواہ اس شیطانی قوت کے شکار مسلمان ہوں یا غیر مسلم۔ جب تک کوئی جماعت اس قوت کا استعمال ترک نہیں کرتی اس کے ساتھ اسلام کی جنگ برابر جاری رہتی ہے۔ مگر جس لمحہ وہ اس گناہ عظیم کو ترک کر کے حق و انصاف کے قانون کی پابندی اختیار کر لیتی ہے۔ ٹھیک اسی لمحہ اس کا خون حرام ہو جاتا ہے۔ اس کے مال اور اس کے اغراض کی حفاظت مسلمانوں پر لازم ہو جاتی ہے۔ اور اسلام کی پرامن حکومت میں اس کو پوری آزادی دیدی جاتی ہے کہ تمام جائز طریقوں سے اپنی دولت۔ اپنی صنعت و تجارت اپنے علوم و آداب۔ اپنے تہذیب و تمدن۔ غرض اپنی اجتماعی و انفرادی زندگی کے ہر شعبہ میں ترقی کرے۔ اور انسانیت کے بلند سے بلند مدارج تک پہنچنے کے لئے جن جن وسائل کی ضرورت ہو انہیں آزادی کے ساتھ استعمال کرے۔ اس بارے میں اسلام کا قانون اہل ذمہ کو جو وسیع آزادی عطا کرتا ہے۔ وہ دنیا کے قوانین میں اپنا جواب نہیں رکھتی۔ اور قدرتی طور پر اس کا جواب ہو بھی نہیں سکتا۔ کیونکہ اسلام کے اور ان دنیاوی قوانین کے نقطہ نظر میں ایک بنیادی فرق ہے۔ یہ قوانین جہانگیری کے اصول پر قائم ہیں۔ ان کے مطابق محکوم قوم حاکم جماعت کی ملکیت ہوتی ہے اور حاکم کے لئے محکوم کے وسائل حیات ایک جائداد کی حیثیت رکھتے ہیں۔ جسے اپنے فائدے کے لئے استعمال کرنا اور محکوم کو اس کے فائدے سے محروم رکھنا۔ اس کا قدرتی حق ہوتا ہے۔ اس لئے ان قوانین کی تنفیذ خواہ کتنی ہی فیاضی و فراخدلی کے ساتھ ہو لیکن حاکم جماعت کا مفاد محکوم جماعت کے حقیقی مفاد سے کبھی متحد نہیں ہو سکتا۔ اور لازمی طور پر کمزور کا مفاد طاقتور کے مفاد پر قربان کر دیا جاتا ہے۔ بخلاف اس کے اسلامی قانون کی بنیاد خدمت نوع انسانی کے اعلیٰ اور شریف مقصد پر رکھی گئی ہے۔ اس میں حاکم و محکوم کا تعلق صحیح معنوں میں خادم و مخدوم کا سا تعلق ہوتا ہے۔ حاکم کا مفاد اس کے سوا کچھ نہیں ہوتا کہ محکوم کے اصلی و حقیقی مفاد کی ترقی کیلئے

کوشش کرے۔ اس کو حکومت کا اختیار دیے جانے کی غرض و غایت ہی یہ ہوتی ہے کہ وہ سوسائٹی کی اخلاقی و روحانی اور مادی زندگی کو تباہ کرنے والی برائیوں کے استیصال اور اسے انسانیت کے اعلیٰ مدارج تک پہنچانے والی اچھائیوں کے عام کرنے میں اپنی تمام قوتوں کو استعمال کرے۔ پس اسلام کا حاکم اپنے محکوم کو اخلاقی حدود کا پابند بنانے کے بعد اسے ہر قسم کی کامل آزادی عطا کرتا ہے وہ اس کے راستے میں اپنی یا اپنی جماعت کی اغراض کے لئے کسی قسم کی مزاحمت نہیں کرتا۔ بلکہ اسے ایک بلند درجہ کا انسان بننے میں پوری مدد دیتا ہے۔

اسلام اور جہانگیریت

بدقسمتی سے اس زمانہ میں مغرب کی بعض جہانگیر قوموں نے یہ دعویٰ کیا ہے کہ وہ دنیا میں تہذیب و انسانیت کی ترقی درماندہ قوموں کی اصلاح اور امن و امان کے قیام کی خاطر جنگ کرتی ہیں۔ مگر اس زبانی دعوے کے برعکس ان کا عمل یہ ہے کہ کمزور قوموں کی آزادی پر ڈاکے ڈالتی ہیں اور تہذیب انسانیت کی ترقی کے بجائے، دنیا سے انسانیت اور انسانی شرافت کی تمام خصوصیات کو ایک ایک کر مٹا رہی ہیں۔ اس سے لوگوں کو شبہ ہو سکتا ہے کہ کہیں اسلام کا دعویٰ بھی ایسا ہی نہ ہو کہ زبان پر اصلاح کا وظیفہ ہو، اور ہاتھ میں فتنہ و فساد کی تلوار ہو۔ اس شبہ کو مغربی اقوام اور اسلامی جہاد اصلاح کی یہ ظاہری مماثلت اور بھی زیادہ تقویت پہنچاتی ہے کہ جس طرح اسلام میں عالمگیر اصلاح کا جہاد صرف مسلمانوں کے لئے مخصوص ہے۔ اسی طرح مغربی مستعمرین بھی تہذیب و تمدن کی عالمگیر اشاعت کے مشن کو صرف اپنی قوم ہی کا ورثہ سمجھتے ہیں۔ اگرچہ پچھلے مباحث کو بنظر غور مطالعہ کرنے سے یہ بدگمانی پیدا ہونے کی بہت کم گنجائش باقی رہتی ہے۔ لیکن جسقدر بھی باقی رہتی ہے۔ بہتر ہے کہ اس کو سوء ظن کے لئے خالی چھوڑنے کے بجائے حقیقت کے علم و یقین سے پر کر دیا جائے۔

جیسا کہ ہر شخص جانتا ہے، جہانگیریت (امپیریلزم) کی اولین خصوصیت یہ ہے کہ وہ ایک خاص قوم اور ملک کے افراد کی حکومت کا نام ہے۔ انگریزی جہانگیریت جسے پر انگلستان کے باشندوں سے مخصوص ہے۔ جرمن جہانگیریت میں جرمن قوم کے سوا کسی کا حصہ نہیں ہے، اطالوی جہانگیریت میں جو کچھ ہے سب اٹلی کے باشندوں کا ہے جس طرح

دنیا کی دوسری قوموں کا انگریز، جرمن، یا طلیانی ہو جانا محال ہے، اسی طرح ان قوموں کی جہانگیریت میں بھی دوسروں کا حصہ دار ہونا محال ہے۔ انگریز "اشاعت تہذیب و تمدن" کے نام سے جہاں کہیں جائینگے، انگریزی قومیت ساتھ ساتھ جائیگی۔ حکومت کے اورنگ نشین ہونگے تو انگریز ہونگے، سیاست کے صدر انجمن ہونگے تو انگریز ہونگے۔ اختیار و اقتدار کے مالک ہوں گے، تو انگریز ہوں گے۔ دوسری نسل اور قوم کے لوگ خواہ انگریزی تہذیب میں کتنی ہی ترقی کرلیں، مگر انگریزی تہذیب ان کو قدرت و اختیار حاصل ہونا قطعاً ناممکن ہے۔ یہی حال دوسری قوموں کی جہانگیریت کا بھی ہے۔ اس قسم کے نظام میں لازمی طور پر حکومت و فرمانروائی کا حق ایک ملک کے باشندوں اور ایک نسل کے افراد سے مخصوص ہو جاتا ہے اور چونکہ نسل و وطنیت کوئی ایسی چیز نہیں ہے جسے کوئی شخص خود اختیار کرسکتا ہو کیونکہ اس کا دائرہ بہرحال انہی لوگوں تک محدود رہتا ہے جنہیں قدرت کسی خاص نسل اور خاص ملک میں پیدا کرنا پسند کرتی ہے۔ اس لیے جہانگیریت کے اس نظام کا دروازہ غیر نسل و وطن کے لوگوں کے لئے ہمیشہ بند رہتا ہے اور جب کبھی کوئی قوم دوسری قوم کو مغلوب کرتی ہے۔ تو اس کو حکومت و سلطنت میں صرف اس لیے کوئی حصہ نہیں ملسکتا کہ وہ حکمران قوم کی نسل سے نہیں ہے۔ پھر اسی چیز سے دوسری خرابیاں پیدا ہوتی ہیں۔ محکوم قوم من حیث القوم ذلیل ہو جاتی ہے، اس میں خودداری و عزافت کا احساس باقی نہیں رہتا۔ اور اگر اس کے حکمران ظلم و ستم اور جور و استبداد کے ساتھ حکمرانی نہ کریں تب بھی اس میں دنائت و پستی کے وہ خصائل قدرتی طور پر پیدا ہوتے ہیں، جو ایک عرصہ تک حکومت خود اختیاری سے محروم رہنے کا لازمی نتیجہ ہیں اور روح ترقی کے لئے مہلک جراثیم کا حکم رکھتے ہیں۔

بخلاف اس کے "اسلام" کسی نسل یا قوم یا وطن کا نام نہیں ہے۔ بلکہ ایک قانون اور ایک نظام حیات کا نام ہے۔ اس کے دروازے سب کے لئے کھلے ہوئے ہیں۔ عربی، عجمی، حبشی، چینی، ہندی، فرنگی، سب اس کو اختیار کرسکتے ہیں۔ اور وہ ان میں کوئی فرق و امتیاز نہیں کرتا۔ اس کو انسان کی نسل یا رنگ یا وطنیت سے کوئی واسطہ نہیں ہے، وہ انسان کو بہ حیثیت انسان ہونے کے خطاب کرتا ہے۔ اور اس کے سامنے زندگی بسر کرنے کا ایک طریقہ، اور تنظیم شئون انسانی کا ایک قانون پیش کرتا ہے جو اس کے نزدیک بہترین ہے۔ اس طریقہ و قانون کو

جو کوئی اختیار کرے وہ اسلامی حکومت میں برابر کا شریک ہے۔ اور اس کی شخصی قابلیت اسے
خلیفہ و امام کے درجہ تک پہنچا سکتی ہے جس طرح دنیا کی حکومتوں میں فرمانروائی کی قابلیت کا معیار
سول سروس یا اسی قسم کا کوئی اور امتحان پاس کرنا ہے، اسی طرح اسلام کی حکومت میں فرمانروائی
اور منصبِ اصلاح و ہدایت کی اہلیت کا اصولی معیار اسلام کے نظامِ حیات کو اختیار کرنا اور اس کے
قانونِ حق کی پابندی کرنا ہے۔ جو کوئی اس معیار پر پورا اترتا ہے وہ بلا لحاظ نسل و رنگ اس منصب
پر فائز ہو جاتا ہے جیسا کہ ہم آگے چل کر بتائینگے۔ اسلام میں نہ تو "حکومتِ قوم بر قوم دیگر" کا کوئی سوال
ہے اور نہ "حکومتِ قوم بر قوم خود" کا وہ "حکومتِ صالح بر غیر صالح" کا اصول پیش کرتا ہے، اور اس کے نزدیک
صالح" اگر ایک حبشی غلام ہو تو کوئی چیز اسے شرفائے عرب پر حکومت کرنے سے نہیں روک سکتی۔
شارعِ اسلام صلعم کا صریح فتویٰ ہے کہ:۔

اسمعوا و اطیعوا ولو استعمل علیکم عبد حبشی کان رأسہ زبیبۃ	سنو اور اطاعت کرو۔ خواہ تمہارے اوپر ایک گنجا حبشی غلام ہی حاکم بنا دیا جائے۔

اسلام عرب میں پیدا ہوا، عرب ہی کو اس کا علم بلند کرنے کا شرف حاصل ہے۔ مگر اس نے
کبھی حکومت و فرمانروائی کو عرب کے ساتھ مخصوص نہیں کیا۔ جب تک عرب صالح رہے انہوں نے
ہی دنیا پر حکومت کی۔ جب ان میں صلاحیت باقی نہ رہی تو جن عجمی قوموں کو عربوں نے فتح کیا
تھا، وہ اسلامی حکومت کی مسند نشین بن گئیں اور انہوں نے خود عرب پر حکومت کی۔ ترک اسلام
کے شدید دشمن تھے، مگر جب وہ اسلام کے دائرہ میں داخل ہو گئے تو دنیائے اسلام کے آدھے
سے زیادہ حصہ نے انہیں اپنا حکمران تسلیم کیا۔ چاٹگام سے لیکر قرطاجنہ تک ان کی فرمانروائی کے
پھریرے اڑتے رہے اور خود رسول اللہ صلعم کی خلافت کے منصب پر بھی انہی کا ایک خاندان سرفراز
ہوا۔ ہم تسلیم کرتے ہیں کہ مسلمان قوموں میں قومیت و نسل کا امتیاز بالکل مفقود نہیں ہوا،
مگر اس کو اسلام سے کوئی واسطہ نہیں۔ اسلام نے ترکی خلفا کی امامت کو بھی اسی طرح جائز سمجھا
جس طرح عباسی خلفاء کو سمجھا تھا۔ اور آج اگر انگریزی قوم مسلمان ہو جائے اور اپنی صلاحیت کا ثبوت
پیش کرے تو یقیناً اسلام کو فرمانروائے انگلستان کی امامت تسلیم کرنے میں بھی تامل نہ ہوگا۔

یہ تو اسلام اور جہانگیریت کا ظاہری فرق تھا۔ معنوی فرق اس سے بھی زیادہ بین ہے

بلکہ بتاہن کلی کا حکم رکھتا ہے۔ جہانگیریت دراصل ایک قوم کی خواہش توسیعِ مملکت وحصولِ مال و زر کا نام ہے۔ جب کوئی قوم اس دولت اور حکومت پر قانع نہیں ہوتی جو اس کو خود اپنی ملک میں حاصل ہوتی ہے تو وہ دوسرے ملکوں پر حملہ کرکے، انکی دولت پر قبضہ کرلی ہے۔ ان کے باشندوں کو اپنا محکوم اور غلام بنالیتی ہے۔ اور اپنی صنعت وتجارت کو ان کے خرچ پر فروغ دیتی ہے۔ یہ کام پہلے بھی ہوتا تھا اور ہمیشہ سے سرکش قومیں یہی کرتی آئی ہیں مگر اب مغربی قوموں نے اس ملک گیری اور لوٹ مار کا نام "تہذیب وتمدن کی اشاعت" اور "نوعِ بشری کی خدمت" رکھا ہے۔ ان کے آئین "تہذیب وتمدن" کی پہلی دفعہ یہ ہے کہ "قوت حق ہے" اور کمزور کو دنیا میں جینے کا کوئی حق نہیں ہے۔ کمزور قوموں میں "تہذیب" کی اشاعت کا جو طریقہ انہوں نے ایجاد کیا ہے وہ یہ ہے کہ ان کو جہالت، افلاس، غلامانہ کمینگی، اور بے دینی وضمیر فروشی کے "جواہر" سے مالامال کردیتی ہیں۔ اور "نوعِ بشری" کی خدمت کے لئے ان کی بہترین کوششوں کا مظاہرہ اس وقت ہوتا ہے۔ جب ان کی بھی قومیں ایک دوسرے سے ٹکرا کر دنیا کے امن وامان کو غارت کردیتی ہیں۔

اسلام کی مقدس تعلیم اس جہانگیری کے عیب سے پاک ہے۔ بلکہ اس کے برعکس وہ عالم انسانی کو اس قسم کی سرکش قوتوں کے استیصال وفانئی جگہ ایک عادلانہ نظامِ حکومت کے قیام کی دعوت دیتا ہے۔ اس کا دعویٰ یہ ہے کہ حکومت وپادشاہی صرف اللہ کے لئے ہے إِنِ الْحُكْمُ إِلَّا لِلَّهِ۔ بندوں کو یہ حق نہیں پہنچتا کہ اللہ کے غلاموں کو اپنا غلام بنائیں۔ ان کا کام صرف یہ ہے کہ اس کے نائب یا "خلیفہ" کی حیثیت سے اس کے بندوں کی خدمت واصلاح کریں اور جو قوت انہیں حاصل ہو۔ اسے اپنی نفس پروری کے بجائے خلق اللہ کی فلاح وبہبود میں استعمال کریں اس "خلافت" یا "وراثت ارضی" کی اہلیت کے لئے اولین شرط عمل صالح ہے۔

وَعَدَ اللَّهُ الَّذِينَ آمَنُوا مِنكُمْ وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِي الْأَرْضِ كَمَا اسْتَخْلَفَ الَّذِينَ مِن قَبْلِهِمْ (۲۴: ۷)

تم میں سے جو لوگ ایمان لائے ہیں اور نیک عمل کرتے ہیں ان سے اللہ نے وعدہ کیا ہے کہ انہیں زمین میں اسی طرح اپنا خلیفہ بنائے گا جس طرح ان سے پہلے کے لوگوں کو بنایا تھا۔

اور

وَلَقَدْ كَتَبْنَا فِي الزَّبُورِ مِنْ بَعْدِ الذِّكْرِ اَنَّ الْاَرْضَ يَرِثُهَا عِبَادِيَ الصَّالِحُونَ۔ اِنَّ فِي هٰذَا لَبَلٰغًا لِقَوْمٍ عَابِدِيْنَ (۲۱:۷)	ہم نے زبور میں نصیحت کے بعد لکھدیا کہ زمین کے وارث میرے نیکوکار بندے ہی ہونگے۔ اس میں عبادت گذار قوموں کے لیے ایک پیغام عمل ہے۔

یہ "خلافت" و "وراثت ارضی" جن لوگوں کو حاصل ہوتی ہے انہیں تاکید کے ساتھ جتادیا جاتا ہے کہ بندگان خدا پر تمہیں جو قدرت عطا کی گئی ہے وہ اللہ کی امانت ہے۔ اسکو اپنی ذاتی ملک سمجھ کر نفسانی لذتوں کے حصول میں خرچ نکرنا۔ حضرت داؤدؑ کو سلطنت عطا ہوتی ہے تو فرمان آتا ہے کہ:۔

يٰدَاوٗدُ اِنَّا جَعَلْنٰكَ خَلِيْفَةً فِي الْاَرْضِ فَاحْكُمْ بَيْنَ النَّاسِ بِالْحَقِّ وَلَا تَتَّبِعِ الْهَوٰى فَيُضِلَّكَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ۔ اِنَّ الَّذِيْنَ يَضِلُّوْنَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ لَهُمْ عَذَابٌ شَدِيْدٌ بِمَا نَسُوْا يَوْمَ الْحِسَابِ (۳۸:۲)	اے داؤد ہم نے تم کو زمین پر اپنا نائب بنایا ہے۔ پس لوگوں میں راستی وصداقت کے ساتھ فیصلے کرو اور اپنی نفسانی خواہش کی پیروی نہ کرو۔ ورنہ وہ تمہیں خدا کی راستہ سے بھٹکا دیگی۔ جو لوگ خدا کے رستہ سے ہٹ جاتے ہیں۔ ان کے لئے سخت عذاب ہے کیونکہ وہ اس بات کو بھول گئے کہ ان کے اعمال کا ایک دن حساب بھی ہوگا۔

حکومت حاصل ہونے کے بعد انسان میں سب سے بڑا عیب یہ پیدا ہوجاتا ہے کہ وہ خود آپ کو عام انسانوں سے ایک بلند تر ہستی سمجھنے لگتا ہے اور اپنی حقیقت کو بھول کر اس غلط فہمی میں پڑجاتا ہے کہ جو لوگ اس کے زیر حکم ہیں وہ گویا اس کی بندگی کے لیے پیدا ہوئے ہیں۔ اسلام اس عیب سے بچنے کی سخت تاکید کرتا ہے۔ اور حصول نجات کو اس سے پرہیز کرنے پر منحصر قرار دیتا ہے:۔

تِلْكَ الدَّارُ الْاٰخِرَةُ نَجْعَلُهَا لِلَّذِيْنَ لَا يُرِيْدُوْنَ عُلُوًّا فِي الْاَرْضِ وَلَا فَسَادًا۔ وَالْعَاقِبَةُ لِلْمُتَّقِيْنَ۔ (۲۸:۹)	اس دار الآخرۃ کی نعمتوں کو ہم ان ہی لوگوں کے لیے مخصوص کردیں گے جو زمین میں تکبر اور فساد نہیں کرتے آخرت کی کامیابیاں صرف پرہیزگاروں کے لیے ہیں۔

حکومت کے قیام کا اولین مقصد یہ ہے کہ لوگوں کے ساتھ انصاف کیا جائے۔ انصاف صرف دو متخاصم فریقوں کے درمیان صحیح فیصلہ کرنے ہی کا نام نہیں ہے۔ بلکہ حقیقی انصاف یہ ہے کہ حاکم اپنے محکوم کے ساتھ برتاؤ کرنے میں حق کو ملحوظ رکھے اور جہاں خود اسکی ذاتی منفعت اور حاکمانہ وقار کا سوال ہو وہاں بھی قدرت و اختیار رکھنے کے باوجود وہی فیصلہ کرے جو حق ہو خواہ اس سے اس کی ذات کو نقصان پہنچے یا اس کے دوستوں کو یا عزیزوں کو۔ اسلام اس انصاف کی بہترین تعلیم دیتا ہے۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا كُونُوا قَوَّامِينَ بِالْقِسْطِ شُهَدَاءَ لِلَّهِ وَلَوْ عَلَىٰ أَنْفُسِكُمْ أَوِ الْوَالِدَيْنِ وَالْأَقْرَبِينَ۔ إِنْ يَكُنْ غَنِيًّا أَوْ فَقِيرًا فَاللَّهُ أَوْلَىٰ بِهِمَا فَلَا تَتَّبِعُوا الْهَوَىٰ أَنْ تَعْدِلُوا وَإِنْ تَلْوُوا أَوْ تُعْرِضُوا فَإِنَّ اللَّهَ كَانَ بِمَا تَعْمَلُونَ خَبِيرًا۔

(۴: ۲۰)

اے ایمان والو! انصاف پر سختی کے ساتھ قائم رہو اور خاص اللہ کے لئے گواہی دو۔ خواہ وہ خود تمہاری ذات یا تمہارے والدین یا عزیزوں ہی کے خلاف کیوں نہ ہو دولت مند کی رضا جوئی یا فقیر پر رحم کھانے کا جذبہ تمہیں حق و انصاف سے نہ پھیر دے۔ کیونکہ اللہ کی رضامندی انکی رضامندی سے بہتر ہے تم اپنی خواہشات کی پیروی میں عدل و انصاف سے نہ پھر جاؤ۔ اگر تم نے ایچ پیچ کی بات کی یا حق سے اعراض کیا تو سمجھ لو کہ جو کچھ تم کرتے ہو اس سے اللہ اچھی طرح باخبر ہے۔

اس سے بھی بڑھکر وہ حکم دیتا ہے کہ جن قوموں کے ساتھ تمہاری دشمنی ہو ان سے بھی انصاف کرو۔

وَلَا يَجْرِمَنَّكُمْ شَنَآنُ قَوْمٍ عَلَىٰ أَلَّا تَعْدِلُوا۔ اعْدِلُوا هُوَ أَقْرَبُ لِلتَّقْوَىٰ (۵: ۲)

کسی قوم کی دشمنی تمہیں اس پر آمادہ نہ کر دے کہ تم اس کے انصاف نہ کرو۔ انصاف کرو۔ کیونکہ یہی پرہیزگاری کے قریب تر ہے۔

قوت و طاقت حاصل کرنے کے بعد ایک قوم میں لازمی طور پر یہ جذبہ پیدا ہوجاتا ہے

کہ اپنی مملکت کے حدود بڑھائے اور کمزور قوموں کے ملک چھینے۔ یہی ملک و مال کا لالچ ظلم و سرکشی کی اصلی بنیاد ہے، اور اسی کی خاطر قومیں رزم آرائیاں کیا کرتی ہیں۔ مگر اسلام اس کی سختی کے ساتھ مذمت کرتا ہے، اور صرف اس سے پرہیز کرنے کی تاکید نہیں کرتا۔ بلکہ ان لوگوں کے خلاف جہاد کرنے کا حکم دیتا ہے جو اس گناہ کا ارتکاب کرتے ہیں۔ جیسا کہ فتنہ وفساد کی تحقیق میں تشریح بیان ہو چکا ہے۔ قرآن مجید کے علاوہ اس بارے میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات بھی نہایت صاف اور واضح ہیں۔ حدیث صحیح ہے کہ

من اقتطع شبرا من ارض ظلما طوقه الله اياه يوم القيمة من سبع ارضين (رواہ مسلم)	جس کسی نے ایک بالشت بھر زمین بھی ظلم سے حاصل کی اس کو اللہ قیامت کے دن سات زمینوں کو طوق کا عذاب دے گا۔

ایک اور حدیث میں ہے کہ:-

ان هذا المال حلوة من اخذه بحقه ووضعه في حقه فنعم المؤنة هو ومن اخذه بغير حقه كان كالذي يأكل ولا يشبع	یہ مال و دولت ایک مزیدار چیز ہے۔ جس کسی نے اسے حق کے ساتھ حاصل کیا اور حق کی جگہ خرچ کیا اس کے لئے تو وہ بہترین توشہ ہے۔ مگر جس نے اسے بغیر حق کے حاصل کیا تو وہ اس شخص کی طرح ہے جو کھائے مگر سیر نہ ہو سکے۔

قرآن مجید اور احادیث نبوی میں اسلام کے سیاسی اخلاق کی نہایت جزئی تفصیلات تک موجود ہیں۔ مگر یہ موقع اس قانون کی تفصیل کا نہیں ہے۔ مختصر یہ ہے کہ اسلام نے حکومت و اقتدار کی ان تمام لذتوں کو حرام قرار دیا ہے جن کے لالچ میں انسان اس کے حصول کی کوشش کرتا ہے۔ اسلام کا حکمران نہ نوعیت کے عام افراد سے ممتاز کوئی بالاتر ہستی ہے۔ نہ وہ عظمت و رفعت کے تخت پر بیٹھ سکتا ہے۔ نہ وہ اپنے آگے کسی کی گردن جھکوا سکتا ہے۔ نہ قانون حق کے خلاف ایک پتہ ہلا سکتا ہے۔ نہ اسے یہ اختیار حاصل ہے کہ اپنے کسی خاندان والے یا خود اپنی ذات کو کسی ادنیٰ سے ادنیٰ ہستی کے جائز حق سے بھی بچائے۔ نہ وہ حق کے خلاف ایک حبہ لے سکتا ہے اور نہ ایک چپہ بھر زمین پر قبضہ کر سکتا ہے [illegible]

غالب رہتا ہے کہ اس کے اعمال کا سخت حساب لیا جائیگا۔ اور اگر حرام کا ایک پیسہ، جبر سے لی ہوئی زمین کا ایک چپہ، تکبر و فرعونیت کا ایک شمہ، ظلم و بے انصافی کا ایک ذرہ، اور ہوائے نفسانی کی بندگی کا ایک شائبہ بھی اس کے حساب میں نکل آیا تو اسے اسکی سزا بھگتنی پڑیگی۔

اسلام میں حاکم یا فرمانروا کی اصلی حیثیت اور اس کی منصبی ذمہ داریوں کی صحیح کیفیت

حضرت ابوبکرؓ نے خلیفہ منتخب ہونے کے بعد اپنے خطبہ میں بیان کی تھی انہوں نے فرمایا:۔

یا ایہا الناس! قد ولیت امرکم ولست بخیرمنکم۔ وان اقواکم عندی الضعیف حتیٰ اٰخذ لہ بحقہ وان اضعفکم عندی القوی حتی اٰخذ منہ ایہا الناس ما انا الا کا حدکم فاذا رأیتمونی قد استقمت فاتبعونی وان زاغت فقومونی

اے لوگو! مجھے تمہاری حکومت کا کام سپرد کیا گیا ہے۔ مگر میں تم سے بہتر نہیں ہوں۔ میرے نزدیک ضعیف آدمی تم میں سب سے زیادہ قوی ہے۔ جبتک کہ اس کا حق اسے نہ دلوا دوں۔ اور قوی آدمی تم میں سب سے زیادہ ضعیف ہے۔ جبتک کہ اس سے حق وصول نہ کرلوں۔ لوگو میری حیثیت تمہارے ایک معمولی فرد سے زیادہ نہیں ہے۔ اگر تم مجھے سیدھی راہ پر چلتے دیکھو تو میری پیروی کرو۔ اور اگر دیکھو کہ ٹیڑھا ہوگیا ہوں تو مجھے سیدھا کردو۔

اسی طرح خلیفہ دوم حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اپنے ایک خطبہ میں اسی کیفیت کا صحیح نقشہ کھینچا ہے۔ فرماتے ہیں کہ:۔

انما انا ومالکم کولی الیتیم ان استغنیت استعففت وان افتقرت اکلت بالمعروف لکم علی ایہا الناس خصال فخذونی بہا لکم علی ان لا اجتبی شیئا من خراجکم ولا مما افاء اللہ علیکم۔ الا

تمہارے مال سے میرا تعلق وہی ہے جو یتیم کے ولی کو اس کے مال سے ہوتا ہے۔ اگر میں خوش حال ہوں گا تو کچھہ نہ لونگا اور اگر تنگ دست ہونگا تو جو میرا جائز حق ہوگا وہ لے لونگا۔ تمہارے میرے اوپر حقوق ہیں اور تم ان کا مجھہ سے مطالبہ کرسکتے ہو۔ مجھہ پر فرض ہے کہ تمہارے خراج میں سے اور اس مال سے جو اللہ نے تمہیں غنیمت میں عطا فرمایا ہے۔ کوئی چیز بیجا وصول نہ کروں۔ اور تمہارا مجھہ پر یہ حق ہے کہ جو کچھہ میرے ہاتھہ میں آئے

من وجد، والکم علی اذا وقع فی یدی ان لا یخرج منی الا فی حقہ | وہ جائز مصرف کے سوا کسی اور صورت سے نہ نکلے۔

اس طرح ہر قسم کی شاہانہ طمطراق، حاکمانہ مطلق العنانی، مال و دولت کی فراوانی، اور نفس کی تمام لذتوں اور راحتوں کو نکال دینے کے بعد حکومت کی ذمہ داریوں کا جو خشک اور بے مزہ حصہ باقی رہ جاتا ہے وہ خود اسلام ہی کی زبان میں یہ ہے کہ:۔

اَلَّذِیْنَ اِنْ مَّکَّنّٰهُمْ فِی الْاَرْضِ اَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتَوُا الزَّکٰوةَ وَاَمَرُوْا بِالْمَعْرُوْفِ وَنَهَوْا عَنِ الْمُنْکَرِ (۲۲: ۶)	ان کو اگر ہم زمین میں قدرت و اختیار عطا کریں تو وہ نماز قائم کریں گے، زکوٰۃ دیں گے، نیکی کا حکم کریں گے اور برائی سے روکیں گے۔

یہ اسلام کا صرف دعویٰ ہی نہیں ہے، بلکہ داعی اسلام علیہ الصلوٰۃ والتسلیم اور آپ کے خلفاء راشدین رضی اللہ عنہم نے اس کا پورا عملی نمونہ دنیا کے سامنے پیش کیا ہے۔ اس کتاب کا موضوع قانون کی تشریح ہے، تاریخ کا استقصا نہیں ہے، تاہم جب ذکر چھڑ گیا ہے۔ تو ہم چند مثالیں پیش کرکے یہ بتائیں گے کہ اسلامی حکومت کا معیار کیا ہے۔

بنی مخزوم کی ایک معزز عورت فاطمہ بنت اسد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے چوری کے الزام میں گرفتار ہو کر آتی ہے۔ قریش کو خوف ہوتا ہے کہ کہیں آپ عام لوگوں کی طرح اس کا بھی ہاتھ کاٹنے کا حکم نہ دیدیں۔ سفارش کے لئے آپ کے سب سے زیادہ عزیز و محبوب شخص (اسامہ بن زیدؓ) کو بھیجتے ہیں۔ مگر آپ ان کی سفارش کو یہ کہکر رد کردیتے ہیں کہ تم سے پہلے کے لوگ اسی وجہ سے ہلاک ہوئے کہ وہ کم حیثیت لوگوں پر تو تعزیر کا حکم جاری کرتے تھے اور شریف و معزز لوگوں کو چھوڑ دیتے تھے۔ پھر جوش میں آکر فرماتے ہیں کہ

والذی نفسی بیدہ لو ان فاطمۃ بنت محمد سرقت لقطعت یدھا (بخاری، ابن ماجہ)	اس ذات کی قسم جس کے ہاتھ میں میری جان ہے اگر محمدؐ کی بیٹی فاطمہ بھی چوری کرتی تو میں اس کا ہاتھ کاٹ دیتا۔

جنگ بدر میں قریش کے دوسرے سرداروں کے ساتھ خود رسول اللہ کے داماد (ابوالعاص)
گرفتار ہو کر آتے ہیں۔ عام قیدیوں کی طرح انہیں بھی بند کر دیا جاتا ہے۔ ان کے پاس فدیہ ادا
کرنے کے لئے مال نہیں ہوتا تو کہہ دیتے ہیں کہ گھر سے منگا کر دو، ورنہ قید رہو۔ وہ خود رسول اللہ
کی بیٹی (حضرت زینبؓ) کو پیغام بھیجتے ہیں۔ اور ان کے پاس سے شوہر کے فدیہ میں ایک
قیمتی ہار آتا ہے جو حضرت خدیجہؓ نے رسول اللہ ان کے جہیز میں دیا تھا۔ ہار کو دیکھ کر
رسول اللہ کو اپنی رفیقۂ حیات کی یاد تازہ ہو جاتی ہے اور بے اختیار آنسو نکل آتے ہیں۔
تاہم خود اپنے اختیار سے فدیہ معاف نہیں کرتے عام مسلمانوں سے اجازت مانگتے ہیں
کہ اگر تم پسند کرو تو بیٹی کو اس کی ماں کی یادگار واپس کر دی جائے، اور جب عام مسلمان
اس کی اجازت دیدیتے ہیں۔ اس وقت رسول اللہ کے داماد کو بغیر فدیہ کے رہائی نصیب ہوئی
ہے۔ (طبری۔ ابوداؤد)
حدیبیہ کے مقام پر رسول خدا اور کفار قریش کا معاہدہ ہوتا ہے۔ صلح کی شرائط
طے ہو چکی ہیں اور معاہدہ کی کتابت ہو رہی ہے۔ عین اس حالت میں ایک مسلمان (ابوجندل
بن سہیل) کفار کی قید سے بھاگ کر آتے ہیں۔ ان کے پاؤں میں بیڑیاں ہیں۔ بدن پر
مار کے اتنے زخم ہیں کہ چور چور ہو رہا ہے۔ وہ مسلمانوں کے آگے گر پڑتے ہیں۔ اور کہتے ہیں
کہ خدارا مجھے ان کی قید سے نکالو۔ رسول اللہ کی رکاب میں ۱۴ سو تلوار بند مسلمان ہیں اور
آپ کے ایک اشارہ میں ابوجندل کو رہائی مل سکتی ہے، مگر کفار سے شرط ہو چکی ہے کہ "قریش
والوں میں سے جو شخص مسلمانوں کے پاس جائے گا وہ واپس کر دیا جائے گا۔
اور مسلمانوں میں سے جو شخص مکہ جائے گا۔ وہ واپس نہ کیا جائے گا۔
اس لئے رسول اللہ انہیں اپنی حمایت میں لینے سے انکار کر دیتے ہیں۔
وہ اپنے زخم دکھا کر فریاد کرتے ہیں کہ کیا آپ مجھے پھر اسی ظلم کا تختۂ مشق بننے کے لئے واپس
کرتے ہیں؟ مگر جواب ملتا ہے:۔

یا ابا جندل! اصبر واحتسب	ابوجندل! صبر کر اور ضبط سے کام لے۔ ہم
فانا لا نغدر ان اللہ جاعل لک	بدعہدی نہیں کر سکتے اللہ تیرے لئے رہائی کی کوئی

فرجاً و مخرجاً۔ (فتح الباری ج ۵ باب الشروط فی الجہاد) | صورت نکالے گا۔

جنگ یرموک کے موقع پر قیصر روم لاکھوں کی فوج مسلمانوں کے مقابلہ پر جمع کرتا ہے۔ اور شام و فلسطین سے مسلمانوں کو نکالدینے، بلکہ ان کی قوت کو کچل دینے کا عزم کر لیتا ہے۔ اس فیصلے کی گھڑی میں اپنی قوت کے بچاؤ کے لئے مسلمانوں کو ایک ایک پیسہ کی ضرورت ہوتی ہے مگر اس کے باوجود وہ حمص کے باشندوں کو جمع کرتے ہیں اور جو خراج ان سے وصول کیا تھا اسے یہ کہہ کر واپس کر دیتے ہیں کہ ہم اب تمہاری حفاظت سے قاصر ہیں۔ اس لئے اب تم اپنا انتظام خود کرو۔ اس پر اہل حمص کہتے ہیں کہ "تمہارا عدل و انصاف ہم کو اس ظلم و جور سے زیادہ عزیز ہے جس میں ہم پہلے مبتلا تھے۔ ہم ہرقل کی فوج سے تمہارے عامل کی قیادت میں مقابلہ کرینگے" (فتوح البلدان للبلاذری) یہ بات یاد رہے کہ ہرقل ایک عیسائی بادشاہ تھا، اور یہ لوگ بھی جو اپنے مسلمان حکمرانوں کی طرف سے اس کے خلاف لڑنا چاہتے تھے، عیسائی تھے اور صدیوں سے رومی سلطنت کے زیر حکومت تھے۔

جنگ صفین میں جاتے وقت خلیفہ چہارم حضرت علیؓ کی زرہ کھوئی جاتی ہے۔ جنگ سے واپس آتے ہیں تو وہی زرہ دار الخلافہ کے ایک یہودی کے پاس پائی جاتی ہے۔ آپ اس زرہ کا مطالبہ کرتے ہیں۔ مگر وہ کہتا ہے کہ یہ تو میری ملک ہے اور ہمیشہ سے میرے ہی قبضہ میں ہے۔ خلیفہ وقت کو یقین ہے کہ یہودی جھوٹ بول رہا ہے اور یہ وہی زرہ ہے جو کھوئی گئی تھی۔ مگر باوجود اس کے وہ اپنے شاہانہ اختیارات سے کام نہیں لیتے بلکہ ایک بے بس مدعی کی طرح قاضی شریح کی عدالت میں جا کر استغاثہ کرتے ہیں۔ قاضی ان کی جلیل القدر شخصیت سے قطع نظر کر کے محض ان کے دعوے پر فیصلہ نہیں کرتا۔ کہتا ہے کہ آپ زرہ کی ملکیت کا ثبوت پیش کیجئے۔ وہ اپنے غلام قنبر اور اپنے بیٹے اور رسول اللہؐ کے نواسے امام حسنؓ کو بطور شہادت پیش کرتے ہیں تو قاضی کہتا ہے کہ امام حسنؓ کی شہادت معتبر نہیں۔ کیونکہ وہ آپ کے بیٹے ہیں اور باپ کے دعوی پر بیٹے کی شہادت تسلیم نہیں کی جا سکتی۔ یہ حال دیکھ کر یہودی باآواز بلند کلمۂ طیبہ پڑھتا ہے اور پکار اٹھتا ہے کہ جس دین میں یہ انصاف ہے

وہ ضرور سچی دین ہے۔ (سیوطی)

خلیفہ دوم حضرت عمرؓ کے پاس ان کا ایک عامل جزیہ کی کثیر رقم لیکر حاضر ہوتا ہے۔ آپ پوچھتے ہیں کہ یہ کیا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ "جزیہ ہے جو ذمیوں سے وصول کیا گیا ہے" مال کی کثرت کو دیکھ کر آپ کو گمان ہوتا ہے کہ جبراً وصول کیا گیا ہوگا۔ فرماتے ہیں کہ کہیں تم نے لوگوں کو تباہ تو نہیں کر دیا" وہ کہتا ہے کہ "خدا کی قسم ہم نے نہایت نرمی سے وصول کیا ہے" پوچھتے ہیں کہ "بغیر مارے باندھے؟" وہ پھر عرض کرتا ہے کہ "واللہ بغیر مارے باندھے" تب کہیں وہ رقم بیت المال میں داخل کی جاتی ہے (فتح البیان) امام ابو یوسفؒ اپنی کتاب الخراج میں لکھتے ہیں کہ حضرت عمرؓ کے پاس جب عراق کا خراج آتا تھا تو دس ذمہ دار افسر کوفہ سے اور دس بصرہ سے ان کی خدمت میں حاضر ہوتے اور چار مرتبہ شرعی قسم کھا کر آپ کو یقین دلاتے تھے کہ یہ رقم حلال ہے۔ اور کسی مسلمان یا ذمی معاہد سے ظلم کے ساتھ وصول نہیں کی گئی ہے۔

حضرت عمرؓ کے بیٹے ابو شحمہؓ شراب پیتے ہیں تو ایک معمولی مجرم کی طرح گرفتار کر لئے جاتے ہیں، خود حضرت عمرؓ اپنے ہاتھ سے انہیں ۸۰ کوڑے لگاتے ہیں۔ اور ان کوڑوں کے صدمہ سے ان کا انتقال ہو جاتا ہے۔ عمرو ابن عاصؓ گورنر مصر کے بیٹے، عبداللہ ایک شخص کو مارتے ہیں۔ وہ دربار خلافت میں استغاثہ کرتا ہے، اور حضرت عمرؓ خود اسی شخص کے ہاتھ سے عبداللہؓ کو کوڑے لگوا دیتے ہیں۔ خود عمرو بن عاصؓ کے متعلق خبر آتی ہے کہ ان کے پاس بہت دولت اکٹھی ہو گئی ہے۔ انہیں لکھتے ہیں کہ "گورنر ہونے سے پہلے تو تمہارے پاس اتنا ساز و سامان نہ تھا اب یہ کہاں سے آ گیا؟" وہ جواب دیتے ہیں کہ "میرا صوبہ ایک زرخیز علاقہ ہے۔ اس لئے میرے پاس میرے خرچ سے بہت کچھ مال بچ رہتا ہے" یہ جواب حضرت عمرؓ کو مطمئن نہیں کرتا۔ آپ محمدؓ ابن مسلمہ کو پورے اختیارات دیکر بھیجتے ہیں۔ وہ مصر پہنچکر ان کے مال کی جانچ پڑتال کرتے ہیں۔ ان کے پچھلے اثاثہ کا حساب کرتے ہیں۔ گورنری کے زمانہ میں اس مالی پر جو معقول اضافہ ہو سکتا تھا اس کا اندازہ لگاتے ہیں، اس کے بعد جو زائد مال بچتا ہے اسے ضبط کر کے بیت المال میں داخل کر دیتے ہیں۔ مصر کا با اختیار گورنر

جس کی حدود مملکت طرابلس تک پہنچی ہوئی تھیں۔ یہ سب کچھ دیکھتا ہے۔ دم نہیں مار سکتا

(بلاذری)

مغیرہ بن شعبہؓ والی بصرہ کی شکایت آتی ہے کہ انہیں ایک عورت کا ناجائز تعلق ہے۔ یہ سنتے ہی حضرت عمرؓ ابوموسیٰ اشعری کو حکم دیتے ہیں کہ بصرہ میں شیطان نے آشیانہ بنا لیا ہے۔ تم وہاں گورنری کا جائزہ لے لو اور مغیرہ کو گواہوں سمیت مدینہ بھیجو۔ حکم کے مطابق مغیرہ مدینہ بھیجے جاتے ہیں۔ خود حضرت عمرؓ کی عدالت میں مقدمہ پیش ہوتا ہے۔ جرح میں گواہ ٹوٹ جاتے ہیں۔ شہادتوں میں شدید اختلاف واقع ہوتا ہے۔ جرم ثابت نہیں ہوتا اس لئے مغیرہ کو رہائی دیتے ہیں۔ اور فرماتے ہیں کہ "اگر شہادت پوری ہو جاتی تو میں یقیناً تم کو سنگسار کر دیتا۔"[1] یہ مغیرہؓ رسول اللہ کے جلیل القدر صحابی تھے۔ عرب کے چند مشہور ترین مدبروں میں سے ایک تھے، اسلام کی بڑی بڑی سیاسی و جنگی خدمات انجام دی تھیں مگر ان کی عظمت شان بیش قیمت خدمات گورنری کی اعلیٰ پوزیشن عرب میں ان کی شہرت و عزت غرض کوئی چیز ان کے کام نہ آئی اور ایک معمولی مجرم کی طرح انہیں پیش ہونا پڑا۔ دنیاوی حکومتوں میں کسی افسر کا بدکاری کرنا اس کا شخصی معاملہ ہے بلکہ آجکل کی مہذب ترین حکومتوں کے قوانین میں بھی زنا اگر طرفین کی رضامندی سے ہو تو کوئی قابل سزا جرم نہیں ہے۔ لیکن جس حکومت کا اصلی مقصد انسانیت کی اصلاح اور امر بالمعروف و نہی عن المنکر تھا۔ اس میں کسی ایسے شخص کے لئے گنجائش نہ تھی جس کا ذاتی عمل درست نہ ہو۔

فارس کے علاقہ میں مسلمان ایک شہر (شہریاج) کا محاصرہ کرتے ہیں۔ اور محصورین کی مزاحمت اس حد تک کمزور ہو جاتی ہے کہ شہر کا فتح ہونا بالکل یقینی ہو جاتا ہے۔ عین اس حالت میں اسلامی فوج کا ایک غلام شہر والوں کے نام امان نامہ لکھتا ہے اور اسے تیر میں باندھ کر شہر میں پھینک دیتا ہے۔ دوسرے دن جب اسلامی فوج شہر پر حملہ کرتی ہے تو اہل شہر دروازہ کھول کر باہر آ جاتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ایک مسلمان ہم کو امان دے چکا ہے؛

[1] یہ واقعہ طبری اور ابن اثیر میں تفصیل کے ساتھ مذکور ہے۔ بلاذری نے بھی تھوڑے سے اختلاف کے ساتھ اس کا ذکر کیا ہے۔

اب تم کیوں برسرپیکار ہو؟ امان نامہ دیکھا جاتا ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ ایک غلام کی تحریر ہے۔ اس معاملہ میں حضرت عمرؓ سے استصواب کیا جاتا ہے کہ اس امان نامہ کی کیا وقعت ہے؟ جواب میں آپ لکھتے ہیں "مسلمان غلام بھی عام مسلمانوں کی طرح ہے۔ اس کے ذمہ کی وہی قیمت ہے جو عام مسلمانوں کے ذمہ کی ہے۔ لہذا اسکی دی ہوئی امان نافذ کیجائے"

(بلاذری ذکر کور فارس)

حضرت ابو بکر صدیقؓ رسول اللہ کے انتقال کے بعد ملک عرب کی سلطنت کے بااختیار حاکم یا بادشاہ منتخب کئے جاتے ہیں اور انتخاب کے دوسرے دن حضرت عمرؓ انہیں دیکھتے ہیں کہ سر پر کپڑوں کے تھان لادے ہوئے بازار جا رہے ہیں۔ حضرت عمرؓ عرض کرتے ہیں کہ "اب آپ مسلمانوں کے امیر ہیں آپ کو یہ کام زیبا نہیں ہے" وہ جواب دیتے ہیں کہ "پھر میں اپنا اور اپنے اہل وعیال کا پیٹ کیونکر پالوں؟" حضرت عمرؓ تجویز کرتے ہیں کہ "یہ کام آپ کے لئے ابو عبیدہؓ کر دیا کریں گے"۔ چنانچہ ان سے خلیفہ اسلام کا یہ معاملہ طے ہوتا ہے کہ وہ ان کی تجارت کا کام سنبھالیں اور ان کے اہل وعیال کے لئے ایک متوسط درجہ کے مہاجر کی خوراک اور گرمی جاڑے کا کپڑا مہیا کر دیا کریں۔ پھر بیت المال سے ان کے لئے ۵۰۰ درہم (آجکل کے حساب سے سو روپے سے کچھ زائد) ماہانہ تنخواہ مقرر ہو جاتی ہے۔ جب انتقال کا وقت قریب آتا ہے تو لوگوں سے کہتے ہیں کہ خلیفہ ہونے کے بعد سے میرے مال میں جو کچھ اضافہ ہوا ہو اس کا حساب کرنا اور وہ سب نئے خلیفہ کے سپرد کر دینا۔ چنانچہ انتقال کے بعد جب حساب کیا جاتا ہے تو ایک اونٹنی، ایک زنگی غلام، اور ایک پرانی چادر کے سوا کچھ نہیں نکلتا۔

(فتح الباری ج ۵۔ کتاب البیوع)

حضرت عمرؓ کے زمانہ میں اسلامی فتوحات کا سیلاب ایران سے لیکر شمالی افریقہ تک پہنچ گیا تھا۔ غنائم اور اموال خراج کی اس قدر کثرت تھی کہ کروروں درہم سالانہ خزانہ میں داخل ہوتے تھے۔ قیصر وکسریٰ کے سارے خزانے مسلمانوں کے قبضہ میں آ گئے تھے۔ مگر خود اس سلطنت کے بادشاہ کا یہ حال تھا کہ بدن پر بارہ بارہ پیوند لگے ہوئے کپڑے ہوتے تھے۔ پاؤں میں پھٹی ہوئی چپلی۔ اور سر پر بوسیدہ عمامہ پہنے ہوئے یتیموں، بیواؤں اور

ضرورتمندوں کی خبرگیری کرتے پھرتے تھے۔ روم و عجم کے لوگ آتے تو انہیں عام مسلمانوں میں "شہنشاہ" عرب کو پہچاننا مشکل ہوتا تھا۔ شام کا سفر کیا تو اس شان سے کہ لوگ خلیفۂ اسلام اور اس کے غلام میں تمیز نہ کرسکے۔ فتح بیت المقدس کے موقع پر شہر میں داخل ہوئے تو پیادہ پا تھے۔ اور ایسے موٹے کپڑے پہنے ہوئے تھے کہ مسلمانوں کو عیسائیوں کے خیال سے شرم آنے لگی۔ اونٹ کا دودھ، زیتون کا تیل، سرکہ اور گیہوں کی روٹی، یہ بہتر سے بہتر غذائیں تھیں جو انہیں نصیب ہوتی تھیں۔ جب انتقال ہوا تو گھر میں اتنا اثاثہ نہ تھا کہ قرضے ادا کیے جاتے اس لئے رہنے کا مکان بیچا گیا اور اس سے قرضے ادا کیے گئے۔

یہ واقعات، قصہ و افسانہ نہیں، تاریخ کے مستند حقائق ہیں۔ ذرا دیکھ کر بتاؤ کہ دنیا میں اس سے بہتر حکومت کا کوئی اور بھی نمونہ موجود ہے؟ جن لوگوں کا آئین سروری اس تقویٰ و طہارت، خشیتِ الٰہی، اس بےنفسی و بےغرضی، اس حریت و مساوات، اس عدل و وفا شعاری، اس دیانت و امانت پر قائم ہو، کیا ان کا یہ دعویٰ جھوٹا ہے کہ دنیا پر حکومت کرنا یا بالفاظ صحیح دنیا کی خدمت کرنا صرف انہی کا حق ہے؟ اگر انہوں نے عجم کے عیش پرست اور ظالم حکمرانوں سے عجم کا تخت خالی کرالیا، اگر انہوں نے روم کے سیہ کار و جفا پیشہ فرمانرواؤں کو روم کی حکومت سے بیدخل کردیا، اگر انہوں نے تمام شیطانی حکومتوں کے تختے الٹ دیے اور ان کی جگہ اپنی حکومت قائم کی تو بتاؤ کہ یہ انسانیت پر ظلم تھا یا اس کی خدمت تھی؟ ان کے مقابلہ میں مغرب کے ان جھوٹے مدعیوں کی کیا وقعت ہے جن کو تقویٰ و پرہیزگاری سے واسطہ نہیں، وفائے عہد کی ہوا تک نہیں لگی، عدل و انصاف اور دیانت و امانت سے جن کو بیر ہے، اور بجز ملک گیری کی ہوس، مال و زر کی حرص، اور حصولِ اقتدار کی خواہش کے کسی اور جذبہ سے آشنا نہیں ہیں؟

ہم کو تسلیم ہے کہ مسلمانوں کی تمام حکومتوں کا عمل اس نمونہ کے مطابق نہیں ہے جو اسلام نے پیش کیا ہے۔ مگر یہ نقص اسلام کا نہیں، اس کے پیرووں کا ہے۔ اسلام تو ایک قانون ہے جو قرآن، سنتِ رسول اور سنتِ خلفائے راشدین سے ماخوذ ہے۔ جو حکومت اس قانون کے مطابق عمل کرتی ہے وہ اسلامی حکومت ہے، اور جس کا عمل اس کے

خلاف ہے وہ اسلامی حکومت نہیں ہے۔ ہمارے لئے مسلمان بادشاہوں کا عمل حجت نہیں ہے، بلکہ اسلام کا قانون حجت ہے، اس میں اگر کوئی نقص ہو تو اسے پیش کیا جائے۔

اسلامی فتوحات کی توجیہ

آیندہ مباحث کی طرف قدم بڑھانے سے پہلے یہاں ایک اور مسئلہ کو صاف کر دینا ضروری ہے۔ اس کتاب میں بار بار یہ بیان کیا گیا ہے۔ اور آیندہ بھی اس حقیقت کا جگہ جگہ ذکر آئیگا کہ اسلامی شریعت میں ملک گیری کی غرض سے تلوار اٹھانا قطعاً حرام ہے۔ اس کے متعلق یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ جب یہ فعل حرام ہے تو آخر صحابۂ کرامؓ اور خلفائے راشدینؓ کے ان حملوں کی کیا توجیہ کی جائیگی جو انہوں نے عراق، شام، ایران، ارمینیا، مصر، اور شمالی افریقہ وغیرہ ممالک پر کئے؟ یہ اعتراض مخالفین اسلام نے بڑی شدومد کے ساتھ پیش کیا ہے، اور مسلمان مورخین و مصنفین نے اس کے نہایت مفصل جوابات دئے ہیں لیکن ان میں کسی نے غور نہیں کیا کہ اس معاملہ میں اسلام اور غیر مسلموں کے نقطۂ نظر میں شدید اختلاف ہے۔ اسی لئے جن لوگوں نے غیر مسلموں کے نقطۂ نظر کی رعایت کرکے جواب دیا ہے انہوں نے اسلام کی غلط ترجمانی کی ہے، اور جنہوں نے اس سے بالکل بے پروا ہو کر جواب دیا ہے وہ مزید تشکوک پیدا ہونے کے موجب ہوئے ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ اسلام حکومت کے معاملہ میں "قومی" اور "اجنبی" کی کوئی تمیز نہیں کرتا، بلکہ "عدل" اور "ظلم" کو وجہ امتیاز قرار دیتا ہے۔ اگر ایک ملک کی حکومت خود اس کے اپنے باشندوں کے ہاتھ میں ہو لیکن اس کے حکمران بدکار، ظالم، نفس پرست، اور ناخدا ترس ہوں۔ تو اسلام کی نگاہ میں وہ اسی قدر نفرت کے قابل ہیں جس قدر ایک اجنبی حکومت کے ایسے ہی بدکردار عمال ہو سکتے ہیں۔ اسی طرح اگر ایک عجمی عرب پر حکومت کرتا ہے اور تمام امور میں عدل، انصاف، دیانت، اور خشیۃ الٰہی کو ملحوظ رکھتا ہے، مظلوموں کی دادرسی کرتا ہے، حق والوں کے حق دلواتا ہے، تکبر و تعلی نہیں کرتا، نفس پروری و غرض پرستی سے احتراز کرتا ہے، اور رعیت کی اصلاحِ حال کے سوا کسی ادنیٰ ذاتی غرض کے لئے اپنی قوتوں کو استعمال نہیں

کرتا، تو اسلام [illegible] نزدیک عرب کے لئے وہ عجمی اس عربی حکمران سے بہتر ہے جو ان صفات سے عاری ہو۔ یہ خیال کہ ظالم عرب عربوں کے لئے عادل عجمی سے بہتر ہے، اور ترکی خواہ کتنا ہی نیک اور صالح ہو، مگر صرف اس لئے کہ وہ ترکی ہے عراقی اسے قبول نہیں کر سکتے۔ ایک ایسا خیال ہے جسے اسلام اصلاً غلط اور کلیتہً باطل سمجھتا ہے۔ اس معاملہ کو وہ "وطنیت" کی نظر سے نہیں بلکہ خالص "انسانیت" کی نگاہ سے دیکھتا ہے، اس کا عقیدہ یہ ہے کہ "صالح" انسان بہرحال "غیر صالح" کے مقابلہ میں قابل ترجیح ہے، اور صلاحیت میں اپنے اور پرائے، وطنی اور اجنبی، ہندی و عراقی، زنگی و فرنگی، کالے اور گورے کی کوئی تمیز نہیں ہے۔

اسلام کے اس عقیدہ کے مطابق حکومت کی اچھائی کا معیار نہ اس کا خود اختیاری یا وطنی ہونا ہے اور نہ اس کی برائی کا معیار اجنبی یا غیر خود اختیاری ہونا۔ یہ سب اغراض ہیں۔ جوہری سوال صرف یہ ہے کہ حکومت کا نظام عادلانہ اور حق پرستانہ ہے یا نہیں ہے۔ اگر پہلی صورت ہے تو اسلام اس کے مٹانے کی کوشش تو درکنار ایسے ارادہ کو بھی گناہ اور ظلم عظیم سمجھتا ہے لیکن دوسری صورت میں وہ ایک ظالمانہ نظام حکومت کو مٹا کر ایک سچا عادلانہ نظام حکومت قائم کرنا اولین فرض قرار دیتا ہے "وطنیت" اور "اجنبیت" کے سوال سے اس نے نفیاً یا اثباتاً کوئی تعرض نہیں کیا ہے جس کے معنی یہ ہیں کہ اس کے نزدیک حکومت کے اچھے یا برے ہونے کے سوال پر اس کے قومی ہونے یا نہ ہونے کا کوئی اثر نہیں ہے۔ یہ دوسری بات ہے کہ غیر قومی حکومت عموماً ظالم و جابر ہوتی ہے۔ کیونکہ ایک قوم دوسری قوم پر حکومت قائم ہی اس لئے کرتی ہے کہ اسے غلام بنا کر اپنی مصلحت کیلئے استعمال کرے۔ اور اس کے برعکس قومی حکومت میں اصلاح پذیری کی صلاحیت زیادہ ہوتی ہے۔ لیکن باوجود اس کے یہ ضروری نہیں ہے کہ قومی حکومت ہر حال میں بہتر ہو، اور غیر قومی حکومت کسی حال میں عادل نہ ہو۔ ہو سکتا ہے کہ ایک قوم پر خود اس کے اپنے سرکش افراد شیطان کی طرح مسلط ہو جائیں اور اسے اپنی شخصی اغراض کا غلام بنا کر تباہ و برباد کر دیں اسی طرح یہ بھی ممکن ہے کہ ایک قوم کو غیر قوم کے نیک نفس اور بے غرض مصلحین ظلم و استبداد کے پنجہ سے رہائی دلائیں اور اس کے لئے مادی و اخلاقی ترقی کی راہیں کھول دیں۔ پس حکومت کی

خوبی کا اصلی معیار اس کا عادل و صالح ہونا ہے اور اس کی برائی کا اصلی معیار غیر عادل اور غیر صالح ہونا۔

اس سے یہ مطلب نکالنا صحیح نہیں ہے کہ اسلام قومی حکومت کا دشمن ہے۔ وہ ہر قوم کے اس حق کو تسلیم کرتا ہے کہ وہ اپنے احوال کی اصلاح خود کرے۔ مگر جب کسی قوم کے اعمال بگڑ جائیں اسکی اخلاقی حالت خراب ہو جائے اور وہ اپنے شریر و مفسد لوگوں کی پیروی و اطاعت اختیار کرکے ذلت و مسکنت کی پستیوں میں گر جائے، تو اسلام کے نزدیک اس قوم کو حکومت خود اختیاری کا حق باقی نہیں رہتا اور دوسرے لوگوں کو جو اس کے مقابلہ میں اصلح ہوں، اس پر حکومت کرنے کا حق حاصل ہو جاتا ہے۔ قرآن حکیم میں نافرمان اور بدکار قوموں کو جگہ جگہ یہ دھمکی دی گئی ہے کہ:-

وَإِنْ تَتَوَلَّوْا يَسْتَبْدِلْ قَوْمًا غَيْرَكُمْ ثُمَّ لَا يَكُونُوا أَمْثَالَكُمْ (۴۷: ۳۸)

اگر تم روگردانی کروگے تو اللہ تمہارے بدلے دوسری قوم کو کھڑا کرے گا۔ اور وہ لوگ تم جیسے نہیں ہونگے۔

اور

إِلَّا تَنْفِرُوا يُعَذِّبْكُمْ عَذَابًا أَلِيمًا وَيَسْتَبْدِلْ قَوْمًا غَيْرَكُمْ وَلَا تَضُرُّوهُ شَيْئًا (۹: ۶)

اگر تم راہ الٰہی میں جہاد کے لیے نہ نکلو گے تو اللہ تمہیں دردناک مصائب میں مبتلا کرے گا۔ اور تمہارے بدلے دوسری قوم کو کھڑا کردے گا۔ اور تم اسکا کچھ نہ بگاڑ سکو گے۔

اور

إِنْ يَشَأْ يُذْهِبْكُمْ أَيُّهَا النَّاسُ وَيَأْتِ بِآخَرِينَ (۴: ۱۹)

اگر خدا چاہے تو اے لوگو! تمہیں لیجائے اور دوسرے لوگوں کو تمہاری جگہ لے آئے۔

اس معنی کی آیات قرآن میں بکثرت آئی ہیں، اور ان سب کا منشا یہ ہے کہ حکومت اور بادشاہی کا حق صلاحیت کے ساتھ مشروط ہے، جو قوم صلاحیت کو کھو دیتی ہے وہ اس حق کو بھی کھو دیتی ہے۔ اور جو صلاحیت اپنے اندر پیدا کر لیتی ہے۔ وہ اس حق کو بھی حاصل کر لیتی ہے۔ اس صلاحیت کو محض قوت و طاقت کا ہم معنی نہ سمجھو، بلکہ یہ جوہر خاص ان لوگوں کے لئے مخصوص ہے جو ایک خدا کی بندگی کرتے ہیں، برے اعمال سے روکتے ہیں۔ اچھے اعمال کا حکم دیتے ہیں۔

ہر عمل خیر کے انجام دینے پر مستعد رہتے ہیں، اور یقین رکھتے ہیں کہ ایک دن انہیں اپنے اعمال کا پورا پورا حساب دینا پڑے گا۔ يُؤْمِنُونَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَيَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَيُسَارِعُونَ فِي الْخَيْرَاتِ وَاُولٰٓئِكَ مِنَ الصّٰلِحِيْنَ (۳ : ۱۰۳)

یہ صالح لوگ کسی ایک قوم یا ایک ملک کی جائداد نہیں ہیں بلکہ تمام نوع بشری اور کائنات انسانی کی مشترکہ جائداد ہیں۔ آدم کی ساری اولاد کو ان کی صلاحیت سے فائدہ اٹھانے کا حق ہے، اور اگر وہ اپنی خدمات کو بلا ضرورت کسی محدود جماعت یا رقبہ کے لیے مخصوص کر دیں، تو یقیناً یہ انسانیت پر ان کا ظلم ہو۔ اسلام نے ان کے لیے رنگ یا نسل یا جغرافی تقسیم کے قبیل سے کوئی حد مقرر نہیں کی ہے، بلکہ بلا قید تمام روئے زمین کے لیے ان کی قابلیتوں کے فوائد کو عام کر دیا ہے، چنانچہ قرآن مجید میں بتصریح ارشاد ہوتا ہے کہ

وَلَقَدْ كَتَبْنَا فِي الزَّبُوْرِ مِنْۢ بَعْدِ الذِّكْرِ اَنَّ الْاَرْضَ يَرِثُهَا عِبَادِيَ الصّٰلِحُوْنَ (۲۱ : ۷)	ہم نے زبور میں نصیحت کے بعد لکھ دیا تھا کہ زمین کے وارث میرے صالح بندے ہونگے۔

یہ حکومت و سلطنت کے متعلق اسلامی تعلیم کی اصلی روح ہے۔ اس کو سمجھ لینے کے بعد صحابۂ کرامؓ کے ان فاتحانہ اقدامات کی علت بہ آسانی سمجھ میں آسکتی ہے جن سے انہوں نے قیصر و کسریٰ کی بادشاہی کے تخت الٹ دیے اور باطل کی فرمانروائی کے سارے طلسم کو درہم برہم کر دیا۔ انہوں نے اپنے ملک کی اصلاح سے فارغ ہو کر جب باہر کی دنیا پر نظر دوڑائی تو دیکھا کہ تمام ہمسایہ ممالک پر ظالم بادشاہ اور جابر امراء مسلط ہیں۔ قوت والوں نے کمزوروں کو غلام بنا لیا ہے۔ دولت والوں نے غریبوں کو خرید رکھا ہے۔ انسان، انسان کا خدا بنا ہوا ہے۔ عدل، انصاف، قانون، کوئی چیز نہیں ہے۔ بادشاہوں اور حاکموں کی خواہشات پر ہزاروں لوگوں کے حقوق پامال ہوتے ہیں، عورتیں لٹتی ہیں، گھر برباد ہوتے ہیں، اور قوموں کی قسمتوں کے فیصلے ہو جاتے ہیں۔ غریب محنتی لوگ اپنا خون پانی ایک کر کے جو دولت کماتے ہیں وہ حرام خوروں کی زیادتیوں سے لوٹ جاتی ہے اور امراء کی عیش پسندیوں میں برباد کی جاتی ہے۔ حاکم لوگ خود پرلے درجے کے سیاہ کار، بد عمل اور ہوس پرست ہیں، اس لئے رعیت بھی ہر قسم کی

معصیتوں میں مبتلا ہے۔ شراب، زنا اور قمار کی عام اجازت ہے، رشوت اور خیانت کا بازار گرم ہے، نفس انسانی کی شرارتوں نے اخلاق و انسانیت کی تمام قیود کو توڑ دیا ہے۔ بہیمی خواہشات کو پورا کرنے کے لئے انسان کسی قید سے آشنا نہیں رہا۔ اور اس کے اخلاق کی دنائت اس حد کو پہنچ گئی ہے کہ اگر تمدن کی اوپری شان و شوکت کے پردے اٹھا کر اسے دیکھا جائے تو حیوانوں کو بھی اس کی حیوانیت پر شرم آنے لگے۔[۱]

انسانی برادری کو اس ذلیل حالت میں مبتلا دیکھ کر صالحین کی وہ سرفروش جماعت اصلاح کے لئے کمربستہ ہوگئی پہلے اس نے وعظ و تذکیر سے کام لیا اور کسرائے عجم، قیصر روم، اور مقوقس مصر کو دعوت دی کہ اسلام کے قانون عدل و حق پرستی کو اختیار کریں جب انہوں نے اس دعوت کو رد کر دیا تو پھر مطالبہ کیا کہ حکومت و فرمانروائی کی مسند کو ان لوگوں کے لئے خالی کر دیں جو اس کے اہل ہیں۔ مگر جب اس مطالبہ کو بھی رد کر دیا گیا اور اس کے جواب میں تلوار پیش کی گئی تو مٹھی بھر انسانوں کی اس بے سر و سامان جماعت نے بیک وقت دو عظیم الشان سلطنتوں کے تختے الٹ دیئے اور سرحد ہندوستان سے لیکر شمالی افریقہ تک جو لوگ ان کے ظلم سے پامال ہو رہے تھے ان سب کو یک لخت آزاد کر دیا۔

تمہیں اختیار ہے کہ ان کے اس فعل کو جہانگیری سے تعبیر کرو یا زیادتی اور تعدی قرار دو مگر تاریخ کے اس

---

[۱] ایران، روم اور مصر وغیرہ ممالک اس وقت سیاسی، اخلاقی اور مذہبی حیثیت سے جس پستی کی حالت میں تھے۔ اس کے ذکر سے تاریخ کی کتابیں بھری پڑی ہیں۔ حرام کاری میں باپ بیٹی اور بھائی بہن تک کی تمیز نہ تھی۔ مذہبی پیشوا تک بدترین اخلاقی جرائم کے ارتکاب کرتے تھے، ایران میں مزدکی مذہب نے سوسائٹی کے سارے نظام کو درہم و برہم کر دیا تھا۔ روم میں امرا اور قیاصرہ کی نفس پرستیوں نے اخلاقی تنزل انتہا کو پہنچا دیا تھا۔ مصر و افریقہ کو رومیوں کی غلامی نے بدترین خصائل کا مجموعہ بنا دیا تھا، اور خود عرب سے متصل شام و عراق میں ان دونوں سلطنتوں کے اثرات نے مفاسد اخلاقی کا ایک طوفان برپا کر رکھا تھا۔ ان حالات کی تفصیل کے لئے میں اسلامی تاریخوں کی بجائے سرجان میلکم اور ایڈورڈ گبن وغیرہ یورپین محققین کی تصانیف پڑھنے کا مشورہ دیتا ہوں۔ لیکی کی "ہسٹری آف یورپین مارلس" خصوصیت کے ساتھ اس عہد کے رومیوں کی اخلاقی حالت ظاہر کرتی ہے۔

بیان کو تم نہیں جھٹلا سکتے کہ انکی حکومت نے ان قوموں کو جس پستی سے نکالا جس میں
وہ گری ہوئی تھیں، انہیں مادی، اخلاقی اور روحانی ترقی کی معراج پر پہنچایا، اور جو ملک
تہذیب و تمدن کے لئے بالکل بنجر ہو گئے تھے ان میں نئے سرے سے
نمو اور روئیدگی کی وہ قوتیں پیدا کیں کہ آجتک عالم انسانی میں انکے
گلزار کی مہک باقی ہے۔ قوم پرستی کا مذہب تو شاید یہی فیصلہ
کرے گا کہ ایران و روم چاہے مٹ جاتے مگر عرب کو ان پر حملہ کرنے کا
حق نہیں تھا، لیکن صداقت کا مذہب یہ کہتا ہے کہ انہوں
نے اس طرح انسانیت کی سب سے بڑی خدمت انجام
دی۔ اور درحقیقت یہ دنیا کی بدقسمتی تھی کہ اسکا
ایک بڑا حصہ اس جماعت کی خدمت سے
محروم رہ گیا جس سے زیادہ صالح"
جماعت سورج کی آنکھ نے
زمین کے چہرے پر کبھی
نہیں دیکھی

اشاعتِ اسلام اور تلوار



اسلامی جنگ کے مقاصد کی اس توضیح میں جو سراسر قرآن مجید احادیث نبوی اور معتبر کتب دینیہ کی تصریحات پر مبنی تھی۔ قارئین کرام نے دیکھ لیا کہ کسی جگہ بھی غیر مسلموں کو بزورِ شمشیر مسلمان کرنے کا حکم موجود نہیں ہے۔ بلکہ کسی حکم میں یہ معنی نکالنے کی بھی گنجائش نہیں ہے کہ اسلام تلوار کے زور سے لوگوں کو اپنی حقانیت کا اقرار کرنے پر مجبور کرتا ہے۔ اسلام کے احکام جنگ میں ایسے کسی حکم کا موجود نہ ہونا بجائے خود اس الزام کی تردید کرتا ہے جو مخالفین نے اس پر لگایا ہے۔ لیکن متعصب اور کج باطن مصنفوں اور ان کے جاہل و کوتہ نظر مقلدوں نے اس معاملہ میں دنیا کو جس قدر دھوکہ دیا ہے۔ اور جس کثرت کے ساتھ غلط فہمیاں پھیلائی ہیں اس کو پیش نظر رکھتے ہوئے ضروری معلوم ہوتا ہے کہ اس مسئلہ کے متعلق بھی اسلام کے اصول و احکام کو پوری وضاحت کے ساتھ بیان کر دیا جائے۔

قرآن مجید کی جن آیات میں احکام جنگ کی تشریح کی گئی ہے ان میں جنگ و خونریزی کی غرض و غایت بتلانے کے ساتھ اس کی ایک حد بھی مقرر کر دی گئی ہے۔ اور اس سے آگے بڑھنے کو ممنوع قرار دیا گیا ہے۔ یہ حد ایک ہی جگہ نہیں بلکہ متعدد مقامات پر نہایت روشن طریقہ سے کھینچی گئی ہے۔ چنانچہ سورہ بقرہ میں مسلمانوں کو قتال کا حکم دیتے ہوئے ارشاد ہوا ہے کہ:

قَاتِلُوهُمْ حَتّٰى لَا تَكُونَ فِتْنَةٌ وَيَكُونَ الدِّينُ لِلّٰهِ (۲:۱۹۳)	ان سے جنگ کرو یہاں تک کہ فتنہ باقی نہ رہے۔ اور دین صرف اللہ کے لئے ہو۔

یہاں حتیٰ کے لفظ نے ایک حد کھینچ دی ہے کہ جب تک فتنہ باقی رہے اور ترقی دین کے راستہ میں رکاوٹیں موجود رہیں اس وقت تک جنگ کی جائے۔ اور جب یہ دونوں چیزیں دور ہو جائیں تو پھر حرب و قتال کا دروازہ بند کر دیا جائے۔ چنانچہ آگے چل کر فرمایا کہ:

فَإِنِ انْتَهَوْا فَلَا عُدْوَانَ إِلَّا عَلَى الظَّالِمِينَ (۲:۲۴)

اگر وہ فتنہ برپا کرنے سے باز آجائیں تو جان لو کہ ظالموں کے سوا اور کسی کے لئے سزا نہیں ہے۔

سورہ مائدہ میں اس سے بھی زیادہ واضح الفاظ میں بتلایا ہے کہ انسانی جان کس صورت میں حرام ہے اور کس صورت میں حلال۔

مَنْ قَتَلَ نَفْسًا بِغَيْرِ نَفْسٍ أَوْ فَسَادٍ فِي الْأَرْضِ فَكَأَنَّمَا قَتَلَ النَّاسَ جَمِيعًا (۵:۵)

جو شخص کسی جان کو قتل کرے بغیر اس کے کہ اس نے کسی کی جان لی ہو، یا زمین میں فساد برپا کیا ہو، تو گویا اس نے تمام انسانوں کا خون کر دیا۔

اس سے معلوم ہوا کہ انسان کو صرف دو صورتوں میں قتل کیا جا سکتا ہے۔ ایک یہ کہ اس نے کسی دوسرے انسان کو ناحق قتل کیا ہو۔ اور دوسرے یہ کہ اس نے زمین میں فساد پھیلایا ہو۔ ان دو صورتوں کے علاوہ کسی تیسری صورت میں اسے قتل کرنا صرف ناجائز ہی نہیں۔ بلکہ اتنا بڑا گناہ ہے کہ رب العالمین اسے تمام دنیا کے قتل کر دینے کے برابر سمجھتا ہے۔

سورہ توبہ میں جنگ و قتال کی آخری حد ادائے جزیہ کو قرار دیا ہے۔ چنانچہ فرمایا۔

حَتَّى يُعْطُوا الْجِزْيَةَ عَنْ يَدٍ وَهُمْ صَاغِرُونَ (۹:۴)

ان سے لڑو یہاں تک کہ وہ اپنے ہاتھ سے جزیہ دیں اور اطاعت قبول کریں۔

اس سے معلوم ہوا کہ جب کفار جزیہ ادا کر کے احکام اسلامی کے اجرا پر رضامند ہو جائیں تو ان سے جنگ نہیں کی جا سکتی۔ اور اجازت قتال کی حد ختم ہو جاتی ہے۔

سورہ شوریٰ میں ایک جامع اصول بیان فرمایا ہے۔ جو ان لوگوں کے خلاف جنگ و قتال کی کوئی گنجائش ہی باقی نہیں چھوڑتا۔ جو بندگان خدا پر ظلم نہیں کرتے اور زمین میں ناحق سرکشی نہیں کرتے۔

وَلَمَنِ انْتَصَرَ بَعْدَ ظُلْمِهِ فَأُولَئِكَ مَا عَلَيْهِمْ مِنْ سَبِيلٍ۔ إِنَّمَا السَّبِيلُ عَلَى الَّذِينَ يَظْلِمُونَ النَّاسَ وَيَبْغُونَ

اور جو کوئی اپنے اوپر ظلم کئے جانے کے بعد بدلہ لے اس پر کوئی راہ نہیں ہے۔ راہ صرف ان پر ہے جو لوگوں پر ظلم کرتے ہیں۔ اور زمین میں ناحق سرکشی کرتے

فِي الْأَرْضِ بِغَيْرِ الْحَقِّ أُولَٰئِكَ
لَهُمْ عَذَابٌ أَلِيمٌ (۴۲ : ۴)

سورۂ ممتحنہ میں اس امر کی تصریح کردی ہے کہ مسلمانوں کی دشمنی صرف انہی کفار کے ساتھ ہے جو دین حق اور پیروانِ دین حق کے دشمن ہیں۔ اور جو لوگ ایسے نہیں ہیں ان سے نیکی واحسان کرنے اور ان کے ساتھ منصفانہ برتاؤ کرنے سے کوئی چیز مسلمانوں کو نہیں روکتی۔

لَا يَنْهَاكُمُ اللَّهُ عَنِ الَّذِينَ لَمْ يُقَاتِلُوكُمْ فِي الدِّينِ وَلَمْ يُخْرِجُوكُمْ مِنْ دِيَارِكُمْ أَنْ تَبَرُّوهُمْ وَتُقْسِطُوا إِلَيْهِمْ إِنَّ اللَّهَ يُحِبُّ الْمُقْسِطِينَ إِنَّمَا يَنْهَاكُمُ اللَّهُ عَنِ الَّذِينَ قَاتَلُوكُمْ فِي الدِّينِ وَأَخْرَجُوكُمْ مِنْ دِيَارِكُمْ وَظَاهَرُوا عَلَىٰ إِخْرَاجِكُمْ أَنْ تَوَلَّوْهُمْ وَمَنْ يَتَوَلَّهُمْ فَأُولَٰئِكَ هُمُ الظَّالِمُونَ (۶۰ : ۲)

اللہ تمہیں ان لوگوں سے منع نہیں کرتا جنہوں نے تم سے دین کے معاملہ میں جنگ نہیں کی۔ اور تمہیں تمہارے وطن سے نہیں نکالا، کہ تم ان کے ساتھ احسان اور انصاف کرو۔ کیونکہ اللہ انصاف کرنے والوں کو دوست رکھتا ہے۔ اللہ تو تمہیں صرف ان لوگوں کے ساتھ دوستی کرنے سے روکتا ہے جنہوں نے تم سے دین کے معاملہ میں جنگ کی ہے۔ اور تمہیں تمہارے وطن سے نکالا ہے۔ اور تمہیں نکالنے میں دشمنوں کی مدد کی ہے۔ انہیں جو کوئی دوست بنائے وہ ظالم ہے۔

ان احکام کا مطلب اس قدر واضح ہے کہ اس کے لئے کسی تشریح کی ضرورت نہیں ہے۔ ان سے صاف طور پر معلوم ہوتا ہے کہ اسلامی جنگ کا اصلی مقصد لوگوں کو زبردستی مسلمان بنانا نہیں ہے بلکہ انہیں ظلم وسرکشی اور فتنہ وفساد سے روک کر قانون عدل کا تابع بنا دینا ہے۔

اسلام کی تلوار ایسے لوگوں کی گردنیں کاٹنے کے لئے تو ضرور تیز ہے جو اسلام اور مسلمانوں کو مٹانے کی کوشش کرتے ہیں۔ یا اللہ کی زمین میں فتنہ وفساد پھیلاتے ہیں۔ اور کوئی نہیں کہہ سکتا کہ اس تیزی میں وہ حق بجانب نہیں ہے۔ لیکن جو لوگ

ظالم نہیں ہیں جو بدکار نہیں ہیں۔ جو صدعن سبیل اللہ نہیں کرتے جو دین حق کو نہیں مٹاتے۔ جو خلق خدا کے امن و اطمینان کو غارت نہیں کرتے۔ جو قانون عدل کی پابندی اختیار کرتے ہیں اور اخلاق و انسانیت کے حدود سے تجاوز نہیں کرتے وہ خواہ کسی دین و ملت سے تعلق رکھتے ہوں اور ان کے دینی عقائد خواہ کتنے ہی باطل ہوں۔ اسلام ان کی جان و مال سے کچھ تعرض نہیں کرتا ان کے لئے اس کی تلوار کند ہے۔ اور اس کی نظروں میں ان کا خون حرام ہے۔

لا اکراہ فی الدین

حدود جنگ کی یہ تعیین بجائے خود فیصلہ کن ہے۔ لیکن کتاب الٰہی کا کمال وضاحت یہ ہے کہ اس نے صرف دلالتہً ہی اس مسئلہ میں ہماری ہدایت کرنے پر قناعت نہیں کی بلکہ صراحتہً بھی ہم کو بتا دیا کہ اسلام کی تبلیغ میں جبر و اکراہ کو کوئی دخل نہیں ہے۔ چنانچہ سورہ بقرہ میں صاف فرمایا ہے کہ:۔

لَا إِكْرَاهَ فِي الدِّينِ قَدْ تَبَيَّنَ الرُّشْدُ مِنَ الْغَيِّ فَمَنْ يَكْفُرْ بِالطَّاغُوتِ وَيُؤْمِنْ بِاللَّهِ فَقَدِ اسْتَمْسَكَ بِالْعُرْوَةِ الْوُثْقَىٰ لَا انْفِصَامَ لَهَا وَاللَّهُ سَمِيعٌ عَلِيمٌ (۳۴:۲)

دین میں کوئی زبردستی نہیں ہے سیدھی راہ غلط راستے سے ممتاز کر کے دکھائی جا چکی ہے۔ پس اب جو کوئی معبودان باطل کو چھوڑ کر اللہ پر ایمان لے آتا ہے۔ تو وہ ایک ایسے مضبوط رشتہ سے تعلق جوڑتا ہے۔ جو ٹوٹنے والا نہیں ہے۔ اور اللہ سننے اور جاننے والا ہے۔

اس حکم کے الفاظ بالکل صاف ہیں۔ لیکن یہ جس موقع پر اترا ہے اسے پیش نظر رکھنے کے بعد اس کا مدعا اور بھی زیادہ صاف ہو جاتا ہے۔ اہل یثرب کا قاعدہ تھا کہ جب ان میں سے کسی عورت کے بچے زندہ نہ رہتے تو وہ منت مانتی کہ اگر میرا کوئی بچہ زندہ رہے گا۔ تو میں اس کو یہودی بناؤں گی۔ مدینہ میں اس طریقہ سے انصار کے بہت سے بچے یہودی بنا دیئے گئے تھے۔ جب ۴ھ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بنی نضیر کو ان کی حرکات

[illegible]
پیرو تھے انصار نے کہا کہ ہم اپنے بچوں کو نہیں چھوڑیں گے۔ ہم نے ان کو اس وقت یہودی بنایا تھا جب ہم ان کے دین کو اپنے دین سے بہتر سمجھتے تھے۔ مگر اب جبکہ اسلام کا آفتاب طلوع ہو چکا ہے اور تمام ادیان سے افضل دین ہمارے پاس ہے تو ہم اپنے بچوں کو یہودی نہ رہنے دیں گے اور انہیں اسلام پر مجبور کریں گے اس پر یہ حکم نازل ہوا کہ لا اکراہ فی الدین انہیں جبراً مسلمان نہ کرو۔ کیونکہ دین میں اکراہ نہیں ہے۔ اس واقعہ کو الفاظ و مضمون کے جزوی اختلاف کے ساتھ ابو داؤد اور نسائی نے اور ابن ابی حاتم اور ابن حبان نے نقل کیا ہے۔ اور مجاہد سعید بن جبیر شعبی۔ اور حسن بصری نے بالاتفاق کہا ہے کہ اس آیت کی شان نزول یہی ہے۔ ابن جریر نے بھی اپنی تفسیر میں اسے بیان کیا ہے۔ اور ابن کثیر نے اسی شان نزول پر اعتماد کیا ہے۔

محمد بن اسحاق نے حضرت ابن عباسؓ کے حوالہ سے ایک دوسری روایت بیان کی ہے۔ جس کا مفاد یہ ہے کہ انصار میں سے ایک شخص کے دو بیٹے نصرانی تھے۔ اس نے رسول اکرمؐ کی خدمت میں حاضر ہو کر عرض کی کہ میرے بیٹے نصرانیت کو چھوڑنے پر راضی نہیں ہوتے کیا میں انہیں مجبور کر سکتا ہوں؟ اس پر یہ آیت نازل ہوئی لا اکراہ فی الدین یہ واقعہ اگرچہ پچھلے واقعہ سے مختلف ہے۔ لیکن مدعا دونوں کا ایک ہی ہے۔ اور جیسا کہ علامہ ابن کثیر نے اپنی مشہور و مستند تفسیر میں لکھا ہے۔ اس شان نزول کی روشنی میں۔ اسلام کی تعلیم صاف یہ معلوم ہوتی ہے کہ:۔

لا تکرھوا احداً علی الدخول فی دین الاسلام فانہ بین واضح جلی دلائلہ وبراھینہ لا یحتاج الی ان یکرہ احد علی الدخول فیہ بل من ھداہ اللہ للاسلام وشرح صدرہ

کسی شخص کو دین اسلام میں داخل ہونے پر مجبور نہ کرو۔ کیونکہ وہ اس قدر بین و واضح ہے اور اس کے دلائل و براہین اس قدر روشن ہیں کہ کسی شخص کو اس میں داخل ہونے پر مجبور کرنے کی ضرورت ہی نہیں ہے۔ اللہ نے جس شخص کو ہدایت دی ہو اور جس کا سینہ قبول حق کے لئے کھول دیا ہو۔ اور جس کو بصیرت کا نور

نور بصیرتہ دخل فیہ علی بینۃ ومن اعمی اللہ قلبہ و ختم علی سمعہ وبصرہ فانہ لا یفیدہ الدخول فی الدین مکرھا ومقسورا۔

عطا کی ہو وہ دلیل واضح کی بنا پر اسے خود اختیار کرے گا۔ اور جس کی سماعت و بینائی پر مہر کر دی ہو اس کا مارے باندھے سے دین میں داخل ہونا بیکار ہے۔

زمخشری نے اپنی تفسیر کشاف میں بھی اس آیت کی تشریح کرتے ہوئے اس قول کی تائید کی ہے۔ چنانچہ لکھتا ہے کہ :۔

لم یجر اللہ امر الایمان علی الاجبار والقسر ولکن علی التمکن والاختیار ونحوہ قولہ وَلَوْ شَاءَ رَبُّكَ لَآمَنَ مَنْ فِي الْأَرْضِ كُلُّهُمْ جَمِيعًا أَفَأَنْتَ تُكْرِهُ النَّاسَ حَتَّىٰ يَكُونُوا مُؤْمِنِينَ ای لو شاء لقسرھم علی الایمان ولکن لم یفعل وبنی الامر علی الاختیار۔

اللہ نے ایمان کے معاملہ میں جبر و زبردستی کو دخل نہیں دیا ہے۔ بلکہ اسے تمکن و اختیار پر چھوڑ دیا ہے اسی مضمون کو یہ ارشاد بھی واضح کرتا ہے کہ ولو شاء ربك لآمن الخ یعنی اگر تیرا خدا چاہتا تو تمام روئے زمین کے باشندے ایمان لے آتے۔ کیا تو لوگوں کو مجبور کرے گا کہ وہ ایمان لائیں ؟

اس آیت سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ اللہ چاہتا تو سب لوگوں کو ایمان پر مجبور کر دیتا۔ مگر اس نے ایسا نہیں کیا اور اس معاملہ کو انسان کی مرضی پر چھوڑ دیا۔

امام رازی اپنی تفسیر میں اسی آیت کے متعلق ابو مسلم اصفہانی اور قفال کا یہ قول نقل کرتے ہیں :۔

"اس کے معنی یہ ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے دین کا معاملہ جبر اور سختی پر نہیں رکھا بلکہ تمکن اور اختیار پر رکھا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے جب توحید کے دلائل ایسے شافی اور قاطع طریقے سے بیان کر دیئے کہ عذر کی گنجائش نہ رہی تو اس نے فرمایا کہ ان دلائل کی توضیح کے بعد کسی کافر کے لئے کفر پر قائم رہنے کی کوئی وجہ باقی نہیں رہی اور اب بھی اگر وہ ایمان نہ لائے تو اس کو قائل کرنے کی صرف یہی صورت باقی رہ گئی ہے کہ اسے بزور اس پر مجبور کیا جائے۔ مگر یہ اس دنیا میں کہ

ابتلاء و آزمائش کا گھر ہے، جائز نہیں ہے۔ کیونکہ قہر و اکراہ سے دین پر مجبور کرنا ابتلاء و امتحان کے مقصد کو باطل کر دیتا ہے۔ اس کی نظیر اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے کہ فَمَنْ شَاءَ فَلْيُؤْمِنْ وَمَنْ شَاءَ فَلْيَكْفُرْ (اب جو چاہے ایمان لائے اور جو چاہے کفر پر قائم رہے) اور ایک دوسری سورہ میں فرمایا وَلَوْ شَاءَ رَبُّكَ لَآمَنَ مَنْ فِي الْأَرْضِ كُلُّهُمْ جَمِيعًا أَفَأَنْتَ تُكْرِهُ النَّاسَ حَتَّى يَكُونُوا مُؤْمِنِينَ (اگر تیرا رب چاہتا تو تمام روئے زمین کے لوگ ایمان لے آتے۔ کیا تو لوگوں کو مجبور کرے گا کہ مومن بن جائیں؟) اور سورہ شعراء میں فرمایا کہ لَعَلَّكَ بَاخِعٌ نَفْسَكَ أَلَّا يَكُونُوا مُؤْمِنِينَ إِنْ نَشَأْ نُنَزِّلْ عَلَيْهِمْ مِنَ السَّمَاءِ آيَةً فَظَلَّتْ أَعْنَاقُهُمْ لَهَا خَاضِعِينَ (شاید تو اس رنج میں گھل گھل کر جان دیدیگا کہ وہ ایمان نہیں لائے۔ اگر ہم چاہیں تو ان پر آسمان سے ایک ایسی نشانی اتار دیں کہ اس کے آگے ان کی گردنیں جھک جائیں (مگر ہم ایسا نہیں کرتے)"

یہ ابو مسلم اصفہانی وہ بزرگ ہیں جن کے متعلق امام رازی نے لکھا ہے کہ وابو مسلم حسن الکلام فی التفسیر کثیر الغوص علی الدقائق واللطائف یعنی تفسیر میں ان کا کلام خوب ہوتا ہے اور وہ تہ سے دقائق اور لطائف کے موتی نکال کر لاتے ہیں۔

خود امام رازی اس قول کی تائید میں لکھتے ہیں:۔

ومما یؤکد ھذا القول انہ تعالیٰ قال بعد ھذہ الآیۃ قد تبین الرشد من الغی یعنی ظہرت الدلائل ووضحت البینات ولم یبق بعدھا الا طریق القسر والالجاء والاکراہ وذلک غیر جائز لانہ ینافی التکلیف	اس قول کو یہ بات اور بھی زیادہ مضبوط کر دیتی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس آیت کے بعد فرمایا کہ "ہدایت، گمراہی سے ممتاز کر کے دکھائی جا چکی ہے" یعنی دلیلیں ظاہر کر دی گئیں، حجتیں کھول کھول کر بیان کر دی گئیں اور اب صرف جبر و زور اور اکراہ کا طریقہ باقی رہ گیا ہے سو وہ جائز نہیں ہے۔ کیونکہ وہ تکلیف کے منافی ہے۔

اس میں شک نہیں کہ اس آیت کے مفہوم میں بہت کچھ کلام بھی کیا گیا ہے۔ مثلاً بعض لوگ اس کو منسوخ کہتے ہیں۔ بعض کہتے ہیں کہ اس کا حکم صرف اہل کتاب کے لئے ہے۔ بعض

کہتے ہیں کہ وہ صرف انصار کے حق میں ہے۔ اور بعض نے حد سے گذر کر کلام الٰہی کے ساتھ یہ مذاق بھی کیا ہے۔ کہ دین میں کوئی زبردستی ہی نہیں ہے۔ یعنی تلوار کے نیچے جو کسی نے اسلام قبول کیا ہو تو یہ نہ کہو کہ اس نے باکراہ قبول کیا۔ لیکن یہ اقوال صرف کتابوں تک محدود ہیں عمل کی دنیا میں انہوں نے ۱۳ سو برس کی طویل مدت کے اندر کبھی قدم نہیں رکھا۔ الا ایک دو شاذ واقعات کے جن سے کوئی اصول نہیں بنتا۔ اگر حقیقت میں اسلام کی تعلیم یہی ہوتی کہ قبول اسلام پر لوگوں کو بزور شمشیر مجبور کیا جا سکتا ہے۔ تو گذشتہ ۱۳ صدیوں میں کم از کم ایک ہی مرتبہ ملت اسلامیہ اس تعلیم کے مطابق لوگوں کو جبراً مسلمان بناتی۔ لیکن صرف یہی نہیں کہ آج تک کبھی ایسا نہیں ہوا۔ بلکہ خلافت راشدہ کے عہد مبارک میں بھی جبکہ اسلام اپنی اصلی شان میں جلوہ گر تھا اور خود سرکار رسالت مآب کے مقدس عہد حکومت میں بھی۔ جو قرآن اور اس کی تعلیم کی عملی تفسیر تھا۔ کبھی اس پر عمل نہیں کیا گیا۔ آنحضرت صلعم کو بارہا کفار پر قدرت حاصل ہوئی۔ اور ان کی بڑی بڑی جماعتیں۔ آپ کے قبضہ میں آئیں لیکن آپ نے ان کی گردنوں میں اسلام کا پھندا کبھی نہیں ڈالا۔ بلکہ اپنی پاک تعلیم سے صرف ان کے دلوں کی گندگی ہی دور کرنے پر قناعت کی۔ دعوت اسلام کے جو سرایا آپ بھیجتے تو ان کو تاکید کرتے کہ لوگوں پر سختی نہ کرنا۔ ابوموسیٰ اشعری۔ اور معاذ بن جبل رضی اللہ عنہما کو یمن بھیجا تو فرمایا یسرا ولا تعسرا وبشرا ولا تنفرا (نرمی کرنا سختی نہ کرنا خوش کرنا نفرت نہ دلانا) مکہ معظمہ میں جب فاتحانہ داخلہ ہوا تو آپ نے ان کافروں کو جو آپ کے خون کے پیاسے تھے لَا تَثْرِیبَ عَلَیْکُمُ الْیَوْمَ اِذْهَبُوْا فَاَنْتُمُ الطُّلَقَاءُ کہکر آزاد چھوڑ دیا۔ اور کسی کو قبول اسلام پر مجبور نہ کیا (ان طلقاء میں سے دو ہزار آدمی آپ کے ساتھ غزوۂ حنین میں بھی شریک تھے) نواح مکہ میں جو جماعتیں دعوت اسلام کے لئے بھیجیں انہیں آپ نے قتال سے منع فرما دیا۔ چنانچہ علامہ ابن جریر لکھتے ہیں کہ بعث النبی صلعم فیما حول المکۃ السرایا تدعوھم الی اللہ عز وجل ولم یامرھم بالقتال قبیلہ بنی جذیمہ میں حضرت خالدؓ نے جب رسول اللہ صلعم کی ہدایت کے بغیر کشت و خون کیا تو آپ نے [illegible] بیزاری کیا اور اس قبیلہ کے مقتولوں [illegible]
چند مثالیں ہیں۔ ورنہ رسول اکرمؐ کی ساری زندگی میں ایک واقعہ بھی ایسا نہیں ملتا کہ آپ نے

کسی شخص کو قتل کی دھمکی دیکر قبول اسلام پر مجبور کیا ہو، اور یہ اس امر کا بین ثبوت ہے کہ لا اکراہ فی الدین کے وہی معنی ہیں جو ظاہر الفاظ سے بصراحت معلوم ہوتے ہیں ورنہ قرآن مجید کا کوئی حکم ایسا نہیں ہے جس پر عمل کر کے آنحضرت ﷺ نے اپنی زندگی میں ایک مثال قائم نہ کردی ہو۔

اس سلسلہ میں ایک حدیث پیش کی جاتی ہے جو امام احمدؒ نے حضرت انس رضی اللہ عنہ کے حوالہ سے روایت کی ہے۔ اس میں بیان کیا گیا ہے کہ آنحضرت صلعم نے ایک شخص سے فرمایا۔ اسلم اسلام قبول کرے۔ اس نے عرض کی کہ انی اجدنی کارھا میں اپنے اندر کچھ کراہت محسوس کرتا ہوں۔ آپ نے فرمایا وان کنت کارھا فان اللہ سیرزقک حسن النیة والاخلاص "اس کراہت کے باوجود تو قبول کرلے پھر اللہ تجھے حسن نیت اور اخلاص بھی بخشدیگا"۔ تعجب ہے کہ اس حدیث کو اکراہ کے ثبوت میں کیونکر پیش کیا جا سکتا ہے۔ حالانکہ اس میں مکرھا کا لفظ نہیں بلکہ کارھا کا لفظ استعمال ہوا ہے اور اس سے وہ کراہت نفس مراد لی گئی ہے جو عدم اخلاص کی ہم معنی ہے۔ اس سے یہ کب ثابت ہوتا ہے کہ حضور نے اس شخص کو باکراہ اسلام کا حلقہ بگوش بنایا ؟

قائلین نسخ کے پاس اپنے دعوے کے لئے اس کے سوا کوئی دلیل نہیں ہے کہ وہ اس آیت کو احکام قتال کی آیات سے تطبیق نہیں دے سکتے ورنہ کوئی صحیح روایت اس کے نسخ کی تائید نہیں کرتی۔ قطع نظر اس بحث کے کہ کسی آیت قرآنی کے نسخ کا دعوی کرنے کے لئے کن دلائل کی ضرورت ہے۔ ہم صرف یہ عرض کرنا چاہتے ہیں کہ اس آیت کا نسخ عہد رسالت کے بعد کی ایجاد ہے۔ عہد رسالت کے اکابر صحابہؓ اس سے واقف نہ تھے۔ ورنہ اگر اس زمانہ میں بھی لوگوں کو اس کا علم ہوتا تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ جیسے احکام شریعت کے نکتہ دان اپنے مملوک اسبق کو قبول اسلام سے انکار کرنے کی آزادی ہرگز نہ دیتے۔

ابن ابی حاتم کی یہ روایت دعوائے نسخ کے حق میں فیصلہ کن ہے:۔

اسبق نے بیان کیا۔ میں حضرت عمر ابن خطابؓ کا نصرانی غلام تھا آپ مجھے اسلام کی دعوت دیتے	عن اسبق قال کنت فی دینھم مملوکا نصرانیا لعمر

ابن الخطاب فکان یعرض علی الاسلام فآبی فیقول لا اکراہ فی الدین ویقول یا اسبق لو اسلمت لاستعنا بک علی بعض امور المسلمین

تھے مگر میں انکار کر دیتا تھا اس پر آپ فرماتے کہ لا اکراہ فی الدین پھر آپ کہتے کہ اے اسبق اگر تو اسلام قبول کر لیتا تو ہم تجھ سے مسلمانوں کے بعض معاملات میں مدد لیتے۔

امام ابن جریر طبری کا قول اس معاملہ میں امام رازی اور ابن کثیر وغیرہ سے ذرا مختلف ہے، مگر وہ تمام آثار و اقوال سلف کو نقل کرنے کے بعد نسخ کے بارے میں یہ فیصلہ دیتے ہیں

"اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ لا اکراہ فی الدین کے معنی یہ ہیں کہ جس سے جزیہ قبول کرنا جائز ہے وہ اگر جزیہ ادا کرے اور حکومتِ اسلام کی اطاعت پر راضی ہو جائے تو اس کے لئے دین میں جبر و اکراہ نہیں ہے۔ جو شخص یہ کہتا ہے کہ یہ آیت اجازتِ جنگ سے منسوخ الحکم ہو گئی ہے۔ اس کا قول بے معنی ہے۔ اگر کہنے والا یہ کہے کہ پھر ابن عباسؓ نے جو یہ روایت کی ہے کہ "یہ آیت ان انصار کے بارے میں نازل ہوئی ہے جنہوں نے اپنی اولاد کو اسلام پر مجبور کرنا چاہا تھا" اس کے متعلق تم کیا کہو گے؟ تو ہم کہیں گے کہ اس روایت کی صحت سے کسی کو انکار نہیں۔ یقیناً یہ آیت ایک خاص معاملہ میں نازل ہوئی ہے۔ مگر اس کا حکم ان تمام صورتوں میں عام ہے جن کی نوعیت اس کی شانِ نزول سے ملتی جلتی ہے۔ ابن عباسؓ وغیرہ کی روایت کے مطابق جن لوگوں کے بارے میں یہ آیت نازل ہوئی ہے، انہوں نے اسلام کا حکم جاری ہونے سے پہلے اہل تورات کا دین اختیار کر لیا تھا۔ اللہ تعالےٰ نے انہیں دینِ اسلام پر مجبور کرنے سے منع فرمایا۔ مگر ممانعت ایسے الفاظ میں فرمائی جن کا حکم ان تمام ادیان پر حاوی ہے۔ جن کے پیروؤں سے جزیہ قبول کیا جا سکتا ہے"

جو لوگ اس حکم کو اہل کتاب کے لئے مخصوص کرتے ہیں۔ ان کے پاس بھی اپنے دعویٰ کے لئے کتاب و سنت کی تصریحات میں سے کوئی دلیل نہیں ہے۔ لا اکراہ کا حکم بالکل عام ہے۔ محض شانِ نزول کی خصوصیت اس کو خاص نہیں کرتی ورنہ قرآن مجید کا کوئی حکم بھی ایسا نہ ملے گا جس کی کوئی خاص شانِ نزول نہ ہو اور پھر ہر حکم کو اسی طرح خاص کرنا پڑیگا۔ رہا یہ خیال کہ حکم جزیہ کی آیت نے اسے خاص کیا ہے سو اس کے متعلق یہ امر قابل لحاظ ہے کہ خود آیۃ

جزیہ کے حکم کو بھی اوتوا الکتب کی تخصیص کے باوجود آئمہ مجتہدین نے تمام کفار و مشرکین کے لئے عام قرار دیا ہے۔ اگرچہ جمہور احناف اس عام حکم سے مشرکین عرب کو (جنکا وجود آیت جزیہ کے اترنے سے پہلے ہی ناپید ہوچکا تھا) مستثنیٰ کرتے ہیں، لیکن امام مالکؒ ابویوسفؒ۔ اور امام اوزاعی وغیرہ نے عرب کے صنم پرستوں تک کو اس دائرۂ رحمت میں شامل کردیا ہے اور اسی خیال کی بنا پر صدر اول سے لیکر اب تک مسلمانوں کا طرز عمل یہ رہا ہے کہ انہوں نے کفار کی تمام اقسام سے جزیہ قبول کرکے انہیں خدا اور رسولؐ کے ذمہ میں داخل کرلیا ہے۔

پھر جب خود آیت جزیہ کا حکم الفاظ کی تخصیص کے باوجود عام قرار دیا گیا ہے تو یہ کیونکر صحیح ہوسکتا ہے کہ وہ ایک دوسری آیت کو جس میں الفاظ کی تعمیم بھی موجود ہے۔ بغیر کسی شرعی دلیل کے خاص کردے۔ تمام اقسام کفرہ سے جزیہ قبول کرنا خود اس امر کی دلیل ہے کہ کسی شخص پر خواہ وہ اہل کتاب سے ہو یا نہ ہو قبول اسلام کے لئے جبر و اکراہ نہیں ہوسکتا کیونکہ اعطائے جزیہ کے بعد عدم اکراہ فی الدین تو شرعاً ثابت ہے۔

دعوت و تبلیغ کا اصل الاصول

حقیقت یہ ہے کہ آیت قتال یا آیت جزیہ کا مضمون لا اکراہ فی الدین کی مذہبی آزادی کا متعارض نہیں ہے جیسا کہ بعض لوگوں نے غلطی سے سمجھ لیا ہے۔ بلکہ وہ صرف اس آزادی کو جو ابتداً بلا شرط عطا کی گئی تھی۔ ایک ضابطہ اور ایک اصول کے ماتحت لے آتا ہے۔ اول اول جبکہ مسلمان ضعیف تھے اور ان میں وہ خدمت انجام دینے کی قوت پیدا نہیں ہوئی تھی جو امۃ وسطا اور خیر امۃ ہونے کی حیثیت سے اللہ تعالےٰ ان سے لینا چاہتا تھا تو مسلمان صرف لکم دینکم ولی دین ہی نہیں کہتے تھے۔ بلکہ لَنَا اَعْمَالُنَا وَلَکُمْ اَعْمَالُکُمْ بھی کہتے تھے ان میں اتنی قوت نہ تھی کہ دنیا کو مفاسد اخلاقی سے بجبر پاک کردیں اور فتنہ و فساد کا نام و نشان مٹا دیں۔ اس لئے امر بالمعروف اور نہی عن المنکر دونوں ایک ہی طریقہ پر ہوتے رہے؛ یعنی جس طرح رسول کریمؐ اور آپ کے پیرو لوگوں کو توحید کے اقرار رسالت کے اقرار۔ یوم آخر کے اعتقاد۔ اور نماز کی اقامت کی دعوت دیتے تھے۔ اسی طرح زنا۔ چوری۔ قتل اولاد۔ قول زور قطع طریق اور صد عن سبیل اللہ وغیرہ سے بھی صرف نفرت دلانے اور زبان سے روکنے

ہی پر اکتفا کرتے تھے لیکن جب مسلمان کمزوری و بے بسی کی حالت سے نکل گئے اور ان میں اپنے مشن کو عملی جامہ پہنانے کی طاقت آگئی تو وہ مذہبی آزادی کا اصول تو اپنی جگہ بدستور قائم رہا کہ کسی شخص کو زبردستی مسلمان نہیں بنایا جائیگا۔ لیکن یہ فیصلہ کر دیا گیا کہ لوگوں کو بدی و شرارت، فتنہ و فساد۔ اور اعمال منکرہ کے ارتکاب کی آزادی ہرگز نہ دی جائےگی۔ پس اسوقت امر بالمعروف کا دائرہ نہی عن المنکر سے الگ ہوگیا۔ نہی عن المنکر میں تو دعوت و تبلیغ کے ساتھ تلوار بھی شامل ہوگئی اور اس نے تمام دنیا کو فتنہ و فساد سے پاک کر دینے کا بیڑا اٹھا لیا۔ خواہ دنیا اس پر راضی ہو یا نہ ہو۔ لیکن امر بالمعروف کے دائرہ میں وہی لَآ اِكْرَاهَ فِي الدِّيْنِ اور مَآ اَنْتَ عَلَيْهِمْ بِجَبَّارٍ کا اصول برقرار رہا۔

ہم اس سے پہلے عرض کر چکے ہیں کہ اسلام کی دو حیثیتیں ہیں۔ ایک حیثیت میں وہ دنیا کے لئے اللہ کا قانون ہے۔ اور دوسری حیثیت میں وہ نیکی و تقویٰ کی جانب ایک دعوت اور پکار ہے۔ پہلی حیثیت کا منشا دنیا میں امن قائم کرنا، مخلوق کو سرکش انسانوں کے ہاتھوں تباہ ہونے سے روکنا اور دنیا والوں کو اخلاق و انسانیت کے حدود کا پابند بنانا ہے جس کے لئے قوت و طاقت کے استعمال کی ضرورت مسلم ہے۔ لیکن دوسری حیثیت میں وہ قلوب کا تزکیہ کرنے والا، ارواح کو پاک و صاف کرنے والا، حیوانی کثافتوں کو دور کرکے ابن آدم کو اعلیٰ انسان بنانیوالا ہے۔ جس کے لئے تلوار کی ضرورت نہیں بلکہ ہدایت کا نور [illegible] انقیاد نہیں۔ بلکہ دلوں کا جھکاؤ۔ اور جسموں کی پابندی نہیں بلکہ روحوں کی اسیری درکار ہے۔ اگر کوئی شخص سر پر تلوار چمکتی ہوئی دیکھ کر لا الٰہ الا اللہ کہہ دے مگر اس کا دل بدستور ماسویٰ اللہ کا بتکدہ بنا رہے تو یہ تصدیق بالقلب کے بغیر اقرار باللسان اس کے لئے کچھ بھی نافع نہیں ہے۔ اور اسلام کے لئے اس کی حلقہ بگوشی قطعاً بیکار ہے۔ ایک دین تو خیر بڑی چیز ہے۔ دنیا کی معمولی تحریکیں بھی جن کا منشا محض دنیوی مقاصد کا حصول ہوتا ہے اپنی کامیابی کے لئے ایسے پیرووں پر بھی بھروسہ نہیں کر سکتیں جو صرف زبان سے انکے ساتھ ہمدردی کرتے ہوں۔ مگر دل سے ان کے مؤید نہ ہوں۔ ایسے ہی منافق اور جھوٹے پیرووں کو لیکر آج تک کسی تحریک نے کامیابی کا منہ نہیں دیکھا ہے۔ اور یقیناً ایسے لوگ تحریک

پوست کے لوتھڑے دل کو لیکر جو صداقت کی روح سے بالکل خالی ہوں کوئی شخص دنیا کے میدان سابقت میں قدم رکھنے کی جرأت اور فوز و فلاح تک پہنچنے کی اُمید نہیں کر سکتا۔ پھر بھلا غور کرو کہ جس دین کے پیش نظر دنیا کی کامیابی نہیں بلکہ آخرت کی فوز و فلاح ہو۔ جو دین نیت اور اعتقاد کو عمل کی بنیاد قرار دیتا ہو۔ جو دین خلوص و صداقت کی روح کے بغیر عمل کی کوئی قیمت نہ سمجھتا ہو۔ جو دین تمام عالم البشری کی اصلاح کی عظیم الشان تحریک لیکر اٹھا ہو۔ اور جس کی تحریک نے دنیا میں وہ کامیابی حاصل کی ہو جو آج تک کسی تحریک کو حاصل نہیں ہوئی۔ کیا ممکن تھا کہ وہ اپنی دعوت کا کام تلوار کی گونگی زبان کے سپرد کرتا؟ کیا یہ ہو سکتا تھا کہ وہ خلوص و صداقت کو چھوڑ کر مجبورانہ اطاعت اور بیچارگی کے اقرار پر قناعت کرتا؟ کیا وہ ایسے پیرو حاصل کر کے مطمئن ہو سکتا تھا جن کے دل خدا کے خوف سے خالی مگر تلوار کی ہیبت سے معمور ہوں؟ کیا ایسے بزدل اور بودے آدمیوں کو وہ کوئی وزن دے سکتا تھا جو محض جان بچانے کے لئے کسی عقیدے کو جس کی صداقت کے وہ قائل نہوں قبول کریں؟ اور اگر وہ ایسا ہوتا تو کیا اسے وہ کامیابی حاصل ہو سکتی تھی۔ جو اس نے فی الحقیقت حاصل کی؟

انسان کی فطرت کو خود اس کے فاطر سے بہتر کون سمجھ سکتا ہے۔ اس نے اپنے حکیمانہ کلام میں جگہ جگہ اس مضمون کو نہایت بلیغ انداز سے سمجھانے کی کوشش کی ہے اور اپنے رسولؐ کو طریقہ طریقہ سے بتلایا ہے کہ اقلیم دل کو فتح کرنے کا صحیح اور موثر طریقہ کونسا ہے۔ چنانچہ ایک جگہ ارشاد ہوتا ہے کہ:۔

لَا تَسْتَوِي الْحَسَنَةُ وَلَا السَّيِّئَةُ ادْفَعْ بِالَّتِي هِيَ أَحْسَنُ فَإِذَا الَّذِي بَيْنَكَ وَبَيْنَهُ عَدَاوَةٌ كَأَنَّهُ وَلِيٌّ حَمِيمٌ (۴۱:۵)	اے پیغمبر! نیکی اور بدی برابر نہیں ہیں تو بدی کو اس طریقہ سے دور کر جو بہت اچھا ہے پھر دیکھ کہ جس کے ساتھ تیری دشمنی ہے وہ تیرا گرم جوش دوست بن جائے گا۔

دوسری جگہ فرمایا:۔

فَبِمَا رَحْمَةٍ مِّنَ اللَّهِ لِنتَ لَهُمْ	یہ اللہ کی رحمت ہے کہ تو ان کے لئے نرم دل بنایا

وَلَوْكُنْتَ فَظًّا غَلِيْظَ الْقَلْبِ لَانْفَضُّوْا مِنْ حَوْلِكَ۔ (۳: ۱۴)	گیا ہے۔ ورنہ اگر تو درشت کلام اور سنگدل ہوتا تو وہ تجھے چھوڑ کر الگ ہو جاتے۔

ایک اور جگہ دعوتِ اسلام کا یہ طریقہ بتلایا کہ:۔

اُدْعُ اِلٰى سَبِيْلِ رَبِّكَ بِالْحِكْمَةِ وَالْمَوْعِظَةِ الْحَسَنَةِ وَجَادِلْهُمْ بِالَّتِيْ هِيَ اَحْسَنُ (۱۶: ۱۶)	انہیں اپنے رب کے راستہ کی طرف حکمت اور عمدہ وعظ و پند کے ساتھ بلا۔ اور اگر جدال و مناظرہ کی ضرورت ہو تو حسن کلام کے ساتھ مجادلہ کر۔

اس نرمی و رفق اور حسن کلام کی یہاں تک تاکید کی کہ کفار کے معبودوں اور پیشواؤں کو برا کہنے سے بھی روک دیا۔

وَلَا تَسُبُّوا الَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ فَيَسُبُّوا اللّٰهَ عَدْوًا بِغَيْرِ عِلْمٍ (۶: ۱۳)	تم ان کے معبودان باطل کو جنہیں یہ خدا کو چھوڑ کر پکارتے ہیں گالیاں نہ دو ورنہ وہ جہالت کی بنا پر اللہ کو گالیاں دیں گے۔

ہدایت و ضلالت کا راز

پھر مختلف مواقع پر یہ باریک نکتہ سمجھایا ہے کہ اگر خدا چاہے تو وہ اپنے بندوں کو ایمان لانے پر مجبور کر سکتا ہے۔ لیکن اسے ایسا مجبورانہ ایمان درکار نہیں ہے جو طبعی خواہشات و جذبات کی طرح انسان کی جبلت میں داخل ہو۔ ایسی ایمان لانے والی اور اطاعت و عبادت کرنے والی مخلوق تو اس کے پاس پہلے سے موجود تھی جس کی فطرت ہی یہ ہے کہ یفعلون ما یؤمرون مگر وہ معبودیت کا اصلی لطف اٹھانے کے لئے ایسی مخلوق چاہتا تھا جسے کوئی قوت اللہ کی معرفت اس کی اطاعت و بندگی اور اس پر ایمان لانے پر مجبور نہ کرنے والی نہ ہو۔ بلکہ وہ خود اپنی عقل سے خدا کو پہچانے خود اپنی جستجو سے اس کو پائے خود اپنی آزاد خواہش سے اس کی بندگی و عبادت کرے۔ اور اس کے احکام کی [illegible] مشیت کی) خلاف ورزی کرنے پر قدرت رکھنے کے باوجود اس کی اطاعت و فرمانبرداری کرے۔ اسی لطف کے لئے اللہ نے انسان کو مہلت دی۔ ایک اجل مسمی ایک مدت مقررہ تک [illegible] عقل کی روشنی میں آزادانہ [illegible] کا اختیار دیا کہ فَمَنْ شَاءَ فَلْيَكْفُرْ وَمَنْ شَاءَ فَلْيُؤْمِنْ

ے ایمان لائے۔ اور جو چاہے کفر کرے) اس کی طرف سے ورپے ہادی ورہنما بھیجے
د اس کے ہم جنس اسے حق کا راستہ گمراہی کے راستہ سے ممتاز کرکے دکھا دیں اور اس
اسطے اس عذر کی گنجائش باقی نہ رہے کہ ہم بالکل تاریکی میں تھے اور پھر اس کے
لئے ایک یوم حساب مقرر کیا۔ تاکہ اس دن ان لوگوں پر بے اندازہ الطاف وعنایات
یش کرے جنہوں نے اپنی عقل سے اس کو پہچانا۔ اور اپنی مرضی سے اس کی بتلائی
سیدھی راہ کو اختیار کیا۔ اور کسی مجبوری سے نہیں بلکہ اپنا فرض سمجھ کر اپنی بندگی کا
ند سمجھ کر اس کی اطاعت وفرمانبرداری کی۔ اور اسی طرح ان لوگوں کو دردناک عذاب
ہوں نے کھلی ہوئی نشانیوں کے باوجود اسے نہ پہچانا۔ گمراہی و ہدایت کے ممتاز
نے کے باوجود گمراہی کو اختیار کیا۔ اس کے بھیجے ہوئے پیغام کو قبول کرنے سے
کیا اور اپنی فریضۂ عبودیت سے منہ موڑ کر اس کے احکام کی نافرمانی کی۔

دیکھو اس راز حقیقت کو کیسے حکیمانہ انداز سے کھولا ہے۔

ءَ رَبُّكَ لَجَعَلَ النَّاسَ
احِدَةً وَّلَا يَزَالُوْنَ مُخْتَلِفِيْنَ
نْ رَّحِمَ رَبُّكَ وَلِذٰلِكَ
مْ وَتَمَّتْ كَلِمَةُ رَبِّكَ
جَهَنَّمَ مِنَ الْجِنَّةِ وَالنَّاسِ
عِيْنَ (۱۱: ۱۰)

اگر تیرا رب چاہتا تو تمام لوگوں کو ایک ہی امت
بنا دیتا مگر وہ اختلاف کرتے ہی رہیں گے سوائے
ان لوگوں کے جن پر اللہ نے رحم کیا ہے اور اسی کے لئے
اس نے انہیں پیدا کیا ہے۔ اس طرح تیرے رب کی وہ
بات پوری ہوگی جو اس نے کہی تھی کہ میں دوزخ کو
جنوں اور انسانوں سے بھر دونگا۔

دوسرے مقامات پر بھی اس راز کی پردہ دری مختلف طریقوں سے کی ہے۔ چنانچہ
فرمایا کہ

ءَ رَبُّكَ لَاٰمَنَ مَنْ
رْضِ كُلُّهُمْ جَمِيْعًا (۱۰: ۱۰)

اگر خدا چاہتا تو زمین کے جتنے رہنے والے ہیں
سب کے سب ایمان لے آتے۔

کہیں فرمایا کہ

ءَ اللّٰهُ مَا اَشْرَكُوْا (۶: ۳)

اگر خدا چاہتا تو وہ ہرگز شرک نہ کرتے۔

کہیں فرمایا:-

إِن نَّشَأْ نُنَزِّلْ عَلَيْهِم مِّنَ السَّمَاءِ آيَةً فَظَلَّتْ أَعْنَاقُهُمْ لَهَا خَاضِعِينَ (۲۶:۴)

اگر ہم چاہتے تو ان پر آسمان سے ایسی نشانی اتار دیتے جسے دیکھ کر ان کی گردنیں مجبوراً جھک جاتیں۔

کہیں فرمایا:-

وَمَا كَانَ لِنَفْسٍ أَن تُؤْمِنَ إِلَّا بِإِذْنِ اللَّهِ وَيَجْعَلُ الرِّجْسَ عَلَى الَّذِينَ لَا يَعْقِلُونَ (۱۰:۱۰۰)

کوئی شخص اللہ کے اذن کے بغیر ایمان نہیں لا سکتا، اور اللہ عدم ایمان کی ناپاکی ان لوگوں پر ڈالتا ہے جو اپنی عقل سے کام نہیں لیتے

کہیں فرمایا:-

إِنَّكَ لَا تَهْدِي مَنْ أَحْبَبْتَ وَلَٰكِنَّ اللَّهَ يَهْدِي مَن يَشَاءُ وَهُوَ أَعْلَمُ بِالْمُهْتَدِينَ (۲۸:۵۶)

تو جسے چاہتا ہے ہدایت نہیں کر سکتا بلکہ اللہ جسے چاہتا ہے ہدایت کرتا ہے اور وہی جانتا ہے کہ کس میں ہدایت قبول کرنے کی صلاحیت ہے

پس جبکہ رب قدیر، خالق کائنات خود نہیں چاہتا کہ اپنے بندوں کو اپنی اطاعت و بندگی پر مجبور کرے بلکہ وہ ان کی آزادانہ بندگی و غلامی کو زیادہ محبوب رکھتا ہے تو پھر کس بندے کو یہ حق پہونچتا ہے کہ اپنے جیسے بندوں پر اس کی بندگی و طاعت کے لیے جبر کر کے مجبور بنائے یا ان کا بے مزہ اور بے قیمت تحفہ اس کے حضور پیش کرے۔ یہی وجہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو بار بار یہ سمجھایا ہے کہ دین میں جبر و اکراہ کا کام نہیں ہے۔ اور آپ کے لئے صرف خدا کا پیغام پہونچا دینا کافی ہے:-

وَمَا أَنتَ عَلَيْهِم بِجَبَّارٍ فَذَكِّرْ بِالْقُرْآنِ مَن يَخَافُ وَعِيدِ (۵۰:۴۵)

تو ان کو قبول ہدایت پر مجبور کرنے والا نہیں ہے جو کوئی اللہ کی وعید سے ڈرنے والا ہو اس کو قرآن سے نصیحت کئے جاؤ۔

فَذَكِّرْ إِنَّمَا أَنتَ مُذَكِّرٌ لَّسْتَ عَلَيْهِم بِمُصَيْطِرٍ (۸۸:۲۲)

تو نصیحت کئے جا کیونکہ تو صرف نصیحت کرنے والا ہے تو ان پر داروغہ نہیں ہے۔

أَفَأَنتَ تُكْرِهُ النَّاسَ حَتَّىٰ يَكُونُوا

کیا تو لوگوں کو مجبور کرے گا کہ وہ مومن ہو جائیں ...

مومنین (۱۰ : ۱۰) — تیرا کام مجبور کرنا نہیں ہے

لَیۡسَ عَلَیۡکَ ھُدٰاھُمۡ وَلٰکِنَّ اللّٰہَ یَھۡدِیۡ مَنۡ یَّشَآءُ (۲ : ۳۷)	ان کی ہدایت تیرے ذمہ نہیں ہے، بلکہ اللہ جس کو چاہتا ہے ہدایت بخشتا ہے،
انّما علیک البلاغ وعلینا الحساب (۱۳ : ۴۰)	تیرے اوپر پیغام پہونچانے کی ذمہ داری ہے اور حساب لینے والے ہم خود ہیں،

اشاعتِ اسلام میں تلوار کا حصہ، اس بحث سے یہ حقیقت تو اچھی طرح واضح ہوگئی کہ اسلام اپنی صداقت پر ایمان لانے کے لئے کسی کو مجبور نہیں کرتا، بلکہ دلائل و براہین کی روشنی میں ہدایت کی راہ کو ضلالت کی راہ سے ممتاز کر کے دکھا دینے کے بعد ہر شخص کو اختیار دیتا ہے کہ چاہے غلط راستہ پر چل کر نامرادی کے گڑھے میں جا گرے، اور چاہے سیدھے راستہ پر لگ کر حقیقی اور دائمی فلاح و کامرانی سے بہرہ اندوز ہو، لیکن اس سلسلۂ کلام کو ختم کرنے سے پہلے ہم یہ بتلا دینا ضروری سمجھتے ہیں کہ اسلام کی اشاعت کو تلوار سے ایک گونہ تعلق ضرور ہے، اس میں شک نہیں کہ جہاں تک تبلیغِ دینِ الٰہی کی حد ہے، اس میں تلوار کا کوئی کام نہیں ہے، لیکن اس تبلیغ کے ساتھ کچھ چیزیں اور بھی ہیں جن کے تعاون سے دنیا میں اسلام کی اشاعت ہوتی ہے، اور وہ یقیناً تلوار کی اعانت سے بے نیاز نہیں ہیں،

عموماً ہم دیکھتے ہیں کہ جب انسان بے قیدی کی زندگی بسر کرتا ہے، اور اپنی خواہشات کی پیروی میں کسی اخلاقی قانون کا پابند نہیں ہوتا، تو اسے اپنی اس پر الم مگر بظاہر پر لطف زندگی میں ایک مزا آنے لگتا ہے، اور اس مزے کو چھوڑنے کے لئے وہ برضا و رغبت آمادہ نہیں کیا جا سکتا، وعظ و نصیحت اور دلیل و برہان کی قوت سے اس کو اخلاقی حدود کی پابندی، حلال و حرام کی تمیز، اور نیک و بد کے امتیاز کی خواہ کتنی ہی تلقین کیجائے، لیکن اول تو اس کی عقل و وجدان پر مسلسل بدکاریاں کرتے رہنے کے باعث ایسا پردہ پڑ جاتا ہے کہ اس قسم کی اخلاقی تعلیم کا اس پر کوئی اثر نہیں ہوتا، اور اگر اس کے ضمیر میں کچھ زندگی باقی بھی ہوتی ہے تو وہ اس کے نفس پر اتنی حاوی نہیں ہوتی کہ اس کے اثر سے وہ حق کو محض اس بنا پر کہ وہ حق ہے، بطوع و رغبت قبول کرلے، اور ان لذتوں سے دست بردار ہو جائے، جو بے قیدی کی زندگی میں اسے حاصل ہوتی ہیں، بخلاف اس کے جب کسی اخلاقی تعلیم کی پشت پر وعظ و تذکیر کیساتھ سیاست و تعزیر بھی ہوتی ہے اور بد کو بد کر کے دکھا دینے کے ساتھ، بدی کو روک دینے والی

قوت سے نہیں کی جاتی ہے اور نہ رفتہ رفتہ طبیعت میں نیک بننے کی صلاحیت پیدا ہوتی ہے [illegible] حدود کی پابندی اور برے بھلے کی تمیز آہستہ آہستہ ترقی کرتی ہے اور آخرکار وہی انسان اس نیکی کی تعلیم کو دل میں جگہ دینے لگتا ہے جو بے قیدی کی زندگی میں اس کو سننے کا بھی روادار نہ تھا۔

تھوڑی دیر کے لئے کسی ایسی سوسائٹی کا تصور کیجئے جس میں کوئی قانون نافذ العمل نہیں ہے، ہر فرد اخلاقی حدود کی پابندی سے آزاد ہے جس پر بس چلتا ہے اسے لوٹ لیتا ہے جس سے عداوت ہوتی ہے اسے مار ڈالتا ہے جس چیز کی ضرورت ہوتی ہے اسے چرا کر یا چھین کر حاصل کر لیتا ہے جو خواہش دل میں پیدا ہوتی ہے اسے جس طریقہ سے چاہتا ہے پورا کر لیتا ہے حلت و حرمت کی [illegible] تمیز نہیں ہوتی، جائز و ناجائز کے فرق سے کوئی واقف ہوتا ہے، حقوق و فرائض کے تخیل سے [illegible] ہوتا ہے اس کے سامنے اپنی خواہشات ہوتی ہیں اور انھیں پورا کرنے کے [illegible] جو [illegible] ہیں ایسی حالت میں اگر کوئی اخلاقی مصلح کھڑا ہو اور لوگوں کو حلال و حرام کی تمیز سکھائے [illegible] کی حد بندی کرے، مقاصد میں حسن و قبح اور طریقوں میں نیک و بد کا فرق دکھائے، چوری سے، حرام خوری سے، خون ناحق سے، زنا اور حق تلفی سے روکے، افراد کے حقوق و فرائض متعین کرے اور ایک مکمل ضابطہ قوانین اخلاق مرتب کر کے رکھ دے، مگر اس قانون کی تنفیذ کے لئے اس کے پاس وعظ و پند اور دلیل و حجت کے سوا کوئی قوت نہ ہو تو کیا یہ امید کی جا سکتی ہے کہ وہ جماعت [illegible] قیود کو بخوشی قبول کر لے گی، کیا وہ اس کے مسکت دلائل سے مغلوب ہو کر [illegible] کی پابند بن جائے گی؟ کیا وہ اس کی پند و نصیحتوں سے متاثر ہو کر خود بخود [illegible] ہو جائے گی جو اس کو بے قیدی کی زندگی میں حاصل تھیں؟ [illegible] اس سوال کا جواب [illegible] میں دیکھئے کیونکہ دنیا میں [illegible] نفسوں کی [illegible] کو محض نیکی سمجھ کر اختیار کرتے ہیں [illegible] چھوڑ دیتے ہیں [illegible] ہو چکا ہے۔

لیکن [illegible] اس صورت میں کیا ہو [illegible] اخلاقی وعظ و [illegible] ہی نہیں [illegible] صاحب [illegible] ملک میں ایک باجبروت حکومت قائم کر دے جس کی قوت سے [illegible] یکلخت دور ہو جائیں جو حیوانی زندگی سے پیدا ہوتی ہیں، تو یقیناً بعض [illegible] سے بدل جائیں گی اور

یہ شخص اس صداقت عظمیٰ کی کامیابی کا فتویٰ لکھ دیگی۔

اسلام کی اشاعت کا بھی تقریباً یہی حال ہے۔ اگر اسلام صرف چند عقائد کا مجموعہ ہوتا، اور اللہ کو ایک کہنے، رسالت کو برحق ماننے، یوم آخر اور ملائکہ پر ایمان لانے کے سوا انسان سے وہ کوئی اور مطالبہ نہ کرتا تو شیطانی طاقتوں سے اس کو کچھ زیادہ جھگڑنے کی نوبت نہ آتی لیکن مشکل یہ ہے کہ وہ صرف ایک عقیدہ ہی نہیں بلکہ ایک قانون بھی ہے، اور ایسا قانون ہے جو انسان کی عملی زندگی کو اوامر و نواہی کی بندشوں میں جکڑ دینا چاہتا ہے۔ اس لئے اس کا کام صرف پند و موعظت سے نہیں چل سکتا اور اسے نوک زبان کے ساتھ نوک سناں سے بھی کام لینا پڑتا ہے۔ اس کے عقائد سے سرکش انسان کو اتنا بعد نہیں ہے، جتنا اس کے قوانین کی پابندی سے انکار ہے۔ وہ چوری کرنا چاہتا ہے اور اسلام اسے ہاتھ کاٹنے کی دھمکی دیتا ہے۔ وہ زنا کرنا چاہتا ہے، اور اسلام اسے کوڑوں کی مار کا حکم سناتا ہے، وہ سود کھانا چاہتا ہے اور اسلام اس کو فَاْذَنُوْا بِحَرْبٍ مِّنَ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ کا چیلنج دیتا ہے۔ وہ حرام و حلال کی قیود سے نکل کر نفس کے مطالبات پورے کرنا چاہتا ہے، اور اسلام ان قیود سے باہر نفس کے کسی حکم کی پیروی نہیں کرنے دیتا۔ اس لئے نفس پرست انسان کی طبیعت اس سے متنفر ہوتی ہے، اور اس کے آئینۂ قلب پر گناہ گاری کا ایسا زنگ چڑھ جاتا ہے کہ اس میں صداقت اسلام کے نور کو قبول کرنے کی صلاحیت ہی باقی نہیں رہتی، یہی وجہ ہے، کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ۱۳ برس تک عرب کو اسلام کی دعوت دیتے رہے، وعظ و تلقین کا جو موثر سے موثر انداز ہو سکتا تھا اسے اختیار کیا، مضبوط دلائل دیئے، واضح حجتیں پیش کیں، فصاحت و بلاغت اور زور خطابت سے دلوں کو گرمایا، اللہ کی جانب سے محیر العقول معجزے دکھلائے، اپنے اخلاق اور اپنی پاک زندگی سے نیکی کا بہترین نمونہ پیش کیا، اور کوئی ذریعہ ایسا نہ چھوڑا جو حق کے اظہار و اثبات کے لئے مفید ہو سکتا تھا، لیکن آپ کی قوم نے آفتاب کی طرح آپ کی صداقت کے روشن ہو جانے کے باوجود آپ کی دعوت قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ حق ان کے سامنے خوب ظاہر ہو چکا تھا، انھوں نے برائی العین دیکھ لیا تھا کہ جس راہ کی طرف ان کا ہادی انھیں بلا رہا تھا، وہ سیدھی راہ ہے، مگر اس کے باوجود صرف یہ چیز انھیں اس راہ کو اختیار کرنے سے روک رہی تھی کہ ان لذتوں کو چھوڑنا انھیں ناگوار تھا جو کافرانہ بے قیدی کی زندگی میں انھیں حاصل تھیں۔ لیکن جب وعظ و تلقین کی ناکامی کے بعد داعیٔ اسلام ؐ نے ہاتھ میں تلوار لی، اور

[illegible] غیر محنت قومی حقائق کا اعلان کر کے تمام مفاخر کا خاتمہ کر دیا۔ غرض
اقتدار کے تمام بتوں کو توڑ دیا۔ ملک میں ایک منظم اور منضبط حکومت قائم کر دی۔ اخلاقی قوانین
بجبر نافذ کر کے اس بدکاری و گناہگاری کی آزادی کو سلب کر لیا جس کی عادتیں ان کو مدہوش کئے
ہوئے تھیں، اور وہ پر امن فضا پیدا کر دی جو اخلاقی نفاست اور انسانی محاسن کے نشوونما کے لئے ہمیشہ
ضروری ہوا کرتی ہے۔ دلوں سے رفتہ رفتہ بدی و شرارت کا زنگ چھوٹنے لگا۔ طبیعتوں سے فاسد
مادے خود بخود نکل گئے۔ روحوں کی کثافتیں دور ہو گئیں۔ اور صرف یہی نہیں کہ آنکھوں سے
پردہ ہٹ کر حق کا نور صاف عیاں ہو گیا، بلکہ گردنوں میں وہ سختی اور سروں میں وہ نخوت
بھی باقی نہیں رہی جو ظہور حق کے بعد انسان کو اس کے آگے جھکنے سے باز رکھتی ہے۔

عرب کی طرح دوسرے ممالک نے بھی جو اسلام کو اس سرعت سے قبول کیا کہ
ایک صدی کے اندر چوتھائی دنیا مسلمان ہو گئی، تو اس کی وجہ بھی یہی تھی کہ اسلام
کی تلوار نے ان پردوں کو چاک کر دیا جو دلوں پر پڑے ہوئے تھے۔ اس فضا کو صاف
کر دیا جس کے اندر کوئی اخلاقی تعلیم پنپ نہیں سکتی۔ ان حکومتوں کے تختے الٹ دیئے
جو حق کی دشمن اور باطل کی پشت پناہ تھیں۔ ان بدکاریوں کا استیصال کر دیا جو
دلوں کو نیکی و پرہیزگاری سے دور رکھتی ہیں۔ ان عادلانہ اخلاقی قوانین کو نافذ
کیا جو آدمی کو حیوانیت کے درجے سے نکال کر انسان بنا دیتے ہیں۔ اور پھر
اسلام کو عملی پیکر میں پیش کر کے دنیا پر ثابت کر دیا کہ انسان کی اخلاقی و
مادی اور روحانی ترقی کے لئے اس سے بہتر کوئی دوسرا دستور عمل نہیں ہو سکتا۔
پس جس طرح یہ کہنا غلط ہے کہ اسلام تلوار کے زور سے لوگوں کو مسلمان بناتا ہے اسی
طرح یہ کہنا بھی غلط ہے کہ اسلام کی اشاعت میں تلوار کا کوئی حصہ نہیں ہے۔ حقیقت
ان دونوں کے درمیان ہے، اور وہ یہ ہے کہ اسلام کی اشاعت میں تبلیغ اور تلوار
دونوں کا حصہ ہے، جس طرح ہر تہذیب کے قیام میں ہوتا ہے۔ تبلیغ کا کام تخم ریزی
ہے، اور تلوار کا کام قلبہ رانی ہے۔ پہلے تلوار زمین کو نرم کرتی ہے تاکہ اس میں
بیج کو پرورش کرنے کی قابلیت پیدا ہو جائے، پھر تبلیغ بیج ڈال کر آب پاشی

کرتی ہے تاکہ وہ پھل حاصل ہو جو اس باغبانی کا مقصود حقیقی ہے، ہمکو دنیا کی
پوری تاریخ میں کسی ایسی تہذیب کا نشان نہیں ملتا جس کے قیام میں ان دونوں عناصر
کا حصہ نہ ہو، تہذیب کی کسی خاص شکل کا کیا ذکر ہے، خود تہذیب کا قیام ہی اس وقت
تک ناممکن ہے، جب تک قلبہ رانی، ورتخم پاشی کے یہ دونوں عمل اپنا اپنا حصہ ادا
نہ کریں، ہر شخص جو انسانی فطرت کا رمز شناس ہے، اس حقیقت سے نا آشنا نہیں
ہے، کہ جماعتوں کی ذہنی و اخلاقی اصلاح کے سلسلہ میں ایک وقت ایسا ضرور آتا ہے
جب کہ قلب و روح کو خطاب کرنے سے پہلے جسم و جان کو خطاب کرنا پڑتا ہے،

جنگ کے ضوابط و قواعد

گذشتہ ابواب میں جو کچھ بیان کیا گیا اس کا تعلق جنگ کے محض اخلاقی پہلو سے تھا، اب ہم بتانا چاہتے ہیں کہ جنگ کے عملی پہلو میں اسلام نے کس قدر عظیم الشان اصلاح کی ہے۔

ہر کام کے حسن و قبح کا فیصلہ دو چیزوں پر کیا جاتا ہے ایک مقصد دوسرے طریق حصولِ مقصد اگر نفس مقصد بُرا ہو تو خواہ اس کو کتنے ہی شریفانہ طریقے سے حاصل کیا جائے، وہ بہرحال مکروہ ہی رہیگا، اور اگر مقصد فی نفسہ نہایت شریف و اعلیٰ ہو لیکن اسے حاصل کرنے کے طریقے غیر شریفانہ سے گرے ہوئے ہوں تو ان سے خود مقصد کی شرافت بھی داغدار ہو جاتی ہے مثال کے طور پر ایک شخص کا مقصد تو یتیم بچوں کی تعلیم و تربیت اور بیوہ عورتوں کی پرورش ہو مگر اس نیک کام کے لیے وہ چوری اور رہزنی کے ذریعہ روپیہ حاصل کرتا ہے، تو گو اس کا مقصد نہایت پاکیزہ ہے لیکن قانون و اخلاق کی نظر میں وہ اسی طرح مجرم ٹھہرایا جائیگا جس طرح ایک چور اور رہزن ٹھہرایا جاتا ہے بخلاف اس کے ایک دوسرا شخص حقیقت میں دنیا کو دھوکا دینا چاہتا ہے لیکن عوام پر اپنا تقدس قائم کرنے کے لیے مسجد میں بیٹھ کر علوم دین کی تعلیم دیتا ہے، نوافل و وظائف کے دریا بہاتا ہے، اور اپنا تمام وقت ذکرِ الٰہی میں صرف کر دیتا ہے، تو گو اس کے یہ افعال نہایت مقدس ہیں مگر وہ گندہ مقصد جس کے لیے اس نے یہ روپ بھرا ہے اس کے حسنِ عمل کی پونجی کو نہ صرف برباد کر دیتا ہے بلکہ اس پرفریب دینداری سے اس کا جرم اور بھی زیادہ سنگین ہو جاتا ہے۔

یہی حال جنگ کا بھی ہے۔ اگر جنگ کا مقصد کمزور قوموں کی آزادی چھیننا، ملکوں کی دولت لوٹنا، اور بندگانِ خدا کو ان کے جائز حقوق سے محروم کرنا ہو تو ایسی جنگ خواہ کتنے ہی ضبط و نظم کے ساتھ کی جائے، خواہ اس میں غیر مقاتلین کی عصمت، زخمیوں کی حفاظت، عورتوں کی عزت، اور دشمن کی عزت کا کتنا ہی لحاظ رکھا جائے، خواہ اس میں لوٹ مار، آتش زنی، تباہ کاری، قتل عام، اور

رہیگی، اور اس الغضب طلوب انتقام سے اس کی ذات میں کوئی فرق نہ آئیگا، زیادہ سے زیادہ اتنا ہوگا کہ وہ
ایک بدتر ظلم نہ رہیگی، خوش تر ظلم ہوجائیگی۔ اسی طرح اگر جنگ کا مقصد نہایت شریف ہو، مثلاً وہ کسی
جائز حق کی حفاظت یا دفعِ فساد و دفعِ شر کے لئے لڑی جائے، مگر اس کے طریقے ظالمانہ ہوں، اسمیں
کسی قسم کے اخلاقی حدود ملحوظ نہ رکھے جائیں، اور لڑنے والوں کا مطمح نظر محض دشمن کو تباہ کرنا اور
اس کو مبتلائے عذاب کرکے جذبۂ انتقام کی آگ بجھانا ہو، تو ایسی جنگ بھی حق کے راستہ سے ہٹی ہوئی
ہوگی، اور اس کے لڑنے والے اصلاً برحق ہونے کے باوجود اپنے ان افعال سے اپنے آپ کو
ظالموں کی صف میں پہونچا دیں گے۔

پس ایک جائز اور خالص حق پرستانہ جنگ کی تعریف یہ ہے کہ اس کا مقصد اور طریقِ حصولِ
مقصد دونوں پاکیزہ اور اشرف و اعلیٰ ہوں۔ اسلام کی تعلیم جنگ کے متعلق اب تک جو کچھ کہا
گیا ہے، وہ صرف اس کے مقصد کی پاکیزگی اور شرافت و بزرگی کو ثابت کرتا ہے۔ اب اثباتِ
مدعا کے لئے دوسرا مرحلہ باقی ہے، سو اس باب میں ہم یہ تحقیق کریں گے کہ طریقِ حصولِ مقصد کے
اعتبار سے اسلام کی جنگ کس حد تک تہذیب و شرافت کے اس معیار پر پوری اترتی ہے۔

اسلام سے پہلے عرب کا طریقِ جنگ

یہاں مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اسلام کے طریقِ جنگ کی تفصیلات بیان کرنے سے پہلے
یہ بتا دیا جائے کہ اسلام جس زمانہ میں ظاہر ہوا ہے، اس وقت عام طور پر کس قسم کا طریقِ جنگ رائج
تھا، تاکہ ناظرین کرام ٹھیک ٹھیک معلوم کر سکیں کہ اسلام نے آکر اس میں کیا اصلاح کی؟ اور اس
اصلاح کی صحیح قدر و قیمت کیا ہے؟ اس کے لئے سب سے پہلے خود اس قوم پر نظر ڈالئے جسمیں
ابتداءً اسلام ظاہر ہوا۔

عرب میں جنگ کی حیثیت ایک قومی پیشہ کی سی تھی۔ ذرائع معاش کی قلت، ضروریاتِ
زندگی کی کمیابی، اور اجتماعی ضبط و نظام کے فقدان سے عربوں میں جنگجوئی کی عادت اس قدر
راسخ ہوگئی تھی کہ وہ قتل و خوں ریزی، اور لوٹ مار کو اپنی قومی خصوصیات بلکہ مفاخر میں

شمار کرنے لگے تھے، غالباً ابتدا میں صرف پیٹ بھرنے، پانی لینے، چراگاہوں میں جانور چرانے یا انتقام لینے کے لئے اس کی ضرورت پیش آتی ہوگی، لیکن صدیوں تک شمشیر زنی و مردم کشی کے کھیل میں مشغول رہنے کی وجہ سے ان کو خونخواری کا ایسا چسکا لگ گیا تھا کہ خون ریزی کسی غرض کے لیے نہیں بلکہ مقصود بالذات بن گئی تھی، اور اس کے ساتھ شقاوت، سنگدلی، انتقام جوئی، کینہ پروری، درندگی، وحشت اور وہ تمام خصائل بھی ان کی سیرت میں نمایاں ہو گئے تھے جو اس قسم کی زندگی بسر کرنے سے قدرتی طور پر نشوونما پاتے ہیں۔ قبیلوں اور خاندانوں میں پشتہا پشت تک عداوتیں منتقل ہوتی تھیں، دشمن قبیلہ کو ہر طرح تباہ و برباد کیا جاتا تھا، آتش انتقام کو بجھانے کے لئے دشمن کو عذاب دینے اور بے حرمت کرنے کے نہایت وحشیانہ طریقے اختیار کئے جاتے تھے، اور محض اظہار فخر و شجاعت کے لئے بھی بسا اوقات نوع انسان کا خون بے دریغ بہایا جاتا تھا۔

جنگ کا تصور عرب جاہلیت میں اعراب قدیمہ کے حالات معلوم کرنے کے لئے ہمارے پاس صرف دو ذریعے ہیں۔ ایک وہ داستانیں جو ایام عرب کے نام سے اہل عرب میں رائج تھیں، دوسرے شعرائے عرب کا کلام جس میں وہ اپنی سوسائٹی کی معاشرت، تہذیب، معاملات، دوستیوں و عداوتوں کی صحیح صحیح تصویریں کھینچتے تھے۔ عجم کی طرح ان کی شاعری نازک خیالیوں اور مبالغہ آفرینیوں کا مجموعہ نہ تھی، بلکہ وہ اپنے گردوپیش جو کچھ دیکھتے تھے اسی کو اپنی زبان میں بے تکلف ادا کر دیتے تھے۔ اس لئے ان کی شاعری نری شاعری ہی نہ تھی بلکہ قومی سیرت کی تصویر بھی تھی۔ جنگ کے متعلق اہل عرب کا تصور کیا تھا؟ وہ اس کو کیا سمجھتے تھے؟ ان کے لڑنے کے طریقے کیا تھے؟ دشمن کیسا تھا اور ان کا برتاؤ کیسا تھا؟ کون کون سے محرکات ان کو جنگ پر ابھارتے تھے؟ کن اغراض و مقاصد کے لئے وہ جنگ کیا کرتے تھے؟ یہ سب چیزیں ان کے اشعار سے ظاہر ہوتی ہیں۔ وہ جو اصطلاحات، تشبیہات اور استعارات جنگ کو اور جنگ کے متعلق اپنے خیالات کا اظہار کرنے کے لئے استعمال کرتے تھے، ان کے تصور جنگ کا ٹھیک ٹھیک نقشہ کھینچ دیتے ہیں۔ مثال کے طور پر ہم یہاں چند الفاظ و محاورات اور استعارات و تشبیہات کو نقل کرتے ہیں۔

حرب، جنگ کے لئے ایک مستعمل لفظ ہے۔ لغت میں اس کے اصلی معنی خشمگیں ہونے کے ہیں۔

محاربۃ، غصہ کرنے اور بھڑکانے اور نیزہ تیز کرنے کو کہتے ہیں،

حَرَب، کسی کے مال کو لوٹ لینا،

حُریبہ، لوٹا ہوا مال جس پر آدمی زندگی بسر کرتا ہو،

محروب اور حریب، وہ شخص جس کا مال لوٹ لیا گیا ہو،

احراب، دشمن کا مال لوٹنے کے لئے کسی کی رہنمائی کرنا،

روع، لڑائی کے لئے عام طور پر بولا جاتا ہے، اسکے اصلی معنی فزع اور خوف کے ہیں، گویا جنگ کو ایک خوفناک چیز سے موسوم کیا گیا ہے، وداک بن ثُمیل المازنی کہتا ہے:۔

مقادیمٌ وصالون فی الروع خطوُهم

وہ آگے بڑھنے والے اور لڑائی کے خطرہ میں قدم ملا کر چلنے والے ہیں،

وغی، یہ بھی لڑائی کا ایک مشہور نام تھا اس کے لغوی معنی شور و ہنگامہ کے ہیں، شاعر کہتا ہے:۔

ما زال معروفاً لمُرّۃ فی الوغی علُّ القنا وعلیهم انهلها

"ہمیشہ سے بنو مرہ کی یہ صفت مشہور ہے کہ وہ جنگ میں بار بار دشمنوں کے خون سے اپنے نیزوں کی پیاس بجھاتے ہیں، اور کم از کم ایک مرتبہ ان کی تشنگی فرو کرنا تو ان پر فرض ہے"

شرح، اصلی معنی بدی کے ہیں، اور جنگ کے لئے مجازاً بکثرت بولا جاتا ہے، شاعر اپنے ممدوح قبیلہ کی اس طرح تعریف کرتا ہے:۔

قومٌ اذا الشر ابدیٰ ناجذیه لهم طاروا الیه زرافات ووُحدانا

"وہ ایسی قوم ہے کہ جب لڑائی اپنی کچلیاں نکال کر اس کو ڈراتی ہے، تو وہ گروہ در گروہ اور تنہا تنہا اس کے مقابلہ کے لئے دوڑ پڑتے ہیں"

کریہۃ، یہ بھی اسمائے جنگ میں سے ہے اور اس کے اصلی معنی سختی، مصیبت اور بلا کے ہیں، شاعر اپنے ممدوح کی تعریف میں کہتا ہے:۔

صعبُ الکریهۃ لا یرامُ جنابُه ماضی العزیمۃ کالحسام المقصل

"وہ جنگ کی مصیبت میں سخت ہے، اس کے احاطۂ مکان کا کوئی قصد نہیں کر سکتا

شمشیر براں کی طرح ارادہ کا پورا ہو"

ھیاج: برانگیختی وخشم گرفتگی کے معنی میں آتا ہے اور مجازاً جنگ کے لئے بھی بولا جاتا ہے، شاعر کہتا ہے:-

کل امرئ یجری الیٰ یوم الھیاج بما استعدا

"ہر شخص لڑائی کے دن اسی سامان کے ساتھ جاتا ہے جو اس نے مہیا کیا ہو"

مغضبۃ: اصلی معنی غصہ و ناراضی اور خشم گرفتگی کے ہیں، اور عرف عام میں جنگ کے لیے مستعمل ہوتا ہے، ابن علقمہ کہتا ہے:-

ان تدع زید بنی ذھل لمغضبۃ نغضب لزرعۃ ان الفضل محسوب

"اگر زید بن ذہل کو جنگ کے لئے بلائیگا تو ہم بنی زرعہ کی طرف سے لڑیں گے، کیونکہ فضیلت محسوب ہوتی ہو"

شعرائے عرب نے جنگ کو مینڈھوں کے ٹکر لڑنے سے تشبیہ دی ہے چنانچہ اس کے لئے نطاح کا لفظ استعمال کرتے ہیں، سعد بن مالک کہتا ہے:-

والکر بعد الفر اذ کرہ التقدم والنطاح

"گریز کے بعد حملہ بہتر ہے جبکہ آگے بڑھنا اور دشمن سے ٹکر لڑنا ناپسند نہ ہو"

جنگ کو اونٹ کے سینے سے تشبیہ دی گئی ہے، کیونکہ اونٹ جب کسی چیز پر اپنا سینہ رکھ دیتا ہے، تو وہ پس کر رہ جاتی ہو، اور اس لئے بھی کہ اونٹ ایک سخت کینہ پرور اور انتقام جو جانور ہے، شاعر کہتا ہے:-

اناختم علینا کلکل الحرب مرۃ فنحن منیخوھا علیکم بکلکل

"تم نے ایک مرتبہ ہمارے اوپر جنگ کے سینہ کو رکھا ہے، اس لئے ہم بھی عنقریب تم پر اس کا سینہ رکھنے والے ہیں"

جنگ کو چکی سے تشبیہ دی گئی ہے، کیونکہ وہ بھی دشمن کو آٹے کی طرح پیس دیتی ہے، ابو الغول طہوی کہتا ہے:-

فوارس لا یملون المنایا اذا دارت رحی الحرب الزبون

وہ ایسے شہسوار ہیں کہ موت سے نہیں گھبراتے جبکہ شدید جنگ کی چکی چلتی ہے"

عمرو بن کلثوم کہتا ہے :۔

متی ننقل الی قوم رحانا　　یکونوا فی اللقاء لہا طحینا

"جب ہم کسی قوم کی طرف اپنی چکی کو لیجاتے ہیں تو وہ لڑائی میں اس کا آٹا بن جاتی ہو"

جنگ کے لئے محض "چکر" کا بھی استعارہ مستعمل تھا عنترہ بن شداد عبسی کہتا ہے :۔

ولقد خشیت بان اموت ولم تکن　　للحرب دائرۃ علی ابنی ضمضم

"مجھے اندیشہ ہے کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ میں مرجاؤں اور ضمضم کے دونوں بیٹے لڑائی کے چکر میں نہ آئیں"

جنگ کو آگ سے بھی بکثرت تشبیہ دی گئی ہے کیونکہ وہ بھی دشمن کو آگ کی طرح جھلس دیتی ہے، حارث بن حلزہ کہتا ہے :۔

ماجزعنا تحت العجاجۃ اذ و　　تـــوا شلالا و اذ تلظی الصلاء

"ہم گرد و غبار میں مضطرب نہ ہوئے جبکہ سوار متفرق ہو کر بھاگے اور جنگ کی آگ خوب بھڑکی"

سعد بن مالک کہتا ہے :

من صد عن نیرانہا　　فانا ابن قیس لا براح

"کوئی جنگ کی آگ سے منہ موڑ جائے تو موڑ جائے، میں تو قیس کا بیٹا ہوں، ہرگز نہ ٹلونگا"

بشامہ بن غدیر کہتا ہے :۔

قومی بنو الحرب العوان بجمعہم　　والمشرفیۃ والقنا اسعا لہا

"میری قوم ساری کی ساری شدید جنگ کی حریف ہے، اور اس کے پاس مشرفی تلوار اور نیزہ، جنگ کی آگ کو بھڑکانے کا ایندھن ہے"

ابو الغول طہوی کہتا ہے :۔

ولا تبلی بسالتہم وان ہم　　صلوا بالحرب حینا بعد حین

"ان کی دلیری و مردانگی میں کمی نہیں آتی، اگرچہ وہ آتش جنگ میں پے در پے کودتے ہیں"

ان تمام تشبیہوں اور استعاروں اور ترکیبوں سے معلوم ہوتا ہے کہ اہل عرب کے تصور میں جنگ ایک ایسی چیز کا نام تھا جس میں لوٹ مار ہو، شور و ہنگامہ ہو، غضب و اشتعال ہو، جس کے خلاف لڑی جائے اس کو پیس دے، جھلس دے، تہس نہس کر دے، اور اس پر ایسی مصیبتیں وارد ہوں جن کے خوف سے رونگٹے کھڑے ہو جائیں، اور لڑنے والے دشمنوں کی حیثیت ان کے تصور میں اس مینڈھے کے مانند تھی جو غضبناک ہو کر اپنے حریف سے ٹکراتا ہے۔ اس میں شجاعت و بسالت کا جوہر تو ضرور ہے، مگر اخلاقی فضیلت اور انسانی شرافت کا نام تک نہیں۔

عربی سیرت میں جنگجوئی کا اثر یہ جنگ اہل عرب کے قلب و روح کی سب سے زیادہ مرغوب چیز تھی۔ ان کے ہاں عام عقیدہ یہ تھا کہ اگر کوئی شخص پلنگ پر پڑ کر مرتا ہے تو اس کی روح ناک سے نکلتی ہے، اور اگر میدان جنگ میں لڑ کر جان دیتا ہے تو اس کی روح اس کے جسم سے نکلتی ہے۔ ہر عرب کی تمنا تھی کہ اس کی روح اس کے زخم سے نکلے کیونکہ ناک سے روح کے نکلنے کو وہ سخت عار سمجھتا تھا۔ شعرائے عرب فخر کرتے ہیں کہ ان کے ہاں کوئی ناک کی موت نہیں مرتا۔ چنانچہ ایک شاعر اپنے قومی مفاخر بیان کرتے ہوئے کہتا ہے:۔

وما مات منا سيد حتف انفه

"ہم میں سے کوئی سردار ناک کی موت نہیں مرا"

جنگ کی صدا کان میں پڑتے ہی ہتھیار لے کر دوڑ جانا عربی سوسائٹی میں فرض کا درجہ رکھتا تھا۔ جنگ خواہ کیسی ہو اس سے اجتناب کرنا بڑی بزدلی اور نامردی کی بات سمجھی جاتی تھی اور اگر کسی کی قوم اس قسم کی بزدلی دکھاتی تو وہ اس پر بڑی شرم و غیرت کا اظہار کرتا تھا۔ ایک شاعر اسی کے متعلق کہتا ہے:۔

لا يسألون اخاهم حين يندبهم في النائبات على ما قال برهانا

"بنو مازن کا یہ حال ہے کہ جب ان کا کوئی بھائی حوادث و مصائب میں ان کو مدد کے لیے پکارتا ہے تو وہ اس کے قول کی کوئی دلیل اور وجہ پوچھے بغیر جنگ میں کود پڑتے ہیں۔

لكن قومي وان كانوا ذوي عدد ليسوا من الشر في شيء وان هانا

مگر میری قوم کثیر التعداد ہونے کے باوجود ایسی ہے کہ جنگ سے کوئی علاقہ نہیں رکھتی

خواہ وہ معمولی ہی سی جنگ ہو،

فلیت لی بھم قوماً اذا رکبوا　　　شدوا الاغارۃ فرساناً و رکبانا

کاش اس کے بدلہ مجھے ایسی قوم ملتی جو گھوڑوں اور اونٹوں پر سوار ہو کر خوب غارتگری کرتی۔

ایک دوسرا شاعر اپنے خاندان کے مفاخر بیان کرتے ہوئے کہتا ہے:-

انی لمن معشر افنی اوائلھم　　　قیل الکماۃ الا این المحامونا

"میں اس قوم سے ہوں جس کے بزرگ، بہادروں کے محض اس غیرت دلانے والے قول پر مر مٹے، کہ ہاں! کہاں ہیں نسب کی حفاظت کرنے والے"

اس قسم کے جذبات سے عرب جاہلیت کا لٹریچر بھرا پڑا ہے جس کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ عرب جنگجوئی کو بڑے فخر کی چیز سمجھتے تھے، اور ان کی نگاہ میں خوں ریزی ایک بڑی ہی خوبی کا کام تھا۔

جنگ کے محرکات اور غنیمت کا شوق اس خوفناک کام پر جو چیزیں ان کو ابھارتی تھیں ان میں سے ایک مالِ غنیمت کا شوق تھا، ایک عرب جب ہتھیار سنبھالتا تھا تو پہلی تمنا جو اس کے دل میں پیدا ہوتی تھی، وہ یہ تھی کہ جنگ میں اسے خوب مالِ غنیمت اور لونڈی غلام ہاتھ آئیں، تجارت یا محنت و مشقت سے حاصل کیا ہوا مال اس کی نگاہ میں ذلیل مال ہے، اصلی عزت اس کے نزدیک اس طیب مال کے حاصل کرنے میں تھی جسے وہ میدانِ جنگ سے لوٹ کر لائے، رات دن مختلف قبیلے ایک دوسرے پر اسی غرض کے لئے چھاپے مارا کرتے تھے، کہ بکریاں، اونٹ، لونڈی غلام اور مال و متاع لوٹ لائیں، اور یہی شوق ان کو زیادہ تر جنگ پر ابھارا کرتا تھا، ایک شاعر اپنے جذبۂ شوقِ غنیمت کو اس طرح ظاہر کرتا ہے:-

فلئن بقیت لارحلن بغزوۃ　　　تحوی الغنائم او یموت کریم

"اگر میں زندہ رہا تو ایک ایسی جنگ پر جاؤں گا جسمیں خوب غنائم ہاتھ آئیں، یا پھر میں ایک شریف کی سی موت مر جاؤں"

ایک دوسرا شاعر اپنے قبیلہ کی تعریف میں کہتا ہے، کہ وہ لوٹ مار کے جوش میں خود اپنے بھائیوں کو بھی نہیں چھوڑتا:-

وکن اذا اغرن علیٰ جناب　　واعوزھن نھب حیث کانا

ہمارے گھوڑے جب قبیلہ جناب پر غارتگری کرتے ہیں اور وہاں کچھ لوٹ کا مال ہاتھ نہیں آتا، تو وہ،

اغرمن ھن الضباب علی حلول　　وضبة انه من حان حانا

ضباب اور ضبہ پر جبکہ وہ اپنے گھروں میں ہوتے ہیں تاخت کرتے ہیں، پھر جو مرے سو مرے اس کی وہ پروا نہیں کرتے،

"واحیانا علی بکر اخینا　　اذا ما لم نجد الا اخانا

"اور کبھی کبھی خود بکر پر بھی حملہ کر دیتے ہیں جبکہ ہمیں اپنے بھائی کے سوا کوئی اور لوٹ مار کے لئے نہ ملے"

جب کوئی قبیلہ جنگ کے لئے نکلتا تو اس کی عورتیں اپنے مردوں کو قسم دیدیا کرتی تھیں کہ بغیر مال غنیمت لئے واپس نہ آنا، چنانچہ عمرو بن کلثوم کہتا ہے:۔

اخذن علی بعولتھن عھدا　　اذا لاقو کتائب معلمین

انھوں نے اپنے شوہروں سے عہد لیا ہے کہ جب بہادری کے نشان لگائے ہوئے دشمن کے لشکر سے ملیں،

لیستلبن افراسا وبیضا　　واسری فی الحبال مقرنینا

"تو گھوڑے اور صیقل شدہ تلواریں لیتے آئیں اور لونڈی غلام رسی میں بندھے ہوئے پکڑ لائیں

یہی شاعر دوسری جگہ اظہار فخر کے طور پر کہتا ہے:۔

فآبوا بالنھاب وبالسبایا　　وابنا بالملوک مصفدینا

"وہ لوٹے ہوئے مال اور لونڈی غلام لیکر واپس ہوئے، اور ہم بادشاہوں کو لیکر پلٹے جو بندھے ہوئے تھے"

تحالق عمم کی جنگ میں طرفہ کے قبیلہ کو جو فتح حاصل ہوئی تھی اس کا ذکر کرتے ہوئے وہ کہتا ہے:۔

یرمتدی البیض عن سوقھا　　وتلف الخیل فواج النعم

"وہ دن جبکہ چمکتی ہوئی تلواریں اپنی پنڈلیاں کھول رہی تھیں اور سوار اونٹوں کے غول کے غول جمع کرتے پھرتے تھے"۔

زہیر آل ربیعہ پر اپنی فتح کے واقعات بیان کرتے ہوئے کہتا ہے:۔

وسبینا من تغلب کل بیضا ء رقود الضحیٰ برود الرضاب

"ہم تغلب سے تمام گوری گوری لڑکیاں لوٹ لائے جو دن چڑھے تک سوتی رہتی ہیں اور جنکا لعاب دہن چوسنے سے ٹھنڈک پہونچتی ہے"۔

یوم مسحلان میں بنی شیبان کو بنی کلب پر جو فتح حاصل ہوئی تھی، اس کی کیفیت ایک شیبانی شاعر اس طرح بیان کرتا ہے:۔

عشیۃ ولّی جمعھم نتتابعوا فصار الینا نھبہ وعوا نسہ

"اس رات ان کی جمعیت بھاگی اور بھاگے ہی چلی گئی، پھر ان کا مال اسباب اور ان کی دراز قد کنواری لڑکیاں ہمارے ہاتھ آگئیں"۔

اس غنیمت کے شوق میں اکثر ایسا ہوتا کہ جب کوئی فوج کسی قبیلہ پر حملہ کرنے کے لئے نکلتی تو بہت سے مال غنیمت کے بھوکے محض لوٹ مار کے لئے اس کے ساتھ ہو جاتے تھے، حارث بن حلزہ ایک قوم پر نعمان بن منذر کی چڑھائی کا حال بیان کرتے ہوئے کہتا ہے:۔

فتادت لہ قراضبۃ من کل حی کانھم القاء

"اس کی مدد کے لئے ہر قبیلہ سے بھوکے لیٹرے جمع ہوگئے، گویا کہ وہ عقاب تھے"۔

آگے چل کر کہتا ہے:۔

ثم میلنا علی تمیم فاحرمنا وفینا بنات مر اماء

"پھر ہم بنی تمیم پر ٹوٹ پڑے اور ماہ حرام میں ان پر پہونچ ان کی بیٹیوں کو لونڈیاں بنا لیا"

یہ لوٹ مار اہل عرب کی جنگ کے اولین مقاصد میں سے تھی، اور عقلائے عرب اس جنگ کو بیکار و بے نتیجہ سمجھتے تھے جسمیں کچھ مال ہاتھ نہ آئے، اکثم بن صیفی جو اپنی قوم کا بڑا جہاندیدہ و فرزانہ شخص تھا، کہا کرتا تھا کہ اھنا الظفر کثرۃ الاسریٰ وخیر الغنیمۃ المال، "بہترین فتح وہ ہے جسمیں قیدی ہاتھ آئیں، اور بہترین غنیمت وہ ہے جسمیں اونٹ اور بکریاں ملیں"۔

تفاخر حصول غنائم کے ساتھ دوسرا اہم محرک یہ جذبہ تھا، کہ اپنی بزرگی و شرافت اور بہادری و شجاعت کی دھاک بٹھائی جائے، یہ تفاخر کا جذبہ دراصل عربوں کی فطری خصوصیات میں سے تھا، اور اپنے ہمجنسوں کے مقابلہ میں اپنے آپ کو طاقتور، ممتاز اور معزز ثابت کرنے کے لئے وہ ہر قسم کے خطرات برداشت کرنے پر آمادہ ہو جاتے تھے، ایک بہادر عرب کی بڑی سے بڑی تمنا یہ ہوتی تھی کہ اس کی چراگاہ میں دوسرے کا اونٹ نہ چر سکے، جس چشمہ سے وہ پانی پیئے اس پر دوسرا نہ آنے پائے، جس منزل میں وہ ٹھہرے وہ دوسروں کے لئے تنگ ہو جائے، جو لباس وہ پہنے اس کے مثل کوئی دوسرا نہ پہن سکے، اس کے مقابلہ پر کسی کو بڑا اور بزرگ نہ سمجھا جائے، اس کے سامنے کسی کی تعریف نہ کی جاوے، وہ جس کو چاہے قتل کر دے، کوئی اس سے خون کا انتقام نہ لے سکے، اس کا ہاتھ سب پر وار رہے، اس کی خدمت سے کسی کو عار نہ ہو، غرض یہ کہ ہر طرح اس کو دوسروں پر تفوق حاصل رہے، اور اس کے سامنے کوئی سر نہ اٹھا سکے، شعرائے جاہلیت کا سارا کلام اسی قسم کی باتوں سے بھرا پڑا ہے، ایک شاعر اپنے مفاخر بیان کرتے ہوئے کہتا ہے:-

وقد علم القبائل من معد ... اذا قبب بابطحها بنينا

"تمام قبائل معد جب سے وہ زمین پر آباد ہیں یہ جانتے ہیں کہ:-

بانا المانعون لما اردنا ... وانا النازلون بحیث شئنا

"ہم جس چیز کو چاہتے ہیں روک دیتے ہیں، اور جس منزل میں چاہتے ہیں ٹھہرتے ہیں"

وانا التارکون اذا سخطنا ... وانا الآخذون اذا رضینا

"جب ہم ناراض ہوتے ہیں تو بے خوف چھوڑ دیتے ہیں، جب ہم راضی ہوتے ہیں تو بے تکلف لے لیتے ہیں"

وانا العاصمون اذا اطعنا ... وانا العازمون اذا عصینا

"جب ہماری اطاعت کی جاتی ہے تو ہم بچانے والے ہوتے ہیں اور جب ہماری نافرمانی کی جاتی ہے تو عازم جنگ ہوتے ہیں"

ونشرب ان وردنا الماء صفوا ... ویشرب غیرنا کدرا وطینا

"جب ہم کسی چشمہ پر پہنچتے ہیں تو صاف پانی پیتے ہیں اور غیروں کو گدلا کیچڑ ملا پانی پینا پڑتا ہے"

قیس بن خطیم کہتا ہے :-

بیض مفارقنا تغلی مراجلنا ... ناسو باموالنا آثار ایدینا

"ہمارے سر سفید ہیں اور ہماری دیگیں جوش کھاتی ہیں، ہم اپنے ہاتھ کے پہونچائے ہوئے زخموں کا مداوا اپنے مال سے کرتے ہیں، (یعنی کوئی ہم سے ثار نہیں لے سکتا)

ایک اور شاعر بنی وبر کی تعریف میں کہتا ہے :-

قومٌ اذا ماجنی جانیهم امنوا ... من لؤم احسابهم ان یقتلوا قودا

"وہ ایسی قوم ہیں کہ اگر ان میں سے کوئی دست درازی کرنے والا کسی کو قتل کر دے تو وہ اس سے بے خوف رہتے ہیں کہ ان سے قصاص لیکر کوئی ان کے حسب کو بٹہ لگا سکے گا"

حجر بن خالد ثعلبی فخر کے لہجہ میں کہتا ہے :-

منعنا حمانا واستباحت رماحنا ... حمی کل قوم مستجیر مراتعہ

"ہم نے اپنی محفوظ چراگاہ کو دوسروں کے لئے ممنوع کر رکھا ہے، اور ہمارے نیزوں نے ہر قوم کی محفوظ چراگاہوں کو جن کے زبردست محافظ موجود ہیں، اپنے لئے مباح کر لیا ہے"

اخنس اپنی قوم کے مفاخر بیان کرتے ہوئے کہتا ہے :-

اری کل قوم قاربوا قید فحلهم ... ونحن خلعنا قیده فهو سارب

"میں دیکھتا ہوں کہ ہر قوم نے اپنے اونٹ کی رسی چھوٹی کر رکھی ہے، مگر ہم نے اس کو کھلا چھوڑ دیا ہے، اور وہ آزادی سے چرتا پھرتا ہے"

ایام عرب کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ عہد جاہلیت میں جتنی ہولناک لڑائیاں ہوئی ہیں ان میں سے اکثر و بیشتر اسی جذبۂ تفاخر کا نتیجہ تھیں، مشہور حرب بسوس جو بنی تغلب اور بنی بکر بن وائل کے درمیان کامل ۴۰ برس تک جاری رہی، صرف اتنی سی بات پر ہوئی تھی، کہ بنی تغلب کے سردار کلیب بن ربیعہ کی چراگاہ میں بنی بکر بن وائل کے ایک مہمان کی اونٹنی گھس گئی، اور وہاں کلیب کے اونٹوں کے ساتھ چرنے لگی، کلیب کا قاعدہ تھا کہ وہ نہ اپنے حمی میں کسی کے جانور چرنے دیتا، نہ اپنی شکارگاہ میں کسی کو کھیلنے دیتا، نہ اپنے جانوروں کے ساتھ کسی کے جانوروں کو پانی پینے دیتا، حتی کہ اپنی آگ کے سامنے کسی کی آگ بھی جلتے ہوئے نہ دیکھ سکتا تھا، اس نے جب غیر کی اونٹنی

کو پنے ہی میں چرتے دیکھا تو غصہ میں آکر اس کو ایک تیر مارا جو اس کے تھن میں جا لگا۔ اونٹنی کے
مالک نے جو اس کو زخمی دیکھا تو اس نے فریاد کی واذلاہ ہائے یہ کیسی ذلت ہے۔ اس پر بنی بکر میں
آگ لگ گئی اور ان کے ایک نوجوان جساس بن مرہ نے جا کر کلیب کو جو اس کا حقیقی بہنوئی تھا
قتل کر ڈالا۔ کلیب کے بھائی مہلہل کو جب اس کی خبر ہوئی تو وہ اپنے بھائی کا انتقام لینے کھڑا ہو گیا۔ اور
بالآخر دونوں قبیلوں میں ایسی جنگ چھڑ گئی کہ جب تک دونوں تباہ نہ ہو گئے تلواریں نیام میں نہ گئیں۔

ایک دوسری جنگ جو حرب داحس کے نام سے مشہور ہے محض گھوڑ دوڑ میں ایک گھوڑے
کے آگے نکل جانے پر برپا ہوئی تھی۔ بنی عبس کے سردار قیس بن زہیر کے پاس داحس اور غبراء نامی
گھوڑے تھے جن کی تیز رفتاری عرب میں مشہور تھی۔ بنی بدر کے سردار حذیفہ بن بدر کو یہ بات ناگوار
ہوئی کہ اس کے ایک ہمچشم کے گھوڑوں کو اتنی شہرت نصیب ہو۔ اس نے اس سے اپنے دو گھوڑوں
سے ان کی شرط بدی۔ اور فریقین کے درمیان یہ بات طے ہوئی کہ جس کے گھوڑے آگے نکل جائیں
سو اونٹ اسے شرط کے [illegible] دونوں کے گھوڑے [illegible] گئے۔ اور جب داحس آگے
نکلنے لگا۔ تو حذیفہ کے ایک آدمی نے اس کے منہ پر [illegible] ایک وادی کی طرف موڑ دیا۔ اس بات
پر فریقین میں جھگڑا ہو گیا۔ قیس نے حذیفہ کے بیٹے ندبہ کو قتل کر دیا۔ حذیفہ نے قیس کے بھائی [illegible]
[illegible] نتیجہ یہ ہوا کہ بنی عبس اور بنی ذبیان میں ایک [illegible] جنگ شروع ہو گئی جس کا سلسلہ [illegible]
جاری رہا۔ اور اس وقت تک ختم نہ ہوا جب تک فریقین کے [illegible] دونوں [illegible]
[illegible] کے قریب نہ پہنچ گئے

اوس و خزرج کی مشہور لڑائیاں جن کا سلسلہ [illegible]
[illegible]

کا یہ خونی سلسلہ شروع ہوگیا کہ اگر اسلام نہ آتا تو دونوں قبیلے لڑ لڑ کر فنا ہو جاتے[1]۔

سوقِ عکاظ میں قبیلۂ کنانہ کا ایک شخص بدر بن معشر پاؤں پھیلا کر بیٹھ گیا اور پکار کر بولا کہ میں عرب کا سب سے معزز آدمی ہوں جس کسی کو مجھ سے زیادہ معزز ہونے کا دعویٰ ہو وہ میرے پاؤں پر تلوار مارے۔ اس پر بنو دھمان کا ایک منچلا جوان آگے بڑھا اور اس نے بدر کے پاؤں پر تلوار مار دی۔ یہ چنگاری دونوں قبیلوں میں جنگ کی آگ بھڑکانے کے لئے کافی تھی، تلواریں کھنچ گئیں، اور وہ جنگ برپا ہوئی جو پہلی حرب فجار کہلاتی ہے[2]۔ اس کے بعد کنانہ اور ہوازن میں کبھی صفائی نہ ہوئی۔ ان کی عداوتیں یہاں تک بڑھیں کہ دونوں قبیلوں کے حلیف قبائل بھی ان میں شریک ہوگئے۔

آخری حرب فجار بھی جس کے متعلق ابن اثیر کہتا ہے کہ ایامِ عرب میں اس سے زیادہ زبردست جنگ کوئی نہیں ہوئی، اسی جذبۂ فخر و غرور کا نتیجہ تھی۔ ۲۶ قبل بعثت میں نعمان بن منذر بادشاہِ حیرہ نے اپنے ہاں سے ایک تجارتی قافلہ سوقِ عکاظ میں بھیجنے کا ارادہ کیا اور سارے عرب سے پوچھا کہ کون اس کو اپنی حفاظت میں لیجانے کا ذمہ لیتا ہے، براض بن قیس کنانی نے کہا کہ میں (بنی) کنانہ سے محفوظ رکھنے کا ذمہ لیتا ہوں۔ ہوازن کے ایک سردار عروۃ الرحال نے کہا کہ میں اس کو تمام عرب سے محفوظ رکھنے کا ذمہ لیتا ہوں۔ براض اس ادعا کو برداشت نہ کرسکا، اور جب عروہ قافلہ کو لیکر چلا تو راستہ میں اس نے عروہ کا کام تمام کردیا، اس واقعہ سے کنانہ اور ہوازن کی عداوت پھر تازہ ہوگئی۔ دونوں میں جنگ چھڑی، قریش نے کنانہ کا اور بنو ثقیف نے ہوازن کا ساتھ دیا، چار سال تک شدید خوں ریزی کا سلسلہ جاری رہا اور یوم شمطہ، یوم العبلاء، یوم شرب، اور یوم الحریرہ کے وہ ہولناک معرکے برپا ہوئے جنھوں نے عرب کے تمام پچھلے معرکوں کو بھلا دیا[3]۔

انتقام: ایک اور قوی و شدید محرک جس نے عرب قبل الاسلام کی تاریخ کو خون سے رنگین کردیا، انتقام کا جذبہ تھا، عرب یہ عقیدہ رکھتے تھے کہ جب کوئی شخص قتل کیا جاتا ہے، تو اس کی روح پرند بن کر اڑ جاتی ہے، اور جب تک اس کا بدلہ نہیں لے لیا جاتا، اس وقت تک وہ کوہ و بیابان میں اسقونی، اسقونی (مجھے پلاؤ مجھے پلاؤ) کہکر چیختی پھرتی ہے، ان کی اصطلاح میں اس پرندے کا نام ھامہ یا صدی تھا،

[1] ابن اثیر ج ۱ ص ۲۰۰ تا ۲۱۱ [2] عقد الفرید ج ۳ ص ۷۸ [3] ابن اثیر ج ۱ ص ۴۲۹-۴۵۰

بعض لوگوں کا یہ عقیدہ تھا کہ جس مقتول کا انتقام لے لیا جاتا ہے وہ زندہ رہتا ہے
جس کا انتقام نہیں لیا جاتا ہے بے جان ہو جاتا ہے۔ بعض لوگ یہ سمجھتے تھے کہ جب تک بدلہ نہ
لے لیا جائے مقتول کی قبر میں اندھیرا رہتا ہے۔ اس قسم کے عقائد کی بنا پر مقتول کے رشتہ دار اہل قبیلہ
حتی کہ اس کے قبیلہ کے حلیف تک اپنا فرض سمجھتے تھے کہ اس کے قاتل سے خون کا بدلہ لے کر اس کی
روح کو مطمئن کر دیں۔ اور اگر قاتل اس کے درجہ سے کمتر درجہ کا آدمی ہو تو اس کے قبیلہ کے کسی
ایسے آدمی کو قتل کریں جس کا خون ان کے خیال میں مقتول کے خون کے برابر قیمت رکھتا ہو۔ اس
طرح بسا اوقات ایک شخص کے قتل ہو جانے سے بڑے بڑے قبیلوں میں آگ لگ جاتی تھی اور
ایسی خوں ریزیوں کا سلسلہ شروع ہوتا تھا کہ سالہا سال تک نہ تھمتا تھا۔ اگر کوئی شخص یا قبیلہ
اپنے آدمی کے خون کا بدلہ (ثار) لینے میں کوتاہی کرتا یا اس کے عوض دیت قبول کر لیتا تو یہ بڑی
ذلت کی بات سمجھی جاتی تھی اور اس بزدلی سے اس کی شرافت کو بٹہ لگ جاتا تھا۔

شعرائے جاہلیت کے کلام میں جو مضامین بکثرت وارد ہوئے ہیں ان میں سے ایک یہی
ثار کا عقیدہ ہے۔ وہ اسی عقیدہ کی بنا پر قوموں کو جنگ کا جوش دلاتے تھے اور رجز میں اکثر اس
بات پر فخر کرتے تھے کہ ان کے قبیلہ نے کبھی اپنے کسی مقتول کا خون رائگاں نہ جانے دیا۔

سموال بن عادیہ کہتا ہے:-

وما مات منا سید حتف انفہ   ولا طُلَّ منا حیث کان قتیل

"ہم سے کوئی سردار اپنی ناک کی موت نہیں مرا اور جب وہ مارا گیا تو اس کا خون بھی
رائگاں نہ گیا۔"

حارث بن حلزہ کہتا ہے:-

ان نبشتم ما بین ملحۃ فالصا   قبُ فیہا الاموات والاحیاء

"اگر تم ملحہ سے صاقب تک قبریں کھودو گے تو دیکھو گے کہ کچھ مردے ہیں جن کا خون بیکار
گیا اور وہ تم ہی میں سے ہیں، اور کچھ زندہ ہیں جن کا ثار رہ گیا اور وہ تم ہی میں سے ہیں۔"

قیس بن عاصم اپنے قبیلہ کو جوش انتقام دلانے کے لیے کہتا ہے:-

فعد بان صدا بعج عریب   تنادی مع الاطلال یا لابن حنظل

بیتیں ہیں جن میں بیان کیا گیا ہے کہ جب تک ہمارے تیر پیچھے پھرتے ہیں کیا بات ہے کہ ابن حنظل
کا بدلہ کسی نے نہ لیا۔

صوادی لا مولی عزیز یجیبها ۔۔۔ ولا اسرة تسقی صداها فتنهل

وہ صدائیں جنکا جواب دینے والا کوئی مولی عزیز نہیں اور نہ کوئی رشتہ دار ہے جو ان کو
گھاٹ پر سیراب کرے۔

تابط شرا اپنے فخر بیان کرتے ہوئے کہتا ہے:۔

قلیل غرار النوم اکبر همه ۔۔۔ دم الثار او یلقی کمیا مسقعا

"وہ بہت کم سونے والا ہے اور اس کا بڑے سے بڑا مقصد یہ ہے کہ خون کا بدلہ لے یا کسی
جفاکش بہادر سے مڈبھیڑ ہو۔"

وداک بن ثمیل اپنی قوم کی تعریف میں کہتا ہے:۔

هیم الی الموت اذ خیروا ۔۔۔ بین تباعات وتقتال

"وہ موت کے مشتاق ہوتے ہیں جب ان کو خون بہا لینے اور لڑنے کے درمیان انتخاب
کا اختیار دیا جاتا ہے۔"

بنی اسد کا ایک شاعر اپنے قبیلہ کو وصیت کرتا ہے:۔

فلا تاخذوا عقلا من القوم اننی ۔۔۔ اری العار یبقی والمعاقل تذهب

"میرے خون کے بدلہ میں اس قوم سے دیت نہ قبول کرلینا، کیونکہ عار باقی رہجاتا ہی
اور دیت کا مال خرچ ہوجاتا ہے"

بنو خزاعہ کا ایک شاعر اپنے قبیلہ کو انتقام کا جوش اس طرح دلاتا ہے:۔

ولا تطعمن ما یعلفونک انهم ۔۔۔ اتوک علی قربا هم بالمثمل

"جو کچھ وہ تجھے دیت میں دیتے ہیں اس کا خیال بھی نہ کر کیونکہ وہ باوجود قرابت کے تیرے
پاس زہر ہلاہل لائے ہیں۔"

ابعد الذی بالنعف نعف کویکب ۔۔۔ رهینة رمس ذی تراب و جندل

"کیا تو دو خون آلود زرہ دیکھنے کے بعد بھی دیت لے گا جو تیرے پاس لائی گئی۔ اور جس سے

ابھی تک خون دور نہیں ہوا ہے۔"

فان کنت قد صرت للقوم ناضحاً   یقال له بالغرب ادبر واقبل

"اگر تو نے ایسا کیا تو میں سمجھتا ہوں کہ تو وہ آب کش اونٹ بن گیا جس پر پکھال رکھ کر کہتے ہیں آگے بڑھ اور پیچھے ہٹ!"

فخذها فلیست للعزیز بخطۃ   وفیها مقال لامرئ متذلل

"اگر تو چاہے تو لے لے مگر یہ شریفوں کا چلن نہیں ہے، اور اس میں تو ذلیل آدمی کو بھی کلام ہوگا۔"

کبشہ بن معدیکرب اپنے بھائی کے خون کا بدلہ لینے کے لئے بنی زبیدہ کو اس طرح ابھارتی ہے:

ارسل عبد اللہ اذ حان وقتہ   الی قومہ لا تعقلوا لهم دمی

"عبد اللہ کا جب آخری وقت آیا تو اس نے اپنی قوم کو زبان حال سے کہلا بھیجا کہ ان سے میرے خون کی دیت نہ قبول کرنا۔"

ولا تأخذوا منهم افالاً وابکراً   واترک فی بیت بصعدۃ مظلم

"تم ان سے بچے اور جوان اونٹ لیکر مجھے چھوڑنا درآں حالیکہ میں صعدہ کی ایک تاریک قبر میں پڑا رہوں۔"

فان انتم لم تثأروا واتدیتم   فمشوا بآذان النعام المصلم

"اگر تم نے میرے خون کا بدلہ نہ لیا اور دیت قبول کر لی تو تم کن کٹے شتر مرغ کی طرح ذلیل پھرو۔"

ولا تردوا الا فضول نسائکم   اذا ارتملت اعقابهن من الدم

"اور تم اپنی عورتوں کے پاس سوائے اس حالت کے جبکہ ان کی ایڑیاں تک خون سے لتھڑی ہوں۔"

یہ عرب کی قبائلی عداوتوں اور لڑائیوں کے اصلی محرکات ہیں۔ ان میں کسی شریف ترو بلند ترین غضب حمیت کا نام و نشان تک نہیں ہے۔ یہی خاص جذبہ اور جوش ہے جو ایک درندے کو اپنے مد مقابل کے پھاڑ کھانے پر ابھارتے ہیں زیادہ ترقی یافتہ مرتبہ ہو

اس واقعہ پر فخر کرتے ہوئے کہتا ہے :-

سبایا بنی شیبان یوم وارۃ   علی النار اذ تجلی به فتیاتها

اس نے جنگ اوارہ میں بنی شیبان کے اسیروں کو چھڑا لیا، جب کہ ان کی جوان لڑکیاں آگ میں ڈالی جا رہی تھیں۔

عمرو بن منذر نے ایک قصور کی بنا پر منت مانی تھی کہ بنی دارم کے سو آدمیوں کو زندہ جلاؤنگا، چنانچہ اس نے ان پر چڑھائی کی، ۹۹ آدمی ہاتھ آئے جنھیں اس نے جلا دیا، اب منت پوری کرنے میں ایک کی کسر رہ گئی تھی، اتفاق سے اس وقت قبیلہ براجم کا ایک شخص ادھر سے گذر رہا تھا وہ گوشت کی بو سونگھ کر سمجھا کہ کھانا پک رہا ہے، اس لئے عمرو کے لشکر کی طرف آگیا، عمرو نے اپنی منت پوری کرنے کے لئے اسی کو آگ کے الاؤ میں جھونک دیا، اسی واقعہ کے متعلق جریر کہتا ہے کہ :-

این الذین بنار عمرو احرقوا   ام این اسعد فیکم المسترضع

"کہاں ہیں وہ جو عمرو کی آگ میں جلائے گئے، اور کہاں ہے اسعد جو تمھارے درمیان پرورش پاتا تھا"۔

اسیرانِ جنگ سے بدسلوکی، اسیرانِ جنگ کے ساتھ جانوروں سے بدتر سلوک کیا جاتا تھا اور بسا اوقات جوشِ انتقام میں ان کو نہایت درجہ کی اذیتیں دے دے کر مارا جاتا تھا، عکل اور عرینہ کا قصہ حادیث میں مذکور ہے کہ یہ لوگ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے چرواہوں کو پکڑ کر لے گئے ان کے ہاتھ پاؤں کاٹے، ان کی آنکھیں پھوڑیں، اور انھیں تپتی ہوئی ریت پر ڈال دیا، یہاں تک کہ وہ پیاس اور تکلیف سے تڑپ تڑپ کر مر گئے،

جنگِ اوارہ کا واقعہ مشہور ہے کہ بنی شیبان کے جتنے اسیر منذر بن امرؤ القیس کے ہاتھ آئے ان سب کو اس نے کوہ اوارہ کی چوٹی پر بٹھا کر قتل کرنا شروع کیا اور کہا کہ جب تک ان کا خون بہ کر پہاڑ کی جڑ تک نہ پہونچ جائیگا، قتل کا سلسلہ بند نہ کرونگا، آخر جب مقتولوں کی تعداد سیکڑوں سے متجاوز ہو گئی تو مجبوراً اس نے منت پوری کرنے کے لئے خون پر پانی ڈلوا دیا، اور وہ بہ کر پہاڑ کی جڑ تک پہونچ گیا۔

مرار قیس کے باپ حجر بن حارث نے جب بنی اسد پر چڑھائی کی تو ان کے جتنے آدمی اس کے ہاتھ قید ہوئے ان سب کو اس نے قتل کرادیا، اور حکم دیا کہ انھیں تلواروں سے نہیں، بلکہ ڈنڈوں سے مار مار کر ہلاک کیا جائے۔

غفلت میں حملہ کرنا دشمن کو مقابلہ کا موقع دیئے بغیر غفلت کی حالت میں اس پر جا پڑنا، مرغوب ترین جنگی چالوں میں شمار ہوتا تھا، اس غرض کے لئے عموماً رات کے آخری حصہ میں حملے کیے جاتے تھے اور یہ دستور ایسا عام ہوگیا تھا کہ لفظ تصبیح کے معنی ہی صبح کے وقت حملہ کرنے کے ہوگئے تھے، قرہ بن زید کہتا ہے:-

فصبحهم بالجيش قيس بن عاصم   فلم يجدوا إلا الأسنة مصدرا

"قیس بن عاصم ان پر صبح کے وقت لشکر لیکر جا پہونچا، مگر وہاں اس کے سوا کچھ نہ پایا کہ نیزوں کی انیاں جسموں سے پار ہوتی تھیں"

عباس بن مرداس سلمی کہتا ہے:-

فلم أر مثل الحي حيا مصبحا   ولا مثلنا يوم التقينا فوارسا

"میں نے اس قبیلہ جیسا قبیلہ کبھی نہیں دیکھا جس پر ہم نے صبح حملہ کیا، اور نہ ہم جیسا کوئی تھا جبکہ ہم نے شہسواروں کا مقابلہ کیا"

اسی بنا پر لوگ اپنے دوستوں کو دعا دیتے تھے، کہ تم صبح کے وقت بخیریت رہو، عنترہ بن شداد اپنی معشوقہ سے کہتا ہے:-

يا دار عبلة بالجواء تكلمي   وعمي صباحا دار عبلة واسلمي

"اے عبلہ کے مکان کہ تو مقام جوا میں ہے، کچھ بول، اور صبح کے وقت غارت گروں سے محفوظ رہ"

عرب میں یہ بھی دستور تھا کہ دشمن کے سرداروں کو رات کے وقت حالت خواب ہی میں قتل کر ڈالتے تھے، اس فن کا مصطلحی نام فتک تھا اور اس کے ماہرین فتاک کہے جاتے تھے، حارثہ بن ظالم مری، براض بن قیس الکنانی، سلیک بن سلکہ، تابط شرا عرب کے مشہور فتاک میں شمار ہوتے ہیں۔

مقتولوں کی تحقیر: جوشِ انتقام میں دشمن کی مردہ لاشوں تک کو نہ چھوڑا جاتا تھا، ان کے ناک کان کاٹ جاتے تھے، ان کے اعضا کی قطع و برید کر کے زندوں کا بدلہ مردوں سے لیا جاتا تھا، اور اس وقت ایسی ایسی وحشیانہ حرکات کی جاتی تھیں جن کے تصور سے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں، جنگِ احد کا مشہور واقعہ ہے کہ قریش کی عورتوں نے شہدائے اسلام کے ناک کان کاٹ کر ان کے ہار بنائے تھے، ابوسفیان کی بیوی ہند سیدنا حمزہ رضی اللہ عنہ کا کلیجہ نکال کر چبا گئی تھی، یوم الیحامیم میں جب بنی جدیلہ کا سردار ربیع بن عمرو مارا گیا تو بنی عبس کے ایک شخص نے اس کے دونوں کان کاٹ کر اپنے جوتے میں لگائے، ابو سروہ عبسی اسی پر فخر کرتے ہوئے کہتا ہے:-

نخصف بالآذان منکم نعالنا

"ہم تمہارے کانوں کا پیوند اپنی جوتی میں لگاتے ہیں"

ایک اور عبسی شاعر بنی جدیلہ کو خطاب کر کے کہتا ہے کہ:-

فان تبغضونا بغضة فی صدورکم   فانا جدعنا منکم وشرینا

"اگر تم اپنے سینوں میں ہمارے خلاف بغض رکھتے ہو تو بیجا نہیں ہے کیونکہ ہم نے تمہارے ناک کان کاٹے ہیں، اور تم کو پکڑ پکڑ کر بیچا ہے"

کبھی کبھی دشمن کی لاشوں کو ٹانگیں پکڑ کر گھسیٹا جاتا تھا، چنانچہ ایک شاعر کہتا ہے:-

وشدوا شدة اخری فجروا   بارجل مثلهم ورموا جوینا

"انھوں نے ایک دوسرا حملہ کیا اور اپنے حریف کی ٹانگیں پکڑ کر گھسیٹیں، اور جوین کو تیر مارا"

جب کسی شخص سے سخت دشمنی ہوتی تو قسم کھاتے تھے کہ اس کو قتل کر کے اس کی کھوپڑی میں شراب پئیں گے، جنگِ احد میں عاصم بن ثابت رضی اللہ عنہ کے ہاتھ سے مسافع بن طلحہ اور جلاس بن طلحہ دو بھائی قتل ہوئے تھے، ان دونوں کی ماں سلافہ نے قسم کھائی کہ وہ عاصم کی کھوپڑی میں شراب پیئے گی، جب مقام رجیع میں عاصم شہید ہوئے تو قریش کے لوگ ان کی تلاش میں نکلے تاکہ ان کا سر سلافہ کے ہاتھ بیچ دیں[1]۔ حرب الفساد میں (جو ۲۵ سال تک جاری رہی) غرض

---

[1] یہ واقعہ طبقات ابن سعد، فتح الباری، اور اسد الغابہ وغیرہ میں مذکور ہے،

نے کثرت [illegible] دشمن کی کھوپڑیوں میں شراب پیتی تھی جنگ [illegible] میں بھی [illegible]
کے واقعات پیش [illegible] ہیں چنانچہ ابو [illegible] عبسی اسی کی طرف اشارہ کرکے کہتا ہے:۔

ولنشرب کرھاً منکم فی الجماجم

"ہم بدمزگی کیساتھ تمہاری کھوپڑیوں میں شراب پیتے ہیں"

"دشمن کی لاشوں کو مردار خوار جانوروں کا طعمہ بنایا جاتا تھا۔ یہ ان کے ہاں [illegible] بات تھی" عنترہ کہتا ہے:۔

ان یفعلا فلقد ترکت اباھما جزر السباع وکل نسر قشعم

"اگر وہ مجھے گالیاں دیتے ہیں تو بیجا نہیں ہے کیونکہ میں نے ان کے باپ کو درندوں اور گدھوں کا طعمہ بننے کے لئے چھوڑ دیا ہے"۔

شریح عبسی کہتا ہے:۔

واقسم لولا درعہ لترکتہ علیہ عوافٍ من ضباعٍ وانسر

"قسم کھا کر کہتا ہوں اگر وہ زرہ پہنے ہوئے نہ ہوتا تو میں اس کو گدھوں اور بجوؤں جیسے مردار خوار جانوروں کے لئے پڑا چھوڑ دیتا"

عاتکہ بنت عبد المطلب حرب فجار کے واقعات پر فخر کرتے ہوئے کہتی ہیں:۔

وخیلاً [illegible] عادی [illegible] تنقر لحمہ ضبع [illegible]

"ہمارے سواروں نے ایک کو زمین پر پڑا چھوڑ دیا [illegible] جو نوچ نوچ کر کھاتے تھے"

مہلہل حرب بسوس کا ذکر کرتے ہوئے کہتا ہے:۔

قتلی [illegible] [illegible] [illegible] وحوجل [illegible]

"ان مقتولوں [illegible] گدھوں [illegible] نوچ کر کھاتے ہیں"

[illegible] بدعہدی [illegible] حرب [illegible] کوئی [illegible]
کبھی دشمن سے انتقام لینے کا کوئی اچھا موقع مل جاتا تو عہد و پیمان توڑ کر حملہ [illegible] جاتے تھے
[illegible]

عرب کی بدعہدیوں کے واقعات ... خود نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں کفارِ عرب کی بدعہدیوں کے واقعات نہایت کثرت سے ملتے ہیں۔ بنو قینقاع، بنو نضیر اور بنو قریظہ سے رسول اللہ صلعم کے معاہدے ہو چکے تھے لیکن تینوں نے وقت پر ان کو توڑ ڈالا۔ بنو نضیر نے خود آنحضرت صلعم کو قتل کرنے کی سازش کی۔ بنو قریظہ نے جنگِ احزاب میں علانیہ اسلام کے خلاف شرکت کی، اور بنو قینقاع نے قریش کے بھڑکانے پر سب سے پہلے اعلانِ جنگ کیا۔ قبائل رعل و ذکوان نے خود ہی رسول اللہ صلعم سے چند آدمی مدد کے طور پر طلب کئے اور جب آپ نے صحابہؓ کی ایک جماعت ان کے پاس بھیجی تو انھوں نے بیر معونہ پر سب کو قتل کر دیا۔ بنو لحیان نے مقام رجیع میں حضرت خبیبؓ، زید بن دثنہؓ اور عبد اللہ بن طارقؓ کو امان دی، اور جب انھوں نے ہتھیار ڈال دیئے تو تینوں کو پکڑ کر باندھ لیا۔ ایک کو قتل کیا، اور دو کو مکہ لیجا کر بیچ ڈالا۔ اسی قسم کی بدعہدیوں کے متعلق قرآن مجید میں فرمایا گیا ہے کہ لا یرقبون فی مومن الا ولا ذمۃ (۹:۲) وہ کسی مسلمان کے ساتھ قرابت یا معاہدے کا لحاظ نہیں رکھتے۔

یہ اس قوم کی جنگ کا حال تھا جس میں اسلام ابتداءً ظاہر ہوا۔ اس کی فوج کی خصوصیات کو ایک شاعر نے جامعیت کے ساتھ اس طرح بیان کیا ہے:-

فلست بحاضر ان لم تزرکم   خلال الدار مشبلۃ طحون

"میں ایک مہذب شہری نہ ہوں، اگر تمھارے عین گھروں کے سامنے ایک پھاڑنے اور پیسنے والا لشکر نہ آئے۔"

یدین بھا العزیز اذا رآھا   ویسقط من مخافتھا الجنین

"اس کو دیکھتے ہی سے قوت والے مسخر ہو جاتے ہیں اور پیٹ والیوں کے حمل خوف سے گر جاتے ہیں۔"

تشیب الناھد العذراء منھا   ویھرب من مخافتھا القطین

"جوان کنواری لڑکیاں اس کی ہیبت سے بوڑھی ہو جاتی ہیں، اور اس کے خوف سے وہ لوگ بھاگ جاتے ہیں جو کبھی اپنی جگہ نہیں چھوڑتے۔"

یطوف بھا من لخوا ... سس ...   کاسد الغیل مسکنھا العرین

"اس میں بنی بخار کے شیر پھرتے ہیں، ان جنگلی شیروں کے مانند جن کا مسکن گھنی جھاڑی ہو"

بطن للیث بہا مستکینا   لہ فی کل ملتفت [illegible]ین

"جس میں شیر ہمیشہ خاموش رہتا ہے، اور سننے والا بس اس شخص کی بات ہی سنتا ہے جسے وہ پھاڑ ڈالے"

اسلام سے پہلے روم و ایران کا طریقِ جنگ

یہ عرب تو خیر وحشی تھے حضریت و مدنیت کا ان میں نام و نشان تک نہ تھا، علوم و تہذیب سے نا آشنا تھے، ان میں اس قسم کی درندگی و بہیمیت کا موجود ہونا کچھ تعجب کی بات نہیں تھی مگر دیکھنا یہ ہے کہ اس عہد میں جو قومیں تہذیب و تمدن کے آسمان پر پہونچی ہوئی تھیں ان کا کیا حال تھا؟

تاریخ نے اس زمانہ کی لڑائیوں کے متعلق بہت کچھ معلومات محفوظ رکھی ہیں، جن لوگوں نے ان کا مطالعہ کیا ہے وہ جانتے ہیں کہ کم از کم اس اعتبار سے مہذب و غیر مہذب دنیا کے طرزِ عمل میں کچھ زیادہ فرق نہ تھا، ایک قوم جب دوسری قوم پر چڑھائی کرتی تھی تو [illegible] تھی کہ اس کو [illegible] چھوڑ [illegible]، جنگی مقاتلین و غیر مقاتلین کا امتیاز عملاً مفقود تھا، دشمن قوم کا ہر فرد گشتنی و گردن زدنی سمجھا جاتا تھا، عورتیں، بچے، بوڑھے، زخمی، بیمار، سب کے سب [illegible] جنگ کا [illegible] تھا، فوجوں کے اقدام میں دشمن کی فصلوں کو تباہ کرنا، باغات کو تہس نہس کرنا، عمارت کو مسمار کرنا، بستیوں کو لوٹنا اور جلانا ایک عام بات تھی، کسی شہر کا شدید مزاحمت کے بعد مفتوح ہونا گویا اس کے لئے پیام موت تھا، غضبناک فاتح جب اس میں گھستے تو بے دریغ قتل عام شروع کر دیتے اور جب خون سے بھی جوش انتقام فرو نہ ہوتا تو شہر میں آگ لگا دیتے تھے، [illegible] ہے کہ اس معاملہ میں سکندر اعظم بھی عام کلیہ سے مستثنیٰ نہ تھا، [illegible] کے وقت [illegible] جب اس نے ۷ مہینہ کے سخت محاصرہ کے بعد فتح کیا تو [illegible] قتل [illegible] کا حکم دیا [illegible] قوم کو دنیا کی مہذب ترین قوم ہونے کا فخر [illegible] ہزار [illegible] کو قتل [illegible] تقریباً ۳۰ ہزار کو غلام بنا کر بیچ ڈالا [illegible] اسیرانِ جنگ [illegible] قتل اور غلامی سے [illegible] کوئی تیسری صورت نہ تھی، بعض اوقات دشمن [illegible] خوف [illegible] خود [illegible] ہوں [illegible]

رتی ہوتی بنا تو ان کو بدترین ذلت اور عذاب کے ساتھ ہلاک کر دیا جاتا تھا، سفرا کا احترام جنگ کے

ترین مصالح میں سے ہے، مگر اس عہد میں یہ جماعت بھی بسا اوقات تعدی سے محفوظ نہ رہتی تھی، فریق

لف کی جانب سے کسی بادشاہ کے دربار میں کوئی ایسا پیغام لیجانا جس کو وہ اپنی توہین یا کسر شان

بھتا ہو، گویا خود اپنی موت کا پیغام لیجانا تھا، ایسے موقع پر سفراء کا ذلیل وخوار ہونا اور قید میں پڑ جانا

مولی بات تھی، اور کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا تھا کہ وہ بے تکلف قتل کر دیئے جاتے تھے، سب سے زیادہ

مصیبت مذہبی طبقہ پر آتی تھی، اگر بدقسمتی سے مفتوح ملک کے باشندے کسی دوسرے مذہب کے

پیرو ہوتے، تو فاتح کا پہلا کام یہ ہوتا تھا کہ ان کے معابد کو تباہ کرے، متبرک مقامات کو بے حرمت

کرے اور مذہبی پیشواؤں کو ذلیل وخوار کرے، اس میں بسا اوقات یہاں تک غلو کیا جاتا کہ فاتح

بزور شمشیر مفتوحوں کو مذہب بدلنے پر مجبور کرتا تھا،

اسلام جس عہد میں ظاہر ہوا ہے، اس کی سب سے زیادہ مہذب سلطنتیں دو تھیں، ایک روم

دوسرے ایران، تہذیب وتمدن، علوم وآداب، اور شان وشوکت ہر اعتبار سے وہ اس وقت

باقی تمام قوموں پر فوقیت وبرتری رکھتی تھیں، اس لئے انھیں کی تاریخ پر ایک نظر ڈال کر دیکھئے کہ

میں ان کا طرز عمل کیا تھا،

مذہبی مظالم روم و ایران کے درمیان سیاسی اختلاف کے ساتھ مذہبی اختلاف

بھی تھا، مجوسی ایران اور مسیحی روم میں جب کبھی لڑائی ہوتی اور ایک کو دوسرے کے ملک میں گھسنے

کا موقع ملتا تو اس کے مذہب کو سب سے زیادہ ظلم وستم کا تختۂ مشق بنایا جاتا تھا، قباد کے زمانہ

ت ۵۰۳ء میں جب حکومت ایران کے اشارہ سے حیرہ کے بادشاہ منذر نے شام پر

حملہ کیا تو ... کو پکڑ کر عزیٰ کے بت پر بھینٹ چڑھا دیا، خسرو پرویز نے

قیصر ... کا بدلہ لینے کے بہانہ سے سلطنت روم کے خلاف اعلانِ جنگ کیا تو اپنے

... مملکت میں مسیحیوں کے کلیسا مسمار کر دیئے، ان کے اموال لوٹ لئے، اور صلیب پرستوں

کو آتش پرستی پر مجبور کیا، ۶۱۵ء میں جب اس نے بیت المقدس کو فتح کیا تو وہاں کے بطریق اعظم

History of ... [illegible]

Gibbons Roman Empire vol V. ch. XLVI

[illegible] تھیں جب کو جب پر حضرت عیسیٰ پڑھائے گئے تھے عیسائیت [illegible] بیت المقدس [illegible]
قسطنطین کے عظیم الشان کنیسوں کو آگ لگا دی، تین سو سال کی جمع شدہ مذہبی یادگاروں
اور نذر و نیاز کی قیمتی چیزوں کو لوٹ لیا، اور ۹۰ ہزار عیسائیوں کو قتل و اسیر کیا[1] اس کے جواب میں
جب ہرقل نے شمال کی جانب سے ایران پر حملہ کیا تو مجوسیوں کے آتشکدوں کو برباد کر دیا، زرتشت
کے وطن ارمیاہ کو پیوند خاک کر دیا، اور مجوسی مذہب کی توہین و تذلیل میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی۔[2]

رومیوں کی دشمنی میں خود ایران کی مسیحی رعایا پر تشدد سختیاں کی جاتی تھیں، رومی سلطنت
کے مسیحی مذہب اختیار کرنے سے پہلے تک ایران کے مسیحی مامون و محفوظ تھے، قسطنطین کے بپتسمہ
لیتے ہی ایران کا رویہ مسیحی رعایا کے ساتھ بدل گیا۔ ۳۳۹ء میں شاپور ذو الاکتاف نے بشپ
شیمون اور ۱۰۰ دوسرے پادریوں کو قتل اور بہت سے مسیحی کنیسوں اور صومعوں کو منہدم کرا دیا،
اس کے بعد ۴۰ سال تک مسیحیوں پر تشدد کی سختیاں جاری رہیں۔[3]

بہرام نے فرقہ مانویہ کو مٹانے کے لئے جو شدید کارروائیاں کیں وہ سب سے زیادہ ہولناک
تھیں، مانی نے جب زرتشت کے مذہب کو چھوڑ کر اپنا الگ مذہب پیدا کیا اور کثرت سے لوگ
اس کے معتقد بننے لگے تو بہرام نے جدید مذہب کے پیرووں کو پکڑ پکڑ کر قتل کرنا شروع کر دیا، اور
خود مانی کو گرفتار کرکے قتل کرا دیا، اس کی کھال کھنچوا کر اس میں بھس بھروا دیا، اور اس کو جندی سابور کے
دروازہ پر لٹکوا دیا، یہ دروازہ عرصہ تک باب مانی کے نام سے موسوم رہا۔[4]

سفراء پر تعدی نظری حیثیت سے سفراء کے احترام کا تصور ایرانی مذہب میں موجود تھا، [illegible] کی
نظریں [illegible] احترام کے [illegible] سمجھتے تھے، لیکن [illegible] کا [illegible] [illegible]
[illegible] کے دربار میں رومیوں کے سفیر جب پیغام لے کر پہنچے کہ رومیوں کی [illegible] پر قناعت
کرنی چاہئے اور [illegible] کو رومیوں کے لئے چھوڑ دینا چاہئے تو [illegible] تخت [illegible]
اور اس نے ان سفراء کو قید میں ڈلوا دیا۔[5]

---

[1] P. [illegible] by [illegible] [2] [illegible]

[3] Sykes vol. I. P. 428 [4] علامہ بیرونی نے آثار الباقیہ میں [illegible] تذکرہ کیا ہے

[5] Sykes vol. I. P. 426

نوشیرواں جیسے منصف بادشاہ کے دربار میں جب دیزابل ایلخان اتراک کے سفیر عقد صلح کی تجویز لے کر آئے تو اس نے اقرار یا انکار کا صاف جواب دینے کے بجائے خاموشی کے ساتھ ان کو زہر دے کر مار ڈالنا زیادہ مناسب سمجھا۔

خسرو پرویز کے فاتحانہ اقدامات نے جب ایشیا اور افریقہ میں رومی سلطنت کا تقریباً خاتمہ کر دیا اور قسطنطنیہ کے سوا پورا ایشیائے کوچک رومیوں کے ہاتھ سے نکل گیا، یہاں تک کہ ایرانی فوجیں عین قسطنطنیہ کے سامنے (Chalcedon موجودہ قاضی کوئی) تک پہونچ گئیں تو ہرقل نے خسرو سے صلح کی تجویز کرنے کے لئے اپنے سفیر بھیجے، مگر خسرو نے ہیئت سفرا کے رئیس کی جیتے جی کھال کھنچوا ڈالی، بقیہ ارکانِ سفارت کو قید کر دیا، اور ہرقل کو جواب میں ایک توبیخ نامہ لکھا جس کا عنوان یہ تھا:۔

"خسرو، خداوند بزرگ، فرماں روائے عالم کی جانب سے اپنے احمق اور کمینہ غلام ہرقل کے نام[۵۱]"

بدعہدی عہد و پیمان کے احترام پر حملہ کرنے میں بھی یہ مہذب قومیں چنداں کم حوصلہ نہ تھیں، ان کے نزدیک ضرورتِ وقت کے سامنے عہد کوئی چیز نہ تھا، تاریخ میں اس قسم کی بیسیوں مثالیں ملتی ہیں کہ جب کبھی قیصرِ روم یا کاسرۂ فارس نے اپنے دشمن کو نازک حالت میں مبتلا دیکھا تو تکلف معاہدات کو بالائے طاق رکھ کر اعلانِ جنگ کر دیا، اور تو اور خود نوشیرواں اور جسٹنین بھی جو اس زمانہ کی رومی و ایرانی تہذیب کے بہترین نمایندے تھے بدعہدوں کی فہرست میں نمایاں نظر آتے ہیں،

نوشیرواں کو جب اپنے اندرونی احوال کی اصلاح کے لئے امن کی ضرورت ہوئی، تو اس نے جسٹنین کی خواہش صلح کو فوراً قبول کر لیا، اور ایک معاہدہ پر دستخط کر دیئے، مگر جب اٹلی میں بلیساریوس کی کامیابیوں سے روم کی طاقت کو بڑھتے دیکھا تو حیرہ سے غسان پر حملہ کرا دیا، اور پھر خود حیرہ کی مدد کو اٹھ کھڑا ہوا تاکہ روم بھی اپنے حلیف غسان کی مدد کرنے پر مجبور ہو جائے[۵۲]،

دوسری طرف سے ۵۷۱ء میں ایلخان اتراک نے نوشیرواں سے ناراض ہو کر جسٹنین سے

---

۵۱ Byzantine Empire. P. 101 Sykes ...

۵۲ Gibbon ch. X. LII

اتحاد کرنے کی خواہش کی تو اس نے بھی [illegible] ہمت [illegible]
سمجھا اور معاہدۂ صلح کو توڑ کر ۵۴۲ء میں نوشیرواں کے خلاف جنگ چھیڑ دی۔

جنگ کے وحشیانہ طریقے علمی و نظری حیثیت سے محاربین کے حقوق و فرائض کا ایک نہایت ابتدائی تصور زمانۂ قدیم سے دنیا میں موجود تھا، قدیم یونان کے مقننوں نے یہ قاعدہ بنایا تھا کہ جنگ میں جو لوگ مارے جائیں ان کو دفن کرنا چاہئے، مفتوح شہر کے جو لوگ معابد میں پناہ لیں انہیں قتل نہ کرنا، اور کھلاڑی لوگوں یا معابد کے خادموں سے کوئی تعرض نہ کرنا چاہئیے۔ مگر اول تو یہ قواعد بین الملی لڑائیوں کے لئے نہ تھے بلکہ واضعین نے انہیں خود اپنی آپس کی خانہ جنگیوں کے لئے وضع کیا تھا، دوسرے عملی حیثیت سے سلطنتوں نے کبھی ان کو قانون کے طور پر نہ تو قبول کیا اور نہ ان کی پابندی کی، رومن سلطنت کی خصوصیت کے ساتھ غیر رومی سلطنتوں کے قانونی وجود ہی کو تسلیم نہیں کرتی تھی، اور ان کے ساتھ معاملہ کرنے میں کسی فرض یا حق کا تصور سرے سے اس کے ہاں ناپید تھا۔ یہی حال ایران کا تھا، ان کے نزدیک غیر ایرانی قومیں وحشی اور ان کی سلطنتیں دراصل سلطنت ایران کی باغی تھیں، اس لئے ان کے ساتھ جنگ کرنے میں وہ کسی قسم کے اخلاقی فرائض محسوس نہ کرتے تھے۔

روم و ایران کا فوجی نظام بھی کچھ اس قسم کا تھا کہ اس میں اخلاقی حدود کی پابندی نہیں ہو سکتی تھی۔ ان میں فوجی تربیت، آداب جنگ کی تعلیم، اور عسکری ضبط و نظم کے قائم رکھنے کا کوئی بندوبست نہ تھا، جنگ کے موقع پر عام جنگجو باشندوں کا ایک انبوہ اکٹھا کیا جاتا تھا، اور صرف یہ شوق ان کو قتل و خون کے کھیل میں شرکت کے لئے کھینچ لاتا تھا کہ ہمسایہ ممالک کو لوٹیں، مخالف قوموں کو تہس نہس کریں، خوش باشی کے لئے مال و دولت، خدمت کیلئے لونڈی غلام، اور شہوت رانی کے لئے خوبصورت لڑکیاں حاصل کریں۔ خود ان کے فرمانرواؤں کے سامنے بھی جنگ کا کوئی اخلاقی نصب العین نہ ہوتا تھا، بلکہ وہ محض دشمن کو نیچا دکھانے یا تباہ کر دینے کے لئے تلوار اٹھایا کرتے تھے، یہی وجہ ہے کہ جب کبھی ان کی فوجیں کسی ملک میں پیشقدمی کرتی تھیں تو بچے، بوڑھے، عورتیں، جانور، درخت، معبد، مندر، غرض کوئی چیز ان کی دست برد

[illegible]

سے [illegible] سکتا تھا، اور جو نہ لوٹا جا سکتا اس کو آگ کی نذر کر دیا جاتا تھا۔

روم سے افریقہ کے ونڈالوں اور یورپ کے گاتھوں کی ہمیشہ جنگ رہتی تھی۔ ان کے ساتھ جو وحشیانہ برتاؤ کیا جاتا تھا اس کے ذکر سے تاریخیں بھری پڑی ہیں۔ قیصر جسٹنین کے زمانہ میں جب ونڈالوں پر چڑھائی کی گئی تو ان کی پوری قوم کو صفحۂ ہستی سے مٹا دیا گیا۔ جنگ سے پہلے اس قوم میں ۱۶۰۰۰۰ آزاد مرد تھے، اور ان کے علاوہ عورتوں، بچوں اور غلاموں کی بھی ایک تعداد کثیر موجود تھی، مگر رومی فاتحوں(۱) نے جب ان پر قابو پایا تو ان میں سے ایک شخص کو بھی زندہ نہ چھوڑا۔ گبن کہتا ہے کہ سارا ملک ایسا تباہ کر دیا گیا تھا کہ ایک اجنبی سیاح اس کے ویرانوں میں سارے سارے دن گھومتا تھا اور کہیں آدم زاد کی شکل نہ دکھائی دیتی تھی۔ پروکوپیوس نے جب اول اول اس سرزمین پر قدم رکھا تھا تو اس کی آبادی کی کثرت اور تجارت و زراعت کی فراوانی دیکھ کر انگشت بدنداں رہ گیا تھا، مگر ۲۰ سال سے بھی کم عرصہ میں یہ شاداب خطہ ویرانی سے بدل گیا، اور پچاس لاکھ کی عظیم الشان آبادی جسٹنین کے حملوں اور جنگ آزمائیوں کی بدولت فنا کے گھاٹ اتر گئی۔

یورپ میں گاتھوں کے ساتھ بھی یہی وحشیانہ سلوک ہوا، یہاں تک کہ ہم سنتے ہیں کہ انکا بادشاہ ٹوٹیلا جب میدانِ جنگ سے زخمی ہو کر بھاگا، اور ایک دور دراز مقام پر جا کر مر گیا تو رومی سپاہی اس کی تلاش میں نکلے۔ اس کی لاش کا سراغ لگایا، اس کو برہنہ کر کے ٹانگ دیا، اور اس کے خون آلود کپڑوں کو تاج سمیت قیصر جسٹنین کے پاس تحفۃً بھیجا۔

سنہ ۷۰ء میں ٹیٹوس رومی نے جب بیت المقدس فتح کیا تو سنتے ہیں کہ دراز قامت حسین لڑکیاں فاتح کے لئے چن لی گئیں، ۱۷ سال سے زیادہ عمر کے آدمی ہزار در ہزار پکڑ کر مصری کانوں میں کام کرنے کے لئے بھیج دئیے گئے، کئی ہزار آدمیوں کو گرفتار کر کے سلطنت کے مختلف شہروں میں بھیجا گیا تاکہ ایمفی تھیٹروں اور کلوسیموں میں ان کو جنگلی جانوروں سے پھڑوانے اور شمشیر زنوں سے کٹوانے یا خود آپس میں ایک دوسرے کو کاٹنے کے کام میں لایا جا سکے۔ دورانِ جنگ میں ۹۷ ہزار آدمی گرفتار کئے گئے جنہیں سے ۱۱ ہزار صرف اس وجہ سے مر گئے کہ ان کے نگہبانوں نے انھیں کھانے کو نہیں دیا۔ ان کے علاوہ جنگ اور قتلِ عام میں

(۱) Gibbon ch. XLIII. (۲) Ch. XLIII.

جو لوگ ہلاک ہوئے ان کی مجموعی تعداد ۹۰۰۰۰ بتائی جاتی ہے۔

روم و ایران کی باہمی لڑائیوں میں بھی اسی قسم کے وحشیانہ حرکات کی جاتی تھیں۔ شاپور
ذو الاکتاف نے جب الجزیرہ میں پیش قدمی کی اور امیڈا (موجودہ دیاربکر) زیادہ شدید مزاحمت
کے بعد فتح ہوا، تو غضبناک فاتح نے شہر میں داخل ہو کر قتل عام کا حکم دے دیا، اور اس کو ایسا ت
کر دیا کہ پھر نہ پنپ سکا۔ ۵۴۰ء میں جب نوشیرواں نے شام پر چڑھائی کی تو اس کے دار الحکومت
انطاکیہ کی اینٹ سے اینٹ بجا دی، باشندوں کا قتل عام کیا، عمارتوں کو مسمار کیا اور جب
اس سے بھی تسکین نہ ہوئی تو شہر میں آگ لگوا دی۔ ۵۴۳ء میں نوشیرواں نے پھر شام پر چڑھ
کیا، اپامیا اور انطاکیہ وغیرہ کو لوٹا جلایا، ۲۹۲۰۰۰ شامیوں کو پکڑ کر ایران بھیج دیا، اور بہت
سی خوبصورت لڑکیاں چن کر میخان ترک کے پاس بھیجیں تاکہ اس کی ناراضی دور ہو اور
وہ جسٹنین سے اتحاد چھوڑ دے۔ ۵۷۶ء میں اس نے آرمینیا پر حملہ کیا اور جب تھیوڈوسیوپولیس
کو فتح نہ کر سکا تو کپیڈوسیا میں گھس کر ہر چیز کو جو سامنے آئی تباہ کر دیا، یہاں تک کہ
میلی تین (Melitene) کو جلا کر خاک کر دیا۔[1] اخیر زمانہ میں خسرو پرویز نے جو زبردست
حملہ سلطنت روم پر کیا تھا وہ شام، فلسطین، ایشیائے کوچک کے لئے قیامت کا نمونہ تھا۔
تنہا بیت المقدس میں جو ستم ڈھائے گئے ان کا ذکر اوپر ہو چکا ہے۔ اس کے علاوہ دمشق،
انطاکیہ اور حلب وغیرہ شہروں کا حشر بھی کچھ اس سے مختلف نہ تھا۔[2]

یہ وحشیانہ حرکات بعض اوقات بدترین مکر و فریب اور بزدلانہ سازشوں کی شکل
میں بھی ظاہر ہوا کرتی تھیں۔ چنانچہ اردشیر کا واقعہ مشہور ہے کہ جب خسرو ارمنستان کو
فوجی قوت سے مغلوب نہ کر سکا تو اس نے اپنی فوج کے ایک افسر کو خفیہ طریقہ سے بھیج کر
اسے قتل کرا دیا۔[3] روم و ایران کی تاریخ میں اس قسم کے واقعات شاذ نہیں ہیں۔

اسیرانِ جنگ کی حالت سب سے زیادہ بدتر سلوک جس جماعت کے ساتھ کیا جاتا تھا

ل [illegible] 488-89

۲ یہ تمام تفصیلات گبن، سائکس اور خود ان کتابوں سے ماخوذ ہیں۔

۳ Sykes vol. I. PP. 427-28

[illegible] جنگ کی عادت تھی، قدیم رومی و یونانی اپنے سوا دوسری قوموں کو وحشی
بربرا (Barbarians) سمجھتے تھے، اور ان کے قانون میں اس بدقسمت مخلوق
کے لئے قتل یا غلامی کے سوا کوئی تیسری صورت موجود ہی نہ تھی، ارسطو جیسا معلم اخلاق بے تکلف
کہتا ہے، کہ قدرت نے بربرہ کو محض غلامی کے لئے پیدا کیا ہے[1]، اور ایک دوسرے مقام پر
حصول ثروت کے جائز اور معزز طریقے گناتے ہوئے کہتا ہے کہ ان قوموں کو غلام بنانے کے
لئے جنگ کرنا بھی ان میں شامل ہے جنھیں قدرت نے اسی غرض کے لئے پیدا کیا ہے[2]،

ایک طرف ان عقائد نے رومیوں کے ذہن میں غیر قوموں کی جان و مال کو بے قدر
کر دیا تھا، دوسری طرف رومی سوسائٹی کی پرورش کچھ ایسی بہیمیت کی فضا میں ہوئی
تھی کہ لوگ اپنے کھیل تماشوں میں ہیبتناک نظارے دیکھ کر خوش ہوتے تھے، اور ان
نظاروں میں مجاز کے بجائے حقیقت کو دیکھنا زیادہ پسند کرتے تھے، اگر کسی گھر کو جلتے ہوئے
دکھانا ہو تو وہ چاہتے تھے کہ فی الواقع ایک گھر جلا دیا جائے، اسی طرح کسی آدمی کا زندہ
جلایا جانا یا کسی مجرم کو شیروں سے پھڑواتے ہوئے دکھانا منظور ہوتا تو تماشائیوں کی تسلی
اس کے بغیر نہ ہوتی تھی کہ ایک آدمی واقعی زندہ جلا دیا جائے، اور ایک دوسرے آدمی کو
واقعی شیروں کے پنجے میں چھوڑ دیا جائے، اس کام کے لئے انھیں ہمیشہ ایسے آدمیوں
کی ضرورت رہتی تھی جنھیں ان وحشیانہ کھیلوں کے لئے استعمال کیا جا سکے، ظاہر ہے کہ
روم کے آزاد شہری اس کے لئے موزوں نہیں ہو سکتے تھے، لہٰذا دوسرے ملکوں سے
لڑائیوں میں جو قیدی پکڑے ہوئے آتے ان کو اس خونی تفریح کا سامان بنایا جاتا
تھا، بعض اوقات یہ کھیل اتنے بڑے پیمانہ پر ہوتے تھے کہ کئی کئی ہزار آدمیوں کو
بیک وقت تلوار اور درندوں کی نذر کر دیا جاتا تھا، ٹیٹوس نے جو نسل انسانی کا دلارا
(Darling of the human race) کہلاتا ہے، ایک دفعہ ۵۰ ہزار درندے
جانوروں کو پکڑوایا اور کئی ہزار یہودی قیدیوں کو ان کے ساتھ ایک احاطہ میں چھڑوا دیا۔
ٹراجان کے کھیلوں میں گیارہ ہزار درندے اور دس ہزار آدمی بیک وقت لڑائے

[1] Politics, Bk. I. ch. II, VI
[2] Politics, Bk. I. ch. VIII

جاتے تھے، کلاڈیوس نے ایک دفعہ جنگی کھیل میں ۱۹ ہزار آدمیوں کو تلواریں دیکر ایک دوسرے
سے لڑوادیا۔ قیصر آگسٹس نے اپنی وصیت کے ساتھ جو تحریک منسلک کی تھی اس میں لکھتا ہے کہ
۸ ہزار شمشیر زنوں اور ۳۵۱۰ جانوروں کے کھیل دیکھے ہیں۔

اس کے علاوہ اسیران جنگ کا دوسرا مصرف یہ تھا کہ آزاد رومیوں کی غلامی کریں۔
میں ان کا درجہ سب سے نیچا تھا۔ ان کے کوئی متعین حقوق نہ تھے۔ ان کی جان کی کوئی قیمت
[نہ] تھی، ان کی زندگی کا مقصد اپنے آقاؤں کی ہر خواہش کو پورا کرنے کے سوا اور کچھ نہ تھا۔
کے بقول "وہ ذلت کے بچپن، مشقت کی جوانی اور بے رحمانہ تغافل کے بڑھاپے میں پیدائش
سے موت تک کے مراحل طے کرتے تھے"[1] رومی قانون میں غلاموں کے لئے اس قدر سخت
قوانین تھے کہ اگر کوئی غلام اپنے آقا پر دست درازی کرتا تو اس کو اور بعض اوقات اس کے
سارے خاندان تک کو موت کی سزا دیدی جاتی تھی[2] عین ظہور اسلام کے زمانہ میں ان
غلاموں کی جو حیثیت تھی، اس کا اندازہ اس واقعہ سے کیا جاسکتا ہے کہ ۶۱۱ء میں جب ہرقل
کی تخت نشینی کے تھوڑے عرصہ بعد اس کی بیوی یوڈوکسیا کا انتقال ہوا اور اس کا جنازہ
قبرستان کی طرف چلا۔ تو اتفاق سے ایک لونڈی نے اس کی مشایعت کرتے ہوئے زمین
پر تھوک دیا، اس قصور میں وہ فوراً گرفتار کرلی گئی۔ اور اس کے قتل کا حکم دیا گیا[3]۔

فیرر کا بیان ہے کہ جب روم کی فتوحات کا دائرہ وسیع ہوا تو نہایت کثرت سے اسیران
جنگ مملکت میں آنے لگے تھے۔ اور ایک وقت میں ان کی مجموعی تعداد ۲ کروڑ تک
پہونچ گئی تھی[4]۔

روم کی طرح ایران میں بھی اسیران جنگ کے لئے کسی قسم کی رعایت نہ تھی معمولی
قیدی تو درکنار خود قیصر روم والیریان جب شاپور اول کے ہاتھ قید ہوا تو اسے زنجیروں سے
باندھ کر شہر میں گشت کرایا گیا، عمر بھر اس سے غلاموں کی طرح خدمت لی گئی اور مرنے کے بعد
اس کی کھال کھنچوا کر اس میں بھس بھروا دیا گیا[5]۔ شاپور ذوالاکتاف کا واقعہ مشہور ہے کہ بحرین

[1] Constantine The Great [2] Early days of Christianity. P. 2
[3] Early days of Byzantine Empire. Clayton. Cutts. P. 57 [5] SYKES VOL. I. P
[4] Early Christian... P. 99

[illegible] سے انتقام لینے کے لئے اس نے حکم دیا تھا کہ ان کے
شانوں میں سوراخ کر کے ان کے اندر رسیاں پرو دی جائیں اور سب کو ملا کر باندھ دیا جائے
اسی بنا پر تاریخ نے اس کو ذوالاکتاف کے نام سے یاد رکھا ہے۔

خونخواری کی یہ داستانیں اور بھی زیادہ ہولناک ہو جاتی ہیں جب سنتے ہیں کہ نوع
انسان پر یہ ظلم و ستم کسی عملی مقصد کے لیے نہیں کئے جاتے تھے بلکہ محض ناموری و شہرت
کے حصول اور شاہانہ ہیبت و جلال کے اظہار کے لئے کئے جاتے تھے پھر کبھی کبھی ایسا بھی
ہوتا تھا کہ [illegible] لاکھوں آدمیوں کا خون محض بادشاہوں کی ذلیل ترین نفسانی خواہشات
کی بھینٹ چڑھا دیا جاتا تھا۔ خود نبی صلے اللہ علیہ وسلم کے زمانہ کا واقعہ ہے کہ خسرو پرویز نے
نعمان بن منذر کی بیٹی کے حسن کی تعریف سنی اور اس کو حکم دیا کہ اپنی لڑکی شاہی حرم میں داخل
کرے۔ نعمان کی عربی غیرت نے اس کو گوارا نہ کیا اور صاف انکار کر دیا۔ اس پر خسرو نے
فرمان صادر کیا کہ حیرہ کی ریاست ضبط کی جائے۔ اور نعمان گرفتار کر لیا جائے۔ نعمان اپنے
بال بچوں کو بنی شیبان کی حفاظت میں دیکر خود کسریٰ کے دربار میں پہونچا کہ عفو تقصیر چاہے
مگر کسریٰ نے اسے قتل کرا دیا۔ اور ۴۰ ہزار کی زبردست فوج بھیجی تا کہ بنی شیبان سے
نعمان بن منذر والوں کو چھین لائے۔ ذوقار کے مقام پر اس فوج کی عربوں سے ایک خونریز
جنگ ہوئی جسمیں طرفین کے ہزاروں آدمی مارے گئے۔ اور صرف اتنی سی بات پر انسانی
خون کی ندیاں بہ گئیں کہ ایک بادشاہ اپنے پہلو میں ایک حسین عورت کو دیکھنا چاہتا تھا۔

اس مختصر تاریخی بیان سے واضح ہوتا ہے کہ اس عہد میں جنگ کے اخلاقی حدود، محاربین
کے حقوق و فرائض، عداوت میں ضبط نفس، اور لڑائی میں رحم و غضب کے امتزاج کا وجود
کیا معنی، ذہنوں میں اس کا تصور تک نہ تھا۔ اور مہذب ترین قومیں بھی جہاں تک جنگ کا
تعلق ہے، وحشت و حیوانیت کے ابتدائی درجہ میں تھیں۔ اس زمانہ میں جنگ کا مفہوم اس کے
سوا کچھ نہ تھا کہ وہ ایک ہنگامہ قتل و خون اور فتنۂ سلب و نہب ہے، جو طاقتور کی ہر خواہش
اور ضرورت کو پورا کرنے کے لئے برپا کیا جا سکتا ہے۔ شقاوت و سنگدلی وحشت و بربریت

زندگی وسفہ کی عین جنگ کی حقیقت میں داخل ہو گئی تھی، لفظ جنگ بولتے ہی آدمی کا ذہن ایک ایسی چیز کی طرف منتقل ہو جاتا تھا جو اپنے اندر انسان کے جان لینے، اور اس کی آبادیوں کو غارت کرنے کے ہر طریقہ کو متضمن تھی، صدیوں کے تغافل نے جنگ ساتھ ان وحشیانہ حرکات کا اس قدر گہرا تعلق قائم کر دیا تھا کہ انسان مشکل ہی سے کسی ایسی جنگ کا تصور کر سکتا تھا، جس میں لوٹ مار، قتل عام، آتش زنی، اور تباہ کاری نہ ہو، جس میں عورتوں بچوں، بوڑھوں، زخمیوں اور بیماروں کو قتل نہ کیا جاتا ہو، جس میں دوسرے مذہب وملت کے معابد و آثار کی بے حرمتی اور تخریب نہ کی جاتی ہو، اور جو اخلاقی حدود کی پابندی کے ساتھ لڑی جاتی ہو،

اسلام کی اصلاحات

یہ حالات تھے جنہیں اسلام ظاہر ہوا، اور اس نے حقیقتِ جنگ کو بدل کر بالکل ایک نیا نظریہ پیش کیا جس سے اس وقت تک دنیا نا آشنا تھی، اس کا نظریہ یہ تھا کہ جنگ وقتال فی الاصل ایک معصیت ہے جس سے ہر انسان کو اجتناب کرنا چاہئے، لیکن جب دنیا میں اس سے بڑی معصیت یعنی ظلم وطغیان اور فتنہ وفساد پھیل گیا ہو اور سرکش لوگوں نے خلق خدا کے امن و راحت کو خطرہ میں ڈال دیا ہو، تو محض دفع مضرت کے لئے جنگ کرنا ضروری اور ضروری ہی نہیں بلکہ فرض ہے،

جنگ کا اسلامی تصور اس نظریہ کے مطابق چونکہ جنگ کا اصلی مقصد حریف مقابل کو ہلاک کرنا اور نقصان پہنچانا نہیں ہے بلکہ محض اس کے شر کو دفع کرنا ہے، اس لئے اسلام یہ اصول پیش کرتا ہے، کہ جنگ میں صرف اتنی ہی قوت استعمال کرنی چاہئے جتنی دفع شر کے لئے ناگزیر ہو، اور اس قوت کا استعمال صرف انہیں طبقوں کے خلاف ہونا چاہئے جو عملاً برسرپیکار ہوں یا حد سے حد جن سے شر کا اندیشہ ہو، باقی تمام انسانی طبقات کو جنگ کے اثرات سے محفوظ رہنا چاہئے اور دشمن کی ان چیزوں تک بھی ہنگامۂ کارزار کو متجاوز نہ ہونا چاہئے جنکو اس کی جنگی قوت سے کوئی تعلق نہ ہو، جنگ کا یہ تصور ان تصورات سے مختلف تھا جو پہلے سے دماغوں میں موجود تھے، اس لئے اسلام نے تمام پچھلی اصطلاحات کو چھوڑ کر جہاد فی سبیل اللہ کی جدید اصطلاح وضع کی، جو اپنے معنی موضوع لہ پر ٹھیک ٹھیک دلالت کرتی ہے، اور وحشیانہ جنگ کے تصورات

ے [illegible] ہے لغت کے اعتبار سے جہاد کے معنی ہیں استفراغ الوسع فی مدافعة العدو، "دشمن کو دفع کرنے میں انتہائی کوشش کرنا" اس لفظ میں تو حرب کی طرح خشم و غضب و نہب کا مفہوم شامل ہے، نہ ردع کی طرح خوف و دہشت کا، نہ شر کی طرح بدی و شرارت کا، نہ نطاح کی طرح بہیمیت و حیوانیت کا، اور نہ [illegible] کی طرح مصیبت و شدت کا، برعکس اس کے وہ صاف صاف ظاہر کرتا ہے کہ قاتل کا منشا مضرت کو دفع کرنا ہے، اور اس کے لئے وہ اتنی کوشش کرنا چاہتا ہے جتنی دفعِ مضرت کے لئے درکار ہو، مگر محض کوشش بھی ادائے مفہوم کے لئے کافی نہ تھی، کیونکہ اس سے جہت ظاہر نہیں ہوتی، کوشش نیکی کی جہت میں بھی ہو سکتی ہے، اور بدی کے جہت میں بھی، اس لئے مزید تحدید کے لئے فی سبیل اللہ کی قید لگا دی تاکہ نفس کی کسی خواہش، کسی ملک کی تسخیر، کسی [illegible] کے وصال، کسی ذاتی عداوت کے انتقام یا مال و دولت یا حکومت و اقتدار یا شہرت و ناموری کے حصول کی خاطر کوشش کرنا، اس میں داخل نہ ہو سکے اور صرف وہی کوشش مراد لی جائے جو محض اللہ کے لئے ہو، جس میں ہوائے نفس کا شائبہ تک نہ ہو، اور جس کو ایسے مقاصد کے حصول میں صرف کیا جائے جنہیں اللہ نے پسند کیا ہے،

اس جدید تصور کے ماتحت اسلام نے جنگ کا ایک مکمل ضابطۂ قانون وضع کیا، جس میں جنگ کے آداب، اس کے اخلاقی حدود، محاربین کے حقوق و فرائض، مقاتلین اور غیر مقاتلین کا امتیاز اور ہر ایک کے حقوق، معاہدین کے حقوق، سفرا اور اسیرانِ جنگ کے حقوق، مفتوح قوموں کے حقوق تفصیل کے ساتھ بیان کئے، ہر ایک کے لئے قواعد کلیہ اور حسب ضرورت جزئی احکام مقرر کئے، اور اس کے ساتھ داعی اسلام اور خلفائے راشدین نے نظائر کا ایک بہت بڑا ذخیرہ بھی چھوڑا، تاکہ قانون پر عملدرآمد کرنے اور قواعد کلیہ کو احوال جزئیہ پر منطبق کرنے کا طریقہ واضح ہو جائے،

مقصدِ جنگ کی تطہیر | لیکن اس قانون سازی کا مدعا صرف اتنا ہی نہ تھا کہ کاغذ پر ایک ضابطہ [illegible] جائے، بلکہ اصل مقصود یہ تھا کہ سابقہ حالت کی اصلاح کی جائے اور جنگ کے وحشیانہ طریقوں کو مٹا کر [illegible] نئے قانون کو رائج کیا جائے، اس کے لئے سب سے پہلے اس غلط تصور کو دلوں سے محو کرنے کی ضرورت تھی، جو صدیوں سے جما ہوا تھا، لوگوں کی عقلیں یہ سمجھنے سے قاصر

تھیں کہ جب مال و دولت کے لئے جنگ نہ کی جائے، ملک و زمین کے لئے نہ کی جائے، شہرت و ناموری کے لئے نہ کیجائے، حمیت و عصبیت کے لئے نہ کیجائے، تو پھر جنگ کا اور کون سا مقصد ہو سکتا ہے جس کے لئے انسان اپنی جان جوکھوں میں ڈال دے۔ وہ ایسی جنگ کا تصور بھی نہیں کر سکتے تھے، جس کو انسان کی خودغرضی اور نفسانیت سے کوئی تعلق نہ ہو، لہذا داعیِ اسلام صلعم نے پہلا کام یہی کیا کہ جہاد فی سبیل اللہ کے معنی، اور وہ حدود جو اسے جہاد فی سبیل الطاغوت سے ممتاز کرتے ہیں، پوری طرح واضح کر دیے، اور مختلف طریقوں سے جنگ کے اس جدید تصور کو لوگوں کے ذہن نشین کیا، اس بارے میں کثرت سے احادیث آئی ہیں، جن میں سے چند کو یہاں درج کیا جاتا ہے[1]۔

ابو موسیٰ اشعریؓ سے روایت ہے کہ:-

جاء رجل الی النبی صلی اللہ علیہ وسلم فقال، الرجل یقاتل للمغنم والرجل یقاتل للذکر، والرجل یقاتل لیری مکانہ فمن فی سبیل اللہ؟ قال من قاتل لتکون کلمۃ اللہ ھی العلیا فھو فی سبیل اللہ۔

ایک شخص رسول اللہ صلعم کے پاس حاضر ہوا، اور بولا کہ کوئی شخص مالِ غنیمت حاصل کرنے کے لئے جنگ کرتا ہے، کوئی شہرت و ناموری کے لئے جنگ کرتا ہے، کوئی اپنی بہادری دکھانے کے لئے جنگ کرتا ہے، فرمایئے کہ ان میں سے کس کی جنگ راہِ خدا میں ہے، حضورؐ نے جواب دیا کہ راہِ خدا کی جنگ تو صرف اس شخص کی ہے جو محض اللہ کا کلمہ بلند کرنے کے لئے لڑے،

یہی ابو موسیٰؓ روایت کرتے ہیں:-

جاء رجل الی النبی صلی اللہ علیہ وسلم فقال یا رسول اللہ ما القتال فی سبیل اللہ؟ فان احدنا یقاتل غضباً

ایک شخص نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آیا، اور بولا کہ یا رسول اللہ قتال فی سبیل اللہ کیا ہے؟ ہم میں سے کوئی جوشِ غضب میں لڑتا ہے اور کوئی حمیت کی بنا پر، آپ نے سر

[1] اس باب میں جتنی احادیث نقل کی گئی ہیں، اکثر بخاری کتاب الجہاد و کتاب المغازی، مسلم کتاب الجہاد و السیر و کتاب الامارۃ، ابوداؤد کتاب الجہاد و کتاب العتق و الامارۃ، نسائی کتاب الجہاد، ابن ماجہ ابواب الجہاد، ترمذی ابواب السیر و ابواب الجہاد، موطا امام مالک کتاب الجہاد سے ماخوذ ہیں۔

لیتذکر حمیتہ فرفع الیہ راسہ تھا یا؟ اور جواب دیا کہ جو شخص اللہ کا کلمہ بلند کرنے کے لئے

فقال من قاتل لتکون کلمۃ اللہ هی العلیا فهو فی سبیل اللہ،

لڑتا ہے، اسی کی جنگ راہِ خدا میں ہے،

ابوامامہ باہلیؓ روایت کرتے ہیں کہ ایک شخص نے حاضر ہو کر عرض کیا ارأیت رجلاً غزا یلتمس الاجر والذکر؟ مالہ؟ اس شخص کے بارے میں آپ کی کیا رائے ہے جو مالی فائدے اور شہرت کے لئے جنگ کرتا ہے؟ ایسے شخص کو کیا ملے گا؟ آنحضرت صلعم نے جواب دیا لا شیئ لہ، اس کو کچھ ثواب نہ ملے گا، سائل کے لئے یہ بات عجیب تھی، پلٹ کر پھر آیا اور پھر یہی سوال کیا، آپؐ نے دوبارہ وہی جواب دیا، اس کا اطمینان اب بھی نہ ہوا، تیسری اور چوتھی مرتبہ پلٹ پلٹ کر آیا اور یہی سوال کرتا رہا، آخر آنحضرت صلعم نے اس کو مطمئن کرنے کے لئے فرمایا، ان اللہ لا یقبل من العمل الا ما کان لہ خالصاً وابتغی بہ وجہ اللہ کوئی عمل اس وقت تک قبول نہیں کرتا جب تک وہ خالص اسی کی خوشنودی و رضا کے لئے نہ کیا جائے،

عبادہ بن الصامتؓ سے روایت ہے کہ ایک مرتبہ رسول اللہ صلعم نے فرمایا من غزا فی سبیل اللہ ولم ینو الا عقالا فلہ ما نوی، جس نے خدا کی راہ میں جہاد کیا، اور صرف ایک اونٹ باندھنے کی رسی کی نیت بھی کرلی، تو بس اس کو وہ رسی ہی ملے گی، ثواب کچھ نہ ملے گا،

معاذ بن جبلؓ سے روایت ہے کہ آنحضرت صلعم نے فرمایا:۔

الغزو غزوان، فاما من ابتغی وجہ اللہ واطاع الامام، وانفق الکریمۃ، واجتنب الفساد فان نومہ ونبھتہ اجر کلہ، واما من غزا ریاءً وسمعۃ وعصی الامام وافسد فی الارض فانہ لا یرجع بالکفاف،

لڑائیاں دو قسم کی ہیں جس شخص نے خالص اللہ کی رضا کے لئے لڑائی کی، اور اس میں امام کی اطاعت کی، اپنا بہترین مال خرچ کیا اور فساد سے پرہیز کیا تو اس کا سونا جاگنا سب اجر کا مستحق ہے، اور جس نے دنیا کے دکھاوے اور شہرت و ناموری کے لئے جنگ کی، اور اسمیں امام کی نافرمانی کی اور زمین میں فساد پھیلایا، تو وہ برابر بھی نہ چھوٹے گا (یعنی الٹا عذاب میں مبتلا ہو گا)،

حضرت ابو ہریرہؓ کا بیان ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:-

اول الناس یقضی لھم یوم القیامۃ ثلاثۃ رجل استشھد فاتی بہ فعرفہ نعمہ فعرفھا قال فما عملت؟ قال قاتلت فیک حتی استشھدت قال کذبت ولکنک قاتلت لیقال فلان جری فقد قیل ثم امر بہ فسحب علی وجھہ حتی القی فی النار۔ الحدیث

قیامت کے دن سب سے پہلے تین قسم کے آدمیوں کا فیصلہ کیا جائیگا، پہلے وہ شخص لایا جائیگا جو لڑ کر شہید ہوا تھا خدا اس کو اپنی نعمتیں جتائیگا اور جب وہ ان کا اقرار کر لیگا تو پھر خدا پوچھے گا کہ تو نے میرے لئے کیا کیا؟ وہ کہے گا کہ تیرے لئے جنگ کی یہاں تک شہید ہو گیا، اس پر خدا فرمائیگا تو جھوٹ بولا، تو تو اس لئے لڑا تھا کہ لوگ کہیں کہ فلاں شخص بڑا جری ہے، سو تیرا یہ مقصد پورا ہو گیا، پھر خدا اس کے عذاب کا حکم دیگا، اور اسے منہ کے بل گھسیٹ کر دوزخ میں ڈال دیا جائیگا، الخ

عبداللہ بن مسعودؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:-

یجیٔ الرجل آخذا بید رجل فیقول یا رب ھذا قتلنی، فیقول اللہ لہ لم قتلتہ؟ فیقول قتلتہ لتکون العزۃ لک فیقول انھا لی و یجیٔ الرجل آخذا بید الرجل فیقول ان ھذا قتلنی، فیقول اللہ لم قتلتہ؟ فیقول لتکون العزۃ لفلان فیقول انھا لیست لفلان فیبوء باثمہ

قیامت کے دن ایک شخص دوسرے شخص کا ہاتھ پکڑے ہوئے آئیگا، اور عرض کریگا کہ اے رب اس نے مجھے قتل کیا تھا، اللہ تعالیٰ دریافت کریگا کہ تو نے اس کو کیوں قتل کیا وہ کہے گا کہ میں نے اسے اس لئے قتل کیا تھا کہ عزت تیرے لئے ہو، اس پر خدا فرمائیگا کہ ہاں عزت میرے ہی لئے ہے، پھر ایک دوسرا شخص ایک شخص کا ہاتھ پکڑے ہوئے آئیگا، اور عرض کریگا کہ اس نے مجھے قتل کیا تھا اللہ تعالیٰ دریافت فرمائیگا کہ تو نے اسے کیوں قتل کیا؟ وہ کہیگا کہ میں نے اس لئے قتل کیا کہ عزت فلاں شخص کے لئے ہو، اس پر اللہ کہے گا کہ عزت فلاں شخص کا حق نہیں ہے پھر مقتولوں کے گناہ اس پر ڈالے جائیں گے۔

یہ تعلیم جنگ کو ہر قسم کے دنیوی مقاصد سے پاک کر دیتی ہے۔ شہرت و ناموری کی طلب

وقت ذ... کی خواہش، مال و دولت اور حصول غنائم کی طمع، شخصی و قومی عداوت کا
انتقام، غرض کوئی دنیوی غرض ایسی نہیں ہے جس کے لئے جنگ جائز رکھی گئی ہو۔ ان چیزوں کو
الگ کر دینے کے بعد جنگ محض ایک خشک و بے مزہ اخلاقی و دینی فرض رہجاتی ہے، جس کے مہالک
وخطرات میں مبتلا ہونے کی از خود خواہش تو کوئی کر ہی نہیں سکتا، اور اگر دوسرے کی طرف سے
فتنہ کی ابتدا ہو تب بھی صرف اس وقت مقابلہ کے لئے تلوار اٹھا سکتا ہے جب کہ اصلاح حال
اور دفع ضرر کے لئے تلوار کے سوا کوئی دوسرا ذریعہ باقی نہ رہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم
نے خود ہی فرمادیا ہے کہ:-

لا تتمنوا لقاء العدو وسلوا اللہ العافیۃ، فاذا لقیتموھم فاصبروا واعلموا ان الجنۃ تحت ظلال السیوف،	دشمن سے مقابلہ کی تمنا مت کرو، بلکہ اللہ سے امن و عافیت کی دعا کیا کرو، مگر جب دشمن سے مقابلہ ہو جائے تو پھر جم کر لڑو، اور جان لو کہ جنت تلواروں کے سایہ تلے ہے،

طریق جنگ کی تطہیر مقصد کی اصلاح کے ساتھ داعی اسلامؐ نے طریق حصول مقصد کی
بھی اصلاح کی اور رفتہ رفتہ ان تمام وحشیانہ حرکات کو روکدیا جو جاہلیت کی لڑائیوں میں کیجاتی
تھیں۔ اس کے متعلق امتناعی احکام بکثرت موجود ہیں جنمیں مجموعاً و منفرداً تمام وحشیانہ افعال
سے منع کیا گیا ہے،

غیر اہل قتال کی حرمت اس سلسلہ میں سب سے پہلی چیز یہ ہے کہ محاربین (BELLIGERENTS)
کو دو طبقوں میں تقسیم کر دیا گیا، ایک اہل قتال (COMBATANTS) دوسرے غیر
اہل قتال (NONCOMBATANTS) اہل قتال وہ ہیں جو عملاً جنگ میں حصہ
لیتے ہیں، یا عقلاً و عرفاً حصہ لینے کی قدرت رکھتے ہیں یعنی جوان مرد، اور غیر اہل قتال وہ ہیں جو
عقلاً و عرفاً جنگ میں حصہ نہیں لے سکتے، یا عدم قدرت کے باعث، یا عادت جاریہ کے اعتبار سے
مثلاً عورتیں، بچے، بوڑھے، بیمار، زخمی، اندھے، مقطوع الاعضا، مجنون، سیاح، خانقاہ نشین،
زاہد، معبدوں اور مندروں کے مجاور اور ایسے ہی دوسرے بے ضرر لوگ، اسلام نے طبقۂ اول
کے لوگوں کو قتل کرنے کی اجازت دی ہے، اور طبقہ دوم کے لوگوں کو قتل کرنے سے

منع کر دیا ہے۔

ایک مرتبہ میدان جنگ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک مقتولہ عورت کی لاش پڑی دیکھی، ناراض ہو کر فرمایا کہ ما کانت ھذہ تقاتل فیمن یقاتل یہ تو لڑنے والوں میں شامل نہ تھی۔ پھر سالار فوج حضرت خالدؓ کو کہلا بھیجا کہ لا تقتلن امراۃ ولا عسیفا، عورت اور اجیر کو ہرگز نہ قتل کرو۔ ایک دوسری روایت کے مطابق اس کے بعد آپ نے عورتوں اور بچوں کے قتل کی عام ممانعت فرمادی، فنھی النبی عن قتل النساء والصبیان۔

ایک حدیث میں آیا ہے کہ آنحضرت صلعم نے فرمایا:۔

لا تقتلوا شیخاً فانیاً ولا طفلاً صغیراً ولا امرأۃ، ولا تغلوا وضموا غنائمکم واصلحوا واحسنوا ان اللہ یحب المحسنین	نہ کسی بوڑھے ضعیف کو قتل کرو، نہ چھوٹے بچوں کو، اور نہ عورت کو، اموال غنیمت میں چوری نہ کرو، جنگ میں جو کچھ ہاتھ آئے سب ایک جگہ جمع کرو، نیکی و احسان کرو کیونکہ اللہ محسنوں کو پسند فرماتا ہے۔

فتح مکہ کے موقع پر آپ نے پہلے سے ہدایت فرمادی کہ کسی زخمی پر حملہ نہ کرنا، جو کوئی جان بچا کر بھاگے، اس کا پیچھا نہ کرنا، اور جو اپنا دروازہ بند کرکے بیٹھ جائے اسے امان دینا۔[1]

ابن عباسؓ سے روایت ہے کہ آنحضرت صلعم جب کہیں فوج بھیجتے تھے، تو ہدایت کر دیتے تھے کہ معابد کے بے ضرر خادموں اور خانقاہ نشین زاہدوں کو قتل نہ کرنا۔ لا تقتلوا اصحاب الصوامع۔

ان مختلف جزئی احکام سے فقہائے اسلام نے یہ قاعدۂ کلیہ مستنبط کیا ہے کہ تمام وہ لوگ جو لڑنے سے معذور ہیں، یا عادۃً معذور کے حکم میں ہیں، قتال سے مستثنیٰ ہیں لیکن ان کا استثنا علی الاطلاق نہیں ہے، بلکہ مقید ہے، اس سے کہ وہ عملاً جنگ میں حصہ نہ لیں، اگر ان میں سے کوئی اعمال جنگ میں فی الواقع شرکت کرے، مثلاً بیمار پلنگ پر لیٹے لیٹے فوجوں کو جنگی چالیں بتا رہا ہو، یا عورت غنیم کی جاسوسی کا کام کر رہی ہو، یا بچہ خفیہ خبریں حاصل کرنے کی کوشش کر رہا ہو یا مذہبی طبقہ کا کوئی فرد دشمن قوم کو جنگ کا جوش دلا رہا ہو، تو اس کا قتل جائز ہوگا، کیونکہ

[1] فتوح البلدان ص ۴۷۔

اس نے خود اپنے آپ کو مقاتلین میں شامل کرکے غیر مقاتلین کے حقوق سے محروم کرلیا، اس باب میں اسلامی قانون کا خلاصہ یہ ہے کہ ہر شخص جو اہلِ قتال میں سے ہے اس کا قتل جائز ہے خواہ وہ بالفعل لڑے یا نہ لڑے، اور ہر شخص جو اہلِ قتال سے نہیں ہے اس کا قتل ناجائز ہے سوائے اس صورت کے کہ وہ حقیقۃً لڑائی میں شامل ہو یا مقاتلین کے سے کام کرنے لگے،

اہلِ قتال کے حقوق، غیر اہلِ قتال کے حقوق بیان کرنے کے بعد یہ بھی بتایا گیا ہے کہ اہلِ قتال جن پر تلوار اٹھانا جائز ہے، ان پر بھی دست درازی کا غیر محدود حق حاصل نہیں ہے، بلکہ اس کے لئے بھی کچھ حدود ہیں جنکی پابندی ضروری ہے، یہ حدود ایک ایک کرکے تفصیل کے ساتھ بیان کئے گئے ہیں،

غفلت میں حملہ کرنے سے احتراز، اہلِ عرب کا قاعدہ تھا کہ راتوں کو اور خصوصاً آخر شب میں جبکہ لوگ بے خبر سوتے ہوتے، اچانک جا پڑتے تھے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس رسم عادت کو بند کر دیا، اور قاعدہ مقرر کیا کہ صبح سے پہلے کسی دشمن پر حملہ نہ کیا جائے، انس بن مالک غزوۂ خیبر کا ذکر کرتے ہوئے بیان کرتے ہیں کہ:-

کان اذا جاء قوماً بلیل لم یُغِر علیھم حتی یصبح،	آنحضرت صلعم جب کسی دشمن قوم پر رات کے وقت پہونچتے تو جب تک صبح نہ ہو جاتی حملہ نہ کرتے تھے،

آگ میں جلانے کی ممانعت، عرب اور غیر عرب شدتِ انتقام میں دشمن کو زندہ جلا دیا کرتے تھے، رسول اللہ صلعم نے اس وحشیانہ حرکت کو بھی ممنوع قرار دیا، حدیث میں آیا ہے کہ آنحضرت صلعم نے فرمایا:-

لا ینبغی ان یعذب بالنار الا رب النار،	آگ کا عذاب دینا سوائے آگ کے پیدا کرنے والے کے اور کسی کو سزاوار نہیں،

حضرت ابوہریرہؓ فرماتے ہیں کہ ایک مرتبہ آنحضرت صلعم نے ہم لوگوں کو لڑائی پر جانے کا حکم دیا، اور ہدایت کی کہ اگر فلاں دو آدمی تم کو ملیں تو ان کو جلا دینا مگر جب ہم روانہ ہونے لگے تو بلا کر فرمایا:-

ؔ ہدایہ باب کیفیۃ القتال، فتح القدیر ج ۴ ص ۲۹۲-۲۹۰، بدائع الصنائع ج ۷ ص ۱۰۱

[illegible] ان تحرقوا فلاناً وفلاناً و [illegible] تم کو [illegible] عذاب [illegible] تو [illegible] دینا مگر
ان النار فلا یعذب بھا الا اللہ فان آگ کا عذاب سوائے خدا کے کوئی نہیں دے سکتا ہے
وجدتموھا فاقتلوھا۔ اگر تم انھیں پاؤ تو بس قتل کر دینا

ایک مرتبہ حضرت علیؓ نے زنادقہ کو آگ کا عذاب دیا تھا، اس پر حضرت ابن عباسؓ نے انھیں روکا اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ حکم بیان کیا کہ لا تعذبوا بعذاب اللہ آگ اللہ کا عذاب ہے اس سے بندوں کو عذاب نہ دو۔

قتل صبر کی ممانعت رسول اللہ صلعم نے دشمن کو باندھ کر قتل کرنے اور تکلیفیں دے دے کر مارنے کی بھی ممانعت فرمائی، عبید بن یعلی کا بیان ہے کہ ہم عبد الرحمن بن خالد کے ساتھ جنگ پر گئے تھے، ایک دفعہ ان کے پاس لشکر اعداء میں سے چار گبر پکڑے ہوئے آئے اور انھوں نے حکم دیا کہ انھیں باندھ کر قتل کیا جائے، اس کی اطلاع جب حضرت ابو ایوب انصاریؓ کو ہوئی انھوں نے کہا:۔

سمعت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم — میں نے رسول اللہ صلعم سے سنا ہے کہ آپ نے قتل صبر
نھی عن قتل الصبر فو الذی نفسی بیدہ — (باندھ کر مارنے) سے منع فرمایا، خدا کی قسم اگر مرغی بھی
لو کانت الدجاجۃ ما صبرتھا فبلغ — ہوتی تو میں اس کو اس طرح باندھ کر نہ مارتا۔ اس کی
ذلک عبد الرحمن بن خالد بن ولید — خبر جب عبد الرحمن بن خالد کو پہونچی تو انھوں نے چار
فاعتق اربعۃ رقاب — غلام آزاد کر دیئے۔

لوٹ مار کی ممانعت جنگ خیبر میں جب اسلامی فوج کے بعض نئے رنگروٹ بے قابو ہو گئے اور انھوں نے غارت گری شروع کر دی، تو یہودیوں کا سردار رسول اللہ صلعم کے پاس حاضر ہوا اور کرخت لہجہ میں آپ کو خطاب کرکے بولا یا محمد ألکم ان تذبحوا حمرنا وتاکلوا ثمرنا وتضربوا نساءنا؟ اے محمدؐ! کیا تم کو یہ زیبا ہے کہ ہمارے گدھوں کو ذبح کرو، ہمارے پھل کھا جاؤ، اور ہماری عورتوں کو مارو؟ اس پر رسول اللہ صلعم نے عبد الرحمن بن عوف کو حکم دیا کہ لشکر میں اجتمعوا للصلوٰۃ کی منادی کریں جب تمام اہل لشکر جمع ہو گئے تو حضور کھڑے ہوئے اور فرمایا:۔

ایحسب احدکم متکئاً علی اریکتہ قد یظن کیا تم میں کا کوئی شخص تخت غرور پر بیٹھا یہ سمجھ رہا ہے کہ اللہ نے سوا ان
ان اللہ لم یحرم شیئاً الا ما فی ھذا القرآن؟ چیزوں کے جو قرآن میں حرام کی گئی ہیں کوئی اور چیز حرام نہیں
الا وانی و اللہ قد امرت ووعظت ونھیت عن کی؟ خدا کی قسم میں جو کچھ تم کو نصیحت کرتا ہوں اور جو امر
اشیاء انھا لمثل القرآن او اکثر نہی کے احکام دیتا ہوں وہ بھی قرآن کی طرح یا اس سے
وان اللہ تعالی لم یحل لکم زیادہ ہیں۔ اللہ نے تمہارے لئے یہ جائز نہیں کیا ہے، کہ
ان تدخلوا بیوت اھل الکتاب الا باذن اہل کتاب کے گھروں میں بلا اجازت گھس جاؤ، ان
ولا ضرب نساءھم ولا اکل ثمارھم کی عورتوں کو مارو پیٹو، اور ان کے پھل کھا جاؤ حالانکہ
اذا اعطوکم الذی علیھم، ان پر جو کچھ واجب تھا وہ تمہیں دے چکے،

ایک دفعہ جہاد میں لشکر نے کچھ بکریاں لوٹ لیں اور ان کا گوشت پکا کر کھانا چاہا، آنحضرت
کو خبر ہوئی تو آپ نے دیگچیاں الٹ دیں اور فرمایا ان النھبۃ لیست با حل من المیتۃ لوٹ گھسوٹ
کا مال مردار سے بہتر نہیں ہے۔

عبداللہ بن یزید روایت کرتے ہیں کہ آنحضرت صلعم نے لوٹے ہوئے مال کو حرام قرار دیا۔ نھی
النبی صلی اللہ علیہ وسلم عن النھبی والمثلۃ،

اگر راستہ میں دودھ دینے والے جانور مل جائیں تو ان کا دودھ دوہ کر پینے کی بھی اجازت
نہ تھی تاوقتیکہ ان کے مالکوں سے اجازت نہ لے لی جائے، شدید ضرورت کی حالت میں صرف
اتنی اجازت تھی، کہ باواز بلند تین مرتبہ پکار دو تاکہ اگر کوئی مالک ہو تو آجائے، اور جب کوئی
نہ آئے تو پی لو۔

تباہ کاری کی ممانعت، فوج کی پیش قدمی کے وقت فصلوں کو خراب کرنا، کھیتوں کو تباہ
کرنا، بستیوں میں قتل عام اور آتش زنی کرنا جنگ کے معمولات میں سے ہے، مگر اسلام اس کو فساد
سے تعبیر کرتا ہے اور سختی کے ساتھ ناجائز قرار دیتا ہے، قرآن مجید میں آیا ہے،

واذا تولی سعی فی الارض لیفسد فیھا جب وہ حاکم بنتا ہے تو کوشش کرتا ہے کہ زمین پر فساد
ویھلک الحرث والنسل واللہ لا پھیلائے اور فصلوں اور نسلوں کو برباد کرے مگر اللہ فساد

سے تو ... یہ ... ... یہ ہے کہ سپاہی میدان جنگ میں کسی حریف مقابل سے چھین لیا جائے، اسکے علاوہ نہب سے مال غنیمت کو
بھی کہتے ہیں جو باقاعدہ تقسیم سے پہلے لے لیا جائے،

عجیب تضاد ... کو پسند نہیں کرتا

حضرت ابوبکرؓ نے شام و عراق کی طرف فوجیں بھیجتے وقت جو ہدایات دی تھیں ان میں ایک ہدایت یہ بھی تھی کہ بستیوں کو ویران نہ کرنا اور فصلوں کو خراب نہ کرنا۔ اس میں شک نہیں کہ اگر جنگی ضروریات کا تقاضا ہو تو درختوں کو کاٹنے اور جلا کر میدان صاف کر دینے کی اجازت ہے، جیسا کہ بنی نضیر کے محاصرہ میں کیا گیا، لیکن محض تخریب کی نیت سے ایسا کرنا بالاتفاق ممنوع ہے۔

مخالفین نے غزوۂ بنی نضیر کے واقعہ کو اس الزام کے ثبوت میں پیش کیا ہے کہ اسلام جنگ میں غارت گری کو جائز رکھتا ہے۔ خود ہمارے محدثین میں سے بھی بعض نے اس کو حرق الدور و النخیل کے جواز کی دلیل سمجھا ہے۔ مگر واقعات کی تحقیق سے ثابت ہوتا ہے کہ بنی نضیر کی کھجوروں کو کاٹنا اور جلانا محض جنگی ضروریات پر مبنی تھا، دشمن کو نقصان پہنچانا یا اس سے انتقام لینا ہرگز مقصود نہ تھا۔ اول تو جو درخت کاٹے گئے تھے وہ قرآن کی تصریح کے مطابق ایک خاص قسم کی کھجور کے تھے جس کو لینہ کہتے ہیں۔ ما قطعتم من لینۃ او ترکتموھا الخ۔ اور سہیلی کا بیان ہے کہ بنی نضیر اس کھجور کو غذا کے کام میں نہ لاتے تھے بلکہ عجوہ اور برنی کو استعمال کرتے تھے۔ علامہ ابن حجر کہتے ہیں کہ:-

قال السھیلی فی تخصیصھا بالذکر | سہیلی خاص طور پر لینہ کا ذکر کئے جانے سے یہ اشارہ نکالتا
ایماءٌ الی ان الذی یجوز قطعہ من | ہے کہ دشمن کے درختوں میں سے صرف انھیں کو کاٹنا
شجر العدو ما لا یکون معدًا للاقتیات | جائز ہے جو غذا کے کام میں نہ آتے ہوں، کیونکہ بنو نضیر
لانھم کانوا یقتاتون العجوۃ والبرنی | عجوہ اور برنی کو کھایا کرتے تھے، لینہ کو نہیں کھاتے
دون اللینۃ[1] | تھے۔

پھر واقعہ کی نوعیت بھی وہ نہیں ہے جو بیان کی جاتی ہے۔ عام راویوں نے تو یہ دیکھ کر کہ آنحضرت صلعم خود محاصرہ میں موجود تھے، اور آپ کی موجودگی میں فوجوں نے درخت کاٹے اور جلائے تھے، یہ نتیجہ نکال لیا ہے کہ یہ کام آپ ہی کے حکم یا اجازت سے کیا گیا۔ لیکن ابن عباسؓ نے صاف تصریح کی ہے کہ مسلمانوں نے محاصرہ کی ضروریات سے کاٹنا اور

---

[1] فتح الباری ج [illegible] ۔ ص ۲۳۴

[illegible] کو خیال آیا کہ معلوم نہیں اس فعل کی شرعی حیثیت کیا ہے؟ (ھل لنا فیما قطعنا من اجر وھل علینا فیما ترکنا من وزر؟) چنانچہ انھوں نے جا کر رسول اللہ صلعم سے استفتا کیا اور اس پر آیت اتری کہ ما قطعتم من لینۃ او ترکتموھا قائمۃ علی اصولھا فباذن اللہ "لینہ کے درختوں میں سے جو کچھ تم نے کاٹا اور جو کچھ چھوڑ دیا سب اللہ ہی کے اذن سے تھا۔"

جابر نے بھی یہی روایت کی ہے کہ درخت کاٹنے کے بعد لوگ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں پوچھتے ہوئے آئے کہ یا رسول اللہ ھل علینا اثم فیما قطعنا او علینا وزر فیما ترکنا؟ "یا رسول اللہ ہم نے جو کچھ کاٹ دیا یا چھوڑ دیا ہے، اس کا کوئی گناہ تو ہم پر نہیں ہے؟" اس پر یہ آیت اتری کہ ما قطعتم من لینۃ الآیۃ

مجاہد نے اس قول کی تائید کرتے ہوئے آیت مذکورہ کی تفسیر یہ کی ہے کہ بعض مہاجرین درختوں کو کاٹنے لگے تھے اور بعض نے ان کو چھوڑ دیا تھا، اس لئے اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل کر کے دونوں کے فعل کو درست قرار دیا۔ اس تفسیر کے مطابق آیت کے معنی یہ ہوں گے کہ "تم میں سے جنھوں نے محاصرہ کو موثر بنانے کی نیت سے لینہ کے درخت کاٹے وہ بھی حق پر ہیں، اور جنھوں نے اس فعل کو فساد سمجھ کر انھیں چھوڑ دیا وہ بھی حق پر ہیں، کیونکہ دونوں نے اللہ کے ایک ایک حکم کی پیروی کی۔"

محمد بن اسحٰق کی تحقیق یہ ہے کہ غزوۂ بنی نضیر میں جب اس طرح درختوں کو کاٹا جانے لگا تو یہود نے آپ کو کہلا بھیجا کہ "اے محمدؐ! تم تو فساد کو منع کرتے ہو اور کہتے ہو کہ میں اصلاح کرنے آیا ہوں، پھر یہ درخت کیوں کاٹ رہے ہو؟ کیا یہ اصلاح ہے؟" اس پر آنحضرت صلعم اور مسلمان متفکر ہوئے، اور اللہ نے ان کی تسلی کے لئے یہ آیت نازل فرمائی کہ ما قطعتم من لینۃ الآیۃ یعنی جو کچھ تم نے کاٹا اور جو کچھ چھوڑا سب اللہ کے اذن سے تھا،

بہرصورت واقعات کی تحقیق سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ خود رسول اللہ صلعم نے قطع اشجار کا حکم نہیں دیا تھا، بلکہ فوج نے محاصرہ کی ضروریات سے مجبور ہو کر بلا اجازت چند درخت کاٹ لئے تھے، اور بعد میں اللہ تعالیٰ نے اس فعل کو اس بنا پر صحیح قرار دیا تھا کہ درخت کاٹنے والوں

کی نیت تخریب و فساد کی نہ تھی بعض فقہاء نے اس سے یہ نتیجہ نکالا ہے کہ یہ حکم اسی خاص موقع کے لئے تھا، اور اس خاص حکم سے یہ عام جواز نہیں نکل سکتا کہ جب کبھی جنگی ضروریات پیش آئیں تو دشمن کے درختوں کو کاٹا اور جلایا جائے۔ چنانچہ امام اوزاعی، لیث، اور ابوثور اسی طرف گئے ہیں، لیکن جمہور محققین کا مذہب یہ ہے کہ تمام جنگی ضروریات کے لئے محض حسب ضرورت ایسا کرنا جائز ہے۔ رہا تخریب و غارت گری کی نیت سے کرنا تو اس کے حرام و ناجائز ہونے پر سب متفق ہیں۔ علامہ ابن جریر نے اوزاعی اور لیث کو جواب دیتے ہوئے لکھا ہے کہ:-

ان النهي محمول على القصد لذلك بخلاف ما اذا اصابوا ذالك في خلال القتال كما وقع في نصب المنجنيق على الطائف،

ممانعت تو دراصل عمداً تخریب کی کی گئی ہے۔ بخلاف اس نقصان کے جو دوران قتال میں ان کو پہنچ جائے جیسے کہ طائف پر منجنیق سے سنگ باری کرتے وقت ہوا۔

امام احمد بھی یہی کہتے ہیں کہ:-

قد تكون في مواضع لا يجدون منه بداً فاما بالعبث فلا تحرق،

یہ ایسے مواقع پر ہو سکتا ہے جبکہ کاٹنا اور جلانا بالکل ناگزیر ہو ورنہ بلا ضرورت نہیں جلانا چاہیے۔

اس قسم کی ناگزیر تباہ کاری پر کسی طرح اعتراض نہیں کیا جا سکتا۔ موجودہ زمانہ کے تو اس جنگ میں بھی محاصرہ کو موثر بنانے اور محصورین کو درختوں اور عمارتوں کی آڑ میں پناہ لینے سے روکنے کے لئے درختوں کو کاٹنا عمارتوں کو توڑنا حتی کہ بستیوں تک کو جلانا جائز رکھا گیا ہے۔

مثلہ کی ممانعت، دشمن کی لاشوں کو بے حرمت کرنے اور ان کے اعضاء قطع و برید کرنے کو بھی اسلام نے سختی سے منع کیا۔ عبداللہ بن یزید انصاری روایت کرتے ہیں کہ:

نهى النبي صلى الله عليه وسلم من النهبى والمثلة،

نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے لوٹ کے مال اور مثلہ (قطع اعضاء) سے منع فرمایا۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم فوجوں کو بھیجتے وقت جو ہدایات دیا کرتے تھے ان میں بتاکید فرماتے

لا تغدروا ولا تغلوا ولا تمثلوا

بدعہدی نہ کرو، غنیمت میں خیانت نہ کرو، مثلہ نہ کرو۔

---

[1] فتوح البلدان ص ۴۷،

قتل عام کی ممانعت فتح مکہ کے موقع پر آنحضرت صلعم جب شہر میں داخل ہونے لگے تو فوج پر

منادی کرادی گئی تھی:-

لا تجھزن علی جریح ولا یتبعن کسی مجروح پر حملہ نہ کیا جائے، کسی بھاگنے والے کا پیچھا نہ کیا
مدبر ولا یقتلن اسیر ومن جائے، کسی قیدی کو قتل نہ کیا جائے، اور جو اپنے گھر کا دروازہ
اغلق بابہ فھو آمن بند کرے وہ امان میں ہے،

حجاج بن یوسف نے ایک مرتبہ حضرت عبداللہ بن عمرؓ کو حکم دیا کہ وہ ایک اسیر کو قتل
کریں، اس پر انھوں نے فرمایا کہ اللہ نے ہمکو اس کی تو اجازت نہیں دی۔ البتہ یہ حکم دیا ہے کہ
جو قیدی گرفتار ہو کر آئیں ان کو یا تو بطریق احسان چھوڑ دو یا فدیہ لیکر رہا کرو، ما امرنا بھذا
بقول اللہ تعالی حتی اذا اثخنتموھم فشدوا الوثاق فاما منا بعد واما فدا ء۔[۱]

قتل سفیر کی ممانعت، سفرا اور قاصدوں کے قتل کو بھی آنحضرت صلعم نے منع فرمایا، مسیلمہ کذاب
کا قاصد عبادہ بن الحارث جب اس کا گستاخانہ پیغام لیکر حاضر ہوا تو آپؐ نے فرمایا:-

لو لا ان الرسل لا تقتل لضربت عنقک اگر قاصدوں کا قتل ممنوع نہ ہوتا تو میں تیری گردن مار دیتا،

اسی اصل سے فقہا نے یہ جزئیہ نکالا ہے کہ جب کوئی شخص اسلامی سرحد پر پہونچ کر بیان کرے کہ
میں فلاں بادشاہ کا سفیر ہوں اور بادشاہ عرب کے پاس پیغام لیکر بھیجا گیا ہوں تو اس کو
امن کے ساتھ داخلہ کی اجازت دیجائے، اس پر کسی قسم کی زیادتی نہ کیجائے، اس کے مال و متاع
خدم و حشم حتی کہ اسلحہ سے بھی تعرض نہ کیا جائے، الا اس صورت میں کہ وہ اپنا سفیر ہونا ثابت نہ کرسکے
بعض فقہانے یہ بھی کہا ہے کہ اگر وہ اسلامی حکومت میں رہ کر زنا اور چوری بھی کرے تو اس پر
حد جاری نہ ہوگی،[۲]

بدعہدی کی ممانعت غدر، نقض عہد، اور معاہدین پر دست درازی کرنے کی برائی میں بے شمار
احادیث آئی ہیں جن کی بنا پر یہ فعل اسلام میں بدترین گناہ قرار دیا گیا ہے، عبداللہ بن عمرو رضی
مروی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا :-

من قتل معاھدًا لم یرح رائحۃ جو کوئی کسی معاہد کو قتل کریگا اسے جنت کی بو تک

---

[۱] فتوح البلدان صفحہ ۴۰ [۲] کتاب الخراج صفحہ ۱۱۶

[illegible] لتوجد من مسیرة اربعین عاما — [illegible] نصیب نہ ہوگی، حالانکہ اس کی خوشبو چالیس برس کی مسافت سے بھی محسوس ہوتی ہے۔

ایک دوسری حدیث میں حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے روایت ہے کہ:

اربع خلال من کن فیه کان منافقا خالصا من اذا حدث کذب واذا وعد اخلف واذا عاھد غدر واذا خاصم فجر — چار خصلتیں ہیں کہ جس میں پائی جائیں گی وہ خالص منافق ہوگا، ایک یہ کہ جب بولے تو جھوٹ بولے، دوسرے یہ کہ جب وعدہ کرے تو اس کی خلاف ورزی کرے، تیسرے یہ کہ جب معاہدہ کرے تو اس کو توڑ دے، چوتھے یہ کہ جب جھگڑا ہو تو گالیاں دے۔

ایک اور حدیث میں ہے کہ:

لکل غادر لواء یوم القیامة یرفع له بقدر غدرہ الا ولا غادر اعظم غدرا من امیر عامة — ہر غدار کی بے وفائی کا اعلان کرنے کے لئے قیامت کے دن ایک جھنڈا ہوگا جو اس کے غدر کے بقدر ہوگا، اور دیکھو کہ جو سردار قوم غدر کرے اس سے بڑا کوئی غدار نہیں ہے۔

ایک مرتبہ امیر معاویہؓ بلاد روم پر حملہ کرنے کے لئے جا رہے تھے اور ابھی معاہدۂ صلح کی مدت منقضی نہ ہوئی تھی، امیر معاویہؓ کا ارادہ تھا کہ مدت ختم ہوتے ہی حملہ کر دیں، مگر ایک صحابی عمرو بن عبسہؓ نے ایام معاہدہ میں جنگ کی تیاری اور سرحدوں کی طرف فوج کی روانگی کو بھی بدعہدی سے تعبیر کیا، اور امیر کے پاس دوڑتے ہوئے اور یہ پکارتے ہوئے پہنچے کہ اللہ اکبر وفاء لا غدر، امیر معاویہ نے سبب پوچھا تو کہا کہ میں نے رسول اللہ صلعم کو یہ فرماتے سنا ہے کہ:

من کان بینه وبین قوم عھد فلا یحلن عھدا ولا یشدنه حتی یمضی امدہ او ینبذ الیھم علی سواء — جس کا کسی قوم سے معاہدہ ہو تو اس میں کوئی تغیر و تبدل نہ کرے تاوقتیکہ اس کی مدت نہ ختم ہو جائے، یا پھر خیانت کا خوف ہو تو برابری کو ملحوظ رکھ کر ان کو ختم معاہدہ کا نوٹس دیدے۔

بدنظمی و انتشار کی ممانعت: اہل عرب کی عادت تھی کہ جب جنگ کو نکلتے تو راستہ میں جو ملتا اسے تنگ کرتے، اور جب کسی جگہ اترتے تو ساری منزل پر پھیل جاتے تھے یہاں تک

کہ راستوں پر چلنا مشکل ہو جاتا تھا، داعی اسلام نے اگر اس کی بھی ممانعت کردی، ایک مرتبہ جب آپ جہاد کو تشریف لیجا رہے تھے تو آپ کے پاس شکایت آئی کہ فوج میں عہد جاہلیت کی سی بدنظمی پھیلی ہوئی ہے اور لوگوں نے منزل کو تنگ کر رکھا ہے، اس پر آپؐ نے منادی کرائی کہ من ضیق منزلاً او قطع طریقاً فلا جہاد لہ "جو کوئی منزل کو تنگ کریگا یا راہ گیروں کو لوٹے گا اس کا جہاد نہیں ہوگا، ایک دوسرے موقع پر فرمایا کہ ان تفرقکم فی ھذہ الشعاب والاودیۃ انما ذالکم الشیطان "تمہارا اس طرح وادیوں اور گھاٹیوں میں منتشر ہوجانا یہی شیطانی فعل ہے"

ابو ثعلبہ خشنی کا بیان ہے کہ اس کے بعد یہ کیفیت ہوگئی تھی کہ جب اسلامی فوج کسی جگہ اترتی تو اس کا گنجان پڑاؤ دیکھ کر ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اگر ایک چادر تان دی گئی تو سب اس کے نیچے آجائیں گے،

شور و ہنگامہ کی ممانعت عرب کی جنگ میں اس قدر شور و ہنگامہ برپا ہوتا تھا کہ اس کا نام ہی دغی پڑ گیا تھا، اسلام لانے کے بعد بھی عربوں نے یہی طریقہ برتنا چاہا، مگر داعی اسلام نے اس کی اجازت نہ دی، ابوموسی اشعریؓ روایت کرتے ہیں کہ:

کنا مع رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فکنا اذا اشرفنا علی واد ھللنا وکبرنا، ارتفعت اصواتنا فقال النبی صلی اللہ علیہ وسلم یا ایھا الناس اربعوا علی انفسکم فانکم لا تدعون اصم ولا غائباً، انہ معکم انہ سمیع قریب،	ہم رسول اللہ صلعم کے ساتھ تھے اور جب کسی وادی پر پہنچتے تھے تو زور شور سے تکبیر و تہلیل کے نعرے بلند کرتے تھے اس پر حضورؐ نے فرمایا کہ اے لوگو! وقار کے ساتھ چلو، تم جس کو پکار رہے ہو وہ نہ بہرا ہے نہ غائب، وہ تو تمہارے ساتھ ہے، سب کچھ سنتا ہے اور بہت ہی قریب ہے،

وحشیانہ افعال کے خلاف عام ہدایات فوجوں کی روانگی کے وقت جنگی برتاؤ کے متعلق ہدایات دینے کا طریقہ جس سے انیسویں صدی کے وسط تک مغربی دنیا نابلد تھی، ساتویں صدی عیسوی میں عرب کے امی پیغمبرؐ نے ایجاد کیا تھا، داعی اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کا قاعدہ

تھا کہ جب آپ کسی سردار کو جنگ پر بھیجتے تو اسے اور اس کی فوج کو اپنے تقویٰ اور خوف خدا کی نصیحت کرتے، پھر فرماتے:-

اغزوا بسم اللہ وفی سبیل اللہ، قاتلوا من کفر باللہ، اغزوا ولا تغدروا ولا تغلوا ولا تمثلوا، ولا تقتلوا ولیدا	جاؤ اللہ کا نام لیکر اور اللہ کی راہ میں کفار سے لڑو مگر جنگ میں کسی سے بدعہدی نہ کرو، غنیمت میں خیانت نہ کرو، مثلہ نہ کرو اور کسی بچہ کو قتل نہ کرو۔

اس کے بعد فوج کو ہدایت کرتے کہ دشمن کے سامنے تین چیزیں پیش کرنا اول اسلام، دوسرے جزیہ، تیسرے جنگ۔ اگر وہ اسلام قبول کرے تو پھر اس پر ہاتھ نہ اٹھاؤ، اگر جزیہ دیکر اطاعت قبول کرے تو اس کی جان و مال پر کسی قسم کی تعدی نہ کرو، لیکن اگر وہ اس سے بھی انکار کرے تو اللہ سے مدد مانگ کر جنگ کرو۔

خلیفہ اول حضرت ابوبکرؓ نے جب شام کی طرف فوجیں روانہ کیں تو ان کو دس ہدایتیں کی تھیں جنکو تمام مورخین و محدثین نے نقل کیا ہے، وہ ہدایات یہ ہیں:-

(۱) عورتیں، بچے اور بوڑھے قتل نہ کئے جائیں،

(۲) مثلہ نہ کیا جائے،

(۳) راہبوں اور عابدوں کو نہ ستایا جائے، اور نہ ان کے معابد مسمار کئے جائیں

(۴) کوئی پھلدار درخت نہ کاٹا جائے اور نہ کھیتیاں جلائی جائیں۔

(۵) آبادیاں ویران نہ کی جائیں۔

(۶) جانوروں کو ہلاک نہ کیا جائے۔

(۷) بدعہدی سے ہر حال میں احتراز کیا جائے۔

(۸) جو لوگ اطاعت کریں ان کی جان و مال کا وہی احترام کیا جائے جو مسلمانوں کی جان و مال کا ہے۔

(۹) اموال غنیمت میں خیانت نہ کی جائے۔

(۱۰) جنگ میں پیٹھ نہ پھیری جائے۔

اصلاح کے نتائج: ان احکام کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ اسلام نے جنگ کو تمام

...جنگ کو ان تمام چیزوں سے پاک کر دیا، جو اُس عہد کی جنگ کا ایک جزو لاینفک بنی ہوئی تھیں، اسیرانِ جنگ اور سفرا کا قتل، معاہدین کا قتل، مجروحین جنگ کا قتل، غیر اہل قتال کا قتل، اعضا کی قطع و برید، مردوں کی بے حرمتی، آگ کا عذاب، لوٹ مار اور قطع طریق، فصلوں اور بستیوں کی تخریب، بدعہدی و پیمان شکنی، فوجوں کی پراگندگی و بدنظمی، لڑائی کا شور و ہنگامہ، سب کچھ آئین جنگ کے خلاف قرار دیدیا گیا، اور جنگ صرف ایک ایسی چیز رہ گئی جسمیں شریف اور بہادر آدمی دشمن کو کم سے کم نقصان پہونچا کر اس کے شر کو دفع کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔

اس اصلاحی تعلیم نے ۸ سال کی قلیل مدت میں جو عظیم الشان نتائج پیدا کئے اُن کا بہترین نمونہ فتح مکہ ہے، ایک قوم پر دوسری قوم کی فتح اور خصوصاً دشمن کے کسی بڑے شہر کی تسخیر کے موقع پر وحشی عرب ہی میں نہیں، بلکہ متمدن روم و ایران میں بھی جو کچھ ہوتا تھا اسے پیشِ نظر رکھئے، اور اس کے بعد غور کیجیے کہ وہی عرب جو چند برس پہلے تک جاہلیت کے طریقوں کے عادی تھے، اس شہر میں فاتح کی حیثیت سے داخل ہوتے ہیں جس سے ۸ ہی برس پہلے ان کو بری طرح تکلیفیں دے دے کر نکالا گیا تھا، اور ایسے دشمنوں پر فتح حاصل کرتے ہیں جنھوں نے ان فاتحوں کو گھر سے بے گھر کرنے ہی پر قناعت نہیں کی تھی بلکہ جس جگہ انھوں نے جا کر پناہ لی تھی وہاں سے بھی ان کو نکال دینے کے لئے کئی مرتبہ چڑھ کر آئے تھے، ایسے شہر اور ویسے دشمنوں پر غلبہ حاصل ہوتا ہے، مگر کوئی قتل عام نہیں کیا جاتا، کسی قسم کی لوٹ مار نہیں ہوتی، کسی کی جان و مال اور عزت و آبرو سے تعرض نہیں کیا جاتا، پرانے اور کٹے دشمنوں میں سے بھی کسی پر انتقام کا ہاتھ نہیں اٹھتا، تسخیر شہر کی پوری کارروائی میں صرف ۲۴ آدمی مارے جاتے ہیں اور وہ بھی اس وقت جبکہ دست درازی میں پیشقدمی ان کی طرف سے ہوئی، سالار فوج داخلہ سے پہلے اعلان کر دیتا ہے کہ جب تک تم پر کوئی ہاتھ نہ اٹھاوے تم بھی ہاتھ نہ اُٹھانا، شہر میں داخل ہوتے ہی منادی کیجاتی ہے کہ جو کوئی اپنا دروازہ بند کر کے بیٹھ جائیگا، اسے امان ہے، جو کوئی ہتھیار ڈال دیگا اسے امان ہے، اور جو کوئی ابوسفیان کے گھر میں پناہ لیگا اسے بھی امان ہے، پھر تسخیر کے بعد فاتح سردار کے سامنے وہ سب دشمن ایک ایک کر کے لائے جاتے ہیں جنھوں نے اسی شہر میں اس کو تیرہ برس تک انتہائی اذیتیں پہونچانے

کے بعد تثریب و تشنیع پر مجبور کیا تھا، اور جو ہجرت نکالے جانے کے بعد بھی اس دین کو دنیا سے مٹانے کے لئے بدر و احد اور جنگ احزاب میں بڑی بڑی تیاریاں کرتے رہے تھے، یہ دشمن گردنیں جھکائے ہوئے سر کھڑے ہوتے ہیں، فاتح پوچھتا ہے "اب تم کیا امید کرتے ہو کہ میں تمھارے ساتھ کیا کرونگا" مفتوح شرمساری کے ساتھ جواب دیتے ہیں کہ تو فیاض بھائی ہے اور فیاض بھائی کا بیٹا ہے" "اخ کریمٌ وابن اخ کریم" تب فاتح کہتا ہے کہ جاؤ، تم آزاد ہو، آج تم سے کوئی بازپرس نہیں، "لا تثریب علیکم الیوم اذہبوا فانتم الطلقاء"، یہ صرف جان ہی کی بخشش نہ تھی، صرف مال کی بھی بخشش نہ تھی، بلکہ اس ساتھ فاتح اور اس کی فوج نے ان جائدادوں کو بھی انھیں کے حق میں معاف کردیا جو ۸ برس پہلے اس کی ملک تھیں،

تاہم ان میں کچھ ایسے شدید دشمن بھی تھے جن کی ایذا رسانی حد درجہ سخت تر ہوئی تھی، فاتح ؐ نے شہر میں داخل ہونے سے پہلے حکم دیدیا تھا کہ ان میں سے جو ملے اسے قتل کردینا، مگر جب ان پر قابو مل گیا تو وہ بھی اس خلق عظیم کے سایہ سے فیض یاب ہوئے، ہبار بن اسود جو فاتح کی جوان بیٹی سیدہ زینب رض کا قاتل تھا عاجزی کے ساتھ مسلمان ہوا اور معاف کیا گیا، وحشی بن حرب جس نے فاتح ؐ کے نہایت محبوب چچا کو قتل کیا تھا مسلمان ہوا اور بخشا گیا، ہند بن عتبہ جو حضرت حمزہ رض کا کلیجہ نکال کر چبا گئی تھی اپنی انتہائی شقاوت کے باوجود فاتح ؐ کے غضب سے محفوظ رہی، اور آخر عفو و درگذر کا دامن اس کے لئے بھی وسیع ہوا، سب سے بڑے دشمن اسلام ابوجہل کا بیٹا عکرمہ جو خود بھی بڑا دشمن اسلام تھا مسلمان ہوگیا اور جلیل القدر صحابہ رض کی صف میں شامل کیا گیا، ان کے علاوہ عبداللہ بن ابی سرح، سارہ اور کعب بن زہیر بھی جو سب کے سب فاتح ؐ کے جانی دشمن تھے معاف کئے گئے، اور صرف حویرث بن نقید، عبدالعزی بن خطل اور مقیس بن صبابہ قتل کئے گئے، سو وہ بھی دشمنی کے جرم میں نہیں بلکہ خون کے قصاص میں،

یہ تھی وہ اصلاح جو صرف ۲۰ سال کے اندر دنیا کی سب سے زیادہ وحشی قوم میں کی گئی تھی، آج اس تہذیب و تمدن کے زمانہ میں بھی دنیا کی مہذب ترین قومیں جب کسی دشمن

گے شہر میں فاتحانہ داخل ہوتی ہیں، تو سب کو معلوم ہے کہ مفتوح شہر پر کیسے کیسے مظالم توڑے جاتے ہیں، بیسویں صدی کی جنگ عظیم میں تہذیبِ مغرب کے علم برداروں نے ایک دوسرے کے ملک میں گھس کر جو تباہیاں پھیلائیں ان کا نظارہ دیکھنے والی آنکھیں ابھی تک موجود ہیں، اس کے مقابلہ میں غور کرو کہ اب سے ۱۳ سو برس پہلے کے تاریک زمانہ میں جبکہ دنیا کی تہذیب کا علم خسرو پرویز اور ہرقل جیسے بادشاہوں کے ہاتھ میں تھا عرب کی ایک جاہل اور بادیہ نشین قوم نے اپنے بدترین دشمنوں کے شہر میں داخل ہو کر جو شریفانہ برتاؤ کیا، وہ کیسی زبردست اصلاح کیسی اعلیٰ اخلاقی تربیت، اور کیسے صحیح و مضبوط عسکری ضبط و نظم کا نتیجہ ہو سکتا تھا،

جنگ کے مہذب قوانین

یہ تو ان چیزوں کا ذکر تھا جو پہلے رائج تھیں، اور اسلام نے ان کو بند کیا، اب ہم ان چیزوں پر نظر ڈالنا چاہتے ہیں جو پہلے نہیں تھیں اور اسلام نے ان کو جاری کیا، ہم کو دیکھنا ہے کہ اسلام نے جنگ کے پچھلے طریقوں کو موقوف کر کے خود کس قسم کے قوانین مقرر کئے، اس کے لئے ہم صرف ان اصولی احکام کو لیں گے جن پر قوانینِ جنگ کی بنیاد قائم ہے، باقی رہے فروعی احکام سو وہ ائمہ وقت اور فقہائے عصر پر چھوڑ دیئے گئے ہیں، کہ اپنے زمانہ کی ضروریات کے مطابق اصول و قواعد کلیہ سے مستنبط کر لیں، اس لئے جو جزئی تفصیلات فقہ کی قدیم کتابوں میں مذکور ہیں ان پر چنداں انحصار کرنے کی ضرورت نہیں ہے،

اطاعت امام: جنگ کو ایک ضابطہ کے تحت لانے کے سلسلہ میں اسلام کا پہلا کام یہ تھا کہ اس نے فوجی نظام میں مرکزیت پیدا کی، اور فوج میں سمع و طاعت کا زبردست قانون جاری کیا [illegible] عہد حرب میں دین اور اہم ترین قاعدہ یہ ہے کہ کوئی خفیف سے خفیف جنگی کارروائی بھی امام کی اجازت کے بغیر نہیں کی جا سکتی، دشمن کو قتل کرنا، اس کے مال پر قبضہ کر لینا اس کو قید کرنا، اس کے جنگی آلات کو برباد کر دینا، فی نفسہ جائز ہونے کے باوجود ایسی حالت میں سخت ناجائز بلکہ گناہ ہو جاتا ہے، جب کہ امام کے حکم و اجازت کے بغیر ایسا کیا جائے، جنگ بدر سے پہلے جب عبد اللہ بن جحشؓ نے آنحضرت صلعم کی اجازت کے بغیر قریش کی ایک

جماعت سے جنگ کی تھی اور کچھ مالِ غنیمت ہاتھ آئے تھے، تو اس پر حضرت سعدؓ نے سخت ناخوشی کا اظہار کیا، اور ان کے مالِ غنیمت کو ناجائز قرار دیدیا تھا، اور صحابہؓ کی جماعت نے ان کو یہ کہکر ملامت کی تھی کہ صنعتم مالم تومروا بہ، "تم نے وہ کام کیا ہے، جس کا تمھیں حکم نہیں دیا گیا تھا"، حضرت خالدؓ بنی جذیمہ کی طرف دعوتِ اسلام کے لئے بھیجے گئے، اور وہاں انھوں نے امام کی اجازت کے بغیر ایک غلط فہمی کی بنا پر قتل کا بازار گرم کردیا، اس کی اطلاع جب رسول اکرمؐ کو ہوئی تو آپؐ شدتِ غضب سے بیتاب ہوکر کھڑے ہوگئے، اور فوراً حضرت علیؓ کو یہ حکم دے کر بھیجا کہ اجعل امر الجاهلية تحت قدميك "تم اس جاہلیت کے کام کو جاکر مٹاؤ"۔

اسلام نے اطاعتِ امام کو خود خدا اور رسول کی اطاعت کے برابر ضروری قرار دیا ہے اور امام کی نافرمانی کو وہی درجہ دیا ہے جو رسولِ خدا کی نافرمانی کا ہے، حدیث میں ہے:

الغزو غزوان، فاما من ابتغى وجه الله واطاع الامام وانفق الكريمة واجتنب الفساد فان نومه ونبهه اجر كله، واما من غزا رياءً وسمعةً وعصى الامام وافسد في الارض فانه[سه] لا يرجع بالكفاف

لڑائیاں دو قسم کی ہیں جس شخص نے خاص خدا کی خوشنودی کے لئے جنگ کی، امام کی اطاعت کی، اپنا بہترین مال خرچ کیا، اور فساد سے پرہیز کیا، اس کا سونا اور جاگنا سب اجر کا مستحق ہے، اور جس نے دکھاوے اور شہرت کے لئے جنگ کی، امام کی نافرمانی کی اور زمین میں فساد پھیلایا تو وہ برابر بھی نہ چھوٹے گا،

ایک دوسری حدیث میں ہے:

من اطاعني فقد اطاع الله ومن عصاني فقد عصى الله ومن يطع الامير فقد اطاعني ومن يعص الامير فقد عصاني،

جس نے میری اطاعت کی اس نے خدا کی اطاعت کی اور جس نے مجھ سے نافرمانی کی اس نے خدا سے نافرمانی کی، پھر جس نے میرے امیر کی اطاعت کی اس نے میری اطاعت کی اور جس نے میرے امیر کی نافرمانی کی اس نے گویا خود مجھ سے نافرمانی کی

سه نسائی جلد ثانی ص ۴۳

ان تاکیدی احکام نے جنگ میں یک باقاعدگی پیدا کردی، اور وہ محض ایک خونی کھیل نہیں رہی کہ فوج کا ہر سپاہی فرداً فرداً لوگوں کی جان و مال کا مختار و رقتل و غارت گری کا مجاز ہو، اسلام سے پہلے فوجوں کے سپاہی آزادی کے ساتھ لوٹ مار کیا کرتے تھے، اور غنیم کے ملک میں گھسنے کے بعد ہر سپاہی کو اختیار ہوتا تھا کہ جس کو چاہے قتل کرے، جسے چاہے لوٹ لے، جس گاؤں اور جس کھیتی کو چاہے جلا دے، اور دشمن قوم کو تباہ و برباد کرنے کے لئے جو جی میں آئے کرے، خود سکندر کی فوج بھی جس کا ڈسپلن بہت مشہور ہے، اس کلیہ سے مستثنیٰ نہ تھی، ایران میں چشننہ فی کرتے وقت اس کے سپاہیوں نے جس آزادی کے ساتھ ملک کو تباہ کیا تھا اس کے حالات تاریخوں میں محفوظ ہیں، لیکن اسلام نے فوج کے لئے جو قواعد وضوابط مقرر کئے ان میں افرادِ فوج کو اس قسم کی آزادی دینے سے قطعاً انکار کردیا، کیونکہ اسلام کے نزدیک انسانی خون بہانے کی ذمہ داری ایک بہت بڑی ذمہ داری ہے، جس کا نہ ہر شخص متحمل ہوسکتا ہے، اور نہ ہر شخص اس کے موقع ومحل اور ضرورت وعدمِ ضرورت کا فیصلہ کرسکتا ہے، اسلامی قانون میں جنگ کے تمام اعمال کی ذمہ داری اور امر و نہی کے تمام اختیارات کا حامل ایک "امیر" کو بنایا گیا ہے اور فوج پر اس کی کامل اطاعت فرض کردی گئی ہے، یہاں تک کہ کسی سپاہی کو اتنا اختیار بھی نہیں دیا گیا ہے کہ امیر کی اجازت کے بغیر دشمن کی سرزمین سے کسی درخت کے پھل توڑ کر کھائے۔

وفائے عہد اسلامی قانون نے جنگ اور صلح دونوں حالتوں میں وفائے عہد کی سخت تاکید کی ہے، حقیقتہً اخلاقیاتِ اسلام کے قواعدِ اصلیہ میں سے ایک یہ بھی ہے، کہ انسان کو سخت سے سخت ضرورت کی حالت میں بھی اپنے عہد پر قائم رہنا چاہئے، بدعہدی سے خواہ کتنا ہی بڑا فائدہ پہونچتا ہو، اور وفائے عہد سے کتنا ہی شدید نقصان پہونچنے کا اندیشہ ہو، اسلام بہرصورت اپنے پیروؤں کو تاکید کرتا ہے، کہ اس فائدے کو چھوڑ دیں اور اس نقصان کو برداشت کریں، کیونکہ نہ بدعہدی کا کوئی بڑے سے بڑا فائدہ اس نقصان کی تلافی کرسکتا ہے جو اس سے انسان کے اخلاق و روحانیت کو پہونچتا ہے، اور نہ وفائے عہد کا کوئی بڑے سے بڑا نقصان اس اخلاقی و روحانی فائدے کو کم کرسکتا ہے، جو اس کے ساتھ توام ہے، یہ قاعدہ

کلیہ جس طرح انفرادی و شخصی زندگی پر حاوی ہے اسی طرح اجتماعی و قومی زندگی پر بھی حاوی ہے، آج کل دنیا میں یہ دستور ہو گیا ہے کہ جن کاموں کو ایک شخص اپنی ذاتی حیثیت میں سخت شرمناک سمجھتا ہے، انھیں ایک قوم اپنی اجتماعی حیثیت میں بے تکلف کر گذرتی ہے اور اسے کوئی عیب نہیں سمجھتی، سلطنتوں کے مدبرین اپنی ذاتی حیثیت میں کیسے ہی اخلاق فاضلہ و تہذیب کاملہ کے مالک ہوں مگر اپنی سلطنت کے فائدے اور اپنی قوم کی ترقی کے لئے جھوٹ بولنا، بے ایمانی کرنا، عہد توڑ دینا وعدہ خلافیاں کرنا، بالکل جائز سمجھتے ہیں، اور بڑی بڑی مدعی تہذیب سلطنتیں ایسی بیباکی کے ساتھ یہ حرکات کرتی ہیں کہ گویا یہ کوئی عیب ہی نہیں ہے، لیکن اسلام اس معاملہ میں، فرد اور جماعت، رعیت اور حکومت، شخص اور قوم میں کوئی امتیاز نہیں کرتا، اور بدعہدی کو ہر حال میں ہر غرض کے لئے ناجائز قرار دیتا ہے، خواہ وہ شخصی فائدے کے لئے ہو یا قومی فائدے کے لئے،

واوفوا بعھد اللہ اذا عاھدتم ولا تنقضوا الایمان بعد توکیدھا وقد جعلتم اللہ علیکم کفیلا، ان اللہ یعلم ما تفعلون ولا تکونوا کالتی نقضت غزلھا من بعد قوۃ انکاثا تتخذون ایمانکم دخلا بینکم ان تکون امۃ ھی اربی من امۃ (۱۶: ۱۳)

اللہ کے عہد کو پورا کرو جب کہ تم کسی سے معاہدہ کرو اور اپنی قسموں کو مضبوط کرنے اور اللہ کو اپنا ضامن کرنے کے بعد نہ توڑو، جو کچھ تم کرتے ہو اللہ کو اس کا حال بالیقین معلوم ہے، تم اس عورت کی طرح نہ بن جاؤ جس نے اپنا ہی کاتا ہوا تاگا محنت سے کاتنے کے بعد ٹکڑے ٹکڑے کر دیا، تم اپنی قسموں کو باہم دغا کے طور پر استعمال کرتے ہو تاکہ ایک قوم دوسری قوم سے مال و عزت میں بڑھ جائے۔

اس مضمون کی آیات قرآن مجید میں بکثرت آئی ہیں، یہاں ان سب کا احاطہ مقصود نہیں ہے، احکام کی تصریح کے لئے صرف چند آیات نقل کی جاتی ہیں :-

الذین یوفون بعھد اللہ ولا ینقضون المیثاق والذین یصلون ما امر اللہ بہ ان یوصل ...... اولئک

جو لوگ اللہ کے عہد کو پورا کرتے ہیں اور عہد و پیمان کو نہیں توڑتے۔ اور اللہ نے جس رشتہ کو جوڑنے کا حکم دیا ہے اسے قائم رکھتے ہیں ...... ان کے لئے انجام

لهم عقبى الدار (۱۳ : ۲۲)

انجام ہے،

بلیٰ من اوفیٰ بعهده واتقیٰ فان الله یحب المتقین ان الذین یشترون بعهد الله ثمناً قلیلاً اولئک لا خلاق لهم فی الاخرة ولا یکلمهم الله ولا ینظر الیهم یوم القیامة ولا یزکیهم ولهم عذاب عظیم (۳ : ۸)

ہاں! جس شخص نے اپنا عہد پورا کیا اور پرہیزگاری اختیار کی سو اللہ پرہیزگاروں کو پسند کرتا ہے، اور جو لوگ عہد کو تھوڑی قیمت پر بیچ ڈالتے ہیں، ان کے لئے آخرت میں کوئی عزت نہیں ہے، اللہ ان سے نہ کلام کرے گا نہ قیامت کے دن ان کی طرف توجہ کرے گا، اور نہ ان کو پاکیزگی بخشے گا، ان کے لئے بڑا عذاب ہوگا،

والموفون بعهدهم اذا عاهدوا والصابرین فی البأساء والضراء وحین البأس اولئک الذین صدقوا واولئک هم المتقون (۲ : ۱۷۷)

اور وہ لوگ جو عہد کرنے کے بعد اسے پورا کرتے ہیں اور وہ جو سختی و تکلیف اور جنگ کی مصیبت میں ثابت قدم رہتے ہیں، وہی سچے لوگ ہیں، اور وہی پرہیزگار ہیں،

واذا قلتم فاعدلوا ولو کان ذا قربیٰ وبعهد الله اوفوا ذٰلکم وصاکم به لعلکم تذکرون (۲ : ۱۶)

جب تم بولو تو انصاف کی بات بولو، خواہ وہ شخص جس کے خلاف تم کہہ رہے ہو تمہارا عزیز ہی کیوں نہ ہو، اور اللہ کے عہد کو پورا کرو، اللہ نے اس کی تم کو نصیحت کی ہے شاید کہ تم نصیحت پکڑو،

واوفوا بالعهد ان العهد کان مسئولا (۱۷ : ۳۴)

عہد پورا کرو کیونکہ عہد کے بارے میں باز پرس ہوگی،

اس تعلیم کا جو عملی نمونہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی سیرت میں پیش کیا ہے اس کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ اسلام میں عہد کی کیا قیمت ہے، جنگ بدر میں جب کہ کفار کی تعداد مسلمانوں سے کہیں زیادہ تھی اور مسلمان اپنی جمعیت بڑھانے کے لئے ایک ایک آدمی کے حاجت مند تھے، حذیفہ بن الیمان اور ان کے والد حسیل بن جابر لشکر اسلام کی طرف روانہ ہوئے، راستہ میں کفار نے ان کو روک لیا اور کہا کہ تم ضرور محمدؐ کی مدد کو

جا رہے ہو، انھوں نے کہا کہ نہیں ہم تو مدینہ کا ارادہ رکھتے ہیں۔ ان کفار نے ان سے یہ عہد لیکر چھوڑ دیا کہ جنگ میں شریک نہ ہوں گے، یہ دونوں کفار سے چھوٹ کر بدر کے میدان میں آنحضرت صلعم کے پاس پہونچے اور یہ قصہ دہرایا، آپ نے سنکر حکم دیا کہ "انصرفا نفی لھم بعھدھم ونستعین اللہ علیھم"، "تم مدینہ چلے جاؤ، ہم عہد کو پورا کریں گے، اور ان کے مقابلہ میں اللہ سے مدد مانگیں گے"

صلح حدیبیہ میں جو شرائط کفار قریش سے طے ہوئی تھیں ان میں سے ایک یہ بھی تھی کہ اگر مکہ سے کوئی شخص بھاگ کر مسلمانوں کے پاس جائیگا تو مسلمان اس کو واپس کر دیں گے، اور اگر مسلمانوں کا کوئی آدمی مکہ جائیگا تو اسے واپس نہ کیا جائیگا، یہ معاہدہ ابھی لکھا ہی جا رہا تھا کہ ابو جندل بن سہیل کفار مکہ کی قید سے کسی طرح چھوٹ کر لشکر اسلام میں پہونچ گئے، پاؤں میں بیڑیاں تھیں، بدن پر مار کے نشان تھے، چہرے پر شدید مصائب کے آثار ہویدا تھے، رسول اللہ صلعم کے سامنے آکر فریاد کی کہ اللہ مجھکو اس مصیبت سے نکالئے، مسلمان ان کی یہ حالت دیکھکر بے چین ہو گئے، چودہ سو تلواریں رسول اللہ صلعم کے اشارہ کی منتظر تھیں اور اسلامی اخوت ایک مسلمان بھائی کو قید سے چھڑانے کے لئے مضطرب تھی، مگر شرائط صلح طے ہو چکی تھیں، معاہدہ لکھا جا رہا تھا، اس لئے اللہ کے رسول صلعم نے ابو جندل کو چھڑانے سے صاف انکار کر دیا، اور فرمایا تو یہ فرمایا:-

"ابو جندل صبر کر، اللہ تیرے لئے رہائی کی کوئی صورت ضرور نکالے گا"

مدینہ واپس ہوئے تو ایک اور صحابی ابو بصیر کفار مکہ کی قید سے چھوٹ کر آپ کے پاس پہونچے، اور ان کے پیچھے پیچھے کفار بھی دو آدمی لیکر پہونچ گئے جنھوں نے حاضر ہو کر ابو بصیر کی واپسی کا مطالبہ کیا، رسول اکرم کو معلوم تھا کہ مکہ میں مسلمانوں کے ساتھ کیسا ظالمانہ سلوک ہوتا ہے، اور خصوصاً بھاگ کر جانے والے قیدی کے ساتھ کیا برتاؤ ہوگا، مگر پاس عہد سب پر مقدم تھا، آپ نے مظلوم مسلمان کو ظالموں کے حوالہ کر دیا، اور عہد کو توڑنا پسند نہ کیا۔

اس قسم کے بے شمار واقعات عہد رسالت اور عہد صحابہؓ کی تاریخ میں ملتے ہیں جنکا احاطہ یہاں مشکل ہے،

غیر جانبداروں کے حقوق۔ اسلام میں غیر جانبداری (NEUTRALITY) کی

اصطلاح نہیں ہے بلکہ اس کو معاہدہ کے ذیل میں داخل کیا گیا ہے۔ اسلامی قانون تمام غیر قوموں کو دو جماعتوں میں تقسیم کرتا ہے۔ ایک وہ جن سے معاہدہ ہے، اور دوسرے وہ جن سے معاہدہ نہیں ہے۔ معاہدین جب تک شرائط معاہدہ پر قائم رہیں گے ان کے ساتھ شرائط کے مطابق معاملہ کیا جائیگا اور جنگ میں ان سے کسی قسم کا تعرض نہ کیا جائیگا، یہی غیر جانبداری اور نیوٹریلیٹی کا مفہوم ہے۔ باقی رہے غیر معاہدین، سو خواہ ان سے عملاً جنگ ہو، یا نہ ہو، حکماً وہ برسرِ جنگ سمجھے جائیں گے، کیونکہ غیر قوموں سے موادعت اور عدمِ موادعت کے بیچ میں کوئی درمیانی حالت اسلام نے تسلیم نہیں کی ہے۔

معاہدین کے ساتھ تمام معاملات شرائطِ معاہدہ کے تابع ہوں گے، مگر اسلام نے مسائلِ جنگ میں معاہدین کے لئے چند اصولی حقوق متعین کر دیے ہیں، جو حسبِ ذیل ہیں:-

(۱) جب تک معاہد قوم عہد پر قائم رہے، اس کے ساتھ کسی قسم کا تعرض کرنا مسلمانوں کے لئے سخت ممنوع ہے،

الا الذین عاھدتم من المشرکین ثم لم ینقصوکم شیئا ولم یظاھروا علیکم احدا فاتموا الیھم عھدھم الی مدتھم ان اللہ یحب المتقین	مگر وہ مشرکین جنسے تم نے معاہدہ کیا تھا، اور جنھوں نے وفائے عہد میں کوئی کمی نہیں کی، اور تمھارے خلاف کسی کو مدد دی ان کے ساتھ مدت معاہدہ کے ختم ہونے تک تم عہد پر قائم رہو کیونکہ اللہ پرہیزگاری کو پسند کرتا ہے،

(۲) اگر مسلمانوں کی کوئی جماعت کسی معاہد قوم کے ملک میں آباد ہو، اور وہاں اس پر ظلم ہوتا ہو، تو اسلامی حکومت ان مسلمانوں کی حمایت نہیں کر سکتی،

وان استنصروکم فی الدین فعلیکم النصر الا علی قوم بینکم وبینھم میثاق، واللہ بما تعملون بصیر (۸: ۱۰)	دارالکفر کے رہنے والے مظلوم مسلمان اگر تم سے مدد مانگیں تو ان کی مدد تم پر فرض ہے، مگر اس موقع کے خلاف مدد نہیں دینی چاہیئے جس سے تمھارا معاہدہ ہو، جو کچھ تم کرتے ہو اللہ اسے خوب دیکھتا ہے،

(۳) حالتِ جنگ میں معاہد قوم کے حدود پر کسی قسم کا تجاوز کرنا جائز نہیں ہے۔ اگر دشمن بھاگ کر کسی ایسی قوم کے حدود میں پناہ لے تو اسلامی فوج وہاں اس کا تعاقب نہیں کر سکتی،

فان تولوا فخذوھم واقتلوھم حیث وجدتموھم ولا تتخذوا منھم ولیاً ولا نصیرا، الا الذین یصلون الی قوم بینکم وبینھم میثاق (۴: ۱۲)

اگر وہ باز نہ آئیں تو انھیں پکڑو اور جہاں پاؤ مار دو اور ان کو دوست اور مددگار نہ بناؤ، سوائے ان لوگوں کے جو کسی ایسی قوم سے جا ملیں جس سے تمھارا معاہدہ ہو۔

یہ قواعد کلیہ غیر جانبداری کے قانون کی بنیاد ہیں، ان سے جزئی احکام حسب ضرورت مستنبط کئے جا سکتے ہیں۔

اعلان جنگ، جب کوئی قوم شرائط معاہدہ کی خلاف ورزی کرے، اور اسلامی حکومت کے خلاف معاندانہ رویہ اختیار کرے، تو اس کے متعلق اسلامی قانون یہ ہے کہ اس کو باضابطہ الٹی میٹم دیا جائے، اور ایفاے عہد کے لئے کافی مہلت دینے کے بعد جنگ چھیڑی جائے۔

واما تخافن من قوم خیانة فانبذ الیھم علی سواء (۸: ۷)

اگر تمھیں کسی قوم سے خیانت وبدعہدی کا خوف ہو تو ان کا معاہدہ برابری کو ملحوظ رکھکر ان کی طرف پھینک دو۔

برابری کو ملحوظ رکھکر معاہدہ کو پھینک دینے کا مطلب مفسرین نے یہ بیان کیا ہے کہ ان کو صاف طور پر مطلع کر دیا جائے، کہ تمھارے معاندانہ افعال، ایسے ہیں جس کی بنا پر ہمارا تمھارا معاہدہ باقی نہیں رہا۔ اس کے بعد دیکھا جائے کہ وہ اپنے افعال سے باز آتے ہیں یا نہیں، اگر وہ پھر بھی باز نہ آئیں تو ان کے خلاف جنگ چھیڑ دیجائے۔ علامہ ابن حجر کہتے ہیں کہ:-

ای اطرح الیھم عھدھم وذالک بان یرسل الیھم من یعلمھم بان العھد قد انتقض

یعنی ان کا معاہدہ ان کی طرف پھینک دو، اور یہ اس طرح کہ انھیں کسی کے ہاتھ کہلا بھیجو کہ عہد ٹوٹ چکا۔

علامہ ابن کثیر لکھتے ہیں:-

ای اعلمھم بانک قد نقضت عھدھم حتی یبقی علمک وعلمھم بانک حرب لھم وھم حرب لک وانہ لا عھد بینک وبینھم علی السواء

یعنی ان کو خبر کر دو کہ تم نے معاہدہ فسخ کر دیا ہے تاکہ علم میں تم اور وہ برابر ہو جائیں کہ تم ان کے دشمن اور وہ تمھارے دشمن ہو گئے، اور اب تمھارے اور ان کے درمیان کوئی عہد باقی نہیں رہا۔

ای نستوی انت وہم فی ذالک

زہری کا قول ہے:-

اذا عاہدت قوماً فخشیت منھم جب تمہارا کسی قوم سے عہد ہو اور تمہیں اس سے نقض عہد النقض فلا توقع بھم بحیار ذالک کا خوف ہو جائے، تو یہ خوف ہونے کے ساتھ ہی ان پر حتی تعلمھم نہ ٹوٹ پڑو، بلکہ پہلے ان کو خبردار کردو،

فقہائے مجتہدین نے صرف اطلاع دینے کو بھی کافی نہیں سمجھا ہے، بلکہ اس نقض عہد کرنے والی قوم کو ایک سال تک مہلت دینے کی بھی سفارش کی ہے تاکہ اگر وہ اپنے معاندانہ رویہ کی اصلاح کرنا چاہیں تو کرلیں اور جنگ سے احتراز ممکن ہو تو یہ امکان ضایع نہ جائے، اس باب میں اسلامی قانون کی صحیح اسپرٹ صدر اول کے ایک واقعہ سے معلوم ہوسکتی ہے، جسمیں خوش قسمتی سے ہم کو بہت سے اکابر فقہا کے فتوے ملتے ہیں، عبدالملک بن صالح کے ایام ولایت میں جب قبرس کے لوگوں نے بدعہدی کی تو اس نے لیث بن سعد، مالک بن انس، سفیان بن عیینہ موسیٰ بن اعین، اسمعیل بن عیاش، یحیٰ بن حمزہ، ابو اسحٰق فزاری، وغیرہ ممتاز فقہا سے استفسار کیا کہ فانبذ الیھم علیٰ سواء کا حکم اس معاملہ میں جاری ہوسکتا ہے یا نہیں؟ اور ہوسکتا ہے تو کس صورت سے؟ اس پر فقہا نے جو جواب دیئے ان میں سے چند یہاں نقل کئے جاتے ہیں:

لیث بن سعد نے لکھا:-

"ان کو ایک سال کی مہلت دیجائے تاکہ باہم مشورہ کرلیں، جو کوئی ذمی بنکر بلاد مسلمین میں آنا چاہے، یہاں آجائے، جو بلاد روم کی طرف ہجرت کرنا چاہے، وہ وہاں چلا جائے، اور جو قبرس ہی میں رہکر رہنا چاہے اس سے تم لڑنے کے حق دار ہو،"

امام مالک نے لکھا:-

"میری رائے میں فسخ معاہدہ میں جلدی نہ کرنی چاہئے، بلکہ ان پر اتمام حجت کرلینا چاہئے، اللہ کہتا ہے، فاتموا الیھم عھدھم الی مدتھم، پس اگر وہ تمہارے ڈھیل دینے پر بھی باز نہ آئیں اور بے وفائی پر اصرار کریں، اور تم دیکھو کہ غدر ان پر ثابت ہے تو پھر تمھیں اختیار ہے کہ ان پر حملہ کردو،"

موسیٰ بن اعین نے لکھا:۔

"اس سے پہلے جب کبھی ایسے واقعات پیش آئے ہیں تو حکام نے ہمیشہ مہلت دی ہے بہت ممکن ہے کہ اہلِ قبرص کے عوام اس فعل میں نہ شریک ہوں جو ان کے خواص کر رہے ہیں" اس لئے میری یہ رائے ہے کہ ان سے عہد قائم رکھا جائے" اور شرائطِ صلح پوری کیجائیں گو ان میں کچھ مفسد لوگ موجود ہیں"۔

اس بارے میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا بھی یہی فیصلہ ہے کہ عہد شکنی کرنے والے معاہدین کو کافی مہلت دینی چاہیے" ان کے عہدِ خلافت میں عمیر بن سعد نے لکھا کہ ہمارے علاقہ میں عربسوس ایک مقام ہے جہاں کے لوگ دشمن کو ہماری خفیہ خبریں پہونچاتے ہیں اور ہم کو دشمن کی خبریں نہیں دیتے" اس پر حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ان کو لکھا کہ پہلے تم ان سے جا کر کہو کہ ہم تم کو ایک بکری کی جگہ دو بکریاں" اور ایک گائے کی جگہ دو گائیں" اور اسی طرح ہر چیز کے عوض دوگنی چیز دیں گے تم اس جگہ کو چھوڑ دو" اگر وہ مان جائیں تو بہتر ورنہ ان کو مطلع کر دو کہ ہمارا تمھارا عہد ختم ہوا" پھر انھیں ایک سال کی مہلت دو" اور اس مدت کے ختم ہونے پر انھیں وہاں سے نکال دو۔[1]

اسیرانِ جنگ، اوپر ذکر ہو چکا ہے کہ اسلام نے اسیرانِ جنگ کو قتل کرنے کی ممانعت کی ہے لیکن اسلامی قانون میں ان کے لئے صرف اتنی ہی رعایت نہیں ہے کہ وہ قتل نہ کئے جائیں بلکہ مزید برآں ان کے ساتھ انتہا درجہ کی نرمی و ملاطفت کا بھی حکم دیا ہے۔ قرآن مجید میں اسیر و مسکین و یتیم کو کھانا کھلانے کی تعریف آئی ہے۔ اور اسے نیکوکاروں کا فعل قرار دیا گیا ہے

ویطعمون الطعام علی حبہ مسکینا ویتیما واسیرا، انما نطعمکم لوجہ اللہ لا نرید منکم جزاءً ولا شکورا، انا نخاف من ربنا یوما عبوسا قمطریرا (۷۶ : ۸)

وہ خاص اللہ کی خوشنودی کے لئے مسکین اور یتیم اور اسیر کو کھانا کھلاتے ہیں۔ اور کہتے ہیں کہ ہم تو محض اللہ کے لئے تمھیں کھلاتے ہیں۔ کسی جزا یا شکریہ کے خواستگار نہیں ہیں ہم تو صرف اس تنگی کے دن سے ڈرتے ہیں جس میں شدتِ تکلیف سے چہرے بگڑ جائیں گے۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم سبایا اور رقار کے بارے میں ہمیشہ حسن سلوک کی نصیحت فرماتے

[1] فتوح البلدان بلاذری ص ۲۳ - ۲۲۔

تھے جنگ بدر میں جب وہ لوگ پکڑے ہوئے آئے جنھوں نے ۱۳ برس تک آپ کو اور مسلمانوں کو تکلیفیں دے دے کر جلاوطنی پر مجبور کیا تھا، تو آپ نے صحابہؓ کو تاکید فرمائی کہ ان کے ساتھ فیاضی کا برتاؤ کریں۔ اس حکم کی تعمیل صحابہؓ نے اس طرح کی کہ ان کو اپنے سے اچھا کھانا کھلایا اور اپنے سے زیادہ آرام دیا بعض صحابہؓ خود کھجوریں کھاتے تھے اور قیدیوں کو روٹی سالن کھلاتے تھے قیدیوں کے پاس کپڑا نہ رہے تو رسول اللہ صلعم نے اپنے پاس سے ان کو کپڑے پہنائے حالانکہ وہ وقت مسلمانوں پر بے انتہا تنگی کا تھا، ان قیدیوں میں سے ایک شخص سہیل بن عمرو بڑا فصیح اللسان تھا، اور رسول اللہ صلعم کے خلاف زہریلی تقریریں کیا کرتا تھا حضرت عمرؓ نے مشورہ دیا کہ اس کے دانت توڑ دیئے جائیں، مگر آنحضرت صلعم نے فرمایا کہ، اگر میں اس کا مثلہ کروں گا، تو اللہ میرا مثلہ کریگا، کچھ مدت قید رکھنے کے بعد آنحضرت صلعم نے آخر کار ان سب قیدیوں کو فدیہ لیکر رہا کردیا۔

۷۔ اسیران جنگ بدر کے فدیہ کے متعلق احادیث اور تفسیر کی کتابوں میں یہ واقعہ نقل کیا گیا ہے کہ جب یہ لوگ قید ہو کر آئے تو آنحضرت صلعم نے صحابہؓ سے مشورہ لیا کہ ان کے معاملہ میں کیا کیا جائے؟ یہ وہ وقت تھا کہ مہاجرینؓ کے دلوں پر ان کے مظالم کے زخم تازہ تھے، دو برس پہلے انھیں لوگوں نے ان کو مکہ سے نکالا تھا، اور اب اس لئے ان پر چڑھ کر آئے تھے کہ انھیں مدینہ میں بھی چین سے نہ بیٹھنے دیں، اس وجہ سے اکثر طبیعتوں میں ان کے خلاف سخت نفرت تھی۔ علاوہ ازیں اس وقت مسلمانوں کی جمعیت بھی بہت تھوڑی تھی، کفار ان سے کئی گنی زیادہ طاقت لیکر میدان میں آئے تھے، اور ان کی تعداد میں ایک ایک آدمی کا اضافہ بھی مسلمانوں کے لئے مہلک تھا، اس لئے قدرتی طور پر مسلمان یہ چاہتے تھے، کہ جہاں تک ممکن ہو دشمن کی قوت کو توڑا جائے، اور یہ ۷۰ آدمی جو ان میں سے کم ہو گئے ہیں، دوبارہ ان سے مل کر ان کی فوجی قوت میں اضافہ نہ کرسکیں، تیسری بات یہ تھی کہ اس وقت مسلمانوں پر فاقوں پہ فاقے گذر رہے تھے، اور ان کے پاس خود اپنا پیٹ بھرنے کے لئے بھی کافی سامان موجود نہ تھا، اس لئے اسیران جنگ کو اختتام جنگ تک قید رکھنا اور ان کی خوراک کا بندوبست کرنا ان کی قدرت سے باہر تھا۔ ان تمام امور کو مدنظر رکھکر حضرت عمرؓ نے یہ رائے دی کہ ان کو قتل کردیا جائے، عبداللہ بن رواحہؓ نے کہا کہ گھنی جھاڑی میں آگ لگا کر ان کو اسمیں پھینک دیا جائے، مگر حضرت ابوبکرؓ نے کہ سراسر لطف و رحم تھے اس کے خلاف یہ رائے دی کہ انھیں معاف کردیا جائے، یہ مختلف رائیں سننے کے بعد رسول اللہ صلعم نے فرمایا کہ، اللہ بعض

اسیران جنگ کے متعلق اسلام کا قانون یہ ہے کہ اختتام جنگ پر انھیں یا تو بلا فدیہ کے چھوڑ دیا جائے، یا فدیہ لیکر رہائی دیدیجائے،

فاذا لقیتم الذین کفروا فضرب الرقاب حتی اذا اثخنتموھم فشدوا الوثاق فاما منا بعد واما فداء (۴۷: ۴)

جب کافروں سے تمہاری مڈبھیڑ ہو تو پہلے قتل کرو، یہاں تک کہ جب ان کو مغلوب کر لو تو پھر قید کی بندش مضبوط کرو، اس کے بعد تمھیں اختیار ہے کہ چاہے احسان کر کے چھوڑ دو، یا فدیہ لیکر رہا کر دو۔

اس آیت کے مطابق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اکثر فدیہ لئے بغیر ہی اسیران جنگ کو

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۳۷) لوگوں کے دلوں کو اتنا نرم کر دیتا ہے کہ دودھ کی طرح ہو جاتے ہیں، اور بعض کے دلوں کو اتنا سخت کر دیتا ہے کہ پتھر بن جاتے ہیں، ابوبکرؓ کی مثال ابراہیمؑ اور عیسیٰؑ کی سی ہے، اور عمرؓ کی مثال نوحؑ کی سی، پھر آپؐ نے یہ فیصلہ کیا کہ نہ تو انھیں قتل کرو اور نہ معاف کرو بلکہ فدیہ لیکر رہا کر دو، چنانچہ ان سے فدیہ قبول کر لیا گیا،

روایت مشہور کے مطابق اس پر عتاب الٰہی نازل ہوا اور یہ آیت اتری کہ:-

ما کان لنبی ان یکون لہ اسریٰ حتیٰ یثخن فی الارض، تریدون عرض الدنیا واللہ یرید الاخرۃ واللہ عزیز حکیم، لولا کتاب من اللہ سبق لمسکم فیما اخذتم عذاب عظیم (۸: ۶۹)

نبی کے لئے یہ سزاوار نہیں ہے کہ اس کے پاس قیدی ہوں جب تک وہ اچھی طرح جنگ نہ کرے، تم محض دنیا کی دولت چاہتے ہو، اللہ آخرت کو چاہتا ہے اور وہی غالب حکمت والا ہے، اگر پہلے سے خدا کا نوشتہ نہ آچکا ہوتا تو جو کچھ تم نے لیا ہے اس پر بڑا عذاب نازل ہوتا۔

بخلاف اس کے اہل علم کی ایک قلیل جماعت اس طرف گئی ہے کہ یہ عتاب اسیروں سے فدیہ لینے پر نہ تھا بلکہ اس بات پر تھا کہ اسلامی اجازت سے پہلے مسلمانوں نے مال غنیمت لوٹنا شروع کر دیا تھا، چنانچہ امام ترمذی نے اپنی جامع کی کتاب التفسیر میں، امام ابو یوسف نے کتاب الخراج میں اور امام ابن جریر طبری نے اپنی تفسیر میں یہ بات نقل کی ہے کہ:-

فلما کان یوم بدر وقعوا فی الغنائم قبل ان تحل لھم فانزل اللہ لولا

جب بدر کا معرکہ ہوا تو مسلمان غنیمت کے حلال ہونے سے پہلے اس پر ٹوٹ پڑے، اس پر یہ آیت اتری کہ لولا کتاب

رہا کر دیا کرتے تھے جیسا کہ تنعیم میں مکہ کے ۸۰ آدمیوں نے لشکرِ اسلام پر حملہ کیا اور سب کے سب گرفتار ہو گئے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے انھیں پیش کیا گیا تو آپ نے سب کو فدیہ لئے بغیر چھوڑ دیا۔ یمامہ کا سردار ثمامہ بن اثال گرفتار ہو کر آیا اور اسے بھی بطریقِ احسان رہائی بخشی گئی اس سے وہ اتنا متاثر ہوا کہ مسلمان ہو گیا، تاہم بعض اوقات فدیہ بھی لے لیا کرتے تھے، خصوصاً تنگی و عسرت کی حالت میں۔

غلامی کا مسئلہ

اس سلسلہ میں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اسلام نے اسیرانِ جنگ کو لونڈی غلام بنا کر رکھنے کی جو اجازت دی ہے، اور جنگ سے پکڑی ہوئی عورتوں کے ساتھ تمتع کو جائز رکھا ہے اس کی کیا اصلیت ہے؟ اور اگر یہ مسئلہ فی الواقع اسلام میں موجود ہے تو یہ کہاں تک اس اسپرٹ کے مطابق ہے جو اسیرانِ جنگ کے متعلق "فاما منا بعد و اما فدا ء" کے قانون میں پیش کی گئی ہے؟ معترضین نے اس سوال کو جس رنگ میں پیش کیا ہے، اور اسلام کے بعض وکیلوں نے اس کا جو جواب دیا ہے، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ دونوں نے مسئلہ کی حقیقت اور اس کے مالہ وما علیہ پر پوری طرح غور نہیں کیا، یہ واقعہ ہے کہ اسلام میں "رسمی" کا قاعدہ موجود ہے اور یہ بھی واقعہ ہے کہ سبایا کو غلام بنا کر رکھنے اور لونڈیوں سے تمتع کرنے کی اجازت دی گئی ہے لیکن اس کی علت اور اصلیت کو سمجھنے کے لئے چند مقدمات کو ذہن نشین کر لینا ضروری ہے۔

اولاً، اس عہد کا یہ عام دستور تھا کہ اسیرانِ جنگ غلام بنا کر رکھے جاتے تھے اور ان کو دنیا میں سب سے بدتر درجہ کی مخلوق سمجھا جاتا تھا، عرب اور اس سے باہر دنیا کے مہذب ممالک میں بھی یہی دستور تھا، اور لوگ صدیوں سے غلاموں کے ساتھ یہی سلوک کرنے کے عادی تھے

یعنی شیخ محمد عبدہ، کتاب من اللہ سبق لمسکم فیما اخذتم عذاب عظیم، من اللہ، الآیہ،

بہر حال جو صورت بھی ہو، یہ امر متفق علیہ ہے کہ یہ آیت جنگِ بدر کے موقع پر اتری تھی اور اسی جنگ سے متعلق تھی، اس سے کوئی عام اور دائمی قانون بنانا مقصود نہ تھا، اسیرانِ جنگ کے متعلق اسلام کا اصلی قانون سورۂ محمد کی اس آیت میں بیان کیا گیا ہے جو متن میں درج ہے، کیونکہ اس کے الفاظ عام ہیں، کسی موقع کے ساتھ مخصوص نہیں ہے، آیت "ما کان لنبی" کے بعد نازل ہوئی ہے، اور رسول اللہ کا عمل بھی اسی پر رہا ہے، ورنہ اگر جنگِ بدر والی آیت کا حکم عام ہوتا تو کبھی کوئی اسیر رہا نہ کیا جاتا۔

اسلام کے لئے اس دستور کو دفعۃً موقوف کردینا مشکل تھا، اسلام کا عام اصول وقت کی ضرورت سے جنگ کرنا نہیں ہے، بلکہ وہ تدریجی اصلاح کا قائل ہے، شراب کی تحریم جس تدریج کے ساتھ ہوئی نماز میں سکون و وقار اور خاموشی کو جس تدریج کے ساتھ قائم کیا گیا، غنائم جنگ پر جس طرح رفتہ رفتہ پابندیاں عاید کی گئیں، اور ایسے ہی دوسرے تمام مسائل میں جس طرح تدریجی اصلاح کی گئی، اس سے اسلام کا طریقِ اصلاح اچھی طرح سمجھ میں آسکتا ہے غلامی کے مسئلہ میں بھی اس نے یہی طریقہ اختیار کیا ہے۔

ثانیاً۔ اس عہد میں اسیرانِ جنگ کے تبادلہ کا دستور نہ تھا، جب مسلمانوں کے آدمی دوسری قوموں کے پاس قید ہوتے تو غلام بنا کر رکھ لئے جاتے تھے، اس لئے مسلمانوں کے پاس بھی اس کے سوا کوئی چارہ کار نہ تھا، کہ دشمن قوموں کے جو لوگ گرفتار ہوکر آئیں انھیں وہ غلام بنا کر رکھ لیں، تاہم جہاں کہیں تبادلہ کا موقع آیا ہے، تو مسلمانوں نے اس کو خوشی کیساتھ منظور کیا ہے، فتح الباری میں علامہ ابن حجر لکھتے ہیں کہ اگر مسلمانوں کے پاس مشرکین کے قیدی ہوتے اور مشرکین کے پاس مسلمانوں کے قیدی ہوتے اور اپنے اپنے قیدیوں کو چھڑانے پر اتفاق ہوجاتا تو اس کا بندوبست کرلیا جاتا[1]، امام ابوحنیفہ، امام ابو یوسف، امام محمد، امام مالک، امام شافعی، امام احمد سب کے سب اس پر متفق ہیں کہ اگر دشمن مسلمان اسیروں سے اپنے اسیروں کا تبادلہ کرنے پر راضی ہو تو تبادلہ کرلینا چاہئے[2]، خود رسول کریمؐ سے تبادلۂ اساری کا ثبوت ملتا ہے، مسلم، ابوداؤد اور ترمذی نے یہ روایت نقل کی ہے کہ آنحضرت صلعم نے دو مسلمانوں کے بدلہ میں ایک دفعہ مشرکین کے ایک آدمی کو رہا کیا۔

ثالثاً۔ بعض اوقات لڑائیوں میں ایک شہر کے مردوں کا اکثر حصہ کام آجاتا تھا بلکہ کبھی کبھی ایسا ہوتا کہ ایک بستی کے تمام ہتھیار اٹھانے کے قابل آدمی قتل ہوجاتے تھے ایسی حالت میں لاوارث عورتوں اور بچوں کی پرورش کا انتظام اس کے سوا اور کسی صورت نہ ہوسکتا تھا، کہ خود فاتح قوم اس کی ذمہ داری اپنے سر لے۔ اور جب یہ کام فاتحین ہی کو کرنا تھا، تو عورتوں کی حفاظت اور سوسائٹی میں ان کی وقعت قایم رکھنے کے لئے اس سے بہتر صورت اور کیا ہوسکتی تھی کہ مسلمان مردوں کو ان سے ازدواجی تعلق قایم کرنے کی

[1] ج ۶ ص ۱۰۱
[2] فتح القدیر ج ۴ ص ۳۰۶۔

اجازت دیدیجاتی، اس صورت سے وہ اسلامی سوسائٹی کے رکن رکین بن سکیں، اور ان مفاسد کا دروازہ بند ہوگیا جو ہزاروں عورتوں کے بے شوہر رہجانے سے لازمی طور پر پیدا ہوتے۔

رابعاً۔ اسلام نے اسیرانِ جنگ کو غلام بنانے کی صرف اجازت دی ہے حکم نہیں دیا ہے۔ اس اجازت سے فائدہ اٹھانا یا نہ اٹھانا مسلمانوں کا اختیاری فعل ہے، بلکہ خلفائے راشدینؓ کے طرزِ عمل سے معلوم ہوتا ہے کہ فائدہ نہ اٹھانا افضل ہے، مصر، شام، عراق، افریقہ، آرمینیہ اور فارس کی فتوحات میں بیشمار مقامات عنوۃً فتح ہوئے، اور ان کے لاکھوں آدمی گرفتار کئے گئے، مگر ایک قلیل تعداد کے سوا کسی کو غلام نہیں بنایا گیا، متعدد مقامات پر ایسا ہوا ہے کہ کسی امیر فوج نے لوگوں کو غلام بنا لیا اور خلیفہ کو خبر ہوئی تو انھوں نے رہائی کا حکم دیدیا، بلاذری لکھتا ہے کہ "مصر کے بعض دیہات شدید مقابلہ کے بعد فتح ہوئے اور مسلمانوں نے انکے باشندوں کو غلام بنا کر حضرت عمرؓ کے پاس مدینہ بھیج دیا، لیکن حضرت عمرؓ نے ان کو رہا کر کے ان کے وطن کی طرف واپس کردیا، اور حکم فرمایا کہ انھیں بھی عام قبطیوں کی طرح ذمی بنایا جائے[1]،، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اسیرانِ جنگ کو غلام بنانا نہ ضروری تھا، نہ افضل و احسن، بلکہ تبادلۂ اساری کا دستور نہ ہونے کے باعث اس کو ایک ناگزیر برائی کے طور پر قبول کیا گیا تھا،

خامساً۔ اسلام نے صرف ان لوگوں کو غلام بنانے کی مجبوراً اجازت دی ہے جو جنگ میں پکڑے ہوئے آئیں، باقی رہا آزاد لوگوں کو پکڑ کر بیچنا جو زمانۂ قدیم میں عموماً رائج تھا، سو اس کو اسلام نے سختی کے ساتھ منع کیا ہے، حدیث میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا

ثلثۃ انا خصمھم یوم القیامۃ رجل اعطی بی ثم غدر ورجل باع حرا فاکل ثمنہ ورجل استاجر اجیرا فاستوفی منہ ولم یعطہ اجرہ	تین شخص ہیں جن کے خلاف قیامت میں میں خود مدعی ہونگا، ایک وہ جس نے میرا ذمہ دیکر بدعہدی کی دوسرا وہ جس نے آزاد انسان کو بیچا اور اس کی قیمت کھائی، تیسرا وہ جس نے کسی مزدور سے پورا پورا کام لیا اور اس کی مزدوری نہ دی؛
(بخاری کتاب البیوع)	

[1] بلاذری کے اصل الفاظ یہ ہیں:- فوقع سبایاھم بالمدینۃ فردھم عمر بن الخطابؓ وصیرھم وجماعۃ القبط اھل الذمہ (فتوح البلدان طبع مصر صفحہ ۲۲۳)

[illegible]

اہم مجبوریوں اور مصلحتوں سے جائز رکھا تھا، تاہم بہت ممکن تھا کہ اس طریقے کو مطلق جائز رکھنے سے مسلمانوں میں بھی غلامی کا وہی طریقہ رائج تھا، جو عرب جاہلیت اور روم و ایران وغیرہ ممالک میں رائج تھا، اور شاید ہندوستان کے شودروں کی طرح سالہا کی ایک نیچ ذات الگ بنجاتی۔

لیکن اسلام کا قاعدہ یہ ہے کہ جن امور میں وہ بلاواسطہ اصلاح کو مشکل پاتا ہے، ان کو قائم ضرور رکھتا ہے، مگر عملی حالت قایم نہیں رہنے دیتا، بلکہ بالواسطہ اصلاح کے ایسے طریقے اختیار کرتا ہے۔ جن سے اس کی تمام مضرتیں اور خرابیاں دور ہو جاتی ہیں، غلامی کے مسئلہ میں بھی اس نے یہی کیا، غلامی کو مٹانا چند در چند وجوہ سے مشکل تھا، اس لئے اس نے صورت کو باقی رکھا، اور بالواسطہ طریقوں سے مادہ کو اس طرح بدل دیا کہ وہ ایک شدید اجتماعی مضرت کے بجائے ایک شاندار انسانی منفعت بن گئی، اس غرض کے لئے اسلام نے بہت سے طریقے اختیار کئے، ہیں جنمیں سے تین اہم تر ہیں؛

۱۔ غلام کو آزاد کرنے، اور آزادی کے حصول میں اس مدد دینے کو بہت بڑا ثواب قرار دیا، اور ہر طریقہ سے اس کی ترغیب دی، قرآن مجید میں آیا ہے:۔

وما ادراک ما العقبة؟ فك — اور تو کیا جانتا ہے، کہ وہ نیکی کا دشوار گذار راستہ کون سا ہے

رقبة او اطعام فی یوم ذی — وہ یہ ہے کہ ایک گردن، یعنی غلام کی گردن، آزاد کیجائے

مسغبة یتیما ذا مقربة او مسکینا — یا بھوک کے دن میں کسی قریبی یتیم یا خاکسار مسکین کو

ذا متربة (۹۰:۱) — کھانا کھلایا جائے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ہمیشہ مختلف طریقوں سے اس کی فضیلت بیان فرمایا کرتے تھے جس سے مسلمانوں میں فک رقاب اور اعتاق عبید کا خاص شوق پیدا ہو گیا تھا، ایک دفعہ ایک اعرابی حاضر ہوا اور بولا کہ یا رسول اللہ صلعم کوئی ایسا عمل بتایئے جس سے میں جنت میں داخل ہو سکوں، آپ نے فرمایا اعتق النسمة وفك الرقبة، "غلام کو آزاد کر، اور گردن کو غلامی سے چھڑا"، ایک دوسری حدیث میں ہے کہ آپ نے فرمایا من اعتق رقبة مسلمة کانت فکاکه من النار عضوا بعضو، "جو کوئی کسی مسلمان غلام کو آزاد

کریگا، اس کا ہر عضو اس غلام کے ہر عضو کے بدلے دوزخ سے بچ جائے گا، ایک اور حدیث میں ہے کہ من اعتق نفسا مسلمۃ کانت فدیتہ من جہنم، "جس نے ایک نفس مسلمہ کو آزاد کیا تو وہ جہنم سے بچنے کے لئے اس کا فدیہ ہوگیا"، ایک مرتبہ امام زین العابدین نے یہ حدیث سنی کہ "جو شخص کسی غلام کو آزاد کریگا، اس کا ہر ہر عضو اس غلام کے ہر ہر عضو کے بدلے بخشا جائیگا"، آپ نے اسی وقت اپنے غلام مطرف کو جسے دس ہزار درہم میں خریدا تھا بلاکر آزاد کردیا،

غلاموں کو آزاد کرنے کا مزید شوق دلانے کے لئے آنحضرت صلعم نے یہ قاعدہ مقرر کیا کہ جتنا زیادہ قیمتی اور زیادہ پسندیدہ غلام آزاد کیا جائیگا، اتنا ہی زیادہ ثواب ہوگا، حضرت ابوذرؓ نے پوچھا ای الرقاب افضل؟ "کیسے غلام کو آزاد کرنا افضل ہے"؟ فرمایا اغلاھا ثمناً و انفسھا عند اھلھا، "وہ جس کی قیمت زیادہ ہو اور جو مالک کو زیادہ پسند ہو"، اسی طرح لونڈی کو عمدہ تربیت دیکر آزاد کرنے اور اس کا نکاح کردینے کو بڑی نیکی کا فعل قرار دیا، من کانت لہ جاریۃ ادبھا و احسن تعلیمھا و اعتقھا و تزوجھا کان لہ اجران "جس نے اپنی لونڈی کو اچھی طرح تعلیم و تربیت دیکر آزاد کیا اور اسے اپنے نکاح میں لے آیا اس کے لئے دوہرا ثواب ہوگا"

پھر مختلف گناہوں کے لئے جو کفارے مقرر کئے گئے ہیں، ان میں غلام آزاد کرنے کو بہترین کفارہ قرار دیا گیا ہے، کسوف شمس اور دوسرے مواقع پر بھی بردہ آزاد کرنے کو دفع بلیات کا ذریعہ بتایا گیا ہے، اور ہر طریقہ سے اعتاق عبید کی ہمت افزائی کی گئی ہے،

۲۔ دوسرا طریقہ یہ تھا کہ غلاموں کے ساتھ حسن سلوک اور نرمی و ملاطفت کی سخت تاکید کی گئی، رسول اکرم صلعم نے اپنی زندگی کے آخری لمحہ میں اپنی امت کو جو وصیت فرمائی تھی اس میں پہلے نماز کی تاکید تھی، اور اس کے بعد غلاموں سے حسن سلوک کی، الصلوۃ وما ملکت ایمانکم

ے نہایہ میں ہے کہ ما ملکت ایمانکم سے یہاں غلام ہی مراد ہیں، اور اس سے حضور کا مقصد احسان فی الرقیق کی تاکید فرمانا تھا، بعض لوگوں نے ما ملکت ایمانکم سے مراد زکوۃ بھی لی ہے مگر قول راجح یہی ہے کہ آپ نے دنیا سے رخصت ہوتے وقت عبادات میں نماز کی تاکید فرمائی اور معاملات میں غلاموں کے ساتھ حسن سلوک کی،

عہدِ جاہلیت سے دماغوں میں غلامی کا جو تصور جما ہوا تھا اس کے اثر سے کبھی کبھی صحابہ غلاموں
کے ساتھ برا سلوک بھی کر بیٹھتے تھے، اس پر رسول اکرم صلعم نے بارہا اپنے معزز ترین اور محبوب ترین
صحابیوں کو ڈانٹا ہے، معرور بن سوید نے ایک مرتبہ حضرت ابوذر غفاری کو دیکھا کہ جو جادر
وہ اوڑھے ہوئے ہیں ویسی ہی ان کے غلام کے بدن پر بھی ہے، پوچھا کہ اس کا کیا سبب ہے؟
انھوں نے جواب دیا کہ ایک مرتبہ میں نے ایک غلام کو گالی دی تھی، اس نے جا کر رسول اللہ
سے شکایت کی، رسول اللہ صلعم سنکر ناراض ہوئے، اور مجھے بلا کر فرمایا، ابوذر تم میں سے ابھی
تک جاہلیت کی بو نہیں گئی،

ان اخوانکم خولکم جعلھم اللہ یہ تمھارے بھائی تمھارے خادم ہیں جنھیں اللہ نے تمھارا
تحت ایدیکم فمن کان اخوہ دست نگر بنایا ہے، پس جس کسی کا بھائی اس کا ماتحت ہو
تحت یدہ فلیطعمہ مما یاکل اسے چاہئے کہ اس کو وہی کھلائے جو خود کھاتا ہے، اور وہی
ولیلبسہ مما یلبس، ولا تکلفوھم پہنائے جو خود پہنتا ہے، تم ان پر ان کی طاقت سے زیادہ
ما یغلبھم فان کلفتموھم فاعینوھم بوجھ نہ ڈالو، اور اگر ایسی کوئی بھاری خدمت ان کے سپرد
کرو، تو خود ان کا ہاتھ بٹاؤ،

ابو مسعود انصاریؓ کا بیان ہے کہ ایک مرتبہ میں اپنے غلام کو مار رہا تھا، یکایک
میں نے سنا کہ پیچھے سے کوئی کہہ رہا ہے، "اعلم ابا مسعود، للہ اقدر علیک منک علیہ"
"خبردار ابو مسعود، اللہ تجھ پر اس سے زیادہ قدرت رکھتا ہے، جو تجھ کو اس غلام پر حاصل ہے"
پلٹ کر دیکھا تو رسول اللہ صلعم تھے، میں نے فوراً عرض کیا ھو حر لوجہ اللہ، "وہ خدا کے
واسطے آزاد ہے"، اس پر حضور نے فرمایا، "اما انک لو لم تفعل للفحتک النار، "اگر تو اس کو
آزاد نہ کرتا تو آگ کے عذاب میں مبتلا ہو جاتا"،

ایک مرتبہ ایک شخص نے حاضر ہو کر پوچھا کہ ہم کتنی مرتبہ اپنے خادم کو معاف کریں؟
آپ نے جواب دیا، "اعفوا عنہ فی کل یوم سبعین مرۃ" "اگر وہ روزانہ ستر بار بھی قصور
کرے تو تم معاف کئے جاؤ"،

سوید بن مقرن کا بیان ہے کہ ہم سات بھائیوں میں ایک غلام تھا، ایک مرتبہ ہمارے

... جان ... کے منہ پر تھپڑ مارا تو رسول اللہ صلعم نے حکم دیا کہ اسے آزاد کردو۔

سوید بن مقرن کے صاحبزادے معاویہ بیان کرتے ہیں کہ ایک مرتبہ میں نے اپنے ... کے ایک غلام کو تھپڑ مارا، والد کو خبر ہوئی تو انھوں نے ہم دونوں کو بلایا اور غلام سے کہا تو معاویہ سے بدلہ لے۔

عرب میں دستور تھا کہ غلام کو عبدی (میرا بندہ) اور لونڈی کو امتی (میری بندی) کہکر پکارتے تھے، اور اپنے آپ کو غلاموں سے رب کہلواتے تھے، آنحضرت صلعم نے اس کو منع کیا اور فرمایا کہ انھیں فتای (میرا لڑکا) اور فتاتی (میری لڑکی) کہکر پکارا کرو اور اپنے آپکو سیدی یا مولائی کہلوایا کرو، اہل عرب غلام کو اپنے پاس جگہ دینا بھی عار سمجھتے تھے، مگر آنحضرت صلعم نے فرمایا کہ ان کو اپنے ساتھ ایک دسترخوان پر بٹھا کر کھلاؤ، اور اگر اتنا نہیں کر سکتے تو کم از کم اپنے کھانے میں سے ایک دو لقمے ہی ان کو کھلا دیا کرو، اذا اتی احدکم غلامه بطعام فان لم یجلسه معه فلیناوله لقمةً او لقمتین،

ان سب باتوں سے یہی مقصود تھا کہ غلاموں کو عزت و آرام سے رکھا جائے، اور وہ خاندان کے رکن بنکر رہیں،

(۳) اسلامی قانون میں غلاموں کو وہ وسیع حقوق دیئے گئے جن سے وہ آزادوں کے لگ بھگ پہونچ گئے، فوجداری قانون ان کو اسی حفاظت کا مستحق قرار دیتا ہے جس کا استحقاق آزادوں کو حاصل ہے، ان کا مال چرانے والا، ان کو قتل کرنے والا، ان کی عورتوں کی آبروریزی کرنے والا، ان کو جسمانی نقصان پہونچانے والا خواہ آزاد ہو یا غلام بہر صورت اس کو وہی سزا دیجائیگی جو آزاد لوگوں کے ساتھ ان جرائم کا ارتکاب کرنے والے کے لئے مقرر ہے، اسی طرح دیوانی قانون ان کی املاک پر ان کے مالکانہ حقوق تسلیم کرتا ہے اور انھیں اپنے ذاتی اموال میں تصرف کرنے کے وسیع اختیارات دیتا ہے، از روئے قانون خود ان کے آقا کو بھی یہ حق نہیں ہے کہ ان کے ذاتی مال میں ان کی مرضی کے خلاف تصرف کرے، یا ان کو کسی قسم کا جسمانی ضرر پہونچائے (سوائے تادیب کے جسمیں رفق اور نرمی کی سخت

---

[1] ابوداؤد، کتاب الادب باب فی حق المملوک،

تائید ہے) یا ان کی بہو بیٹیوں سے ناجائز علاقہ رکھے۔

قانون سے زیادہ اسلامی سوسائٹی نے ان کو اپنے اندر مساوات کا درجہ دیا ہے جہاں تک زندگی میں غلاموں کی حیثیت کسی طرح آزادوں سے کم نہ تھی علم، سیاست، مذہب، معاشرت غرض ہر شعبہ میں ان کے لئے ترقی کی تمام راہیں کھلی ہوئی تھیں، اور غلام ہونا ان کے لئے کسی حیثیت سے بھی رکاوٹ کا باعث نہ تھا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے خود اپنی پھوپھی زاد بہن سیدہ زینب رضی اللہ عنہا کو جنھیں بعد میں ام المومنین ہونے کا شرف حاصل ہوا، اپنے آزاد کردہ غلام زید بن حارثہ رضی اللہ عنہ سے بیاہ دیا، امام حسین رضی اللہ عنہ کا نکاح ایران کی ایک شہزادی سے ہوا جو جنگ میں لونڈی بن کر آئی تھیں، امام زین العابدین انھیں لونڈی کے بطن سے تھے جنھیں وہ درجہ شرف اسلام میں سب سے بالاتر درجہ رکھتی ہے۔ سالم بن عبداللہ اور قاسم بن محمد بن ابی بکر جو فقہائے تابعین کی اولین صف میں ہیں دو لونڈیوں کے پیٹ سے تھے، امام حسن بصری جو ائمہ تابعین کے سرخیل اور اصحاب طریقت کے پیشوا ہیں، ایک غلام کے بیٹے تھے، امام ابو حنیفہ جو آج کروڑوں مسلمانوں کے مقتدا ہیں، اور جنکو اسلامی دنیا امام اعظم کے لقب سے یاد کرتی ہے، بنی تیم اللہ کے موالی میں سے بتائے جاتے ہیں، مشہور محدث محمد بن سیرین جن کا شمار اکابر تابعین میں ہوتا ہے، ایک غلام کے بیٹے تھے، ان کے باپ سیرین اور ماں صفیہ دونوں مملوک تھے، مگر اس درجہ کے مملوک تھے کہ حضرت صفیہ کو تین امہات المومنین نے دلہن بنایا تھا اور سیرین سے ان کا نکاح ابی بن کعب رضی اللہ عنہ جیسے جلیل القدر صحابی نے پڑھایا تھا، امام مالک کے استاد نافع حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ کے غلام تھے، امام مالک کو جس سلسلۃ الذہب پر ناز ہے اس کی ایک کڑی یہی نافع تھے، ابو عبدالرحمن عبداللہ بن مبارک جن کا شمار اکابر مجتہدین میں ہوتا ہے، ایک غلام مبارک نامی کے بیٹے تھے، عکرمہ جو ائمہ مفسرین میں ہیں خود غلام تھے، محمد بن اسحٰق مشہور صاحب سیرۃ کے دادا یسار معرکۂ عین التمر سے پکڑے ہوئے آئے تھے۔ مکہ کے امام المحدثین عطاء بن رباح، یمن کے امام طاؤس بن کیسان، مصر کے امام یزید بن حبیب

؎ روم میں یہ عام دستور تھا کہ جب کسی غلام کی لڑکی بیاہی جاتی تو اس کو پہلی شب [illegible]
پڑتی تھی، اس شرمناک ظلم سے عیسائی بشپ تک نہ چوکتے تھے۔ دیکھو امیر علی کی سپرٹ آف اسلام صفحہ ۲۲۲۔

شام کے امام مکحول، جزیرہ کے امام میمون بن مہران، خراسان کے امام ضحاک، تو وہ سب
[illegible] ابراہیم نخعی سب کے سب غلاموں کے گروہ سے تھے، سلمان فارسیؓ غلام تھے، جنھیں حضرت
علیؓ فرماتے ہیں کہ سلمان مناا ھل البیت "سلمان تو ہم اہلبیت میں سے ہیں"، بلال حبشیؓ
غلام تھے جنکو حضرت عمرؓ کہا کرتے تھے کہ بلال سیدنا و مولی سیدنا، "بلال ہمارے آقا
کا غلام اور ہمارا آقا ہے" صہیب رومیؓ غلام تھے، جنھیں حضرت عمرؓ نے اپنی جگہ مسلمانوں کی امامت
کے لئے کھڑا کیا تھا، سالمؓ ابو حذیفہؓ کے غلام تھے جن کے متعلق حضرت عمرؓ نے اپنے انتقال
کے وقت فرمایا تھا کہ اگر آج وہ زندہ ہوتے تو میں ان کو خلافت کے لئے منتخب کرتا، اسامہ بن
زیدؓ غلام زادے تھے جنھیں رسول اکرمؐ نے اپنے آخری وقت میں اس لشکر کا سردار بنایا تھا
جس میں حضرت ابو بکرؓ جیسے جلیل القدر صحابی شریک تھے، اور جن کے متعلق حضرت عمرؓ نے اپنے
صاحبزادے عبد اللہؓ سے کہا تھا کہ اسامہ کا باپ تیرے باپ سے اور اسامہ خود تجھ سے رسول اللہؐ
کو زیادہ محبوب تھا، یہ تو قرون اولی کی باتیں ہیں، بعد میں جبکہ اسلامی روح بہت کچھ کمزور ہو گئی
تھی، قطب الدین ایبک، شمس الدین التمش، اور غیاث الدین بلبن جیسے جلیل القدر غلاموں
نے خود ہمارے ملک ہندوستان پر حکومت کی ہے، محمود غزنوی جو اپنے وقت میں دنیا کا
سب سے بڑا فاتح تھا، نسلاً ترکی غلام تھا، مصر میں کئی صدی تک ممالیک کی حکومت رہی ہے اور
ان کا نام خود کہتا ہے کہ وہ دراصل غلام تھے جنھوں نے پادشاہی کے تخت پر بار پایا،

ان غلاموں کو کون غلام کہہ سکتا ہے؟ کیا آزادوں کے لئے ان سے کچھ زیادہ ترقی
عزت اور اقتدار حاصل کرنے کے مواقع تھے؟ کیا ان کی غلامی نے ان کو اجتماعی زندگی
میں اعلی سے اعلی مدارج تک پہونچنے سے روکا؟ اگر غلامی اسی چیز کا نام ہے اور وہ ایسی ہی
ہوتی ہے تو آزادی کا نام غلامی رکھدینے میں کیا ہرج ہے؟

یہ طریقے تھے جن سے اسلام نے غلامی کو گھٹاتے گھٹاتے آزادی سے جا ملایا، بلکہ دونوں
میں کوئی فرق نہ رہنے دیا، لفظ "غلامی" تو بے شک باقی رہا، مگر غلامی کی حقیقت بدل کر
کچھ سے کچھ ہو گئی۔

غنیمت کا مسئلہ اسلام میں مال غنیمت کا جواز بھی ان مسائل میں سے ہے جن پر مخالفین

نے بہت کچھ حاشیہ آرائیاں کی ہیں اور جنگی خود مؤرخین نے بھی کثرِ غلط ذکا بات کی ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ غنیمت کے معاملہ میں بھی اسلام نے وہی تدریجی اصلاح کا طریقہ اختیار کیا ہے جو غلامی کے مسئلہ میں اختیار کیا تھا، عرب میں غنیمت کا شوق جس قدر بڑھا ہوا تھا اسکا حال اوپر بیان ہو چکا ہے، مالِ غنیمت کا حصول وہ سب سے بڑا لالچ تھا جس کے لئے ایک عرب جنگ کے خطرات برداشت کرنے اور مرنے مارنے پر آمادہ ہوا کرتا تھا، عرب کی جنگ کے عین مفہوم میں لوٹ مار داخل تھی حتی کہ لفظ حرب کے مدلول کا تصور ہی اس وقت تک دماغوں میں مکمل نہ ہو سکتا تھا جب تک اسمیں سلب و نہب کا مفہوم شامل نہ ہو جب اسلام آیا تو عرب اسی موروثی رغبت و شوق کو لیکر اس میں بھی داخل ہوئے، اور اس کے لئے یہ ناممکن ہو گیا کہ اس صدیوں کی متوارث ذہنیت کو دفعۃً بدل دے، اسے جن نومسلم عربوں کی اصلاح کرنی تھی ان کا حال یہ تھا کہ بلا ارادہ جبلّی طور پر غنیمت کی طرف کھنچتے تھے، اور میدانِ جنگ میں اموالِ غنیمت کو دیکھ کر ضبط نہ کر سکتے تھے، جنگِ بدر سے پہلے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے عبد اللہ بن جحشؓ کو ایک جماعت کے ساتھ بطنِ نخلہ کی طرف بھیجا کہ دشمن کی اطلاعات فراہم کریں، راستہ میں قریش کے چند تاجروں سے ان کی مڈبھیڑ ہوئی، مالِ غنیمت دیکھ کر ان کے آدمی قابو سے باہر ہو گئے، اور ان لوگوں کو قتل کر کے سامان لوٹ لائے، مورخین نے اس واقعہ کو جنگِ بدر کے فوری اسباب میں شمار کیا ہے[1] خود جنگِ بدر میں ایک طرف قریش کا تجارتی قافلہ شام کی جانب سے آ رہا تھا، اور دوسری طرف قریش کی فوجیں مکہ سے آ رہی تھیں، باوجودیکہ اس وقت غنیم کا زور توڑنا سب سے زیادہ ضروری تھا مگر لشکرِ اسلام کی عام خواہش یہی تھی کہ پہلے قافلہ پر حملہ کر کے اسے لوٹ لیا جائے، اسی کے متعلق قرآن مجید میں آیا ہے:-

واذ یعدکم اللہ احدی الطائفتین انھا لکم وتودون ان غیر ذات الشوکۃ تکون لکم ویرید اللہ ان یحق الحق بکلمتہ ویقطع	اور جبکہ اللہ وعدہ کر رہا تھا کہ دو جماعتوں میں سے ایک پر تم کو غلبہ ہوگا، اور تم چاہتے تھے کہ کمزور جماعت تمہارے ہاتھ آجائے مگر اللہ چاہتا تھا کہ اپنے کلمات سے حق کو حق کر دکھائے اور کافروں کی جڑ

[1] طبری، طبع مصر ج ۲ ص ۲۶۰، ابن اثیر طبع مصر ج ۲ ص ۴۲ - ۴۳۔

دابر الکفرین (۱:۰)   کاٹ دے،

پھر جب لڑائی میں جیت گئے تو صحابۂ کرامؓ کی مقدس جماعت کے لئے شوق غنیمت کو ضبط کرنا مشکل ہوگیا اور حکم الٰہی کا انتظار کئے بغیر غنائم کے لوٹنے میں مشغول ہوگئے[1] اسی کے متعلق یہ آیت اتری کہ[2]

لولا کتاب من اللہ سبق لمسکم فیما اخذتم عذاب عظیم (۱۰:۰)	اگر پہلے سے خدا کا نوشتہ نہ آچکا ہوتا تو جو کچھ تم نے لیا ہی اس پر بڑا عذاب نازل ہوتا،

جنگ احد میں اسی شوق غنیمت نے فتح کو شکست سے بدل دیا تھا، قریش کے پاؤں اکھڑتے ہی صحابہؓ اموال غنیمت کی طرف متوجہ ہوگئے اور ان تیر اندازوں کو بھی عالم بیخودی میں سرکار رسالتمآب کا حکم یاد نہ رہا جنھیں آپ نے عقب کی حفاظت پر متعین فرمایا تھا، نتیجہ یہ ہوا کہ اسلامی فوج پراگندہ ہوگئی، اور لشکر کفار نے پلٹ کر ایسا حملہ کیا کہ خود رسول اللہ صلعم زخمی ہوگئے، حنین میں بھی یہی ہوا، کہ پہلے حملہ سے دشمنوں میں ابتری پھیلی تو معاً جدید الاسلام اعراب غنیمت پر لوٹ پڑے، اور ان میں برہمی دیکھ کر بنی ہوازن کے تیر اندازوں نے ایسا حملہ کیا کہ بڑے بڑے جاں نثاروں کے پاؤں اکھڑ گئے، بخاری میں براء بن عازبؓ کی روایت ہے کہ انا لما حملنا علیھم انکشفوا فاکببنا علی الغنائم فاستقبلنا بالسھام[3]

معاذ اللہ یہ واقعات بیان کرنے سے صحابۂ کرامؓ کی تنقیص مقصود نہیں ہے، بلکہ صرف یہ بتانا ہے کہ غنیمت کا شوق ایک فطری جذبہ تھا جو صدیوں کی روایات سے طبیعتوں میں اس قدر راسخ ہوگیا تھا کہ کسی انسانی جماعت حتیٰ کہ صحابۂ کرامؓ جیسی مقدس، اور متاع دنیا کو حقیر جاننے والی جماعت کے لئے بھی اس کے اثرات کو دفعتہً دل و دماغ سے محو کر دینا غیر ممکن تھا جب حال یہ تھا تو ایک حکیمانہ مذہب جو فطرت سے جنگ نہیں، بلکہ اس کی اصلاح کرنا چاہتا تھا اس سے بہتر طریقہ اور کیا اختیار کر سکتا تھا، کہ نفس غنیمت کو حلال کر دیتا اور بالواسطہ طریقوں سے اسکے شوق کو گھٹانے اور اس کے حدود کو کم کرنے کی کوشش کرتا، یہی راستہ تھا جو اسلام نے اختیار

[1] طبری ج ۳ ص ۱۲۲۰، کتاب الخراج ص ۲۲، [2] ترمذی کتاب التفسیر [3] بخاری کتاب المغازی باب قول اللہ تعالیٰ ویوم حنین، الخ

کیا، اس نے جس مجبوری سے غنیمت کو حلال کیا ہے، اس کا حال ایک حدیث سے معلوم ہوتا ہے، جس کو امام ابویوسف رحؒ نے حضرت ابوہریرہؓ کے حوالہ سے نکالا ہے:-

قال رسول اللہ صلعم لم تحل الغنائم لقوم سود الرؤس قبلکم، کانت تنزل نار من السماء فتاکلھا، فلما کان یوم بدر اسرع الناس فی الغنائم، فانزل اللہ عزوجل لولا کتاب من اللہ سبق لمسکم فیما اخذتم عذاب عظیم فکلوا مما غنمتم حلالاً طیباً،

رسول اللہ صلعم نے فرمایا کہ تم سے پہلے کسی کالے سر والی قوم کے لئے غنیمت حلال نہیں کی گئی، ایک آگ آسمان سے اترتی اور مالِ غنیمت کو کھا جایا کرتی تھی، جب جنگِ بدر واقع ہوئی تو لوگ غنیمت پر ٹوٹ پڑے، اس پر یہ آیت اتری کہ "اگر اللہ کا نوشتہ پہلے ہی سے نہ آچکا ہوتا تو تم پر بڑا عذاب نازل ہوتا، خیر اب جو کچھ تم نے لوٹا ہے، اسے کھاؤ، کہ وہ تمہارے لئے حلال و پاک ہے،

اس حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ غنیمت پہلے حلال نہ تھی، مگر انسانی فطرت کے ناقابل تغیر رجحان کو دیکھ کر اسے حلال کر دیا گیا، تاہم محض فطرت کی رعایت ہی کر کے بے قید نہیں چھوڑ دی گئی، بلکہ اس رجحان کی اصلاح اور اس کی حد بندی کے لئے مختلف طریقے اختیار کئے گئے، جنھوں نے رفتہ رفتہ دلوں سے شوقِ غنیمت ہی کو دور کر دیا، اور جو تھوڑا بہت باقی رہ گیا اس کی اصلاح اس طرح کی گئی کہ اموالِ غنیمت پر متعدد اقسام کی پابندیاں عائد کر دی گئیں، اور خود اموالِ غنیمت کے دائرہ کو بہت محدود کر دیا گیا،

اس سلسلہ میں خصوصیت کے ساتھ تین طریقے ایسے ہیں جنکا ذکر ضروری ہے،

ا۔ اسلام نے غنیمت کی معنوی قیمت اس قدر گرا دی کہ دین داروں میں حصولِ غنائم کا شوق ہی باقی نہیں رہا، پہلے کہا کہ جو شخص غنیمت حاصل کرنے کی نیت سے جنگ کریگا اس کو جہاد کا ثواب نہیں ملے گا، ثواب صرف ان لوگوں کا حصہ ہے جو دل کو دنیوی اغراض سے پاک رکھکر خاص خدا کے لئے جنگ کریں، پھر جب دلوں میں غنیمت سے زیادہ حصولِ ثواب کی

لہ یہ اشارہ ہے ایک واقعہ کی طرف جس کو حضرت ابوہریرہؓ نے ایک اور روایت میں بیان کیا ہے، دیکھو بخاری کتاب الجہاد باب قول النبی احلت لکم الغنائم،

تعلیم یہ ہوئی کہ جو شخص دنیا میں اپنی جنگ کا فائدہ حاصل کرے گا، اس کے لئے آخرت کا ثواب کم ہو جائیگا اور جو دنیا میں فائدہ نہ اٹھائیگا، اس کو آخرت میں پورا ثواب ملیگا،

ما من غازية تغزو في سبيل الله فيصيبون الغنيمة الا تعجلوا ثلثي اجرهم من الآخرة ويبقى لهم الثلث. وان لم يصيبوا غنيمة تم لهم اجرهم[1]	جس فوج نے اللہ کی راہ میں جنگ کی اور مال غنیمت پالیا، تو اس نے اپنے آخرت کے ثواب میں دو تہائی حصہ نہیں پالیا اور اس کے لئے صرف ایک تہائی باقی رہگیا، اور اگر اس نے غنیمت نہ پائی تو اس کو پورا اجر ملے گا،

اس تعلیم نے مسلمانوں میں مال غنیمت کی آرزو سے بڑھ کر ثواب آخرت کی تمنا پیدا کردی اور وہی عرب جو کبھی غنائم کے انبار دیکھ کر بے قابو ہو جاتے تھے، چند ہی برس کے اندر متاع دنیا سے اس قدر بے نیاز ہو گئے کہ مال غنیمت ان کے سامنے پیش کیا جاتا تھا، اور وہ انکار کر دیتے تھے، رسول اکرمؐ کی زندگی کے آخری زمانہ میں جب غزوۂ تبوک کے لئے نفیر عام دیگئی تو واثلہ بن اسقع نے لوگوں سے کہا کہ جو شخص مجھ کو اپنے ساتھ جنگ میں لے چلے گا، اسے غنیمت میں سے آدھا حصہ دونگا، انصار میں سے ایک صحابی نے یہ شرط قبول کرلی اور ان کو اپنے ساتھ لیگئے غزوہ میں لشکر اسلام کو جو کچھ مال ملا، اس میں سے واثلہ کے حصہ میں چند نہایت عمدہ جوان اونٹنیاں آئیں۔ یہ انھیں لیکر وہ ان انصاری شیخ کے پاس پہونچے اور کہا کہ یہ وہی مال غنیمت ہے جسکا حصہ دینے کی میں نے آپ سے شرط کی تھی، مگر انھوں نے یہ کہکر قبول کرنے سے انکار کردیا کہ میرا مقصد غنیمت حاصل کرنا نہ تھا، محض ثواب مطلوب تھا[2]"

ایک دفعہ ایک بدوی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ جہاد میں شریک ہوا، دوران جنگ میں کچھ مال غنیمت آپ کے پاس آیا اور آپ نے دوسرے مجاہدین کی طرح اس بدوی کا حصہ بھی لگایا، اس کی اطلاع جب اس کو ہوئی تو اس نے حاضر ہو کر عرض کیا کہ "میں نے

---

[1] مسلم کتاب الجہاد والسیر باب السریة التی تخفق

[2] ابوداؤد ج ۲ باب الرجل یکری دابته علی النصف او السهم،

اس مال کے لئے آپ نے [illegible] نہیں کی ہے [illegible] حلق کی طرف اشارہ کر کے اس جگہ تیر کھاؤں اور شہید ہو جاؤں[1]۔

۲۔ مالِ غنیمت میں محتاجوں، معذوروں اور مسکینوں کی پرورش اور عام قومی ضروریات کے لئے پانچواں حصہ مقرر کیا گیا۔

واعلموا انما غنمتم من شئ فان للہ خمسہ وللرسول ولذی القربٰی والیتمٰی والمساکین و ابن السبیل (۸ : ۵)	جان لو کہ جو کچھ مالِ غنیمت تم کو حاصل ہو اس کا پانچواں حصہ اللہ اور اس کے رسولؐ اور اہلِ قرابت اور یتامیٰ و مساکین اور مسافروں کا حصہ ہے۔

اس طریقہ سے اموالِ غنیمت کا ایک معتدبہ حصہ نیک کاموں کے لئے [illegible] افرادِ فوج کے حصہ میں بہت کچھ کمی کر دی گئی۔

۳۔ مالِ غنیمت کا اطلاق پہلے ہر اس مال پر ہوتا تھا جو ایک فوج دشمن سے [illegible] لوٹے خواہ کسی طرح لوٹے، لیکن اسلام نے غنیمت صرف اس مال کو قرار دیا جو میدانِ جنگ میں دشمن کی افواج سے فاتح فوج کے ہاتھ آئے۔ اس سے ایک طرف [illegible] پر امن غیر فوجی آبادیوں میں کیا جائے غنیمت کی جائز حدود سے خارج [illegible] وہ مال بھی غنیمت کی تعریف سے نکل جاتا ہے جو جنگ کے [illegible] کے ہاتھ آئے، یا جس پر میدانِ جنگ [illegible] اس دوسری قسم کے مال کو فوج میں تقسیم کرنے کے بجائے حکومت [illegible] کی ملک قرار دیا ہے چنانچہ قرآن مجید میں آتا ہے :-

ما افاء اللہ علی رسولہ منھم فما اوجفتم علیہ من خیل ولا رکاب ولکن اللہ یسلط رسلہ علی من یشاء واللہ علی کل شئ قدیر	جو کچھ مال اللہ نے اپنے رسولؐ کو [illegible] تم نے اپنے گھوڑے اور اونٹ نہیں دوڑائے [illegible] اپنے رسولؐ کو جس پر چاہتا ہے مسلط کرتا ہے [illegible] ہر چیز پر قادر ہے۔ سو یہ مال جو اللہ اپنے رسولؐ

---

[1] نسائی کتاب الجنائز، باب الصلوٰۃ علی الشہداء ۶۱۔

ما افاء الله علی رسولہ من اھل القری فللہ وللرسول ولذی القربی والیتمی والمساکین وابن السبیل کی لایکون دولۃ بین الاغنیاء منکم (۵۹ : ۱)	کو فئے کے طور پر عطا فرمائے، اللہ اور اس کے رسول اور اہل قرابت، یتامیٰ، مساکین، اور مسافروں کا حق ہے، تاکہ وہ تمہارے مال داروں ہی کے درمیان نہ گردش کرتا پھرے،

اس آیت نے یہ تصریح کردی ہے کہ صرف وہ اموال منقولہ غنیمت کے تحت آتے ہیں جنکو اپنے گھوڑے، اور اونٹ دوڑا کر (یعنی میدان جنگ میں لڑکر) فوج نے حاصل کیا ہو باقی رہے وہ اموال املاک، اور آراضی جو "ایجاف خیل ورکاب" کا بلا واسطہ نتیجہ نہ ہوں، تو وہ حکومت اسلامیہ کی ملک ہیں، اور خدا اور رسولؐ کے کاموں پر خرچ ہونے کے لئے ہیں،

یہ حکم ابتداءً صرف رسول اللہ صلعم کی ذات کے لئے مخصوص سمجھا گیا تھا، مگر جب صحابہ کرام نے غور کیا تو نظر آیا کہ "فئے" کے حقداروں میں چھ نام گنائے گئے ہیں، اللہ، رسولؐ، ذوی القربیٰ یتامیٰ، مساکین، اور ابن سبیل، ان میں سے صرف ایک "رسولؐ" دنیا سے رخصت ہوگئے ہیں، باقی، "اللہ" حی ولایموت ہے، اور ذی القربیٰ، یتامیٰ، مساکین، اور ابن سبیل تا قیام قیامت موجود ہیں، پس تنہا رسولؐ کے رخصت ہوجانے سے یہ پانچ حقدار کیونکر بے حق ہو سکتے ہیں، پھر خود رسولؐ کا استحقاق بھی تنہا ان کی ذات کے لئے نہ تھا، بلکہ اس کام کے لئے تھا جو وہ اپنی زندگی میں کرتے تھے، اور وہ کام بدستور جاری ہے، اس لئے "فئے" میں سے رسولؐ کا حق بھی فوت نہیں ہوا، علاوہ ازیں "فئے" کو ان چھ حقداروں کا حق قرار دینے کی جو مصلحت بیان کی گئی تھی وہ یہ تھی، کہ یہ مال تنہا مالداروں ہی میں گشت نہ کرتا پھرے بلکہ قوم کے تمام طبقے اس سے مستفید ہوں، کی لایکون دولۃ بین الاغنیاء منکم، یہ مصلحت جس طرح رسولؐ کی زندگی میں تھی اسی طرح اب بھی باقی ہے، اور جب تک دنیا آباد ہے باقی رہے گی، اس بناء پر یہ قانون قرار دیا گیا ہے کہ "فئے" کا مال خدا، رسولؐ کے کاموں اور امت کے عام طبقوں کی خدمت کے لئے محفوظ رکھا جائے[1]،

---

[1] یہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا اجتہاد تھا، جس وقت فوج نے سواد عراق کی تقسیم کا مطالبہ کیا تھا تو آپ نے اسکی تردید میں یہی آیت دلیل کے طور پیش کی تھی، اور کہا تھا کہ هذه عامة فی القرى کلها، کتاب الخراج صفحہ ۱۵،

سی قانون کے مطابق حضرت عمرؓ نے ممالک مفتوحہ کو فوج پر تقسیم کرنے سے انکار کر دیا تھا، ور فوجوں کو صرف اس مال پر قناعت کرنی پڑتی تھی جو لڑائیوں کے دوران میں غنیمت کے طور پر دشمن کی افواج سے حاصل ہوا تھا، اس بارے میں حضرت عمرؓ کا وہ خط جو انھوں نے سعد بن وقاصؓ کو لکھا تھا، اسلامی قانون کو بالکل واضح کر دیتا ہے، بلاذری نے اس خط کو ان الفاظ میں نقل کیا ہے :-

"تمھارا خط پہونچا، تم بیان کرتے ہو کہ لوگ تم سے کہہ رہے ہیں کہ جو کچھ ملک و مال اللہ تعالیٰ نے ان کو غنیمت میں عطا کیا ہے، اس کو تقسیم کر دیا جائے، سو تم میرا یہ خط ملنے کے بعد ایسا کرو کہ فوج نے اپنے گھوڑے اور اونٹ دوڑا کر جو مال، اسباب اور جانور لوٹے ہیں ان کو خمس وضع کرنے کے بعد اہل فوج میں تقسیم کر دو، باقی آراضی اور نہریں کو کاشتکاروں کے پاس رہنے دو تاکہ مسلمانوں کی تنخواہوں کے کام آئیں، ورنہ اگر ان کو موجودہ زمانہ کے لوگوں میں تقسیم کر دو گے بعد میں آنے والوں کے لئے کچھ نہ بچیگا۔"

حضرت ابو عبیدہؓ نے جب شام فتح کیا، تو اس وقت بھی فوج نے تمام ملک کو غنیمت قرار دیکر یہ مطالبہ کیا تھا کہ اسے تقسیم کر دیا جائے، اس کی اطلاع انھوں نے حضرت عمرؓ کو دی اور حکم دریافت کیا، جواب میں آپ نے ایک طویل خط لکھا جسمیں آیت مذکورہ سے استدلال کرتے ہوے فرماتے ہیں کہ :-

فاقرر ما افاء اللہ علیک فی ایدی اھلہ واجعل الجزیۃ علیھم بقدر طاقتھم[1]	پس تم ان املاک کو جو اللہ نے تم کو فے میں عطا کی ہیں، اہل ملک کے ہاتھ میں رہنے دو اور ان پر ان کی طاقت کے مطابق ٹیکس لگا دو۔

اس طرح ایک طرف تو اسلام نے غنیمت کے شوق کو کم کیا جو لوٹ مار اور غارتگری کا اصلی محرک تھا، دوسری طرف ایسے قوانین مقرر کئے جن سے غنیمت کا دائرہ گھٹ کر صرف ان منقولات اموال تک محدود رہ گیا جو جنگی اعمال کے سلسلہ میں غنیم کی شکست خوردہ افواج سے

[1] فتوح البلدان صفحہ ۲۶۸، امام ابو یوسف نے کتاب الخراج صفحہ ۔۔ میں بھی تھوڑے سے تغیر کے ساتھ اسے نقل کیا ہے۔ [2] کتاب الخراج صفحہ ۸۲۔

حاصل ہوتے ہیں، اور تیسری طرف اس مال غنیمت میں سے بھی پانچواں حصہ نیک کاموں کے لئے لیا۔ اب اسلامی اصطلاح میں لفظ غنیمت جس چیز پر بولا جاتا ہے، وہ بعینہ وہی ہے جسے مغربی قانون میں غنائم جنگ (SHOILS OF WAR) کہا جاتا ہے اور جسے تمام دنیا کے مقننوں نے فاتح کا فطری حق تسلیم کیا ہے، فرق صرف اتنا ہے کہ مغربی قانون تمام اموال غنیمت کو حکومت کا حصہ قرار دیتا ہے، اور اسلامی قانون ان میں سے پانچواں حصہ لیکر باقی چار حصے ان جانباز سپاہیوں میں تقسیم کر دیتا ہے جنھوں نے جان جوکھوں میں ڈال کر انھیں حاصل کیا ہے۔

صلح دوستی اسلامی جنگ کے شعائر میں سے ایک یہ بھی ہے کہ مسلمان کو ہر وقت صلح کے لئے تیار رہنا چاہیے چونکہ اسلام کی جنگ کا مقصد درجنگ نہیں ہے، امن وسلامتی ہے، اس لئے اگر مصالحت کے ذریعہ یہ مقصد حاصل ہونے کی کوئی صورت موجود ہو، تو ہتھیار اٹھانے سے پہلے اس صورت سے فائدہ اٹھانا چاہیئے یہی وجہ ہے کہ اسلام نے جنگ کی آخری حد وجوہ نزاع کے ارتفاع، اور جنگ کی ضرورت باقی نہ رہنے کو قرار دیا ہے حتی تضع الحرب اوزارھا، اور حتی لا تکون فتنۃ ویکون الدین کلہ للّٰہ پس قرآن مجید ہمکو حکم دیتا ہے کہ اگر دشمن تم سے خود صلح کی درخواست کرے تو اسے کھلے دل سے قبول کرلو۔

وان جنحوا للسلم فاجنح لها وتوکل علی اللّٰہ انہ هو السمیع العلیم وان یریدوا ان یخدعوک فان حسبک اللّٰہ هو الذی ایدک بنصرہ وبالمومنین (۸ : ۸)	اگر وہ صلح کے لئے جھکیں تو تم بھی جھک جاؤ اور اللہ پر بھروسہ رکھو کہ وہ سب کچھ سنتا اور جانتا ہے اور اگر وہ تمھیں دھوکہ دینے کا ارادہ رکھتے ہوں تو پرواہ نہ کرو کہ تمھارے لئے اللہ کافی ہے وہی ہے جس نے تم کو نصرت بخشی اور مومنوں کی کثرت سے تم کو تقویت دی،

یہ بھی حکم ہے کہ اگر کوئی دشمن ہتھیار ڈالدے، اور اپنی زبان سے یا زبان حال سے امان مانگے تو پھر تمکو اس پر ہاتھ اٹھانے کا حق باقی نہیں رہتا۔

فان اعتزلوکم فلم یقاتلوکم والقوا الیکم السلم فما جعل اللہ لکم علیہم سبیلا (۴: ۱۲)	اگر وہ تم سے ہاتھ کھینچ لیں اور جنگ نہ کریں اور صلح کی خواہش کریں تو ایسی حالت میں اللہ نے تم کو ان پر دست درازی کی کوئی راہ نہیں دی ہے۔

اسی طرح اگر دشمن قوم کے افراد اکے دکے ملجائیں اور امان مانگیں تو ان کو قتل کرنا جائز نہیں ہے، بلکہ امن کے ساتھ ان کو رہنے دینا چاہئے، اور جب وہ اپنے ملک کی طرف واپس جانا چاہیں تو خیریت سے پہونچا دینا چاہئے:-

وان احد من المشرکین استجارک فاجرہ حتی یسمع کلام اللہ ثم ابلغہ مامنہ، ذالک بانہم قوم لا یعلمون (۹: ۶)	اگر مشرکوں میں سے کوئی تمہاری پناہ میں آنا چاہے تو اس کو پناہ دو یہاں تک کہ وہ اللہ کا کلام سنے پھر اس کو اس کے امن تک پہونچا دو، یہ اس لئے ہے کہ وہ نادان لوگ ہیں۔

ابتداءً اس آیت کی غرض اشاعتِ اسلام تھی جیسا کہ ابن جریرؒ اور ابن کثیرؒ نے بیان کیا ہے فاجرہ حتی یسمع کلام اللہ سے مراد یہ ہے کہ ان کو اپنی پناہ میں لیکر اللہ کا کلام سناؤ اگر وہ اس طرح وعظ و نصیحت حاصل کریں اور اسلام قبول کرلیں تو بہتر ہے اور اگر ان کے دل اسلام کے لئے نہ کھلیں تو ان کو قتل نہ کرو بلکہ امن و عافیت کے ساتھ ان کو ان کے وطن تک پہونچا دو، ثم ابلغہ مامنہ لیکن چونکہ آیت کے الفاظ عام تھے اس لئے ائمہ مجتہدین نے اس سے یہ حکم نکالا کہ دار الحرب سے جو لوگ تجارت یا سیاحت یا حصولِ علم یا کسی اور غرض سے آنا چاہیں اور حکومتِ اسلامیہ کی پناہ میں رہنے کی درخواست کریں تو انکو دار الاسلام میں آنے اور آزادی کے ساتھ نقل و حرکت کرنے کی اجازت دینی چاہئے[1]۔ فقہائے حنفیہ نے اس کے لئے ایک سال کی مدت مقرر کی ہے، اگر حربی مستامن کو دار الاسلام میں رہتے ہوئے ایک سال گذر جائے تو اس کو نوٹس دیا جائیگا کہ یا تو وہ واپس چلا جائے یا ذمی

[1] اس کے لئے اولین شرط یہ ہے کہ وہ امان لیکر داخل ہوں، ورنہ بغیر امان حدبث آنے کی صورت میں ان کو جاسوس قرار دیا جائیگا، اور جاسوس کے لئے اسلامی قانون میں بھی تمام دوسرے قوانین کی طرح قتل کی سزا ہے۔

قومیت ([illegible]) بدل کر اسلامی رعیت بنجائے، تاہم حقوق کے اعتبار سے ذمی اور مستامن میں زیادہ فرق نہیں ہے، مستامن کے لئے شریعت نے یہ وسیع رعایات مقرر کی ہیں کہ اس سے جزیہ نہیں لیا جائیگا، بڑے سے بڑے جرم کا ارتکاب کرنے کے باوجود وہ امان جو اسے دی گئی ہے منسوخ نہ ہوگی، اگر وہ کسی مسلمان کو قتل کردے، یا رہزنی کرے یا مسلمان عورت سے زنا کرے تب بھی اسے محض عام مجرموں کی طرح سزا دیجائیگی حد یہ ہے کہ اگر وہ دار الاسلام کی خبریں بھی دشمنوں کو خفیہ خفیہ بھیجتا ہو تو امان کا عہد نہ ٹوٹے گا صرف جرم کی سزا دیدیجائیگی، ان رعایات کے مقابلہ میں اس کے ساتھ صرف اتنی سختی برتی گئی ہے کہ اگر اسلامی رعایا کا کوئی فرد خواہ وہ مسلمان ہو یا ذمی اس کو قتل کردے تو قاتل سے قصاص نہ کیا جائیگا محض دیت وصول کیجائے گی، مگر اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ وہ اسلامی رعیت نہیں ہے، اور اجنبی کو اپنی رعیت کے برابر حقوق کوئی حکومت بھی نہیں دیا کرتی، خصوصاً جبکہ وہ اجنبی ایک ایسی قوم سے ہو جس کا اس حکومت سے نہ کوئی معاہدہ ہو اور نہ باضابطہ سیاسی تعلق،

یہ تو وہ صورتیں تھیں جنمیں دعوتِ صلح کفار کی طرف سے ہو، اب رہی دوسری صورت یعنی مسلمانوں کی طرف سے صلح کی دعوت، تو اس کے متعلق اسلام نے یہ اعلیٰ درجہ کا اصول مسلمانوں کو سکھایا ہے، کہ جب تم بالادست اور طاقتور ہو، اس وقت دشمن کو صلح کا پیام دو،

فلا تهنوا وتدعوا الى السّلم وانتم الاعلون (۴۷: ۴)	اعدا کے مقابلہ میں ضعیف نہ بنو، اور انھیں اس وقت صلح کی دعوت دو جبکہ تم غالب و سربلند ہو،

ابن کثیر نے اس آیت کی تفسیر میں لکھا ہے :-

قال جل وعلا لعباده المومنين	اللہ جل وعلا اپنے مومن بندوں سے کہتا ہے کہ فلا تهنوا

ے کتاب بحر [illegible] صفحہ [illegible] بدیہ کتاب السیر باب المستامن، بعض فقہانے یہ بھی فتویٰ دیا ہے کہ خواہ نوٹس دیا جائے یا نہ دیا جائے بہرصورت ایک سال گذرنے کے بعد اس کی قومیت خود بخود بدل جائے گی چنانچہ مبسوط کے الفاظ اسی پر دلالت کرتے ہیں، ۲ے رد المحتار ج ۲ ص ۲۷۳،

فلا تهنوا اي تضعفوا عن القتال ولا تدعوا الى السلم اي المهادنة والمسالمة ووضع القتال بينكم وبين الكفار في حال قوتكم وكثرة عددكم ولهذا قال فلا تهنوا وتدعوا الى السلم وانتم الاعلون اي في حال علوكم على عدوكم،	تم ضعیف و کم ہمت نہ بنو اور اپنے دشمن کے دربار سلم یعنی مصالحت و مسالمت اور التوائے جنگ کی دعوت اس وقت دو جبکہ تم طاقتور اور کثیر التعداد ہو، اسی لئے فرمایا، فلا تهنوا وتدعوا الی السلم وانتم الاعلون، یعنی دعوت صلح کی اس حال میں کہ تم اپنے دشمن پر بالادست ہو،

یہ کیسا اعلیٰ درجہ کا اصول ہے، آج دنیا کی مہذب قوموں میں صلح صرف جنگ سے معذور و مجبور ہونے کا نام ہے، فرانس اور جرمنی میں اس لئے صلح ہے کہ وہ باہم لڑنے کی قدرت نہیں رکھتے، انگلستان اور روس میں اس لئے صلح ہے کہ کچھ مجبوریاں ان کو جنگ سے روکے ہوئے ہیں، اگر آج یہ مجبوریاں دور ہو جائیں، اور ایک قوم دوسری قوم کو مٹا دینے پر قادر ہو جائے تو شاید یہ قومیں جنگ میں ایک لمحہ کی بھی دیر نہ کریں، لیکن اس کے برعکس اسلام یہ سکھاتا ہے، کہ جب تم کو دشمن پر نمایاں غلبہ حاصل ہو، اور تم اس پر اپنی بالادستی، اور اپنی قوت و قدرت اچھی طرح ثابت کر دو، تو اس کو صلح کی طرف دعوت دو، اور اپنی طاقت کو دنیا میں جنگ برپا کرنے کے بجائے، امن و سلامتی قائم رکھنے کے لئے استعمال کرو،

بعض حالات ایسے بھی ہوتے ہیں جبکہ مسلمانوں کی طاقت بہت کمزور ہوتی ہے یا انہیں اپنی اندرونی اصلاح کے لئے بیرونی امن و سکون کی ضرورت ہوتی ہے، ایسے حالات میں مسلمانوں کے امام کو اختیار دیا گیا ہے کہ موقع و محل کے لحاظ سے، اسلامی مصالح کو دیکھ کر دشمنوں کے ساتھ موادعت کر لے، اس باب میں صلح حدیبیہ کی مثال ہمارے سامنے ہے، جس میں رسول اللہ صلعم نے ضروریات وقت کے لحاظ سے قریش کے ساتھ ایسی شرائط پر صلح طے کر لی تھیں کہ بظاہر ان سے اسلام کی کمزوری محسوس ہوتی تھی، مگر درحقیقت انہیں نے اسلام کے لئے پھیلنے اور طاقتور بننے کے مواقع بہم پہونچا دیئے،

مفتوح قوموں کے ساتھ برتاؤ : جنگ کے مسائل ختم ہوئے، اب ہم کو متعلقاتِ جنگ پر بھی ایک نظر ڈالنی چاہئے، دشمن کے ساتھ ایسی حالت میں نیک سلوک کرنا جبکہ اس کے اندر مقاومت اور انتقام کی قوت موجود ہو، کسی نہ کسی حد تک "کلوخ اندازرا پاداشِ سنگ" کے خوف پر محمول کیا جا سکتا ہے، مگر جب اس کی قوتِ مقابلہ بالکل لوٹ جائے، اور وہ بے بس ہوکر اپنے آپ کو فاتح کے رحم پر چھوڑ دے، اس وقت اس کے ساتھ فیاضی کا سلوک کرنا خالص اور کامل نیکی ہے، جو فاتح کے حسنِ نیت کو بالکل واضح کر دیتی ہے، مفتوح کیساتھ فاتح کے برتاؤ کا انحصار درحقیقت فاتح کے مقصدِ فتح پر ہوا کرتا ہے، اگر اس نے مفتوح کو حصولِ دولت کے لئے فتح کیا ہے، تو اس کی حاکمانہ سیاست پر استحصال بالجبر کا غلبہ ہوگا، اگر مذہبی عداوت کی بنا پر کیا ہے تو حکومت میں مذہبی تعصب و تشدد نمایاں ہوگا، اگر ملک گیری و فرماں روائی کی حرص اس کی محرک ہوئی ہے تو حکومت کی ساری عمارت ظلم و جور اور استکبار و استعباد پر قائم ہوگی، بخلاف اس کے اگر فاتح کا مقصد حقیقۃً اصلاح کے سوا کچھ نہ ہو تو نہ وہ مفتوح قوم کی دولت لوٹے گا، نہ مذہبی تشدد برتیگا، نہ ظلم و جور کا برتاؤ کریگا، اور نہ اس کو ذلیل و خوار کر کے اپنا غلام بنائیگا، اس کی حکومت عدل، رواداری، مساوات اور فیاضی پر مبنی ہوگی، اور اس کی سیاست کا مدار صرف یہ ہوگا کہ مفتوح قوم کو فتنہ و فساد اور طغیان و سرکشی سے باز رکھے، اور اپنے دامنِ عافیت میں اسکو امن کے ساتھ اخلاقی، مادی اور روحانی ترقی کے مواقع بہم پہونچائے، اب اس معیار کے مطابق ہمکو دیکھنا چاہئے کہ اسلام اپنی مفتوح قوموں کے ساتھ کیا سلوک کرتا ہے؟ اس کا قانون مفتوحین کو کیا درجہ دیتا ہے؟ اس کی شریعت ان کے لئے کیا حقوق مقرر کرتی ہے؟ اور اس کی حکومت ان کے ساتھ ایک مصلح حکومت کا سا برتاؤ کرتی ہے، یا مفسد حکومت کا سا؟

مفتوحین کی دو قسمیں : اسلامی قانون نے تمام مفتوحین کو دو اقسام پر منقسم کیا ہے، ایک وہ جو صلح کیساتھ اطاعت قبول کریں، دوسرے وہ جو بزورِ شمشیر مغلوب ہوں، ان دونوں کے احکام میں تھوڑا سا فرق ہے، اس لئے ہم دونوں کے احکام الگ الگ بیان کریں گے،

معاہدین : جو لوگ جنگ سے پہلے یا دورانِ جنگ میں اطاعت قبول کرنے پر راضی

ہو جائیں اور حکومت اسلامیہ سے مخصوص شرائط طے کریں۔ ان کے لئے اسلام کا قانون یہ ہے کہ ان کے ساتھ تمام معاملات ان شرائطِ صلح کے تابع ہوں گے جو ان سے طے ہوئی ہیں، دشمن کو اطاعت پر آمادہ کرنے کے لیے چند خاص شرائط طے کر لینا اور پھر جب وہ پوری طرح قابو میں آجائے تو اس کے ساتھ مختلف برتاؤ کرنا آج کل کی تہذیب قوموں کے سیاسی معمولات سے ہے۔ مگر اسلام اس کو ناجائز بلکہ حرام اور گناہ عظیم قرار دیتا ہے۔ اس کے نزدیک یہ ضروری ہے کہ جب کسی قوم کے ساتھ کچھ شرائط طے ہو جائیں، خواہ وہ مرغوب ہوں یا نہ ہوں، تو اس کے بعد ان شرائط سے یک سرِمو بھی تجاوز نہ کیا جائے، بلا لحاظ اس کے کہ فریقین کی اعتباری حیثیت اور طاقت و قوت میں کتنا ہی فرق آجائے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں:-

لعلکم تقاتلون قوماً فتظہرون علیہم فیتقونکم باموالہم دون انفسہم وابنائہم (وفی حدیث فیصالحونکم علی صلح) فلا تصیبوا منہم فوق ذالک فانہ لا یصلح لکم[۱]

اگر تم کسی قوم سے لڑو اور اس پر غالب آجاؤ، اور وہ قوم اپنی اور اپنی اولاد کی جان بچانے کے لئے تم کو خراج دینا منظور کرے (ایک دوسری حدیث میں ہے کہ تم سے ایک صلحنامہ طے کرے) تو پھر تم اس مقررہ خراج سے ایک حبہ بھی زائد نہ لینا کیونکہ وہ تمہارے لئے ناجائز ہوگا۔

ایک اور حدیث میں ہے کہ آنحضرت صلعم نے فرمایا:-

الا من ظلم معاھداً او انتقصہ او کلفہ فوق طاقتہ او اخذ منہ شیئاً بغیر طیب نفس فانا حجیجہ یوم القیامۃ[۲]

خبردار، جو شخص کسی معاہد پر ظلم کریگا یا اس کے حقوق میں کمی کریگا یا اس کی طاقت سے زیادہ اس پر بار ڈالیگا یا اس سے کوئی چیز اس کی مرضی کے خلاف وصول کریگا اس کے خلاف قیامت کے دن میں خود مستغیث بنونگا۔

ان دونوں حدیثوں کے الفاظ عام ہیں اور ان سے یہ عام حکم مستنبط ہوتا ہے کہ معاہد ذمیوں کے ساتھ صلحنامہ میں جو شرائط طے ہو جائیں ان میں سے کسی قسم کی کمی یا زیادتی کرنا ہرگز جائز نہیں ہے، نہ ان پر ٹیکس بڑھایا جا سکتا ہے، نہ ان کی زمینوں پر قبضہ کیا جا سکتا ہے، نہ ان کی عمارتیں چھینی جا سکتی ہیں، نہ ان پر سخت فوجداری قوانین نافذ کیے جا سکتے ہیں،

۱؎ ابوداؤد کتاب الجہاد ۲؎ ایضاً۔

ان کے مذہب میں دخل دیا جا سکتا ہے، نہ ان کی عزت و آبرو پر حملہ کیا جا سکتا ہے، اور نہ کوئی ایسا فعل کیا جا سکتا ہے جو ظلم یا انتقاص یا تکلیف ما لا یطاق یا اخذ بغیر طیب نفس کی حدود میں آتا ہو۔ انہیں احکام کی بنا پر فقہائے اسلام نے صلحاً فتح ہونے والی قوموں کے متعلق کسی قسم کے قوانین مقرر نہیں کئے، اور صرف یہ عام قاعدہ وضع کر کے چھوڑ دیا کہ ان کے ساتھ ہمارا معاملہ بالکل شرائطِ صلح کے مطابق ہوگا، امام ابو یوسف لکھتے ہیں کہ:-

یؤخذ منھم ما صولحوا علیہ و یوفی لھم ولا یزاد علیھم[1]

ان سے وہی لیا جائیگا جس پر ان کے ساتھ صلح ہوئی ہے، ان کے حق میں صلح کی شرائط پوری کیجائیں گی، اور ان پر کچھ زیادہ نہ کیا جائیگا،

ظاہر ہے کہ صلحنامہ کے لئے قواعد و اصول متعین نہیں کئے جا سکتے، وقت اور موقع کے لحاظ سے جیسی شرائط مناسب ہوں گی وہی طے کر لی جائیں گی، تاہم نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے خلفائے راشدین رضنے مختلف قوموں سے جو صلحنامے کئے ہیں، ان سے ہمیں کم از کم وہ عام اصول معلوم ہو جاتے ہیں جن پر اسلام اپنے دشمنوں سے مصالحت کرتا، اور کر سکتا ہے، ان اصول کو واضح کرنے کے لئے ہم چند صلحنامے یہاں نقل کرتے ہیں،

اہل نجران کی درخواست پر نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے جو صلحنامہ لکھ کر انہیں دیا تھا اس میں خراج کی رقم مقرر کرنے کے بعد لکھا ہے:-

ولنجران وحاشیتھا جوار اللہ وذمۃ محمد النبی رسول اللہ علی انفسھم وملتھم وارضھم واموالھم وغائبھم وشاھدھم وعیرھم وبعثھم وامثلتھم،

نجران کے عیسائیوں اور ان کے ہمسایوں[2] کے لئے اللہ کی پناہ اور اللہ کے رسول محمد نبیؐ کا ذمہ ہے ان کی جانوں کے لئے، ان کے مذہب، ان کی زمین ان کے اموال ان کے حاضر و غائب، ان کے اونٹوں، ان کے قاصدوں، اور ان کے مذہبی نشانات[3] سب

---

[1] کتاب الخراج صفحہ ۴۵۔ [2] ڈاکٹر اسپرنگر نے حاشیہ سے مراد یہودی لیے ہیں، (سیرۃ محمدؐ ج ۳ ص ۵۰۲)؛ مگر در اصل اس سے مراد تمام وہ لوگ ہیں جو عیسائیوں کے ساتھ وہاں آباد تھے، [3] امثلہ سے مراد صلیبیں اور تصویریں وغیرہ ہیں جو کنیسوں میں رکھی جاتی ہیں،

لا يغير مما كانوا عليه ولا
يغير حق من حقوقهم ولا ملتهم
ولا يفتن اسقف من اسقفيته
ولا راهب من رهبانيته
ولا واقه من وقاهيته على
ما تحت ايديهم من قليل او
كثير وليس عليهم رهق ولا دم
جاهلية ولا يحشرون ولا
يعشرون ولا يطأ ارضهم
جيش من سأل منهم حقا
فبينهم النصف غير ظالمين
ولا مظلومين بنجران ومن
اكل منهم ربا من ذي قبل
فذمتي منه بريئة ولا
يؤخذ منهم رجل بظلم آخر
ولهم على ما في هذه الصحيفة
جوار الله وذمة محمد النبي
ابدا حتى ياتي امر الله ما
نصحوا واصلحوا فيما عليهم

[illegible]
رہیں گے، ان کے حقوق میں سے کوئی حق و ملت
میں سے کوئی نشان نہ بدلا جائیگا، ان کے کسی سقف
کو اس کی سقفیت سے، اور کسی راہب کو اس کی رہبانیت
سے، اور کسی خادم کلیسا کو اس کی خدمت سے نہ ہٹایا
جائیگا خواہ اس کے ہاتھ کے نیچے جو کچھ ہے وہ تھوڑا ہو یا زیادہ
ان پر عہد جاہلیت کے کسی خون یا عہد کی کوئی ذمہ داری
نہیں ہے، ان کو فوجی خدمت یا دہ یکی ادا کرنے پر
مجبور نہ کیا جائیگا اور ان کی زمین کو کوئی لشکر پامال
نہ کریگا، اگر کوئی شخص ان کے خلاف کسی حق کا دعویٰ
کریگا تو فریقین کے درمیان انصاف کیا جائیگا، نہ اہل
نجران ظالم بن سکیں گے، نہ مظلوم، مگر جس شخص نے
اس سے پہلے سود کھایا ہو اس کی ذمہ داری سے ہم
بری ہوں گے، ان میں سے کسی شخص کو دوسرے کے گناہ
میں نہ پکڑا جائیگا، اس صحیفہ میں جو کچھ ہے اس کے لئے
اللہ کی ضمانت اور محمد نبی کا ذمہ ہے، ہمیشہ کے واسطے
جب تک کہ اللہ کا حکم آئے، اور جب تک وہ خیر خواہ رہیں
اور ان حقوق کو ادا کرتے رہیں جو اس معاہدہ کی رو سے
ان پر عائد ہوتے ہیں۔

[illegible]
لشکر ان کی زمین کو پامال نہ کریگا بلکہ یہ بھی ہو کہ تمام خارجی [illegible] کے مقابلہ میں ان کی حفاظت [illegible]
۳؎ اس سے مراد یہ ہے کہ جس نے معاہدہ سے پہلے سود پر رقم دی ہو اور معاہدہ کے بعد [illegible] پر سود کا مطالبہ
کرے تو ہم اسکو دلانے کے ذمہ دار نہیں ہیں مگر یعقوبی نے جو معاہدہ نقل کیا ہے [illegible]

حضرت ابوبکرؓ کے زمانہ میں خالد بن ولیدؓ نے اہل حیرہ کو جو صلحنامہ لکھ کر دیا تھا اس میں انھوں نے تمام باشندوں پر مجموعاً صرف ۶۰ ہزار درہم (یعنی محتاجوں اور مفلسوں کو الگ کرکے بقیہ آبادی پر ۱۰ درہم فی کس کے حساب سے) سالانہ خراج مقرر کیا، اور اس کے مقابلہ میں حکومت اسلامیہ کی جانب سے یہ عہد کیا کہ:-

لا يهدم لهم بيعة ولا كنيسة ولا قصر من قصورهم التي كانوا يتحصنون فيها اذا نزل بهم عدو لهم ولا يمنعون من ضرب النواقيس ولا من اخراج الصلبان في يوم عيدهم [1]	ان کا کوئی معبد اور گرجا منہدم نہ کیا جائیگا، نہ ان کے قلعوں میں سے کوئی قلعہ توڑا جائیگا، جنمیں وہ اپنے دشمنوں سے بچاؤ کے لئے پناہ گزیں ہوا کرتے تھے، نہ انھیں ناقوس بجانے سے روکا جائیگا، اور نہ ان کی عید کے دن صلیبیں نکالنے سے منع کیا جائیگا،

حضرت عمرؓ نے اہل بیت المقدس کو جو صلحنامہ لکھ کر دیا تھا اس کے الفاظ یہ ہیں

اعطاهم امانا لانفسهم و اموالهم ولكنائسهم وصلبانهم وسقيمها وبريها وسائر ملتها انه لا تسكن كنائسهم ولا تهدم ولا ينتقص منها ولا من حيزها ولا من صليبهم ولا من شئ من اموالهم ولا يكرهون على دينهم ولا يضار احد منهم [2]	ان کو امان دی ان کی جان و مال اور ان کے کنیسوں اور صلیبوں اور ان کے تندرستوں اور بیماروں کے لئے یہ امان ایلیا کی ساری ملت کیلئے ہے، عہد کیا جاتا ہے کہ ان کے کنیسوں کو مسلمانوں کا مسکن نہ بنایا جائیگا، نہ ان کو منہدم کیا جائیگا، نہ ان کے احاطوں اور ان کی عمارتوں میں کوئی کمی کیجائیگی، نہ ان کی صلیبوں اور ان کے اموال میں سے کسی چیز کو نقصان پہونچایا جائیگا، ان پر دین کے معاملہ میں کوئی جبر نہ کیا جائیگا، اور نہ ان میں سے کسی کو ضرر پہونچایا جائیگا،

[1] ابو یوسف کا بیان ہے کہ حضرت ابوبکرؓ نے اسی صلحنامہ کو نافذ فرمایا، کتاب الخراج صفحہ ۱۴۴

[2] یہ صلحنامہ اس وقت لکھا گیا تھا جب اہل بیت المقدس کی قوت مقابلہ بالکل ٹوٹ چکی تھی،

اہل دمشق کو حضرت عمرؓ نے جو صلحنامہ لکھ دیا اس کے الفاظ یہ ہیں:۔

اعطاھم امانا علی انفسھم و اموالھم، وکنائسھم وسور مدینتھم لایھدم ولایسکن شئی من دورھم لھم بذالک عھد اللہ وذمۃ رسولہ... لایعرض لھم الا بخیر اذا اعطوا الجزیۃ۔	ان کو امان دی ان کی جان و مال کے لئے اور ان کے کنیسوں اور ان کے شہر کی فصیل کے لئے، ان کے مکانات میں سے نہ کوئی توڑا جائیگا اور نہ مسلمانوں کا مسکن بنایا جائیگا۔ اس پر ان کے لئے اللہ کا عہد اور اس کے رسول کا ذمہ ہے .... ان کے ساتھ ہمیشہ نیک سلوک کیا جائے گا، جب تک وہ جزیہ ادا کرتے رہیں گے۔

حضرت خالد بن ولید نے اہل عانات کو جو صلحنامہ لکھ دیا تھا اس کے الفاظ یہ ہیں:۔

لایھدم لھم بیعۃ ولاکنیسۃ وعلی ان یضربوا نواقیسھم فی ای ساعۃ شاؤا من لیل او نھار الافی اوقات الصلوٰۃ وعلی ان یخرجوا الصلبان فی ایام عیدھم۔	ان کا کوئی معبد اور کوئی گرجا منہدم نہ کیا جائے گا، وہ رات دن میں جس وقت چاہیں اپنے ناقوس بجائیں، مگر اوقات نماز کا احترام ملحوظ رکھیں ان کو حق ہوگا کہ اپنے ایام عید میں صلیبیں نکالیں۔

بعلبک کے لوگوں کو حضرت ابوعبیدہؓ نے جو صلحنامہ لکھ کر دیا تھا اس کے الفاظ یہ ہیں:۔

ھذا کتاب امان لفلان بن فلان و اھل بعلبک رومھا و فرسھا وعربھا علی انفسھم واموالھم، وکنائسھم، ودورھم داخل المدینۃ وخارجھا و علی ارحائھم....	یہ امان کی تحریر ہے فلاں بن فلاں اور اہل بعلبک کے لئے عام اس سے کہ وہ رومی ہوں یا فارسی یا عرب امان ہے، ان کی جان، مال، کنائس اور مکانات کے لئے عام اس سے کہ وہ شہر کے اندر ہوں یا باہر اور ان کی چکیوں کے لئے .... ان میں سے جو مسلمان ہو جائیگا اس کے وہی

لہ یہ صلحنامہ اس وقت لکھا گیا تھا جب ابوعبیدہؓ دمشق فتح ہو چکا تھا اس غالباً یہاں حاکم بعلبک کا نام ہوگا۔

من استغرقهم من دينه   حقوق میں جو ہمارے ہیں اور اس پر ذمی فرائض
ما علينا ولتجارهم ان يترددوا   میں جو ہم پر ہیں، ان کے تاجروں کو حق ہوگا کہ جن ملکوں
الى حيث ارادوا من البلاد   سے ہماری صلح ہو چکی ہے، ان میں آزادی کے ساتھ
التي صالحنا عليها وعلى من   آمد و رفت رکھیں، ان میں سے جو کوئی اپنے دین پر
اقام منهم الجزية والخراج   قائم رہیگا، اس کے لئے جزیہ اور خراج ہے۔

اہل دبیل کے صلحنامہ میں حبیب بن مسلمہؓ نے لکھا:-

هذا كتاب من حبيب بن مسلمة   یہ تحریر ہے حبیب بن مسلمہؓ کی جانب سے اہل دبیل
لنصارى اهل دبيل ومجوسها   کے لئے عام اس سے کہ وہ عیسائی ہوں یا مجوسی
ويهودها، شاهدهم وغائبهم   یا یہودی، حاضر ہوں یا غائب، میں نے تم کو
اني امنتكم على انفسكم واموالكم   امان دی تمہاری جانوں اور مالوں اور کنیسوں
وكنائسكم وبيعكم وسور   اور معبدوں، اور تمہارے شہر کی فصیل کے لئے، پس
مدينتكم فانتم آمنون و   تم امان میں ہو اور جب تک تم اپنے عہد پر قائم ہو اور
علينا الوفاء لكم بالعهد ما   جزیہ و خراج ادا کرتے رہو، ہم پر فرض ہے کہ
وفيتم واديتم الجزية   اس عہد کو پورا کریں،
والخراج.

آذربائیجان کے صلحنامہ میں حذیفہ بن الیمانؓ نے لکھا:-

الامان على انفسهم واموالهم   امان ہے ان کی جان و مال اور ان کی ملتوں
وملهم وشرائعهم   اور ان کی شریعتوں کے لئے،

جرجان کے صلحنامہ میں انھیں حذیفہؓ نے لکھا کہ:-

لهم الامان على انفسهم   ان کی جان و مال اور ان کی ملتوں اور شریعتوں
واموالهم وملهم وشرائعهم   کے لئے امان ہے، ان میں سے کسی چیز میں تغیر
ولا يغير شيء من ذالك   نہ کیا جائیگا،

ماہ دینار کے صلحنامہ میں انھوں نے لکھا کہ:-

لا یغیر ان عن ملتہ ولا یحال بینہم وبین شرائعہم	ان کو مذہب بدلنے پر مجبور نہ کیا جائیگا اور نہ ان کے مذہبی قوانین میں مداخلت کی جائیگی۔

ہم نے اتنی تفصیل کے ساتھ یہ معاہدات اس لئے نقل کئے ہیں کہ قارئین کرام کو اسلام کے انداز مصالحت کا ایک عمومی تصور ہو جائے، ایک دو معاہدات کو دیکھکر یہ خیال پیدا ہونا ممکن ہے، کہ شاید کسی خاص حالت میں رسول اللہ صلعم اور آپ کے صحابہؓ نے مجبوراً ایسی شرائط قبول کر لی ہوں گی، لیکن یہاں عرب، شام، الجزیرہ، اور فارس وغیرہ ممالک کے تین عہدنامے آپ کے سامنے موجود ہیں، اور تاریخوں میں ان کے علاوہ بیسیوں اور عہدنامے مل سکتے ہیں جن کے اندر ایک ہی قسم کی فیاضانہ روح پائی جاتی ہے ہم نے خصوصیت کے ساتھ ان معاہدات کو نقل کیا ہے جو نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے صحابہؓ نے پوری طرح غالب آجانے کے بعد کئے تھے۔ نجران کا معاہدہ اس وقت ہوا تھا جب تمام عرب پر اسلام کی دھاک بیٹھ چکی تھی، اور خود اہل نجران نے خوفزدہ ہو کر اپنے سید اور عاقب کو مصالحت کے لئے بھیجا تھا، حیرہ کا معاہدہ اس وقت ہوا جب اس کے گرد و پیش کے مقامات کو خالد بن ولیدؓ کی بے پناہ تلوار فتح کر چکی تھی، اور اہل حیرہ نے اپنی خیریت اسی میں دیکھی تھی، کہ خود آگے بڑھکر اطاعت قبول کریں۔ دمشق اور بیت المقدس کے متعلق تو آپ کو معلوم ہی ہو چکا ہے، کہ وہ قریب قریب فتح ہو چکے تھے۔ اور اگر مسلمان چاہتے کہ انہیں بزور شمشیر فتح کریں تو یہ ان کے لئے کچھ مشکل نہ تھا۔ ایسی حالت میں صلح کرنا اور ان شرائط پر کرنا جو اوپر کے معاہدات میں درج ہیں، کسی ایسی قوم کا فعل نہیں ہو سکتا تھا جس کا مقصد اپنے مذہب کی جبریہ اشاعت کرنا ہوتا، یا جس نے غیر مذہب کا نام مٹانے کے لئے تلوار اٹھائی ہوتی۔ یا جو محض لوٹ مار اور حصول ملک و مال کے لئے نکلی ہوتی۔

غیر معاہدین | مفتوحین کی دوسری قسم میں وہ لوگ ہیں جو آخر وقت تک مسلمانوں سے لڑتے رہے ہوں۔ اور جنہوں نے اس وقت ہتھیار ڈالے ہوں جب اسلامی فوجیں ان کے استحکامات کو توڑ کر ان کی بستیوں میں فاتحانہ داخل ہو چکی ہوں۔ ایسے مفتوحین کے بارے

میں اسلام سے قبل فاتح قوم کا یہ حق تسلیم کیا ہے کہ اگر وہ چاہے تو ان کے تمام ہتھیار اٹھانے والے مردوں کو قتل کر دے، ان کی عورتوں اور بچوں کو غلام بنالے اور ان کی املاک پر قبضہ کرلے لیکن طریق دوئم یہ بتایا ہے کہ ان کو بھی ذمی بنا لیا جائے، اور اسی حال پر رہنے دیا جائے جس پر وہ جنگ سے پہلے تھے، آپ کو معلوم ہے کہ اس زمانہ کا عام دستور ہی یہ تھا کہ مفتوحوں کو غلام بنا لیتے، ان کے املاک پر قبضہ کر لیتے اور شہروں کی تسخیر کے بعد قتل عام کر کے ان کی جنگی طاقت کو فنا کر دیتے تھے، اسلام کے لئے، اس عام وقتی ذہنیت کو دفعۃً بدل دینا مشکل تھا، وقت کی روح سے جنگ کرنا اس کے طریق اصلاح کے خلاف تھا، اس لئے اس نے ایک طرف رواجوں اور دستوروں سے متاثر دماغوں کو مطمئن کرنے کے لئے پچھلے طریقہ کو ظاہری شکل میں باقی رکھا، اور دوسری طرف رسول اکرم اور آپ کے صحابہؓ نے اپنی رہنمائی سے مسلمانوں میں اتنی فراخ حوصلگی اور فیاضی کی اسپرٹ پیدا کر دی کہ انھوں نے خود ہی اس اجازت سے فائدہ اٹھانا پسند نہ کیا، اور رفتہ رفتہ ایک جوابی رواج ایسا پیدا ہو گیا جس نے پچھلے رواج کو منسوخ کر دیا، عہد رسالت اور عہدِ خلفاے راشدینؓ بلکہ پورے عہدِ اسلامی کی تاریخ شاہد ہے کہ مسلمانوں نے ہزاروں ملکوں اور شہروں کو عنوۃً فتح کیا، مگر کسی ایک میں بھی نہ قتل عام کیا، نہ باشندوں کو غلام بنایا، اور نہ ان کی املاک ضبط کیں[1]، عہد رسالت میں خیبر عنوۃً فتح ہوا اور آنحضرت صلعم نے اس کے باشندوں کو ذمی بنا لیا، مکہ عنوۃً فتح ہوا، اور نہ زمین فوج میں تقسیم کی گئی نہ باشندوں کو غلام بنایا گیا، غزوۂ حنین میں ہوازن مغلوب ہوئے اور آنحضرت صلعم کے حکم سے ان کی جان بخشی کی گئی، حضرت عمرؓ کے زمانہ میں جب عراق وشام کے علاقے عنوۃً فتح ہوئے تو پہلی مرتبہ اسلامی فوج میں یہ جذبہ پیدا ہوا کہ حق فتح سے فائدہ اٹھا کر زمین تقسیم کر دیجائے اور باشندے غلام بنا لئے جائیں، چنانچہ انھوں نے حضرت عمرؓ سے کہا کہ:۔

"ہم نے اس زمین کو اپنا خون بہا کر فتح کیا ہے، اس لئے آپ اسے ہمارے

---

[1] بنی قریظہ ...... اس سے مستثنیٰ ہے، اور اس پر مفصل بحث آگے آتی ہے۔

درمیان تقسیم کیجئے اور اس کے باشندوں کو غلام بنا لیجئے۔

مگر حضرت عمرؓ نے اپنے زبردست دلائل سے ان کے دلوں کا رخ پھیر دیا اور یہ قدیم ذہنیت ہمیشہ کے لئے بدل گئی۔[1] امام ابو یوسفؒ نے وہ پورا مباحثہ نقل کیا ہے جو اس مسئلہ پر صحابہؓ کی کونسل میں ہوا تھا۔ اس کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ اصلاح کا عمل کس طرح انجام پذیر ہوا۔ حضرت بلالؓ اور حضرت عبدالرحمن بن عوفؓ کا مطالبہ تھا کہ زمین فوج میں تقسیم کی جائے اور باشندوں کو لونڈی غلام بنا لیا جائے۔ لیکن حضرت عثمانؓ حضرت علیؓ، حضرت طلحہؓ، حضرت عبداللہ بن عمرؓ اور انصارؓ کے تمام اکابر اس کے مخالف تھے اور سب کی رائے یہ تھی کہ ملک کو تقسیم کرنے اور باشندوں کو غلام بنانے کی پالیسی کسی طرح مناسب نہیں ہے۔ خود حضرت عمرؓ سخت مخالف تھے۔ انھوں نے تقریر کرتے ہوئے فرمایا:۔

"میری رائے یہ ہے کہ زمین کو اس کے غیر مسلم باشندوں کے ہاتھ میں چھوڑ دوں ان کی زمین پر خراج اور ان کی گردنوں پر جزیہ مقرر کر دوں۔ اور اس طرح یہ زمین مسلمانوں کے سپاہیوں اور بال بچوں اور آئندہ نسلوں کی بسر اوقات کے لئے فئے کے حکم میں ہو جائے۔ اب کیا آپ لوگوں کی یہ رائے ہے کہ ان علاقوں کو لوگوں کی ذاتی ملک بنا دیا جائے؟ کیا آپ کے نزدیک شام، الجزیرہ، کوفہ، بصرہ اور مصر جیسے بڑے بڑے صوبوں کو فوج میں تقسیم کر دینا ضروری ہے؟ اگر ایسا کر دیا گیا تو پھر لوگوں کے وظائف اور غرباء کے وظیفے کہاں سے آئیں گے؟"[2]

اس پر پوری کونسل نے بالاتفاق حضرت عمرؓ کی تجویز منظور کر لی اور تمام اہل عراق ذمی بنا لئے گئے۔ شام کی فتح کے بعد بھی یہی جھگڑا اٹھا تھا۔ اور اس وقت حضرت زبیر بن العوامؓ معارضینؓ کے لیڈر تھے۔ مگر حضرت عمرؓ نے اس کا بھی وہی فیصلہ کیا جو مسئلہ عراق کا کیا تھا۔ اس کے بعد پھر کبھی مسلمانوں میں یہ جذبہ پیدا نہیں ۔

[1] طبری مطبوعہ یورپ صفحہ [illegible]۔ فتوح البلدان صفحہ [illegible]

[2] کتاب الخراج صفحہ ۲۳-۲۵

ہندوستان سے لیکر سپین تک یورپ، ایشیا اور افریقہ کی بیشمار زمینوں کو انھوں نے عنوۃً فتح کیا، اور کسی جگہ بھی حق فتح کو استعمال نہ کیا۔

اس قسم کے مفتوحین کو جب ذمی بنایا جاتا ہے، تو ان کو چند خاص حقوق دیئے جاتے ہیں، جنکی تفصیلات کتب فقہیہ میں موجود ہیں، ذیل میں ان احکام کا خلاصہ درج کیا جاتا ہے جن سے ذمیوں کی اس جماعت کی آئینی حیثیت معلوم ہوتی ہے۔

(۱) جب امام ان سے جزیہ قبول کرلے تو ہمیشہ کے لئے عقدِ ذمہ قائم ہوجائیگا: اور ان کی جان ومال کی حفاظت کرنا مسلمانوں پر فرض ہوگا، کیونکہ قبولِ جزیہ کیساتھ ہی عصمت نفس ومال ثابت ہوجاتی ہے[1]۔ اس کے بعد امام کو یا مسلمانوں کو یہ حق باقی نہیں رہتا کہ ان کی املاک پر قبضہ کریں یا انھیں غلام بنائیں، حضرت عمرؓ نے حضرت ابوعبیدہؓ کو صاف لکھا ہے کہ فاذا اخذت منهم الجزیة فلا شئ لك علیهم ولا سبیل[2]۔

(۲) عقدِ ذمہ قائم ہونے کے بعد زمینوں کے مالک وہی ہوں گے، انکی ملکیت ان کے ورثہ کو منتقل ہوگی، اور ان کو اپنی املاک میں بیع، ہبہ، رہن وغیرہ کے حاصل ہوں گے، حکومت اسلامیہ کو ان پر کسی قسم کے تصرف کا حق نہ ہوگا۔

(۳) جزیہ کی مقدار ان کی مالی حالت کے لحاظ سے متعین کیجائیگی، جو مالدار ہیں ان سے زیادہ، جو متوسط الحال ہیں ان سے کم، اور جو غریب ہیں، ان سے بہت کم لیا جائیگا۔ اور جو کوئی ذریعہ آمدنی نہیں رکھتے یا جن کی زندگی کا انحصار دوسروں کی بخشش پر ہے، ان پر جزیہ معاف کردیا جائیگا، اگرچہ جزیہ کے لئے کوئی خاص رقم متعین نہیں ہے، لیکن اس کی تعین میں یہ امر مدنظر رکھنا ضروری ہے کہ ایسی رقم مقرر کیجائے جس کا ادا کرنا، ان کے لئے آسان ہو، حضرت عمرؓ نے مالداروں پر ایک روپیہ ماہانہ، متوسط الحال لوگوں پر آٹھ آنہ مہینہ اور غریب محنت پیشہ لوگوں پر چار آنہ مہینہ جزیہ مقرر کیا تھا[3]۔

---

[1] بدائع ج ۷ ص ... [2] کتاب الخراج ص ... [3] فتح القدیر ج ۴ ص ۳۵۹، کتاب الخراج ص ...

(۴) جزیہ صرف ان لوگوں پر لگایا جائیگا جو اہل قتال ہیں غیر اہل قتال مثلاً بچے، عورتیں، مجانین، اندھے، اپاہج، اصحاب صوامع، از کار رفتہ بوڑھے، ایسے بیمار جن کی بیماری سال کے ایک بڑے حصہ تک ممتد ہو جائے، اور لونڈی غلام وغیرہ جزیہ سے مستثنیٰ ہیں۔[4]

(۵) عنوۃً فتح ہونے والے شہر کے معابد اور کنائس پر مسلمانوں کو قبضہ کر لینے کا حق ہے لیکن اس حق سے استفادہ نہ کرنا اور بطریق احسان ان کو علی حالہ قائم رہنے دینا اولیٰ اور افضل ہے۔ حضرت عمرؓ کے زمانہ میں جتنے ممالک فتح ہوئے، ان میں کوئی معبد نہ توڑا گیا اور نہ اس سے کسی قسم کا تعرض کیا گیا۔ امام ابو یوسفؒ نے لکھا ہے ترکت علی حالہا ولم تھدم ولم یتعرض لھم، ان کو بحال رکھا گیا، انھیں نہ توڑا گیا، اور نہ کسی قسم کا تعرض کیا گیا۔[5] قدیم معابد کو مسمار کرنا بہر حال ناجائز ہے۔[6]

ذمیوں کے عام حقوق۔ اب ہم ذمیوں کے وہ حقوق بیان کریں گے جو تمام اہل ذمہ کیلئے عام ہیں خواہ وہ معاہد ہوں یا غیر معاہد، صلحاً فتح ہوئے ہوں یا عنوۃً۔

(۱) ذمی کے خون کی قیمت مسلمان کے خون کے برابر ہے، اگر کوئی مسلمان ذمی کو قتل کریگا تو اس کا قصاص اسی طرح لیا جائیگا جس طرح مسلمان کے قتل کرنے کی صورت میں لیا جاتا ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں ایک مسلمان نے ایک ذمی کو قتل کیا تو آپؐ نے اس کے قتل کا حکم دیا اور فرمایا کہ انا احق من وفی بذمتہ، اس کے ذمہ کو وفا کرنے کا سب سے زیادہ حقدار میں ہوں۔[7]

حضرت عمرؓ کے زمانہ میں قبیلہ بکر بن وائل کے ایک شخص نے حیرہ کے ایک ذمی کو قتل کر دیا، اس پر آپ نے حکم دیا کہ قاتل کو مقتول کے وارثوں کے حوالہ کیا جائے۔ چنانچہ وہ مقتول کے وارث کو دیدیا گیا، اور اس نے اسے قتل کر دیا۔[8]

حضرت عثمانؓ کے زمانہ میں خود عبید اللہ بن عمرؓ کے قتل کا فتویٰ دیدیا گیا تھا کیونکہ انھوں نے

---

۴ بدائع ج ۲ ص [illegible] فتح القدیر ج ۴ ص [illegible] کتاب الخراج ص [illegible] ۵ کتاب الخراج ص [illegible]
۶ بدائع ج ۷ ص [illegible] ۷ عنایہ شرح ہدایہ ص [illegible] دار قطنی نے یہ حدیث ابن عمرؓ سے نقل کی ہے [illegible]
[illegible] مرسلاً آیا ہے۔ ۸ برہان شرح مواہب الرحمن ج ۳ ص ۲۸۷

ہرمزان اور ابولؤلؤ کی بیٹی کو اس شبہ میں قتل کر دیا تھا کہ شاید وہ حضرت عمرؓ کے قتل کی سازش میں شریک ہوں۔

حضرت علیؓ کے زمانہ میں ایک مسلمان پر ایک ذمی کے قتل کا الزام لگایا گیا ثبوت مکمل ہونے کے بعد آپ نے قصاص کا حکم دیدیا، مقتول کے بھائی نے آکر عرض کیا کہ میں نے خون معاف کیا مگر آپ مطمئن نہ ہوئے اور فرمایا کہ "لعلھم فزعوک او ھددوک" "شاید لوگوں نے تجھے ڈرایا دھمکایا ہے" اس نے جواب دیا کہ نہیں، مجھے خون بہا مل چکا ہے اور میں سمجھتا ہوں کہ اس کے قتل سے میرا بھائی واپس نہیں آجائیگا۔ تب آپ نے قاتل کو رہا کیا، اور فرمایا کہ "من کان له ذمتنا فدمه کدمنا ودیته کدیتنا"[1] "جو کوئی ہمارا ذمی ہو اس کا خون ہمارے خون کی طرح اور اس کی دیت ہماری دیت کی طرح ہے"، ایک دوسری روایت کے مطابق حضرت علیؓ نے فرمایا، "انما قبلوا عقد الذمة لتکون اموالھم کاموالنا ودماءھم کدمائنا" "انھوں نے عقد ذمہ قبول ہی اس لئے کیا ہے کہ ان کے مال ہمارے مال کیطرح اور ان کے خون ہمارے خون کی طرح ہو جائیں"۔ اسی قول کی بنا پر فقہا نے یہ جزئیہ نکالا ہے کہ اگر مسلمان کسی ذمی کو بلا ارادہ قتل کرے تو اس کی دیت بھی وہی ہوگی جو مسلمان کو خطأً قتل کرنے سے لازم آتی ہے۔[2]

(۲) تعزیرات میں ذمی اور مسلمان کا درجہ مساوی ہے، جرائم کی جو سزا مسلمان کو دیجائیگی وہی ذمی کو بھی دیجائیگی۔ ذمی کا مال مسلمان چرائے یا مسلمان کا مال ذمی چرائے دونوں صورتوں میں سارق کا ہاتھ کاٹا جائیگا، ذمی کسی مسلمان عورت سے زنا کرے، یا مسلمان کسی ذمی عورت سے زنا کرے، دونوں صورتوں میں سزا یکساں ہوگی۔[3] وھلم جرا۔

(۳) دیوانی قانون میں بھی ذمی اور مسلمان کے درمیان کامل مساوات ہے، حضرت علیؓ کے ارشاد۔ "اموالھم کاموالنا" کے معنی ہی یہ ہیں کہ ان کے مال کی ویسی ہی حفاظت ہونی چاہئے جیسی مسلمانوں کے مال کی ہوتی ہے، اس باب میں ذمیوں کے حقوق کا اتنا لحاظ

۱؎ برہان ج ۲ ص ۲۸۰، ہمارے پیش نظر برہان کا وہ قلمی نسخہ ہے جو مدرسہ امینیہ دہلی کے کتبخانہ میں موجود ہے۔ ۲؎ درالمختار جلد ۳

۳؎ کتاب الخراج صفحہ ۱۰۸-۱۰۹

رکھا گیا ہے کہ اگر کوئی مسلمان ان کی شراب یا ان کے خنزیر کو بھی تلف کردے تو اس پر ضمان لازم آئیگا، در المختار میں ہے ویضمن المسلم قیمۃ خمرہ وخنزیرہ اذا اتلفہ۔ مسلمان اس کی شراب اور اس کے سور کی قیمت ادا کریگا، اگر وہ اسے تلف کردے۔

(۴) ذمی کو زبان یا ہاتھ پاؤں سے تکلیف پہونچانا، اس کو گالی دینا، مارنا پیٹنا یا اس کی غیبت کرنا، اسی طرح ناجائز ہے جس طرح مسلمان کے حق میں ناجائز ہے، در المختار میں ہے، ویجب کف الاذیٰ عنہ وتحرم غیبتہ کالمسلم۔

(۵) عقد ذمہ مسلمانوں کی جانب ابدی لزوم رکھتا ہے یعنی وہ اسے باندھنے کے بعد پھر توڑ دینے کے مختار نہیں ہیں۔ لیکن دوسری جانب ذمیوں کو اختیار ہے کہ جب تک چاہیں اس پر قایم رہیں اور جب چاہیں توڑ دیں، بدائع میں ہے، واما صفۃ العقد فھو لازم فی حقنا حتی لا یملک المسلمون نقضہ بحال من الاحوال، واما فی حقھم فغیر لازم۔

(۶) ذمی خواہ کیسے ہی بڑے جرم کا ارتکاب کرے، اس کا ذمہ نہیں ٹوٹتا حتی کہ جزیہ بند کردینا، مسلمان کو قتل کرنا، نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی شان میں گستاخی کرنا، یا کسی مسلمان عورت کی آبروریزی کرنا بھی اس کے حق میں ناقض ذمہ نہیں ہے، البتہ صرف دو صورتیں ایسی ہیں جنمیں عقد ذمہ باقی نہیں رہتا، ایک یہ کہ وہ دار اسلام کو چھوڑ کر دشمنوں سے جا ملے، دوسرے یہ کہ حکومت اسلامیہ کے خلاف علانیہ بغاوت کرکے فتنہ وفساد برپا کردے۔

(۷) ذمیوں کے معاملات ان کی شریعت کے مطابق طے کیے جائیں گے، اسلامی قانون ان پر نافذ نہیں کیا جائیگا، جن افعال کی حرمت ان کے مذہب میں ثابت ہے۔ ان سے تو وہ ہر حال میں منع کیے جائیں گے۔ البتہ جو افعال ان کے ہاں جائز اور اسلام میں ممنوع ہیں انھیں وہ اپنی بستیوں میں آزادی کے ساتھ کرسکیں گے، اور خالص اسلامی آبادیوں میں حکومت اسلامیہ کو اختیار ہوگا کہ انھیں آزادی دے یا نہ دے، بدائع میں ہے۔

سلہ جلد ۳ صفحہ ۲۰۰ ... سلہ تاتارخانیہ ... سلہ جلد ۳ صفحہ ... سلہ بدائع ج ۷ ص ... فتح القدیر ج ۴ ص ۳۸۱ ... سلہ خاص اسلامی آبادیوں سے مراد وہ مقامات ہیں جو اصطلاح شرع میں امصار المسلمین کہلاتے ہیں، اس قسم کے ... حرف انھیں مقامات پر ... جنگی زمین مسلمانوں کی ملک ہو ... نے خود شعائر اسلامی کے لیے مخصوص کرلیا ہو۔

جو بستیاں اور مقامات امصارِ مسلمین میں سے نہیں ہیں ان میں ذمیوں کو شراب وخنزیر بیچنے، اور صلیب نکالنے اور ناقوس بجانے سے نہیں روکا جائیگا، خواہ وہاں مسلمانوں کی کتنی ہی کثیر تعداد آباد ہو، البتہ یہ افعال امصارِ مسلمین میں مکروہ ہیں جہاں جمعہ وعیدین اور حدود قائم کی جاتی ہوں .... رہا وہ فسق جس کی حرمت کے وہ بھی قائل ہیں، مثلاً زنا اور دوسرے تمام فواحش جو ان کے دین میں بھی حرام ہیں تو اس کے اظہار سے ان کو ہر حال میں روکا جائیگا، خواہ وہ امصارِ مسلمین میں ہوں، یا خود اپنے امصار میں۔	ولا یمنعون من اظهار شئ مما ذکرنا من بیع الخمر والخنزیر والصلیب وضرب الناقوس فی قریة او موضع لیس من امصار المسلمین ولو کان فیه عدد کثیر من اهل الاسلام وانما یکره ذالك فی امصار المسلمین وهی التی یقام فیها الجمع والاعیاد والحدود....... واما اظهار فسق یعتقدون حرمته کالزنا وسائر الفواحش التی حرام فی دینهم فانهم یمنعون من ذالك سواء کانوا فی امصار المسلمین او فی امصارهم۔

لیکن امصارِ مسلمین میں بھی ان کو صرف صلیبوں اور مورتیوں کے جلوس نکالنے اور علانیہ ناقوس بجاتے ہوئے بازاروں میں نکلنے کی ممانعت کی گئی ہے[2]، ورنہ اپنے قدیم معابد کے اندر رہکر وہ تمام شعائر کا اظہار کرسکتے ہیں، حکومت اسلامیہ اس میں دخل دینے کی مجاز نہیں ہے۔

(۸) امصارِ مسلمین میں ذمیوں کے جو قدیم معابد ہوں ان سے تعرض نہیں کیا جاسکتا، اگر

---

[1] بدائع ج ۷ ص ۱۱۳ [2] امصار مسلمین میں یہ قیود عائد کرنے کا مقصد یہ ہے کہ مسلمانوں اور غیر مسلموں کے درمیان تصادم کے مواقع پیدا نہ ہوں، افسوس ہے کہ بعد کے لوگوں نے اس کا منشا کچھ اور سمجھا۔

ٹوٹ جائیں تو انہیں اسی جگہ دوبارہ بنا لینے کا حق ہے لیکن نئے معبد بنانے کا حق نہیں ہے۔[1]

(۹) جو مقامات امصار مسلمین نہیں ہیں ان میں ذمیوں کو نئے معابد بنانے کی بھی عام اجازت ہے، اسی طرح جو مقامات "مصر" نہ رہے ہوں یعنی امام نے اس کو ترک کرکے اقامت جمعہ و اعیاد اور اقامت حدود کا سلسلہ بند کر دیا ہو، ان میں بھی نئے معابد کی تعمیر اور اظہار شعائر کفر جائز ہے۔[2] ابن عباسؓ کا فتویٰ یہ ہے کہ :-

اما مصر مصرته العرب فليس للعجم ان يحدثوا فيه بناء بيعة ولا كنيسة ولا يضربوا فيه بناقوس ولا يظهروا فيه خمرا ولا يتخذوا فيه خنزيرا وكل مصر كانت العجم مصرته ففتحه الله على العرب فنزلوا على حكمهم فللعجم ما في عهدهم وعلى العرب ان يوفوا لهم بذلك[3]

جن شہروں کو مسلمانوں نے آباد کیا ہے ان میں ذمیوں کو یہ حق نہیں ہے کہ نئے معابد اور کنائس تعمیر کریں یا ناقوس بجائیں یا شراب پئیں اور سور پالیں۔ باقی رہے وہ شہر جو عجمیوں کے آباد کئے ہوئے ہیں اور جن کو اللہ نے عربوں (یعنی مسلمانوں) کے ہاتھ پر فتح کیا اور عجم نے مسلمانوں کے حکم پر اطاعت قبول کر لی، تو عجم کے لئے وہی حقوق ہیں جو ان کے معاہدہ میں طے ہو جائیں اور عرب پر ان کا ادا کرنا لازم ہے۔

(۱۰) جزیہ و خراج کے معاملہ میں ذمیوں پر تشدد کرنا ممنوع ہے۔ ان کے ساتھ نرمی اور رفق کی تاکید کی گئی ہے، اور ان پر ایسا بار ڈالنے سے منع کیا گیا ہے جسے اٹھانے کی ان میں قدرت نہ ہو۔

جزیہ کی مقدار مقرر کرنے میں ذمیوں پر تشدد کرنا ممنوع ہے۔ ان کے ساتھ نرمی اور رفق کی حضرت عمرؓ کی وصیت ہے کہ لا یکلفوا فوق طاقتهم جتنا مال دینا ان کی طاقت سے باہر ہو اس کے ادا کرنے کی تکلیف نہ دو۔[4]

جزیہ کے عوض ان کی املاک کا نیلام نہیں کیا جا سکتا۔ حضرت علیؓ کا حکم ہے کہ لا تبیعن

[1] [illegible]

[2] [illegible]

[3] [illegible]

[4] ایضاً ص [illegible]

لهم في خراجهم حمارا ولا بقرة ولا كسوة شيئا ولا صيفا. خراج میں نہ کا گدھا یا ان کی گائے یا ان کے کپڑے نہ بیچنا[1] ایک اور موقع پر اپنے عامل کو بھیجتے وقت جناب امیر علیہ السلام نے فرمایا:-

"ان کے جاڑے گرمی کے کپڑے اور ان کے کھانے کا سامان اور ان کے جانور جن سے وہ کھیتی باڑی کرتے ہیں خراج وصول کرنے کی خاطر ہرگز نہ بیچنا، نہ کسی کو درہم وصول کرنے کے لئے کوڑے مارنا، نہ کسی کو کھڑا رکھنے کی سزا دینا، اور نہ خراج کے عوض کسی چیز کا نیلام کرنا، کیونکہ ہم جو ان کے حاکم بنائے گئے ہیں تو ہمارا کام نرمی سے وصول کرنا ہے، اگر تم نے میرے حکم کے خلاف عمل کیا تو اللہ میرے بجائے تمکو پکڑیگا، اور اگر مجھے تمھاری خلاف ورزی کی خبر پہونچی تو میں تمھیں معزول کر دونگا[2]"

جزیہ کی تحصیل میں ان پر ہر قسم کی سختی کرنے سے منع کیا گیا ہے، حضرت عمرؓ نے شام کے گورنر حضرت ابو عبیدہؓ کو جو فرمان لکھا تھا، اس میں منجملہ اور احکام کے ایک یہ بھی تھا کہ:-

وامنع المسلمين من ظلمهم والاضرار بهم واكل اموالهم الا بحلها[3].	مسلمانوں کو ان پر ظلم کرنے، اور انھیں ضرر پہونچانے اور ناجائز طریقہ سے ان کے مال کھانے سے منع کرنا،

شام کے سفر میں حضرت عمرؓ نے دیکھا کہ ان کے عامل جزیہ وصول کرنے کے لئے ذمیوں کو سزائیں دے رہے ہیں، اس پر آپ نے فرمایا کہ ان کو تکلیف نہ دو، اگر تم انھیں عذاب دوگے تو قیامت کے دن اللہ تمھیں عذاب دیگا، لا تعذبوا الناس فان الذين يعذبون الناس في الدنيا يعذبهم الله يوم القيامة[4]،

ہشام بن حکم نے حمص کے ایک سرکاری افسر کو دیکھا کہ وہ ایک قبطی کو جزیہ وصول کرنے کے لئے دھوپ میں کھڑا کر رہا ہے، اس پر انھوں نے اسے ملامت کی اور کہا کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے سنا ہے کہ، ان اللہ عز وجل یعذب الذین یعذبون

---

[1] فتح البیان ج ۴ ص ۹۳، [2] کتاب الخراج صفحہ ۹، [3] کتاب الخراج صفحہ ۲۴، [4] کتاب الخراج صفحہ ۰۰

الناس فی الدنیا" اللہ عزوجل ان لوگوں کو عذاب دیگا جو دنیا میں لوگوں کو عذاب دیتے ہیں۔

فقہائے اسلام نے نادہندوں کے حق میں صرف اتنی اجازت دی ہے کہ انھیں تادیباً قید بے مشقت کی سزا دی جاسکتی ہے، امام ابو یوسفؒ نے لکھا ہے "ولکن یرفق بھم ویحبسون حتی یوددوا ما علیھم"۔

(۱۱) جو ذمی محتاج اور فقیر ہوجائیں انھیں صرف جزیہ سے معاف ہی نہیں کیا جائیگا بلکہ ان کے لئے اسلامی خزانہ سے وظائف بھی مقرر کیے جائیں گے۔ حضرت خالدؓ نے اہل حیرہ کو جو امان نامہ لکھ کر دیا تھا اس میں لکھتے ہیں:۔

وجعلت لھم ایما شیخ ضعف عن العمل او اصابتہ آفۃ من الآفات او کان غنیاً فافتقر وصار اھل دینہ یتصدقون علیہ طرحت جزیتہ وعیل من بیت مال المسلمین ھو وعیالہ

میں نے ان کے لئے یہ حق بھی رکھا ہے کہ جو کوئی شخص بڑھاپے کے سبب از کار رفتہ ہوجائے یا اس پر کوئی آفت نازل ہوجائے، یا وہ پہلے مالدار تھا پھر فقیر ہوگیا یہاں تک کہ اس کے ہم مذہب لوگ اسکو صدقہ خیرات دینے لگے، تو اس کا جزیہ معاف کردیا جائیگا اور اسے اور اس کے بال بچوں کو مسلمانوں کے بیت المال سے خرچ دیا جائیگا۔

ایک دفعہ حضرت عمرؓ نے ایک ضعیف العمر ذمی کو بھیک مانگتے دیکھا اور اس سے اس ذلیل حرکت کا سبب دریافت کیا، اس نے کہا کہ جزیہ ادا کرنے کے لئے بھیک مانگتا ہوں اس پر آپ نے اس کا جزیہ معاف کردیا، اس کے لئے وظیفہ مقرر کیا اور اپنے خزانچی کو لکھا کہ:۔

"واللہ ما انصفناہ" یہ ہرگز انصاف نہیں ہے کہ ہم اس کی جوانی میں اس سے فائدہ اٹھائیں اور بڑھاپے میں اس کو رسوا کریں۔

دمشق کے سفر میں بھی حضرت عمرؓ نے معذور ذمیوں کے لئے امدادی وظائف مقرر کرنے کے احکام جاری کیے تھے۔

[illegible]

[illegible] صفحہ ... ۔ فتوح البلدان بلاذری صفحہ ۱۲۹

(۱۲) اگر کوئی ذمی مرجائے اور اس کے حساب میں جزیہ کا بقایا واجب الادا ہو، تو وہ اسکے ترکہ سے وصول نہیں کیا جائیگا، اور نہ اس کے ورثہ پر اسکا بار ڈالا جائیگا، امام ابو یوسف لکھتے ہیں کہ ان وجبت علیہ الجزیۃ فمات قبل ان توخذ منہ او اخذ بعضھا وبقی البعض لم یوخذ بذالك ورثتہ ولم توخذ من ترکتہ۔[1]

(۱۳) مسلمان تاجروں کی طرح ذمی تاجروں کے اموال تجارت پر بھی ٹیکس لیا جائیگا جبکہ ان کا راس المال ۲۰۰ درہم تک پہونچ جائے یا وہ ۲۰ متقال سونے کے مالک ہوجائیں[2] اسمیں شک نہیں کہ فقہانے ذمی تاجر پر جارتی محصول ۵ فی صدی لگایا ہے، اور مسلمان تاجر پر ۲½ فی صدی، لیکن یہ فعل نص پر مبنی نہ تھا بلکہ اجتہاد پر مبنی تھا، اور وقتی مصالح اسی کے مقتضی تھے، اس زمانہ میں مسلمان زیادہ تر جہاد اور ثغور اسلامیہ کی حفاظت میں مشغول رہتے تھے، اور تمام تجارت ذمیوں کے ہاتھ میں آگئی تھی، اس لئے مسلمان تاجرون کی ہمت افزائی اور ان کی تجارت کے تحفظ کے لئے ان پر ٹیکس کم کر دیا گیا،

(۱۴) ذمی فوجی خدمت سے مستثنیٰ ہیں اور دشمن سے ملک کی حفاظت کرنا تنہا مسلمانوں کے فرائض میں داخل کیا گیا ہے، چونکہ ان سے جزیہ اسی حفاظت کے معاوضہ میں وصول کیا جاتا ہے، اس لئے اسلام نہ تو ان کو فوجی خدمت کی تکلیف دینا جائز سمجھتا ہے، اور نہ انکی حفاظت سے عاجز ہونے کی صورت میں جزیہ وصول کرنا، اگر مسلمان ان کی حفاظت نہ کرسکے، تو انھیں ذمیوں کے اموال جزیہ سے فائدہ اٹھانے کا کوئی حق باقی نہیں رہتا، جنگ یرموک کے موقع پر جب رومیوں نے مسلمانوں کے مقابلہ پر ایک زبردست فوج جمع کی اور مسلمانوں کو شام کے تمام مفتوح علاقے چھوڑ کر ایک مرکز پر جمع ہونے کی ضرورت لاحق ہوئی تو حضرت ابو عبیدہؓ نے اپنے امراء کو لکھا کہ جو کچھ جزیہ وخراج تم نے ذمیوں سے وصول کیا ہے، انھیں واپس کردو، اور ان سے کہو کہ "اب ہم تمھاری حفاظت سے عاجز ہیں، اس لئے ہم نے جو مال تمھاری حفاظت کے معاوضہ میں وصول کیا تھا اسے واپس کرتے ہیں"[3] اس حکم کے مطابق

[1] کتاب الخراج صفحہ ۷۰ [2] ایضاً

[3] کتاب الخراج صفحہ ۱۱۱

تمام اجناد کے امرا نے جمع شدہ رقم واپس کردی[1]۔

اسلامی قانون سے یہ چند احکام صرف یہ دکھانے کے لئے نقل کئے گئے ہیں، کہ اسلام نے اپنی مفتوح قوموں کے ساتھ جس انصاف اور عدل و مساوات کا سلوک روا رکھا ہے اس کی نظیر گذشتہ قوموں میں اور اکثر حیثیات سے موجودہ زمانہ کی مہذب قوموں میں بھی نہیں ملتی، یہ قانون محض ایک کاغذی قانون نہیں ہے بلکہ اس کے ساتھ عملی تنفیذ کی ایک شاندار تاریخ بھی موجود ہے، چنانچہ ہم نے اس قانون کی ہر ہر دفعہ کے ساتھ حدیث و تاریخ کی مستند کتابوں سے متعدد نظائر بھی پیش کر دیئے ہیں، تاکہ قارئین کو معلوم ہو جائے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے صحابہ کرامؓ نے کس طرح اس قانون کو عملی جامہ پہنایا، عہدِ رسالت صلعم اور عہد صحابہؓ کے بعد بھی فقہائے اسلام ہمیشہ اس قانون کو ٹھیک ٹھیک نافذ کرانے کی کوشش کرتے رہے ہیں، اور جب کبھی سرکش امرا نے اس کے خلاف عمل کیا ہے، تو انھوں نے اس سے باز رکھنے یا کم از کم اس کی تلافی کرنے کی کوشش کی ہے۔ تاریخ کا مشہور واقعہ ہے کہ ولید بن عبد الملک اموی نے دمشق کے کنیسہ یوحنا کو زبردستی عیسائیوں سے چھین کر مسجد میں شامل کر لیا، جب حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ تخت خلافت پر متمکن ہوئے اور عیسائیوں نے ان سے اس ظلم کی شکایت کی تو انھوں نے اپنے عامل کو حکم دیا کہ مسجد کا جتنا حصہ گرجا کی زمین پر تعمیر کیا گیا ہے، اسے منہدم کر کے عیسائیوں کے حوالہ کر دو[2]۔

ولید بن یزید نے رومی حملہ کے خوف سے قبرس کے ذمی باشندوں کو جلا وطن کر کے شام میں آباد کیا، تو اس پر فقہائے اسلام اور عام مسلمان سخت ناراض ہوئے، اور اسے گناہ عظیم سمجھا پھر جب یزید بن ولید نے ان کو دوبارہ قبرس میں لیجا کر آباد کر دیا تو اس کی عام طور پر تحسین کی گئی اور کہا گیا کہ یہی انصاف کا اقتضاء ہے۔ اسمٰعیل بن عیاش کا بیان ہے کہ، فاستفظع ذالک المسلمون واستعظمه الفقهاء، فلما ولی یزید بن الولید بن عبد الملک ردهم الی قبرس

[1] بلاذری نے لکھا ہے کہ جب مسلمانوں نے حمص میں جزیہ کی رقم واپس کی تو وہاں کے باشندوں نے کہا [illegible] تمہاری حکومت اور انصاف پسندی ہم کو اس ظلم و ستم کے مقابلہ میں زیادہ محبوب ہے جس میں ہم مبتلا تھے، اب ہم ہرقل کے عامل کو اپنے شہر میں ہرگز نہ گھسنے دیں گے تاوقتیکہ ہم مغلوب ہو جائیں۔ فتوح البلدان طبع یورپ صفحہ ۱۳۷۔ [2] فتوح البلدان صفحہ ۱۳۲۔

فاستحسن المسلمون ذالك من فعله وعدلہ علاً،[1]

بلاذری کا بیان ہے کہ ایک مرتبہ جبل لبنان کے باشندوں میں سے ایک گروہ نے بغاوت کردی، اس پر صالح بن علی بن عبد اللہ نے ان کی سرکوبی کے لئے ایک فوج بھیجی، اور اس نے ان کے ہتھیار اٹھانے والے مردوں کو قتل کردیا، اور باقی لوگوں میں سے ایک جماعت کو جلاوطن کیا اور ایک جماعت کو وہیں آباد رہنے دیا، امام اوزاعیؒ اس زمانہ میں زندہ تھے، انھوں نے صالح کو اس ظلم پر سخت تنبیہ کی، اور ایک طویل خط لکھا جس کے چند فقرے یہ ہیں:-

"جبل لبنان کے اہل ذمہ کی جلاوطنی کا حال تمکو معلوم ہے، ان میں بعض ایسے لوگ بھی تھے جنھوں نے بغاوت کرنے والوں کے ساتھ کوئی حصہ نہیں لیا تھا، مگر باوجود اس کے تم نے کچھ کو قتل کیا اور کچھ لوگوں کو ان کی بستیوں کی طرف واپس بھیجدیا، میں نہیں سمجھ سکتا کہ عام لوگوں کو بعض خاص لوگوں کے جرم کی سزا کیونکر دیجاسکتی ہے، اور کس بنا پر ان کے گھروں اور ان کی جائدادوں سے بے دخل کیا جاسکتا ہے، حالانکہ اللہ کا حکم یہ ہے کہ لا تزر وازرة وزر اخرى، اور یہ ایک واجب التعمیل حکم ہے، تمہارے لئے بہترین نصیحت یہ ہے کہ تم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد کو یاد رکھو کہ "جو کوئی کسی معاہد پر ظلم کریگا، اور اس کی طاقت سے زیادہ اس پر بار ڈالے گا اس کے خلاف میں خود مدعی بنونگا"۔[2]

یہ اور ایسی ہی بیشمار مثالیں تاریخ میں ملتی ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ ائمۂ اسلام نے ہمیشہ اہل الذمہ کے حقوق کی حمایت کی ہے، اور اگر کبھی کسی امیر یا بادشاہ نے ان پر جبر و ظلم کیا بھی ہے تو وہ اسلامی قانون کے صریح خلاف تھا جس سے اسلام بری الذمہ ہے،

ذمیوں کے لباس کا مسئلہ ایک چیز البتہ اسلام میں ایسی ملتی ہے جس پر مخالفین کو بہت کچھ اعتراض کی گنجائش مل گئی ہے، اور وہ ذمیوں کے لباس کا مسئلہ ہے، مگر افسوس ہے کہ ابتداءً اس کی جو حیثیت تھی اسے بعد میں غلط صورت دیدی گئی، اور اسی سے لوگوں کو یہ سمجھنے کا موقع مل گیا کہ اسلام نے ذمیوں کی تحقیر و تذلیل کے لئے ایک مخصوص لباس اور ایک مخصوص وضع معاشرت

[1] فتوح البلدان مطبوعہ یورپ صفحہ ۱۵۲۔ [2] فتوح البلدان صفحہ ۱۶۹۔

[illegible]

میں اس قسم کی شرط موجود ہے [illegible] ایک خاص قسم کا [illegible] مسلمانوں سے
مشابہت نہ اختیار کریں۔ شہر حیرہ کے معاہدہ میں بھی یہ الفاظ ہیں۔

ولهم كل ما لبسوا من الزی الا زی الحرب من غير ان يتشبهوا بالمسلمين ¹

ان کو حق ہو گا کہ جیسا لباس چاہیں پہنیں مگر جنگی لباس نہ پہنیں، اور مسلمانوں سے تشابہ اختیار نہ کریں۔

اسی طرح دمشق کے معاہدہ میں جس کی شرائط خود عیسائیوں کی طرف سے پیش کی گئی تھیں، یہ الفاظ موجود ہیں:

ولا نتشبه بهم فی شئ من ملابسهم فی قلنسوة ولا عمامة ولا نعلين ولا فرق شعر

ہم مسلمانوں سے ان کے لباس میں کسی قسم کی مشابہت نہ اختیار کریں گے [illegible] ٹوپیوں میں اور نہ مانگ نکالنے میں۔

ہماری کتب فقہ میں بھی اسی قسم کے احکام پائے جاتے ہیں [illegible]

ان اهل الذمة يوخذون بان يكون لهم علامات يعرفون بها ولا يتركون يتشبهون بالمسلمين فی لباسهم

اہل ذمہ کو ایسی علامات [illegible] جن سے وہ پہچانے جا سکیں اور [illegible] مسلمانوں سے تشابہ نہ اختیار کرنے دیا جائے۔

امام ابو یوسف نے بھی اپنی کتاب الخراج میں اس قسم کے احکام بیان کئے ہیں کہ ذمیوں کو مسلمانوں کے ساتھ وضع قطع میں مشابہت نہ اختیار کرنی چاہئے۔

یہ سب احکام [illegible] منقول ہیں، لیکن ان کا مقصد [illegible] تحقیر نہیں ہے بلکہ مختلف قوموں کے [illegible] جس طرح ذمیوں

¹ [illegible]

تفصیل [illegible] احکام [illegible] علیہم [illegible]
منقول نہیں ہے [illegible] احکام [illegible]
[illegible] سے منع کرنے کا مقصد [illegible]

مسلمانوں کے ساتھ تشابہ اختیار کرنے سے روکا گیا ہے، اسی طرح مسلمانوں کو بھی غیر مسلموں کے ساتھ تشابہ اختیار کرنے سے منع کردیا گیا ہے، لباس کے تشابہ میں جو مفاسد پوشیدہ ہیں ان سے اسلام غافل نہیں ہے، خصوصیت کے ساتھ محکوم قوموں میں اکثر یہ عیب پیدا ہوجایا کرتا ہے کہ وہ اپنے قومی لباس اور قومی معاشرت کو ذلیل سمجھنے لگتے ہیں، اور حاکم قوم کا لباس اور طرز معاشرت اختیار کرنے میں فخر محسوس کرتے ہیں، یہ غلامانہ ذہنیت آج بھی دنیا کی محکوم قوموں میں موجود ہے، خود ہندوستان میں ہم دیکھتے ہیں کہ بیشمار ہندی نژاد حضرات انگریزی لباس بڑے شوق کے ساتھ پہنتے ہیں اور اسے پہن کر یہ سمجھنے لگتے ہیں، کہ گویا ترقی کے کسی بہت ہی اعلیٰ مرتبہ پر پہونچ گئے ہیں، حالانکہ کوئی انگریز ہندوستانی لباس نہیں پہنتا اور اگر خالص انگریزی سوسائٹیوں میں پہنتا بھی ہے تو تفاخر کے لئے نہیں بلکہ تفنن اور مسخرہ پن کے لئے، نفسیات محکومیت کے اس نکتہ کو ائمہ اسلام خوب سمجھتے تھے، اس لئے انھوں نے اہل الذمہ کو تشابہ بالمسلمین سے منع کرکے ان کی تذلیل و تحقیر نہیں کی بلکہ ان کی قومی عزت و شرافت کو برقرار رکھا، ممکن ہے کہ اس قسم کے قوانین بعض لوگوں کی نگاہ میں موجب حقارت ہوں، مگر ہمارے نزدیک اسمیں کوئی تحقیر نہیں ہے، بلکہ ہم بہت خوش ہوں اگر ہمارے حکمراں بھی ہمکو یورپین لباس اور طرز معاشرت اختیار کرنے سے حکماً منع کردیں،

بڑی غلط فہمی ان احکام سے پیدا ہوئی ہے جنمیں کہا گیا ہے کہ ذمی زنار باندھیں، دوہرے تسمے کی جوتی پہنیں، اونچی باڑھ کی ٹوپی پہنیں اور ان کی زین کے آگے گول لکڑی ہو، لوگوں نے سمجھ لیا کہ یہ احکام ذمیوں کے حق میں دائمی ہیں اور ان کے لئے یہ وضع اسلام نے مخصوص کردی ہے۔ حالانکہ درحقیقت یہ احکام اصولی نہیں، بلکہ فروعی ہیں، اصل حکم تو یہ ہے کہ "ذمی مسلمانوں کے ساتھ تشابہ اختیار نہ کریں"، اب اس اصل سے فقہائے عصر نے فروع نکال لئے اور اسی لباس و وضع کو جو ان کے زمانہ میں عموماً عجم کے مجوسیوں اور شام کے عیسائیوں میں رائج تھی، ان کے لئے لازم کردیا، اس سے یہ ہرگز مقصود نہیں ہے کہ ہر زمانہ اور ہر ملک کے ذمی زنار باندھیں، لمبی ٹوپی اوڑھیں، اور دوہرے تسمے کی جوتی پہنیں،

یہ احکام تو صراحت سے ثابت تھے، ان کے علاوہ [illegible] منفعت [illegible] مستنبطین سے ایسے ہی دوسرے جزئی احکام مستنبط کر سکتے ہیں،

چند مستثنیات

جنگ اور متعلقات جنگ کے متعلق اسلام نے جو قواعد و ضوابط اور حدود و قیود مقرر کیے ہیں انھیں صفحات بالا میں تفصیل کے ساتھ بیان کر دیا گیا ہے، مگر رسول اکرم اور خلفائے راشدین کے زمانہ میں بعض واقعات ایسے بھی پیش آئے ہیں جو بظاہر ان قوانین سے مختلف معلوم ہوتے ہیں، اور ان سے ایک ناواقف اس شبہہ میں پڑ سکتا ہے کہ شاید اسلام کے اصل احکام وہ نہیں ہیں جو بیان کیے گئے ہیں، یا اس کے احکام میں اختلاف اور تضاد ہے، یا رسول اللہ صلعم اور صحابہؓ کا عمل اسلامی قوانین کے خلاف تھا، اس لئے اس باب کو ختم کرنے سے پہلے ضروری ہے کہ ان مستثنیٰ واقعات کی تشریح بھی کر دی جائے۔

بنو نضیر کا اخراج اس سلسلہ میں پہلا واقعہ بنو نضیر کے اخراج کا ہے۔ یہ یہودیوں کا ایک قبیلہ تھا جو صدیوں سے یثرب میں آباد تھا، ہجرت کے بعد آنحضرت صلعم کا ان سے معاہدہ ہوا اور جنگ بدر کے بعد آپ نے ان کو مدینہ سے نکال دیا، مخالفین اس واقعہ کو یہ معنی پہناتے ہیں، کہ آنحضرت صلعم نے بنی النضیر کیساتھ نعوذ باللہ مکر کیا یعنی جب کمزور تھے تو ان سے معاہدہ کر لیا اور جب طاقتور ہو گئے تو عہد توڑ کر انھیں جلاوطن کر دیا، لیکن یہ واقعہ کی محض یکطرفہ صورت فرض کر لینے کا نتیجہ ہے، ورنہ اگر اس کی تمام تفصیلات پر نظر کی جائے تو صورت واقعہ بالکل برعکس نظر آئیگی، عہد شکنی کے مجرم رسول اللہ صلعم نہیں بلکہ خود بنی نضیر نکلیں گے، اور ان کے خلاف آنحضرت صلعم کی جنگی کارروائی ظلم نہیں بلکہ عین حق ثابت ہوگی،

واقعہ یہ ہے کہ آنحضرت جب مکہ سے ہجرت کر کے مدینہ تشریف لائے تھے تو آپ نے یہودیوں کے دوسرے قبائل کی طرح بنو نضیر سے بھی ایک معاہدہ کیا تھا جس کی بنیادی شرط یہ تھی کہ فریقین ایک دوسرے کے خلاف کسی قسم کی معاندانہ کارروائی نہ کریں گے، اور نہ ایک دوسرے

ابن ہشام نے سیرت میں اس معاہدہ کو تفصیل [illegible] نقل کیا ہے۔

کے دشمنوں کی ... مدد کریں گے۔ حافظ ابن حجر نے لکھا ہے کہ :-

وادعهم على ان لا يحاربوه ولا يمالئوا عليه عدوه

ان سے موادعت کی تھی اس بات پر کہ نہ وہ آپ سے جنگ کریں گے اور نہ آپ کے خلاف آپ کے دشمنوں کی اعانت کریں گے۔

اس معاہدہ کے بعد آنحضرت صلعم اور عام مسلمان ان کی طرف سے مطمئن ہو گئے تھے اور ان سے دوستانہ میل جول شروع کر دیا تھا، لیکن شرائط معاہدہ کے بالکل خلاف وہ کفار قریش سے سازباز کرتے رہتے، چپکے چپکے ان کو مسلمانوں کے متعلق خفیہ اطلاعات فراہم کرنے لگے، موسیٰ بن عقبہ نے مغازی میں لکھا ہے کہ :-

كانت نضير قد دسوا الى قريش وحضوهم على قتال رسول الله صلى الله عليه وسلم ودلوهم على العورة

بنی نضیر قریش سے خفیہ سازش کرتے تھے، ان کو رسول اللہ صلعم کے خلاف جنگ پر ابھارتے تھے، اور انھیں خفیہ خبریں دیتے تھے،

پھر انھوں نے اسی پر بس نہ کی بلکہ آنحضرت صلعم کو قتل کرنے کی بھی متعدد مرتبہ کوشش کی، ایک مرتبہ آپ کو کہلا کر بھیجا کہ آپ اپنے ساتھ تین آدمی لیکر آئیے اور ہم بھی اپنے تین عالم بھیجتے ہیں، ایک درمیانی مقام پر ان سے آپ کا مناظرہ ہو، اور اگر آپ ان پر اپنے دین کی حقانیت ثابت کر دیں تو ہم آپ پر ایمان لے آئیں گے، آنحضرت صلعم نے اس دعوت کو منظور کر لیا، مگر ابھی جائے معینہ کی جانب روانہ نہ ہوئے تھے، کہ خود بنی نضیر کی ایک عورت نے اپنے بھائی کو جو مسلمان تھا، یہ اطلاع دی کہ یہودی خنجر لیکر آرہے ہیں، اور تمہارے نبی صلعم کے قتل کا ارادہ رکھتے ہیں، یہ سن کر آپ نے مناظرہ کا ارادہ ترک کر دیا،[۳]

ایک دوسرے موقع پر آنحضرت صلعم بنی عامر کے دو آدمیوں کی دیت کا معاملہ طے کرنے کے لئے بنو نضیر کے ہاں تشریف لے گئے، ان لوگوں نے بظاہر دوستانہ برتاؤ کیا، اور آپ سے کہا کہ ہم مدد دینے کو حاضر ہیں، مگر آپس میں جا کر مشورہ کیا کہ یہ شخص تم کو ایسی حالت میں پھر نہ ملے گا، بہتر ہے کہ ہم میں کا ایک آدمی مکان کی چھت پر چڑھے اور

---

[۱] فتح الباری ج ۷ ص ۲۲۳ [۲] فتح الباری ج ۷، ص ۲۳۳ [۳] اس واقعہ کو تھوڑے اختلاف کیساتھ ابوداؤد باب فی خبر النضیر اور فتح الباری ج ۷، ص ۲۳۳ میں بیان کیا گیا ہے،

اس پر ایک بھاری پتھر پھینک دے، چنانچہ یہ بات طے ہوگئی اور اس کام کے لئے عمرو بن جحاش بن کعب مقرر ہوا، مگر عین وقت پر آپ کو اطلاع ہوگئی اور آپ وہاں سے اٹھ کر چلے آئے۔[۱]

اب پیمانۂ صبر لبریز ہوچکا تھا، مسلسل بدعہدیوں اور سازشوں کے باعث اندیشہ تھا کہ کہیں یہ آستین کے سانپ کسی بیرونی حملے کے وقت مدینہ کی سلامتی کو خطرہ میں نہ ڈال دیں، یہی نہیں بلکہ یہاں تک اندیشہ تھا کہ کہیں یہ لوگ خفیہ طریقہ سے آنحضرت صلعم کو شہید نہ کردیں، مسلمان ان سے ایسے خوفزدہ ہوگئے تھے کہ ایک مرتبہ جب ایک صحابی کا انتقال ہونے لگا، تو انھوں نے اپنے عزیزوں کو وصیت کی کہ میرے مرنے کی اطلاع رسول اللہ صلعم کو رات کے وقت نہ دینا، کہیں ایسا نہ ہو کہ آپ جنازہ کی شرکت کے لئے نکلیں اور کوئی یہودی آپ کو قتل کردے۔[۲] ایسی حالت میں ان عہد شکن دشمنوں سے مزید چشم پوشی نہیں کی جاسکتی تھی، مگر آنحضرت صلعم نے پھر بھی ان کے ساتھ رعایت کی اور دفعۃً ان پر حملہ کردینے کے بجائے محمد بن مسلمہ کے ذریعہ ان کو یہ الٹی میٹم دیا کہ:

"تم نے میرے ساتھ غدر کیا ہے لہٰذا تم یا تو خود دس دن کے اندر مدینہ خالی کردو، ورنہ میں مجبوراً تم سے جنگ کرونگا"

اس کے ساتھ عبد اللہ بن ابی سردار منافقین نے انھیں کہلا بھیجا کہ تم ہرگز نہ نکلنا ہم تمھاری مدد کریں گے، چنانچہ انھوں نے آنحضرت کے الٹی میٹم کا جواب یہ دیا۔

انا لا نبرح دارنا فاصنع ما بدا لک[۳] | ہم اپنا وطن نہ چھوڑیں گے تمہارا جو جی چاہے کرو۔

اس کے بعد کون کہہ سکتا ہے کہ رسول اللہ صلعم ان کے خلاف جنگ کرنے میں حق بجانب نہ تھے، آپ نے اتمام حجت کا پورا پورا حق ادا کیا تھا، ایک معاہدہ کی صریح خلاف ورزی کے مقابلہ میں جو زیادہ سے زیادہ نرمی کی جاسکتی تھی، وہ کرچکے تھے اب مجبوراً جنگ کے لئے

۱؎ طبری مطبوعہ مصر ج ۳ ص ۴۰، فتح الباری ج ۷ ص ۲۳۲، فتوح البلدان صفحہ ۲۰ ۲؎ ابن سعد ج ۳ ص ۵۰، ذکر طلحہ بن البراء ۳؎ طبری ج ۳ ص ۴۰، فتح الباری ج ۷ ص ۲۳۲، فتوح البلدان ص ۲۲

نکلے، اور ان کا محاصرہ کر لیا، قبل اس کے کہ خوں ریزی کی نوبت آتی، صرف محاصرہ ہی کی شدت نے یہودیوں کو بدحواس کر دیا، اور انھوں نے خود ہی تجویز پیش کی کہ آپ ہمارے خون معاف کر دیں ہم مدینہ سے نکل کر اذرعات (شام) چلے جائیں گے، اور جو کچھ مال ہمارے اونٹ اٹھا سکیں گے وہ تو لیجائیں گے باقی سب کچھ یہیں چھوڑ جائیں گے، اس شرط کو آنحضرت صلعم نے منظور کر لیا اور بغیر کسی ادنیٰ اصرار کے بنو نضیر اسلامی علاقہ سے گذر کر شام کی طرف چلے گئے[1]، اس مصالحت کے متعلق بلاذری لکھتا ہے:۔

ثم صالحوہ علی ان یخرجوا من بلادہ ولھم ما حملت الابل الا الحلقۃ والآلۃ[2]،

پھر انھوں نے اس شرط پر آپ سے صلح کر لی کہ وہ آپکے شہر سے نکل جائیں گے، اور سوائے اسلحہ اور زرہوں کے باقی، جو مال ان کے اونٹ اٹھا سکیں گے وہ انکا ہے

حافظ ابن حجر نے لکھا ہے کہ:۔

فسألوا ان یجلوا عن ارضھم علی ان لھم ما حملت الابل فصولحوا علی ذالک[3]۔

پھر انھوں نے درخواست کی کہ ہمیں اپنے علاقہ سے نکل جانے دیا جائے، اور جو کچھ ہمارے اونٹ اٹھا سکیں وہ مال ہمارا ہو، چنانچہ اسی پر ان سے صلح ہو گئی،

اب یہ ظاہر ہے کہ اعلان جنگ ہونے کے بعد، ایسی حالت میں جبکہ ان کو آسانی کے ساتھ مغلوب کر کے پورا پورا انتقام لیا جا سکتا ہے، ان کی شرائط مان لینا، اور ان کو امن و سلامتی کے ساتھ صرف اپنی جانیں ہی نہیں بلکہ اپنا مال بھی لیکر نکلجانے دینا، بجز رحمدلی اور صلح پسندی کے، اور کسی چیز کا نتیجہ نہیں ہو سکتا تھا، اور صرف وہی شخص ایسا کر سکتا تھا جس کا مقصد خوں ریزی وغارت گری نہ ہو، بلکہ محض دفع شر ہو، مگر اس احسان کا جو بدلہ آنحضرت صلعم کو ملا وہ بہت ہی تلخ تھا، جن دشمنوں کو آپ نے قابو میں آجانے کے بعد محض رحم کھا کر چھوڑ دیا تھا انھوں نے مدینہ سے نکل کر تمام عرب میں آپؐ کے خلاف سازش کا جال پھیلا دیا، اور دو ہی سال بعد ۲۴ ہزار کا لشکر جرار اٹھا کر کے مدینہ پر حملہ آور ہوئے، اگر آپؐ اسی وقت ان سانپوں کا سر کچل دیتے تو یہ طوفان ہرگز نہ اٹھتا، لیکن رحمۃ للعالمین کی شان اس سے بالاتر تھی،

[1] طبری ج ۳ ص ۱۳۰، [2] فتوح البلدان صفحہ ۲۴، [3] فتح الباری ج ۷ ص ۲۳۲،

اگر کسی مغلوب دشمن کی نسبت رحم اور درگذر دیتے، آپ کو ان کے جذبۂ عناد و عداوت کا خوب معلوم تھا، اور آپ یہ بھی جانتے تھے کہ یہ فتنہ پرداز چین سے نہ بیٹھیں گے، مگر اس کے باوجود جب انھوں نے جاں بخشی کی درخواست کی تو آپؐ نے اسے قبول کرلیا،

بنو قریظہ کا واقعہ، | بنو قریظہ کے قتل عام کو سب سے زیادہ اعتراضات کا مورد بنایا گیا ہے، یہ لوگ مذہبا یہودی تھے اور بنو نضیر کی طرح مدینہ میں آباد تھے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم جب مدینہ تشریف لائے، تو آپؐ نے ان سے بھی دوسرے یہودی قبائل کی طرح وہی معاہدہ کیا جس کا ذکر اوپر گذر چکا ہے، پھر جب بنو نضیر سے جنگ ہوئی تو آپؐ نے دوبارہ بنو قریظہ کو معاہدہ کی دعوت دی، اور قدیم معاہدہ کی تجدید کرلی[۱]، مگر جب جنگ احزاب میں انھوں نے کھلم کھلا دشمنوں کا ساتھ دیا تو آپؐ نے اُدھر سے فارغ ہوکر ان پر حملہ کیا، ان کے بالغ مردوں کو قتل کردیا، بچوں اور عورتوں کو غلام بنالیا، اور ان کا مال مسلمانوں میں تقسیم کردیا، اس واقعہ کی بنا پر مخالفین نے آنحضرت صلعم پر بدعہدی اور شقاوت و سنگدلی کے شدید الزامات لگائے ہیں، مگر جب تفصیلات پر نظر ڈالی جاتی ہے، تو اس کی حقیقت بھی مخالفین کے زعم و بیان سے بالکل مختلف نظر آتی ہے،

اوپر بیان ہوچکا ہے کہ بنو قریظہ سے دو مرتبہ معاہدہ ہوا تھا، ایک عام معاہدہ جو دوسرے یہودی قبائل کی معیت میں ہوا، دوسرا خاص معاہدہ جو بنی نضیر سے لڑائی کے موقع پر ان سے کیا گیا، ان دو معاہدات کے بعد بنو قریظہ کا فرض تھا کہ رسول اللہ صلعم اور آپ کے متبعین کے خلاف کسی قسم کی معاندانہ کارروائی میں حصہ نہ لیتے، لیکن جنگ احزاب میں جب بنو نضیر کی تحریض پر عرب کے بڑے بڑے قبائل اسلام کو مٹانے کے لئے متفق ہوکر مدینہ پر حملہ آور ہوئے، تو بنو قریظہ نے حیی بن اخطب نضری کے بہکانے سے علانیہ معاہدہ توڑ دیا اور جنگ میں شامل ہوگئے[۲]، آنحضرت صلعم کو ان کے نقض عہد کی خبر ہوئی تو آپ نے سعد بن معاذ اور سعد بن عبادہؓ کو ان کے پاس بھیجا اور وفائے عہد کی نصیحت کی، مگر انھوں نے صاف صاف کہدیا کہ

---

[۱] بخاری کتاب المغازی ... باب فی خبر النضیر، [۲] ابن تیمیہ ... ص ... فتح الباری ج ۷ ص ۳۰۰،

[illegible]

[illegible] وقت پر عہد توڑ دیئے اور جنگ میں شریک ہو جانے سے مدینہ دو طرف سے محصور ہو گیا، ایک طرف قریش اور غطفان وغیرہ کی فوجیں تھیں، اور دوسری طرف بنو قریظہ [illegible] زیادہ خطرہ یہ تھا کہ مسلمانوں نے جس قلعہ میں اپنی عورتوں کو حفاظت کے لئے بھیج دیا تھا وہ بنو قریظہ کی عین زد میں تھا اور یہ لوگ اس کا محاصرہ کرنے کی دھمکی دے رہے تھے، اس صورت حال نے مسلمانوں کو انتہائی دہشت و پریشانی میں مبتلا کر دیا، حتی کہ آنحضرت صلعم نے مجبور ہو کر یہ تہیہ کر لیا کہ مدینہ کی پیداوار کا تیسرا حصہ دیکر حملہ آوروں سے مصالحت کر لیں[1]،

قرآن مجید میں اس پریشانی کی کیفیت اس طرح بیان کی گئی ہے:-

اذ جاؤکم من فوقکم و من اسفل منکم و اذ زاغت الابصار و اذ بلغت القلوب الحناجر و تظنون باللہ الظنونا (۳۳: ۲)	جبکہ وہ تم پر بالائے شہر اور پائین شہر کی جانب چڑھ آئے اور جبکہ تمھاری آنکھوں میں اندھیرا چھا گیا، اور جبکہ دل منہ کو آنے لگے اور تم اللہ کے متعلق طرح طرح کی بدگمانی کرنے لگے،

اس آیت کی تشریح کرتے ہوئے حضرت حذیفہؓ بیان کرتے ہیں:-

"اس رات ہماری پریشانی دیکھنے سے تعلق رکھتی تھی، ایک طرف ابو سفیان اور اس کے ساتھی زبردست فوجیں لئے ہوئے اوپر سے آئے، اور دوسری طرف بنو قریظہ نیچے سے بڑھے اور ان کے حملہ سے ہمارے بال بچوں کی سلامتی بھی خطرہ میں پڑ گئی[2]"

اس شدید اور خطرناک بدعہدی کے بعد ان لوگوں کے ساتھ کسی قسم کی رعایت کرنا خودکشی کرنا تھا، چنانچہ جب احزاب کے دل بادل چھٹ گئے، اور بیرونی حملہ کا خوف جاتا رہا تو آنحضرت صلعم نے فوراً بنو قریظہ کا محاصرہ کر لیا، ۱۵ دن یا ۲۰ دن تک اسلامی فوجیں ان کے قلعہ کے گرد پڑی رہیں، جب انھوں نے دیکھا کہ یہ قضا کا پیغام ٹل نہیں سکتا، تو آنحضرت صلعم کی خدمت میں کہلا بھیجا

---

[1] ابن اثیر ج ۲، ص ۷۲، فتح الباری ج ۷، ص ۲۸۱، [2] فتح الباری ج ۷، ص ۲۸۱، ابن کثیر ج ۴، ص ۵۲،

سعد بن معاذ [illegible] حق میں جو فیصلہ [illegible] میں [illegible] بعض روایتوں میں [illegible] خود

اپنی قسمت کا فیصلہ آپ پر چھوڑ دیا، اور آپ نے اس خیال سے سعدؓ بن معاذ کو حکم بنایا کہ وہ بنو قریظہ کے حلیف تھے۔ ان پر کسی کو شک نہ ہوسکتا تھا، کہ وہ ان کے حق میں ناواجب فیصلہ کریں گے، بہرحال جو صورت بھی ہو سعد بالاتفاق حکم بنائے گئے، اور انھوں نے فیصلہ دیا کہ بنو قریظہ کے بالغ مرد قتل کئے جائیں عورتوں اور بچوں کو لونڈی غلام بنایا جائے، اور ان کا مال مسلمانوں میں بانٹ دیا جائے، چنانچہ یہی فیصلہ نافذ کیا گیا اور اس کے مطابق ان کے مرد قتل کر دیئے گئے،

اب جہاں تک بدعہدی کے الزام کا تعلق ہے، وہ تو صاف ہوچکا کوئی نہیں کہہ سکتا کہ آنحضرت صلعم نے ان پر حملہ کرکے عہد شکنی کی لیکن دوسرا الزام یہ باقی رہجاتا ہے کہ ان کے ساتھ انتقام بہت سخت لیا گیا، مگر اس کو سختی اور سنگدلی سے تعبیر کرنے سے پہلے چند امور کو اچھی طرح ذہن نشین کرلینا چاہئے:

(۱) بنو قریظہ اور ان کے ہم قوم بنو نضیر کی بدعہدیوں کو دیکھکر یہ ناممکن تھا کہ ان سے از سر نو کوئی معاہدہ کیا جاتا، اور یہ توقع قائم کیجاسکتی کہ پھر کسی نازک موقع پر وہ اسے نہ توڑدیں گے،

(۲) ان کے قلعے مدینہ سے بالکل متصل تھے اور ایسی صریح غداری کے بعد ان کے متقریب رہنے سے ہر وقت خطرہ تھا کہ کب کسی دشمن کو عین مسلمانوں کے گھروں پر چڑھا لائیں

(۳) ان کو جلا وطن بھی نہیں کیا جاسکتا تھا، کیونکہ ان سے پہلے ان کے بھائی بنو نضیر کو جلاوطن کرنے کا یہ نتیجہ ہوا تھا کہ انھوں نے مسلمانوں سے دور بیٹھکر اطمینان کے ساتھ جنگ کی تیاریاں کیں اور فوجیں جمع کرکے مدینہ پر چڑھ آئے،

(۴) ان باتوں کے باوجود آنحضرت صلعم نے خود ان کے لئے کوئی سزا تجویز نہیں کی بلکہ ان کی مرضی اور اتفاق سے ایک ایسے شخص کو حکم بنایا جو خود ان کا حلیف تھا،

(۵) ثالثی اور پنچایت کے متعلق یہ تمام دنیا کا مسلمہ قانون ہے کہ جب فریقین کی رضا سے کوئی شخص حکم، ثالث، یا پنچ بنایا جائے، تو جو فیصلہ وہ کردے، اس کی پابندی فریقین پر لازم ہوتی ہے،

(۶) سعد بن معاذؓ نے جو کچھ فیصلہ کیا وہ توراۃ کے احکام پر مبنی تھا، اسی لئے کسی

ۓ صحیح مسلم کتاب [illegible] باب جواز قتال من نقض العہد [illegible] صفحہ [illegible] [illegible] جلد ۲ [illegible]

یہودی نے اس کے خلاف ایک لفظ نہ کہا،

(۷)، ان میں سے صرف وہ مرد قتل کئے گئے جو ہتھیار اٹھانے کے قابل تھے، کیونکہ انھیں سے جنگ غدر کا اندیشہ تھا، باقی رہیں عورتیں اور بچے تو ان کے سردھروں کے قتل ہوجانے کے بعد ان کی پرورش کا بجز اس کے اور کیا وسیلہ ہوسکتا تھا کہ مسلمان خود ان کے کفیل بنتے،

ان وجوہ کو ذہن نشین کر لینے کے بعد یہ تسلیم کرنے میں کوئی روک باقی نہیں رہتی کہ بنو قریظہ کے ساتھ جو سلوک کیا گیا وہ عین انصاف کے مطابق تھا اور اس کے سوا ان سے کوئی سلوک نہیں کیا جاسکتا تھا

کعب بن اشرف کا قتل،

عہدِ رسالت کا ایک اور واقعہ جس پر سخت اعتراضات کئے جاتے ہیں یہ ہے کہ آنحضرت صلعم نے اپنے ایک دشمن کعب بن اشرف کو خفیہ طریقہ سے قتل کرا دیا، مخالفین کا اعتراض یہ ہے کہ یہ وہی عہدِ جاہلیت کا فتک تھا، اور علاوہ بزدلی کے آدابِ جنگ کے بھی خلاف تھا، لیکن اس واقعہ کے بھی چند مخصوص اسباب تھے جن کو معترضین نے نظر انداز کر دیا ہے،

یہ شخص یہود بنی النضیر میں سے تھا، اور اپنی قوم کیساتھ اس معاہدہ میں شریک تھا جو ہجرت کے بعد رسول اللہ صلعم کے اور انکے درمیان ہوا تھا مگر اسے اسلام اور خاص کر داعیِ اسلام سے سخت عداوت تھی آپ کی شان میں ہجویہ اشعار کہتا، مسلمان عورتوں کے متعلق نہایت گندے عشقیہ قصائد کہتا[1] اور کفارِ قریش کو آنحضرت صلعم کے خلاف اشتعال دلاتا تھا[2] جب جنگ بدر میں آنحضرت صلعم کو فتح ہوئی تو اس کو سخت رنج ہوا اور شدتِ غضب میں پکار اٹھا کہ

واللہ لئن کان محمد اصاب ھؤلاء القوم لبطن الارض خیر لنا من ظھرھا،	خدا کی قسم اگر محمد صلعم نے قریش کو واقعی شکست دیدی ہے تو زمین کا پیٹ ہمارے لئے اس کی پیٹھ سے زیادہ بہتر ہے،

(بقیہ حاشیہ صفحہ ماقبل) «جب تو کسی شہر کے پاس اس سے لڑنے کے لئے پہونچے تو پہلے اس سے صلح کا پیغام کر تب یوں ہوگا کہ اگر وہ تجھے جواب دے کہ صلح منظور، اور دروازہ تیرے لئے کھول دے تو ساری خلق جو اس شہر میں پائی جائے تیری باج گذار ہوگی اور تیری خدمت کریگی، اور اگر وہ تجھ سے صلح نہ کرے بلکہ تجھ سے جنگ کرے تو تو اس کا محاصرہ کر، جب خداوند خدا تیرا خدا اسے تیرے قبضہ میں کر دے تو وہاں کے ہر ایک مرد کو تلوار کی دھار سے قتل کر، مگر عورتوں اور بچوں اور جانوروں کو جو کچھ اس شہر میں ہو اپنے لئے غنیمت کے طور پر رکھ لے» (استثنا، باب ۲۰، آیت ۱۰-۱۴)

[1] ابن الاثیر جلد ۲ ص ۵۳ فتح الباری ج ۷ ص ۲۰۳ میں ہے کہ وتشبب بنساء المسلمین حتی اذاھم

[2] ابو داؤد کتاب الجہاد باب کیف کان اخراج الیہود میں ہے ویحرض علیہ کفار قریش،

پھر وہ مدینہ سے مکہ پہونچا اور وہاں نہایت درد انگیز طریقہ سے قریش کے مقتولوں کے مرثیے کہہ کہہ کر انکے عوام اور سرداروں کو انتقام کا جوش دلانے لگا۔ اس کی یہ سب حرکات اس معاہدہ کے خلاف تھیں جو مسلمانوں اور یہودیوں کے درمیان ہوا تھا، اور جس میں وہ بھی اپنی قوم کے ساتھ شریک تھا تاہم انھیں کسی نہ کسی طرح معاف کیا جاسکتا تھا، لیکن ان سب سے گذر کر وہ اپنے جذبۂ عناد میں یہاں تک پہونچا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی جان تک لینے کا تہیہ کر لیا، اور ایک سازش کی تیاری کی جس کا مقصد آپ کو دھوکہ سے قتل کرنا تھا۔ علامہ ابن کثیر نے ابو مالک کے حوالہ سے بیان کیا ہے کہ اس نے ایک جماعت کے ساتھ مل کر یہ انتظام کیا تھا کہ آنحضرت صلعم کو اپنے گھر بلائے اور چپکے سے قتل کرا دے، چنانچہ اسی پر یہ آیت نازل ہوئی تھی کہ:۔

اذ ھم قوم ان یبسطوا الیکم ایدیھم فکف ایدیھم عنکم (۵: ۲)

جبکہ ایک جماعت نے تم پر دست درازی کا قصد کیا اور اللہ نے ان کے ہاتھ تم پر بڑھنے سے روک دیے۔

ابن حجر بھی اس روایت کو فتح الباری میں لائے ہیں مگر جس طریق سے انھوں نے اسے لیا ہے وہ ضعیف ہے، تاہم یعقوبی نے جو ایک بڑا مورخ ہے بنو النضیر کا حال بیان کرتے ہوئے صاف لکھا ہے کہ:۔

انہ اراد ان یمکر برسول اللہ

اس نے رسول اللہ صلعم کو دھوکہ سے قتل کرنے کا ارادہ کیا تھا۔

ان تمام بیانات سے اس واقعہ کی صداقت مسلم ہو جاتی ہے کہ اس کے جرائم کی فہرست کو اس سازش قتل نے مکمل کر دیا تھا، اور اس کے بعد اس کے کشتنی ہونے کے لئے کسی اور چیز کی ضرورت نہیں باقی رہتی۔ ایک شخص معاہدہ کو توڑتا ہے، مسلمانوں کے دشمنوں سے ساز باز کرتا ہے، مسلمانوں کے خلاف جنگ کی آگ بھڑکاتا ہے، اور مسلمانوں کے امام کو قتل کرنے کی خفیہ سازشیں کرتا ہے، ایسے شخص کی سزا بجز قتل کے اور کیا ہو سکتی ہے۔ تنہا اس کے فعل کی بنا پر اس کی قوم کے خلاف تو اعلان جنگ نہیں کیا جا سکتا تھا کہ کھلے میدان میں اس سے مقابلہ ہوتا اور اسے قتل کیا جاتا، خود اس کی قوم سے بھی یہ امید فضول تھی کہ وہ اس کو ان حرکات سے روکے گی کیونکہ ساری قوم کا یہی طرز عداوت و بغض سے بھرا ہوا تھا، پھر وہ دوسرے اعدائے اسلام کے ساتھ بھی مل کر بھی کھلے میدان میں لڑنے کے لئے نہیں آیا، بلکہ ہمیشہ پردہ کے پیچھے مخفی سازشیں کرتا رہا، اس لئے اس کے شر کے استیصال کی صرف یہی ایک صورت باقی رہ گئی تھی کہ پردہ کے پیچھے ہی اس کی زندگی کا خاتمہ کر دیا جائے۔ چنانچہ آنحضرت صلعم نے مجبوراً اسی تدبیر کو اختیار کیا، و محمد بن مسلمہ

[illegible] سے قتل کر دیا،

اس واقعہ سے یہ نتیجہ نکالنا صحیح نہیں ہے کہ خفیہ طریقہ سے دشمن کے سرداروں کو قتل کرا دینا اسلام کے قانونِ جنگ کی کوئی مستقل دفعہ ہے، اگر ایسا ہوتا تو یقیناً آنحضرت صلعم سب سے پہلے ابوجہل اور ابوسفیان جیسے دشمنوں کو قتل کراتے، اور صحابہؓ میں ایسے فدائیوں کی کمی نہ تھی جو اس قسم کے تمام دشمنوں کو ایک ایک کر کے قتل کر سکتے تھے، لیکن عہدِ رسالتؐ و عہدِ صحابہؓ کی پوری تاریخ میں ہم کو کعب بن اشرف اور ابو رافع[1] کے سوا کسی اور شخص کا نام نہیں ملتا جسے اس طرح خفیہ طریقہ سے قتل کیا گیا ہو، حالانکہ آپ کے دشمن صرف یہی دو شخص نہ تھے، پس یہ واقعہ خود اس بات کا کافی ثبوت ہے کہ خفیہ طریقہ سے دشمن کو قتل کرنا اسلام کی کوئی مستقل جنگی پالیسی نہیں ہے بلکہ ایسے مخصوص حالات میں اس کی اجازت ہے جبکہ دشمن خود سامنے نہ آتا ہو اور پردے کے پیچھے بیٹھ کر خفیہ سازشیں کیا کرتا ہو،

یہودِ خیبر کا اخراج

عہدِ رسالت صلعم کے بعد عہدِ خلافت میں یہودِ خیبر کے اخراج کو خاص طور پر ہدفِ ملامت بنایا گیا ہے، مخالفین کہتے ہیں کہ جب رسول اللہ صلعم نے اہلِ خیبر سے پیداوار کے نصف حصہ پر معاملہ کر لیا تھا، اور وہ مستقل طور پر اسلام کی رعایا بن چکے تھے تو حضرت عمرؓ کو انہیں جلا وطن کرنے کا کیا حق تھا؟ کیا اس طرح انھوں نے عہد شکنی اور اہل الذمہ کی حق تلفی نہیں کی؟ یہ اعتراض بہ ظاہر بہت وزنی ہے، مگر تاریخ نے وہ تمام حقائق محفوظ رکھے ہیں جن سے اس اعتراض کا سارا تار و پود بکھر جاتا ہے،

خیبر جب فتح ہوا تھا تو ابتداءً آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے یہودیوں کی صلح اس شرط پر ہوئی تھی

---

[1] [illegible] صحیح بخاری میں صراحت بیان کیا گیا ہے۔ کان ابو رافع یوذی رسول اللہ صلعم ویعین علیہ "ابو رافع آنحضرت صلعم کو اذیت پہنچاتا تھا اور آپ کے خلاف دشمنوں کی اعانت کرتا تھا" (کتاب المغازی، باب قتل ابی رافع) لیکن ابن عائذ نے عروہ کے طریق سے یہ روایت نقل کی ہے کہ کان ممن اعان غطفان وغیرہم من مشرکی العرب بالمال الکثیر "اس نے غطفان وغیرہ مشرکین عرب کو رسول اللہ صلعم کے خلاف جنگ میں بہت روپیہ مدد دی تھی" (فتح الباری ج ۷، ص ۲۴۳) طبری نے اس پر یہ اضافہ کیا ہے کہ کان حزب الاحزاب علی رسول اللہ "اس نے رسول اللہ صلعم کے خلاف جنگ احزاب میں فوجیں اکٹھی کی تھیں" (ج ۳ ص ۰) ابن سعد نے طبقات میں لکھا ہے کہ قد اجلب فی غطفان ومن حولہ من مشرکی العرب وجعل لھم الحفل العظیم لحرب رسول اللہ "اس نے غطفان اور دوسرے مشرکین عرب کی ایک بہت بڑی جمعیت رسول اللہ صلعم سے لڑنے کے لئے اکٹھی کی تھی" (ج ۲ ص ۶۶) ابن اثیر نے لکھا ہے کہ کان یظاھر کعب بن اشرف علی رسول اللہ "وہ کعب بن اشرف کو رسول اللہ صلعم کے خلاف مدد دیتا تھا" (ج ۲ ص ۱۳۰ طبع یورپ) ان تمام بیانات کا [illegible] یہ بھی ثابت ہے کہ وہ بھی کعب کی طرح خود کبھی کھلے میدان میں لڑنے نہیں آیا [illegible] پیچھے سے دشمنوں کو مال اور فوجوں سے مدد دے کر رسول اللہ صلعم کے خلاف استعمال کرتا رہا۔

کہ آپ کی جان بخشی کر دیں تو وہ اس علاقہ کو چھوڑ کر کہیں اور چلے جائیں گے۔ لیکن صلح ہو چکنے کے بعد جب زمین کے باقاعدہ بندوبست کا موقع آیا تو اہل خیبر نے آپ سے درخواست کی کہ:۔

"آپ ہمکو یہیں رہنے دیں اور ہم سے معاملہ کر لیں، کیونکہ ہم زراعت اور نخلستان کے کام سے خوب واقف ہیں"

آنحضرت صلعم نے ان کی یہ درخواست قبول کر لی، اور ان سے عارضی طور پر معاملہ کر لیا، لیکن معاملہ کی شرائط تحریر کرتے وقت صاف طور پر یہ تصریح کر دی کہ اقرکم ما اقرکم اللہ "ہم تمکو برقرار رکھیں گے جب تک اللہ تمکو برقرار رکھے گا"[۲] اس کا مطلب یہ تھا کہ تم کو مستقل طور پر نہیں رکھا جائیگا، بلکہ جب تک احکام خداوندی کے مطابق ہمارے قومی مصالح تمہیں رکھنے کی اجازت دیں گے اس وقت تک تمہیں رہنے دیا جائیگا، اور جب تمہارا طرز عمل نامناسب ہوگا تو ہمیں آزادی ہوگی کہ اصل صلحنامہ کی شرائط کو نافذ کر کے تمہیں جلاوطن کر دیں، ابن حجر نے اس جملہ کی یہ تشریح کی ہے:۔

وان المراد بقوله ما اقركم الله ما قدر الله انا نترككم فيها فاذا شئنا فاخرجناكم تبين ان الله قدر اخراجكم[۳]	یہ جو آنحضرت صلعم نے فرمایا کہ جب تک اللہ تمکو رکھے گا، تو اس کا مطلب یہ تھا کہ جب تک اللہ نے تمہارا یہاں رہنا مقدر کر رکھا ہے ہم تمکو رہنے دیں گے، اور جب ہم تمہیں نکالنا چاہیں گے اور نکال دیں گے تو یہ فعل خود اس بات کی دلیل ہوگا کہ تمہارے اخراج کے لئے اللہ کی تقدیر پوری ہو چکی ہے۔

ابوداؤد نے ایک اور روایت میں اس سے بھی زیادہ صاف تصریح کی ہے:۔

كان عامل خيبر على ان نخرجهم اذا شئنا[۴]	آنحضرت صلعم نے ان سے اس شرط پر معاملہ کیا تھا کہ ہم جب چاہیں گے ان کو نکال دیں گے

اس سے یہ بات تو بالکل صاف ہو جاتی ہے کہ ان سے کوئی ایسا معاہدہ نہ تھا جس کے لئے ان کا اخراج ناقض ہوتا، بلکہ اس کے برعکس اصل معاہدہ ان کے اخراج ہی کا مقتضی تھا، ...

۱؎ فتوح البلدان ص ۲۹-۳۰، ابن ہشام ص ۷۷۶، ابن سعد ج ۲ ص ۷۷-۸۰۔ ۲؎ بخاری کتاب الشروط باب اذا اشترط فی المزارعة، فتوح البلدان صفحہ ۲۹۔ ۳؎ فتح الباری ج ۵ ص ۲۰۰۔ ۴؎ ابوداؤد باب ما جاء فی حکم ارض خیبر۔

یہ سوال کہ نصف خراج پر جو عارضی معاملہ ان سے کیا تھا، اسے کن وجوہ کی بنا پر فسخ کیا گیا؟ تو اس کی تحقیق کے لئے ذیل کے واقعات پیش نظر رکھنے چاہئیں،

صلح کو چند ہی روز گذرے تھے کہ ان میں سے ایک عورت نے آنحضرت صلعم کی دعوت کی اور اس میں آپ کو زہر کھلا دیا، بعد میں جب تحقیق کی گئی تو خود مجرمہ نے اعترافِ جرم کیا اور اس فعل میں دوسرے یہودیوں کی سازش بھی ثابت ہو گئی[1]

آنحضرت صلعم ہی کے زمانہ میں انھوں نے عبداللہ بن سہل بن زید الانصاری کو قتل کر کے ایک نہر کے کنارے ڈالدیا[2]

حضرت عمرؓ کے زمانہ میں وہ علانیہ برسر بغاوت ہو گئے اور حضرت عبداللہ بن عمرؓ کو سوتے میں پکڑ کر کوٹھے سے نیچے پھینک دیا جس سے ان کے ہاتھ ٹوٹ گئے[3]

ابتدائی واقعات خاص لوگوں کے ساتھ مخصوص تھے، اس لئے عامۃ الناس کو ان کے جرم کا ذمہ دار نہ سمجھا گیا، مگر یہ آخری جرم کھلے بندوں کیا گیا تھا، اور تمام قوم کا معاندانہ رویہ ظاہر نظر آرہا تھا، اس لئے حضرت عمرؓ نے اس معاملہ کو صحابہؓ کی مجلس میں پیش کیا اور اس پر تقریر کرتے ہوئے فرمایا:-

ان رسول اللہ صلعم کان عامل یهود خیبر علی اموالهم وقال نقرکم ما اقرکم اللہ وان عبد اللہ ابن عمر خرج الی ماله هناک فعدی علیه من اللیل ففدعت یداه ورجلاه ولیس لنا هناک عدو غیرهم هم عدونا وتهمتنا وقد رأیت اجلاءهم[4]

رسول اللہ صلعم نے یہود خیبر سے ان کے اموال پر معاملہ کیا تھا اور یہ فرمایا تھا کہ "ہم تمہیں برقرار رکھیں گے جب تک اللہ تمکو برقرار رکھے گا"، اب عبداللہ بن عمرؓ وہاں اپنی جائداد پر گئے تھے، رات کے وقت ان پر حملہ کیا گیا اور ان کے ہاتھ پاؤں توڑ دیئے گئے، اس وقت اس ملک میں ان کے سوا ہمارا کوئی دشمن نہیں ہے، وہی ہمارے دشمن رہ گئے ہیں، اس لئے میری رائے میں ان کو جلاوطن کر دینا چاہئے۔

[1] صحیح بخاری میں یہ واقعہ کئی جگہ مذکور ہے، غزوۂ خیبر کے بیان، اور کتاب الطب میں اس کی تفصیل ملتی ہے، [2] اسد الغابہ ج ۳ ص ۱۷۹، [3] فتوح البلدان صفحہ ۳۱، ابن ہشام صفحہ ۷۸۰،

[4] بخاری کتاب الشروط باب اذا اشترط فی المزارعہ،

حضرت عمرؓ کی اس تجویز سے جو خیبر سے متعلق ہے، یہودیوں کے اخراج کا فیصلہ ہو گیا، لیکن

ان مجرموں کو بھی اس طرح جلاوطن نہیں کیا گیا کہ ان کے اموال و اراضی پر قبضہ کر کے انھیں بیک بینی و دوگوش نکال دیا گیا ہو بلکہ جو کچھ وہ چھوڑ گئے اس کا پورا پورا معاوضہ ان کو بیت المال سے دیا گیا اور سفر کی آسانی کے لئے اونٹ اور کجاوے دیئے گئے یہاں تک کہ کجاوے باندھنے کی رسیاں تک حکومت کی طرف سے مہیا کی گئیں[1]۔

اس میں شک نہیں کہ بعض روایات میں ان کے اخراج کی یہ وجہ بھی بتائی گئی ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ حدیث سنی کہ لا یجتمع دینان فی جزیرۃ العرب "جزیرۂ عرب میں دو دین جمع نہ ہونے پائیں" تو آپ نے اس کی تحقیق کی اور صحیح ثابت ہونے کے بعد یہودیوں کے اخراج کا فیصلہ کر لیا۔ بلاذری نے اس روایت کو ابن شہاب کے طریق سے نقل کیا ہے[2] اور امام زہری نے عبداللہ بن عتبہ کے طریق سے[3] لیکن اس حدیث کا یہ منشا ہرگز نہ تھا کہ غیر مسلم قوموں کو بلا قصور عرب سے نکال دیا جائے، امام زہری نے اپنی روایت میں خود یہ تصریح کی ہے کہ جب اس حدیث کی صحت ثابت ہو گئی تو حضرت عمرؓ نے اعلان کرایا کہ:-

من کان لہ من اہل الکتابین عہد فلیأت بہ انفذہ لہ[4]	دونوں کتابوں (انجیل و توراۃ) کے متبعین میں سے جس کسی کے پاس کوئی معاہدہ ہو وہ لے آئے تاکہ میں اسے نافذ کروں

ظاہر ہے کہ اگر اس حدیث کا یہ منشا ہوتا کہ بلا امتیاز تمام غیر مسلم جزیرۃ العرب سے نکال دیئے جائیں تو حضرت عمرؓ یہ اعلان ہرگز نہ کراتے، اور تمام غیر مسلموں کو یک قلم خارج البلاد کرا دیتے خواہ ان سے معاہدہ ہوتا یا نہ ہوتا، مگر جب انھوں نے ایسا نہیں کیا بلکہ اہل معاہدہ سے ان کے عہدنامے طلب کئے اور وعدہ کیا کہ ان عہدناموں کو نافذ کیا جائے گا تو اس کا مطلب یہی ہو سکتا ہے کہ اس حدیث سے مطلقاً اخراج مقصود نہ تھا بلکہ ایک عام پالیسی کی تعیین مقصود تھی جس پر دوسرے وجوہات کا لحاظ رکھتے ہوئے عمل درآمد کیا جانا چاہئے تھا۔ پس یہ سمجھنے کی کوئی وجہ نہیں ہے کہ ایک ذمی قوم محض اس بنا پر ملک سے نکال دی گئی کہ عرب میں دو دینوں کا اجتماع مرغوب نہ تھا بلکہ زیادہ تر [illegible]

[1] بلاذری کتاب [illegible] [2] فتوح البلدان ص [illegible] [3] فتح الباری ج ۵ ص ۰۰
[4] فتح الباری ج ۵ ص ۲۰۷۔

یہ معلوم ہوتا ہے کہ جب یہودِ خیبر کی مسلسل بدعنوانیوں سے تنگ آکر حضرت عمرؓ نے انھیں جلاوطن کرنے کا خیال کیا ہوگا تو قدرتی طور پر انھیں ایک ذمی قوم کے ساتھ یہ معاملہ کرنے میں تامل ہوا ہوگا، اور وہ کسی شرعی حجت کی تلاش میں ہوں گے، اسی دوران میں یہ حدیث ان کو پہونچی ہوگی، اور اس کو اچھی طرح تحقیق کرنے کے بعد مطمئن ہو کر انھوں نے اپنی رائے کو عمل میں لانے کا فیصلہ کیا ہوگا، بعد میں راویوں نے اپنے اپنے رجحانِ طبع کے موافق اس ایک واقعہ کو دو الگ واقعے بنا لیا اور دو مختلف روایتوں کی صورت میں بیان کرنے لگے۔

اہل نجران کا اخراج خلافت راشدہ کا دوسرا اہم واقعہ جو خیبر کے معاملہ سے بھی زیادہ طعن و ملامت کا ہدف بنا ہوا ہے، نجران کے عیسائیوں کا اخراج ہے، خیبر کے یہودی عنوۃً فتح ہوئے تھے اور ان سے بعد کو جلاوطنی ہی کی شرط پر صلح ہوئی تھی، اس لئے مخالفین کو اسمیں اعتراض کی زیادہ گنجائش نہ مل سکی، لیکن اہل نجران نے تو بغیر جنگ کے خود بخود اطاعت قبول کی تھی، اور جزیہ دیکر آنحضرت صلعم سے باقاعدہ عہدنامہ لکھوایا تھا، اس لئے ان کے اخراج کو مخالفین اسلام صریح عہد شکنی قرار دیتے ہیں، ان کا سارا زور اس پر ہے کہ معاہدہ میں غیر مشروط امان دی گئی تھی، اور حضرت عمرؓ نے ناجائز طور پر اس امان کو فسخ کیا مگر واقعات کی تحقیق سے یہ دعویٰ غلط ثابت ہوتا ہے،

نجران سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا جو معاہدہ ہوا تھا، اسمیں نصاریٰ کو اس شرط کے ساتھ امان دی گئی تھی کہ جب تک وہ حکومت اسلامیہ کے وفادار رہیں گے، اور اپنے واجبات کو ٹھیک ٹھیک ادا کرتے رہیں گے، اس وقت تک انھیں اللہ کی پناہ اور رسول صلعم کی حفاظت حاصل رہیگی، بلاذری اور امام ابو یوسفؒ نے جو معاہدہ نقل کیا ہے اسمیں یہ صریح الفاظ موجود ہیں کہ:۔

لھم ما فی ھذہ الصحیفۃ جوار اللّٰہ وذمۃ محمد النبی ابداً حتی یاتی امر اللّٰہ ما نصحوا واصلحوا فیما علیھم	ان کے لئے جو کچھ اس عہدنامہ میں ہے اس پر اللہ کی پناہ اور محمد نبی (صلعم) کی دائمی حفاظت ہے، جب تک کہ اللہ کا حکم آئے اور وہ خیر خواہ رہیں اور جو کچھ ان کے ذمہ واجب ہے اسے ٹھیک ٹھیک ادا کرتے رہیں،

اسی طرح حضرت ابوبکرؓ نے منصبِ خلافت پر فائز ہونے کے بعد جو عہدنامہ ان کو لکھکر دیا تھا اسمیں

---

[1] کتاب الخراج صفحہ ۴۱، فتوح البلدان صفحہ ۷۲،

[illegible]

وعليه [illegible]

[illegible]

[illegible] حکومت [illegible]

[illegible] حکومت [illegible]

[illegible] حکومت [illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible] ابو یوسف نے اپنی کتاب [illegible]

[illegible] لکھا ہے کہ

[illegible]

كانوا [illegible] في [illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible] فزون قوت سے خود مدینہ کی حکومت کا قبضہ خطرے میں پڑ گیا تو آپ نے موقع کو غنیمت سمجھ کر ان کی جلاوطنی کا حکم صادر کر دیا۔[1]

تاہم ایک ایسی قوم جس کے خلاف بغاوت کی تیاری کا ثبوت بہم پہونچ چکا تھا حکومت اسلامیہ کے حدود سے خارج نہیں کی گئی بلکہ صرف عرب سے خارج کی گئی۔ اس کو "اللہ کی پناہ اور محمد نبی صلعم کے ذمہ" سے محروم نہیں کیا گیا، بلکہ اسی پناہ اور ذمہ میں ایک نامناسب مقام سے دوسرے مناسب مقام کی طرف منتقل کر دیا گیا۔ نجران سے اس کے اخراج کا مقصد صرف یہ تھا کہ وہ حجاز اور حبش کے درمیان ایک نازک سیاسی و حربی پوزیشن پر قابض نہ رہے۔ اس سے زیادہ کوئی اور سزا دینی مقصود نہ تھی۔ اس لئے حضرت عمرؓ نے ان کو نجران یمن سے منتقل کر کے نجران عراق کی طرف بھیج دیا۔ ان کی زمینوں کے بدلے زمینیں دیں۔ دو سال کا جزیہ معاف کیا۔ یمن سے عراق تک کے سفر کے لئے پوری آسانیاں بہم پہونچائیں اور اپنے عمال کو حکم دیا کہ انھیں کسی قسم کی تکلیف نہ ہونے پائے۔ امام ابو یوسف نے اس فرمان کو بلفظہ نقل کیا ہے جس کے چند فقرے یہ ہیں:-

"شام و عراق کے افسروں میں سے جس کے پاس یہ جائیں وہ ان کو قابل کاشت زمین عطا کرے اور جس زمین میں یہ کاشت کریں وہ ان کے لئے خدا واسطے کا صدقہ ہے اور اس زمین کا عوض ہے جو یمن میں ان سے لی گئی ہے۔ اس زمین میں ان پر کوئی دست درازی اور مداخلت نہ کی جائے۔ ...... اگر کوئی شخص ان پر ظلم کرتا ہو تو ہر مسلمان جو وہاں موجود ہو لازم ہے کہ ان کی مدد کرے کیونکہ وہ ایسی قوم ہیں جو ہماری پناہ میں ہے۔ ان کا جزیہ ۲۴ مہینہ کے لئے معاف ہے[2]"

معترضین نے ان سب باتوں کو بھلا کر صرف اتنا یاد رکھا ہے کہ اہل نجران سے عہد تھا عمر بن خطابؓ نے اسے توڑا اور انھیں جلاوطن کر دیا۔ مگر ان تمام حالات کو دیکھ کر کوئی بتائے کہ اگر آج اس بیسویں صدی میں بھی کوئی قوم وہ روش اختیار کرے جو اہل نجران نے کی تھی اور اسکی سیاسی و جنگی پوزیشن وہی ہو جو اہل نجران کی تھی تو ایک مہذب حکومت جو اپنی مملکت کے امن کو محفوظ رکھنا چاہتی ہو اس کے ساتھ کیا سلوک کرے گی؟

---

[1] فتوح البلدان صفحہ ۷۳، ابن اثیر ج ۲ ص ۲۱۱۔ [2] کتاب الخراج ص ۴۱۔

جدید قانونِ جنگ کی تدوین

اس باب میں جو کچھ عرض کیا گیا ہے اس کے مطالعہ سے یہ معلوم ہو جاتا ہے کہ شریعت اسلامیہ نے جنگ کے عملی پہلوؤں میں سے کسی پہلو کو بھی ایک مضبوط قانون سے منضبط کئے بغیر نہیں چھوڑا۔ اس نے جنگ کے وہ وحشیانہ طریقے جو دنیا میں رائج تھے یک قلم موقوف کر دیے۔ جنگ اور متعلقات جنگ کے متعلق نئے مہذب قوانین وضع کئے۔ کچھ پرانے طریقوں کو وقت کی روح کے لحاظ سے ایک بدلی ہوئی شکل میں باقی رکھا، مگر ان کے اندر تدریجی اصلاح پذیری کی ایسی لچک پیدا کر دی کہ زمانہ کی ترقی، حالات کے تغیر اور انسانی افکار کے نشوونما کے ساتھ ساتھ ان میں خود بخود اصلاح ہو جائے۔ اسی طرح کچھ نئے اصول وضع کئے جن میں ترقی کی ایسی صلاحیت رکھ دی کہ ہر زمانہ کی ضروریات کے مطابق ان سے فروعی و جزئی احکام نکالے جا سکتے ہیں۔ اس کے ساتھ خود نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے صحابہ ایک ایسا نمونہ عمل چھوڑ گئے ہیں جو روح شریعت کو پوری طرح ظاہر کرتا ہے اور اس روح کو پیش نظر رکھ کر ہم ہر نئی پیش آمدہ صورت میں یہ معلوم کر سکتے ہیں کہ اسلامی آئین عمل کا کون سا طریقہ اختیار کریگا۔ قرون اولی میں فقہا نے اسی مواد سے ایک مکمل ضابطہ قوانین جنگ مرتب کیا تھا جو صدیوں تک اسلامی سلطنتوں میں رائج تھا۔ مگر اس زمانہ کے قوانین جنگ بعینہ آج کی ضروریات کے لیے کافی نہیں ہیں۔ بہت سے فروع و جزئیات جو اس زمانہ میں مستنبط کئے گئے تھے آج بیکار ہیں۔ اس لئے ضرورت ہے کہ ہم اصل ماخذ یعنی قرآن مجید اور حدیث نبوی کی طرف رجوع کریں اور ان میں جو اصول و فروع موجود ہیں ان سے ایک نیا ضابطہ قانون مدون کریں۔ اس جدید قانون کی تدوین اس طریقہ پر ہونی چاہیے کہ جن مسائل میں فروع کی تفصیل بھی قرآن و حدیث سے ملتی ہے ان کو بجنسہ باقی رہنے دیں، جن مسائل میں صرف اصول ملتے ہیں اور فروع نہیں ملتے ان میں شریعت کی روح اور علمائے سلف کی تصریحات، اور موجودہ عہد کی ضروریات کے مطابق فروع نکالیں، اور جن مسائل میں شریعت نے ہم کو ترک و اختیار کا حق دیا ہے ان میں کسی [illegible] مذہب [illegible] نہ کریں [illegible] ناجائز کر دیں جنھیں موجودہ عہد کی دنیا چھوڑ چکی ہے۔ اس کام میں [illegible] فقہائے قدیم کی [illegible]

ہیں وہ تو محض [illegible] اصول شریعت کی [illegible] زمانہ کی ضروریات کے مطابق ہم ان کو بدل سکتے ہیں ان دونوں طریقوں کے درمیان ایک متوسط طریقہ اختیار کرنا چاہئے۔ اور وہ یہ ہے کہ ان کے مجتہدات میں سے جو چیزیں ہمارے موجودہ عہد کی ضرورت کے [illegible] میں ان کو ہم باقی رکھیں [illegible] جو انہی کے ساتھ پرانی ہو چکی ہیں ان کو چھوڑ کر براہ راست اصول شریعت سے فروع اخذ کریں۔

مثال کے طور پر قرآن و حدیث میں اسیران جنگ، مجروحین و مرضیٰ، غیر جانبداروں کے حقوق و فرائض اور ایسے ہی دوسرے مسائل پر صرف اصول ملتے ہیں، فروع کی کوئی تفصیل نہیں ملتی۔ اس [illegible] تفصیل اور بیان اصول پر اکتفا کے معنی یہ ہیں کہ شریعت ہر زمانہ کے مسلمانوں کو یہ حق دیتی ہے کہ [illegible] اپنی ضروریات کے مطابق خود فروع اخذ کریں۔ لہٰذا ہمکو اس بات کی ضرورت نہیں ہے کہ ان فروع کے لئے پانچویں اور چھٹی صدی ہجری کی لکھی ہوئی کتب فقہیہ کی طرف رجوع کریں اور ان میں جو کچھ تفصیلات ہیں ان کو بلا تامل قبول کرلیں۔ بلکہ ہمارا کام یہ ہے کہ خود اپنے زمانہ کے حالات کو دیکھ کر ان اصول شریعت سے ایسے قوانین مستنبط کرلیں جو موجودہ حالات کے لئے مناسب ہوں، بلکہ شریعت ہمکو یہ حق بھی دیتی ہے کہ موجودہ [illegible] الوقت قوانین جس حد تک روح شریعت کے مطابق ہوں ان کو ہم اختیار کرلیں۔ اور زمانہ حال کی سلطنتوں کے درمیان جو معاہدے ہوں ان میں بھی احکام شرعیہ کو ملحوظ رکھ کر شریک ہو جائیں۔

ہم نے اس باب میں شریعت کے اصلی مآخذ یعنی قرآن و حدیث سے وہ اصول و فروع نقل کردیئے ہیں، جو ایک مکمل ضابطۂ قانون کے لئے مواد مہیا کرتے ہیں، اس کے ساتھ جہاں جہاں علمائے سلف کی تشریحات عہد جدید کی ضرورت کے مطابق پائی گئی ہیں، ان کو بھی نقل کردیا ہے اور ان مستثنیات کی بھی تشریح کردی ہے جن کی ظاہری شکل کو دیکھ کر لوگوں کو اسلامی قانون کے اندر تناقض ہونے کا شبہ ہوتا ہے۔ [illegible] تمام مواد کو پیش نظر رکھ کر فقہ کی جدید کتاب [illegible] مرتب کرنا فقہائے عصر [illegible]۔

جنگ اور مذاہب

کسی چیز کے عیب و صواب کی جب تحقیق کی جاتی ہے تو پہلے یہ دیکھا جاتا ہے [illegible]
پھر یہ دریافت کیا جاتا ہے کہ اس میں کن دوسری چیزوں میں [illegible]
حیثیت سے [illegible]
سے جہاں تک جنگ و مذاہب کا تعلق ہے [illegible]
اسلام کو دوسرے مذاہب کے مقابلہ میں [illegible]
کیا نسبت رکھتا ہے؟ اگر وہ جنگ کو [illegible]
[illegible] تو اس مذہب میں ان کی تعلیم انسانی فطرت کے [illegible]
مذہب [illegible] کے اصول [illegible]
[illegible]
[illegible]
شکل پیدا کرلیتی ہے۔ ایک مذہب کے پیرو جب دوسرے مذاہب [illegible]
پہلوؤں کو [illegible] کرتے ہیں [illegible] کوشش ہی نہیں کرتے [illegible]
تو اسے [illegible] چھپانے کی کوشش کرتے ہیں [illegible]
بلکہ محض [illegible] تحقیق سے پہلے [illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]

دوسرے مذہب کے متعلق یک غلط رائے قائم کرے اور ان کا مطالعہ صرف اس نیت سے کرے کہ کی
خوبیوں پر پردہ ڈالنا ہے، اور ان کی برائیوں کو تلاش کرکے ان سے اپنے مذہب کی برتری ثابت کرنی ہو، اس
قسم کی بددیانتی اور فریب کاری سے کسی مذہب کی برتری کا اثبات، نہ تو فی الحقیقت اس کی برتری کا
اثبات ہوگا، نہ ایسی کامیابی کسی دین حق کے لئے باعث فخر ہو سکتی ہے، اور نہ حق وصداقت کی نظر
میں ایسے مذہب کو کوئی وقعت حاصل ہو سکتی ہے، اگر اس طرح دھوکا کھا کر کوئی شخص اس کی حقانیت
کا معتقد ہو جائے، تو یہ اعتقاد بالکل ناقابل اعتماد ہوگا، کیونکہ اس کی بنیاد ہی غلط ہوگی،

ان مفاسد سے احتراز کرکے تقابل ادیان کی بحث کو کسی صحیح نتیجہ تک پہونچانے کے لئے ضروری
ہے، کہ چند اصول طے کرلئے جائیں، اور ان کی سختی کے ساتھ پابندی کیجائے، ہماری رائے میں وہ اصول یہ
ہونے چاہئیں:-

ایک مذہب کی تعلیم کو صحیح ثابت کرنے کے لئے یہ ضروری نہیں ہے کہ دوسرے مذاہب کی
تعلیمات کو کلیتہً غلط ثابت کیا جائے، اور نہ یہ ضروری ہے کہ ایک مذہب میں حق وصداقت کے موجود
ہونے سے دوسرے مذہب میں اس کا عدم لازم آئے، حق ایک کلی ہے، جس کے افراد خواہ کہیں ہوں
بہرحال اسی ایک کلی کے فرد رہتے ہیں، حال ومقام کے بدلنے سے ان کی حقیقت واصلیت نہیں بدلتی،
جو حق ہمارے مذہب میں پایا جاتا ہے، اسی کا دوسرے مذہب میں پایا جانا ہمارے مذہب کے نقص کی دلیل
نہیں ہے، بلکہ اس بات کی دلیل ہے کہ وہ مذہب بھی ہمارے مذہب سے قریب تر ہے، لہذا تقابل
ادیان کی بحث میں ایک محقق کو اس خیال سے بالکل خالی الذہن ہو جانا چاہئے، کہ اس کے مذہب کی
حقانیت کا اثبات دوسرے مذاہب کے ابطال پر منحصر ہے، اگر دوسرے مذاہب کی کچھ خوبیاں اس کے سامنے
آئیں تو اسے چاہئے کہ انھیں اپنے مذہب کے لئے مضر سمجھ کر دل کے دروازے بند نہ کرلے، بلکہ کھلے دل سے
ان کا اعتراف کرے،

(۲) جو شخص یہ دعوی کرتا ہے کہ حق اس کے مذہب کے سوا کہیں اور موجود ہی نہیں ہے، وہ دوسرے
مذاہب ہی پر نہیں خود حق پر بھی ظلم کرتا ہے، واقعہ یہ ہے کہ حق وصداقت کی روشنی کم وبیش سب جگہ
موجود ہے، البتہ ارباب تحقیق جب کسی ایک مذہب کو دوسرے مذاہب پر ترجیح دیتے ہیں تو اس کی
وجہ یہ ہوتی ہے کہ ان کی نگاہ میں وہ مذہب تجلیاتِ حقیقت کا مظہر اتم ہوتا ہے، پس تقابل ادیان

کسی متبع کو بھی یہ حیثیت فیصلہ کی نہ دی جانا چاہئے۔ اس کے علاوہ مذہب سو یہ مذاہب حق کی روشنی سے خالی ہیں، بلکہ اسے یہ سمجھنا چاہئے کہ اس کے سامنے حق اور باطل دونوں ملے جلے آئیں گے، اور اس کا کام یہ ہوگا کہ اپنی عقل اور قوتِ تمیز سے کام لیکر حق کو حق اور باطل کو باطل دیکھے اور ایک کو دوسرے سے ممتاز کرے۔

(۴) مذہبی تحقیقات میں اس امر کا خاص اہتمام کرنا چاہئے کہ کسی مذہب کے متعصب مخالفین اور غالی متبعین، دونوں کی تصنیفات کا مطالعہ کرنے سے پرہیز کیا جائے۔ ابتدائی تحقیقات میں اس قسم کے لوگوں کی تصنیفات کے مطالعہ سے ایک ناظر کبھی صحیح نتیجہ پر نہیں پہونچ سکتا، کیونکہ یہ محقق مذہب کے اصلی چہرے کو دیکھنے سے پہلے ہی اس کی آنکھوں پر ایک خاص رنگ کی عینک چڑھ جاتی ہے جس سے وہ اس مذہب کو اس کے اصلی رنگ میں نہیں دیکھ سکتا۔ اگر ان تحقیقات کو کسی صحیح نتیجہ تک پہونچانا ہو تو یہ ضروری ہے کہ کسی مذہب کو اس حیثیت سے دیکھا جائے کہ وہ خود اپنے آپ کو کس شکل میں دیکھتے ہیں بلکہ اس حیثیت سے دیکھا جائے کہ وہ خود اپنے آپ کو کس شکل میں دکھاتا ہے۔ اس کے لئے حتی الامکان ہر مذہب کے ماخذ اصلیہ کا مطالعہ کرنا چاہئے، اور ان کو پڑھ کر خود اپنی عقل سے فیصلہ کرنا چاہئے کہ وہ مذہب کہاں تک صحیح اور کہاں تک غلط ہے، پھر جب آدمی خود ایک رائے قائم کرلے تو اس کے بعد دوسروں کی آراء وافکار کا مطالعہ کرنے میں کچھ مضائقہ نہیں، کیونکہ اس وقت وہ حق اور باطل میں بآسانی امتیاز کر سکے گا۔

آیندہ صفحات میں مسئلہ جنگ پر مختلف مذاہب کی تعلیمات پر جو گفتگو کی جائیگی، اس میں انہیں اصول ثلٰثہ کو ملحوظ رکھا گیا ہے، اور اس امر کی پوری کوشش کی گئی ہے کہ اپنے مذہب کی تائید وحمایت کے جذبہ سے خالی ہوکر حق کو حق اور باطل کو باطل ثابت کیا جائے۔

دنیا کے چار بڑے مذاہب، اس مختصر کتاب میں یہ ممکن نہیں ہے کہ جنگ کے متعلق دنیا کے تمام چھوٹے بڑے مذاہب کی تعلیمات کا حصر کیا جائے، اس قسم کا احاطہ واستیعاب نہ تو آسان ہے، اور نہ ضروری، عموماً تقابلِ ادیان کی بحثیں صرف ان مذاہب تک محدود رہتی ہیں جو اپنے پیروؤں کی کثرت، اپنی تعلیمات کی وسعت، اور اپنی گذشتہ وموجودہ عظمت کے اعتبار سے دنیا کے بڑے مذاہب شمار کئے جاتے ہیں، اسی قاعدہ کی پیروی کرکے ہم بھی اپنی بحث کو بڑے بڑے مذاہب تک محدود رکھیں گے۔

یہ مذاہب چار ہیں، ہندو مذہب، بودھ مذہب، یہودیت اور مسیحیت، مسئلہ جنگ کے

[illegible] جنگ کو جائز رکھا [illegible] ہیں ہندو مذہب [illegible]

[illegible] جنگ کو جائز نہیں رکھا اور یہ بودھ مذہب اور مسیحیت

[illegible] [illegible] اور اس کے بعد قسم دوم [illegible]

ہندو مذہب

[illegible] مذہب بحث کرنے سے [illegible] مشکل پیش آتی ہے کہ وہ کس چیز کو ہندو

[illegible] مذہب ہی نہیں ہے جنہیں [illegible] یہ لفظ استعمال کیا جاتا [illegible]

[illegible] کی بنیاد رکھی گئی ہو مگر [illegible] مذہب [illegible]

[illegible] عقیدہ [illegible] عقائد [illegible] اور [illegible]

[illegible] بالکل جدا [illegible] اور سب کے سب ہندو کہلاتے ہیں [illegible]

[illegible] ہندو مذہب کی [illegible] کرتے ہیں تو ہمیں یہ فیصلہ کرنے میں بڑی دقت [illegible]

[illegible] مختلف مذاہب [illegible] کریں۔

[illegible] مشکل کو ہندوؤں [illegible] ایک حد تک آسان کر دیا ہے [illegible]

[illegible] مخصوص [illegible] کتابوں پر اپنی مذہبی عقیدت کو [illegible]

[illegible] ہندوؤں کا [illegible] بڑی اکثریت نے ان [illegible]

[illegible] بہت دقتیں پیش آتی ہیں کوئی کہتا ہے کہ ہندو مذہب [illegible]

[illegible] (Guru Parsad Sen. Introduction to the Study [illegible]

[illegible] عبادت، عقائد، روایات اور تخیلات کا مجموعہ [illegible]

[illegible] ان کی متبرک کتابوں کی تصدیق حاصل ہے اور [illegible]

[illegible] Lyall, Religious Systems [illegible] ہندو کی تعریف کو [illegible]

[illegible] ہندو [illegible] بودھ مت، مسیحیت، پارسی مذہب، یہودی مذہب یا دنیا کا کسی اور مذہب [illegible]

[illegible] عبادت وحدانیت سے لیکر بت پرستی تک وسیع ہو اور جن کے دینیات کلیۃً سنسکرت زبان [illegible]

لکھے ہوئے ہوں، ہندو ہیں۔" (Census Report Baroda 1901, p. 120)

...و اپنے دین کی اساس و بنیاد کے طور پر تسلیم کر لیا ہے، یہ کتابیں تین ہیں، چار وید، گیتا، اور منوسمرتی یہاں
...ہندو مذہب کے متعلق جو کچھ کہا جائیگا اس کا ماخذ یہی تین کتابیں ہوں گی،

...ہندو مذہب کے تین دور | یہ تینوں کتابیں تاریخی حیثیت سے تین مختلف دوروں سے تعلق رکھتی ہیں
...ر مسئلہ جنگ میں ہندو مذہب کے تین مختلف پہلوؤں کو پیش کرتی ہیں،

ویدوں کا تعلق اس دور سے ہے جسمیں آریہ قوم وسط ایشیا سے نکلکر ہندوستان پر حملہ آور ہوئی
...تھی، اور اس ملک کے اصلی باشندوں سے جو رنگ، نسل، اور مذہب میں اس سے بالکل مختلف تھے
...برسر جنگ تھی، اس جنگ میں اپنے اجنبی دشمنوں کے خلاف ان حملہ آوروں کے جذبات کیا تھے؟ ان
...وہ کس نظر سے دیکھتے تھے؟ ان سے بنائے مخاصمت کیا تھی؟ ان کے خلاف جنگ کے مقاصد کیا
...تھے؟ اور وہ ان سے کس قسم کا معاملہ کرنا پسند کرتے تھے؟ ویدوں کی نظمیں ان سوالات پر کافی روشنی ڈالتی ہیں

گیتا اس دور کی کتاب ہے جسمیں شمالی ہند پر آریوں کا تسلط قائم ہو چکا تھا، اور تفوق و برتری
...کے لئے خود آریوں کے دو با اثر خاندانوں میں کشمکش ہو رہی تھی، یہ کتاب بھگوان کرشن جیسے مذہبی پیشوا
...کی زبان سے جنگ کے متعلق ہندوؤں کے فلسفیانہ افکار سے روشناس کرتی ہے،

منوسمرتی اس دور کے مذہبی، سیاسی، اور تمدنی قوانین کا مجموعہ ہے جسمیں ہندوستان آریہ ورت
...بن چکا تھا، غیر آریہ قوموں کی طاقت فنا ہو چکی تھی، اور اس ملک میں آریہ قوم کی تہذیب عروج پر
...تھی، اس کتاب میں ہمکو جنگ کے قواعد و ضوابط اور مفتوح اقوام کے حقوق و فرائض کے متعلق بہت
...تفصیلات ملتی ہیں،

آیندہ بحث میں یہی ترتیب ملحوظ رکھی جائیگی،

...ویدوں کی جنگی تعلیم | لفظ وید چار کتابوں پر بولا جاتا ہے، جو الگ الگ ناموں سے مشہور ہیں، سب
...سے قدیم رگ وید ہے، پھر یجروید، پھر سام وید، پھر اتھروید، ان کے منتروں کو مضامین کے اعتبار
...سے مرتب کرنا مشکل ہے، کیونکہ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ ایک ایک منتر میں متعدد مضامین آ جاتے ہیں
...اس لئے ہم مضامین کے اعتبار کو نظر انداز کر کے صرف ان منتروں کو الگ نقل کر دیں گے
...جو جنگ سے کسی نوع کا تعلق رکھتے ہیں،

[illegible]
...ہے،

رگ وید کے منتر حسب ذیل ہیں :۔
"اے اندر! وہ دولت، جو مسرت بخشے، فاتح کی دائمی فاتحانہ دولت، جو ہماری خوب مدد کرے، جس کے ذریعہ ہم دست بدست لڑائی میں اپنے دشمنوں کو دفع کر سکیں"
(۱۱:۸:۲۰۱)
"اے روشن آگ! تو جس پر متبرک تیل ڈالا جاتا ہے، ہمارے دشمنوں کو جلا دے جنکی حفاظت خبیث روحیں کرتی ہیں" (۱:۱۲:۵)
"(اندر اور وارونا) کی نصرت سے ہم دولت کا بڑا خزانہ جمع کر لیں اور اس کے کھتے بھر لیں، کافی اور بچا رکھنے کے قابل، اے اندر اور وارونا! تمکو میں دولت کے لئے متعدد صورتوں سے پکارتا ہوں، ہم کو تم فتحمند رکھو" (۱:۱۷:۶،۷)
"ہر بدگو کو قتل کر دے، اور جو کوئی ہمکو خفیہ طریقوں سے (غالباً جادو سے) تکلیف پہونچائے، اسے برباد کر، اے اندر! ہمکو خوبصورت گھوڑے اور گائیں دلوا، ہزاروں کی تعداد میں، اے بڑے دولت مند!" (۱:۲۹:۷)
"تو آریوں اور دسیوؤں کے درمیان امتیاز کر جو اَدھرمی ہیں ان کو سزا دے، اور انھیں اس کے حوالہ کر دے جس کی گھانس (دیوتاؤں کے نذرانے کے لئے) کٹی رکھی ہے" (۱:۵۱:۸)

ے مسٹر ... نے اپنی کتاب (Indo Aryans) میں یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ دسیو سے خود آریوں کے نابکار قبائل مراد ہیں، (جلد اول صفحہ ۲۱۰) لیکن خود ویدوں کے مطالعہ سے یہ بات پایہ تحقیق کو پہونچ جاتی ہے کہ آریہ حملہ آور اس لفظ سے ہندوستان کے ان اصلی باشندوں کو یاد کرتے تھے، جن سے ان کی جنگ تھی، یہ صرف میری اپنی رائے نہیں ہے، بلکہ اکثر محققین اسی رائے کے مؤید ہیں، گرفتھ لکھتا ہے،
"یہ نام اکثر ان دیسی اقوام کے لئے مستعمل ہوتا ہے جو آریوں کی مہاجرت میں مزاحم ہوئی تھیں، بعد میں یہ لفظ ان تمام لوگوں کے لئے بولا جانے لگا جو وید کی عبادات اور مخصوص برہمنی رسوم ادا نہیں کرتے،" (اتھرو وید ج ۱ ص ۹)
پروفیسر بلوم فیلڈ لکھتا ہے :۔
ایک نامعلوم زمانہ میں جو آج کل کے تخمینہ کے مطابق ۱۵۰۰ قبل مسیح میں شروع ہوا تھا، اگرچہ ممکن ہے کہ اس سے بھی

"ان خوبصورت [illegible] ... [illegible] ...
گایوں کے افلاس کو دور کر کے ان قطروں کے باعث اندر وسیوں کو منتشر [illegible]
اور ان کی اذیت سے محفوظ ہو کر ہم وافر سامان خوراک حاصل کریں۔ اے اندر ہم کو
خوب دولت اور خوراک جمع کر لینے دے .... ہم بہادروں کی سی طاقت پیدا
کر لیں جو مویشی اور گھوڑے حاصل کرنے کا خاص وسیلہ ہے۔" (۱۱: ۵۳: ۴-۵)
"پس اے اندر ہم کو بڑھنے والی شوکت عطا کر۔ ہم کو وہ قہر در حقیقت عطا کر جو قوموں
کو مغلوب کرے۔ ہمارے دولت مند سرداروں کو برقرار رکھ۔ ہمارے راجاؤں کی
حفاظت کر، ہم کو دولت اور خوراک، شریف اولاد کے ساتھ عنایت کر۔" (۱۱:۴۸)
"اے اگنی، تیرے مالدار پوجاری خوراک حاصل کریں، اور امرا بڑی عمریں پائیں
ہم اپنے دشمنوں سے لڑائی میں مال غنیمت حاصل کریں، اور دیوتاؤں کو ان کا حصہ
نذر کریں۔ اے اگنی ہم تیری مدد سے گھوڑوں کے ذریعہ گھوڑے، آدمیوں کے ذریعہ آدمی
(یعنی غلام) اور بہادروں کے ذریعہ بہادر فتح کریں۔" (۱۱:۷۳: ۵-۹)

[illegible] ... زیادہ قدیم تہذیب کے شروع ہونے ... [illegible] ...
ہندوکش کے شمال میں ہے شمالی مغربی ہندوستان یعنی [illegible] ... [illegible] کی سرزمین پر ہجرت
کرنی شروع کی [illegible] کے اصلی غیر آریہ باشندے جو آریوں سے نیچ [illegible] ... [illegible]
مغلوب ہو گئے۔" Encyclopaedia of Religion and Ethics [illegible] P. 107

پروفیسر میکڈانل لکھتا ہے:-
"رگ وید میں داس اور دسیو کی اصطلاحیں عموماً ان سیہ رنگ قدیم باشندوں کے لئے استعمال کی گئی ہیں جنہیں
فاتح آریوں نے مغلوب کیا تھا۔" Encyclopaedia of Religion and Ethics Vol. XII P. 610

ڈیم کروک لکھتا ہے:-
"بڑے بڑے دیوتا اپنے پوجاریوں کے فیاض [illegible] ... دسیو یا سیہ رنگ [illegible] باشندوں
کے خلاف جنگ کرنے میں ہندو آریہ کی مدد کرتے ہیں۔" Encyclopaedia of Religions and Ethics
[illegible] P. 691

”طاقتور اندر نے اپنے حسین رنگ والے[1] دوستوں کے ساتھ مل کر زمین فتح کی سورج کی روشنی اور پانیوں کو فتح کیا، اندر ہمارا محافظ ہو اور ہم بے خوف و خطر مال لوٹیں“

(۱: ۱۰۰: ۱۸، ۱۹)

”اے اندر تونے پورو کے لئے، اپنے غلام دیوداس کے لئے، اپنے پوجاری کے لئے ۹۰ قلعوں کے پرخچے اڑا دیے، اس طاقتور نے اتیھگو کے لئے شمبر کو پہاڑوں سے اُتارا، اپنی قوت سے زبردست خزانے تقسیم کئے، اور تمام خزانوں کو بانٹ دیا، اندر نے جنگ میں اپنے آریہ پوجاریوں کی مدد کی، اس نے جو ہر جنگ میں سینکڑوں نصرتیں مہیا رکھتا ہے“ (۱: ۱۳۰: ۸)

”اے اندر گھون! ہم جنگ میں تجھ سے امداد پاکر ان لوگوں کو مغلوب کریں جو ہمارا مقابلہ کرتے ہیں، ان کو فتح کریں جو ہم سے لڑتے ہیں، آج کے دن سوم رس انڈیلنے والوں کو برکت دے، ہم اپنی اس قربانی میں اپنی قوت دکھا کر مالِ غنیمت تقسیم کریں، لڑائی کا مالِ غنیمت (۱: ۱۳۲: ۱)

”جب اچھے نقشہ کے ساتھ بہادر لوگ فوج کو آگے بڑھاتے ہیں، تو وہ باقاعدہ جنگ میں فتح حاصل کرتے ہیں، اور شہرت و ناموری کی تلاش میں بڑھتے اور دباتے چلے جاتے ہیں“ (۱: ۱۳۲: ۵)

”اے اندر! تو ہر موقع پر ہمارا رہے، آدمیوں کا محافظ، نہایت شریف دل ہم کو ہمارے تمام حریفوں پر فتح بخشنے والا ہم نہایت وافر مقدار میں قوت بخش غذا حاصل کریں“ (۱: ۱۷۴: ۱۰)

”تو اے بہادر! مالِ غنیمت لوٹنے والے! آدمی کی گاڑی تیز چلا، ایک جلتے ہوئے جہاز کی طرح بے دین وسیو کو جلا دے، اے فاتح!“ (۱: ۱۷۵: ۳)

[1] حسین رنگ والوں سے مراد وہ گورے رنگ کے آریہ قبائل ہیں جنھوں نے ماوراء النہر سے آکر ہندوستان پر حملہ کیا تھا، ان کے مقابلہ میں ہندوستان کے اصلی باشندے کالے رنگ کے تھے، دیکھو گرفتھ کا ترجمہ رگ وید جلد اول صفحہ ۱۳۰۔

"اے طاقتور، اے اندر! تیری مدد سے ہم اپنے دشمنوں کو جو اپنے تئیں تنومند سمجھتے ہیں، زیر کریں، تو ہمارا محافظ بن، ہمیں بڑھا، ہمیں قوی بنا، ہم وافر مقدار میں قوت بخش غذائیں حاصل کریں۔" (۱ : ۷۹ : ۵)

"ہم تیری مدد سے دولت حاصل کریں، تیری اعانت سے اور آریوں کی قوت سے اپنے تمام دشمن دسیوں کو مغلوب کریں۔" (۲ : ۱۱ : ۱۵)

"اے بہادر! تو ہمارے من چلے بہادروں کے ساتھ مل کر وہ شجاعانہ کارنامے دکھا جنہیں تجھ کو پورا کرنا ہے، وہ (یعنی دشمن) اپنی قوت کے زعم باطل سے پھولے ہوئے ہیں، ان کو قتل کر اور ان کی املاک یہاں ہمارے پاس لے آ۔" (۲ : ۳۰ : ۱۰)

اے اندر! تو جنگ کے میدانوں میں مویشی حاصل کرنے کے لئے لڑتا رہا ہے، کیونکہ بہت لوگ تیری حمد و ثنا کرتے ہیں۔" (۵ : ۳۳ : ۴)

"اندر نے سورج اور گھوڑوں پر قبضہ کرکے اس گائے کو حاصل کیا جو بہت سوں کو سیر کرتی ہے، اس نے سونے کے خزانے فتح کئے، اس نے دسیوں کو زیر کیا اور آریہ وردں کو محفوظ کر دیا۔" (۳ : ۳۴ : ۹)

"اے آگ کے دیوتا! جو کوئی خفیہ طور سے ہم پر حملہ کرے جو ہمسایہ ہم کو ضرر پہونچائے اس کو تو منتر کی طاقت سے، ہمیشہ مشتعل رہنے والے شعلے سے جلانے والی تیز حرارت سے، جلا دے .... ہماری مدد کر تاکہ ہم یہ خواہش پوری کریں، دولت حاصل کریں، بہادروں کے ذخیرہ کے ساتھ" (۶ : ۵ : ۴ - ۷)

"اے اندر! ہم کو بہادرانہ سطوت عطا کر، آزمودہ کاری اور روز افزوں قوت کے ساتھ، جو مال غنیمت حاصل کرتی ہے، تیری مدد سے ہم جنگ میں اپنے دشمنوں کو مغلوب کریں چاہے وہ اپنے ہوں یا پرائے، ہم ہر دشمن پر فتحمند ہوں۔ اے بہادر! ہم تیری مدد سے دونوں قسم کے دشمنوں کو قتل کرکے خوش و خرم ہوں، بڑی دولت کے ساتھ" (۶ : ۱۹ : ۸ - ۱۳)

تو نے ... تیرے ... کے ساتھ ... دیئے جو ... کی پناہ تھے۔ تو نے انکو

تہ تیغ کر دیا، اور پورد کتا کی مدد کی" (۶ : ۲۰ : ۱۰)

"اے اندر ہمکو وہ دولت دے جو دشمن کو جنگ میں اس طرح مغلوب کر دے جیسے آسمان

لے دسیو کی طرح لفظ داس بھی ان دیسی قوموں کے لئے بولا جاتا تھا جو آریہ حملہ آوروں سے برسر پیکار تھیں، بعض لوگوں نے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ داس اور دسیو سے مراد ارواح خبیثہ ہیں، اگر یہ تاویل کسی طرح قابل تسلیم نہیں ہے، گرفتھ کہتا ہے:۔

یہ اصطلاح مثلاً ان خاص بد روحوں کے لئے وضع کی گئی تھی جو اندر اور انسانوں کی دشمن سمجھی جاتی تھیں، مگر بالعموم اس سے وہ وحشی لوگ مراد لئے جاتے تھے، جو اس ملک کے اصلی باشندے تھے، اور جن سے ابتدائی آریہ مہاجرین کی جنگ تھی"

دوسری جگہ یہی مصنف لفظ "واسم ورتم" کی تشریح کرتے ہوئے لکھتا ہے کہ

"اس سے مراد وہ وحشی بد شکل باشندے ہیں جنہیں آریہ مہاجرین نے بھوت پریت کی جماعت میں شامل کر دیا"

(گرفتھ کا ترجمہ اتھروید جلد اول صفحہ ۴۴۰)

داس اور دسیو کے مسمی کی تعیین میں اسوقت کسی شک کی گنجائش نہیں رہتی جب ہم خود رگ وید میں انکے انسان ہونے کے متعلق بین شہادتیں دیکھتے ہیں۔ انکو جگہ جگہ بے دین اور ادھرمی کہا گیا ہے، وہ دیوتاؤں کو نہ ماننے والے اجنبی قوانین کی پابندی کرنے والے اور عقل سے محروم بتائے گئے ہیں۔ ان کے پاس گلے بیل اور مویشی کی کثرت ہے، انکے پاس قلعے ہیں جنکو آریہ فتح کرتے ہیں، ان سب سے زیادہ روشن دلیل یہ ہے کہ انکی ناک چپٹی انکے جبڑے چپٹے اور رنگ کالے بتائے گئے ہیں جو بعینہ قدیم دراوڈین نسل کے لوگوں میں ہمکو آج بھی نظر آتے ہیں، رگ وید میں ایک جگہ لکھا ہے:

"اے بہادر تو نے لڑائیوں میں بیل جیسے جبڑے والے داسوں کے جادو ٹونے تک کو مغلوب کر لیا (۷ : ۹۹ : ۴)"

دوسری جگہ دسیو کا حلیہ اس طرح بیان کیا جاتا ہے :۔

"تو اپنے ہتھیار سے نکٹے دسیوں کو قتل کرتا ہے" (۵ : ۲۹ : ۱)

ایک اور جگہ داسوں کے غلامی میں دیئے جانے کا ذکر اس طرح کیا جاتا ہے :۔

"یا دو اور تو روا نے بھی ہمکو خدمت کیلئے دو داس دیئے ہیں، اور بہت سی گائیں" (۱۰ : ۶۲ : ۱۰)

پھر ایک جگہ داس عورتوں کے بھی غلامی میں دیئے جانے کا ذکر ہے، چنانچہ ایک شخص تراسا دسیو کو ہم پچاس لونڈیوں کا نذرانہ پیش کرتے ہوئے دیکھتے ہیں (۸ : ۱۹ : ۳۶)، ان بین شہادتوں کی موجودگی میں خواہ مخواہ تاویل کرنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے کہ یہ لوگ آدمی نہ تھے بلکہ بھوت پریت تھے۔

زمین پر چھایا ہوا ہے، دولت جو بہادروں ... لاتی ہے، جو خالہ پیدا کرنے والی زمینیں فتح کرتی ہے وہ دولت جو دشمن کو شکست دیتی ہے۔" (۶: ۲۰: ۱)

"اے دیوتاؤ! ہم ایک ایسے ملک میں آپہونچے ہیں جو چراگاہوں سے خالی ہے، ایسی سرزمین جو وسیع ہونے کے باوجود ہمیں پرورش کرنے کے لئے کافی نہیں ہے، اے برہسپتی! مواشی حاصل کرنے کے لئے جنگ میں مدد کر، اے اندر! اس بھجن گانے والے کے لئے ایک راہ نکال، روز بروز وہ ان کی دیہی آریوں کی جائے سکونت سے اس سیہ رو مخلوق کو دور بھگا رہا ہے، اس بہادر نے ان کمینے بھیری بھرنے والے داسوں یعنی ورچین اور شامبر کو دریاؤں کے سنگم پر قتل کر ڈالا۔" (۶: ۴۷: ۲۰-۲۱)

"تیر کمان کی مدد سے ہم مواشی حاصل کریں، تیر کمان کی مدد سے ہم لڑائی جیتیں، تیر کمان کی مدد سے اپنی گھمسان کی لڑائیوں میں فتح مند ہوں، تیر کمان دشمنوں کو غمگین کرتی ہے، اس سے مسلح ہو کر ہم تمام ممالک فتح کریں۔" (۶: ۷۵: ۲) یجروید بیض، ادھیاے ۲۹ منتر ۳۹)

"اے اندر! جب میدانِ جنگ گرم ہو تو ہمارے دشمنوں کو، ان فانی لوگوں کو جو ہماری ہجو کرتے ہیں، ہلاک کر دے، بدگوؤں کی بددعائیں ہم سے دور رکھ، ہمارے پاس مال و دولت کے جمع کئے ہوئے خزانے لا، ہمارے ناتی حریفوں کے ہتھیار توڑ دے، ہمیں عظیم الشان شہرت اور مال و دولت عطا کر، ہمارے حریفوں کو آسانی کے ساتھ مغلوب ہو جانے والا بنا دے۔ اے بہادر! ہم فتح مند ہوں، مالِ غنیمت حاصل کریں، اس طرح اے اندر! قیمتی چیزوں سے ہم کو مطمئن کر، ہم تیری بلند پایہ مہربانی حاصل کریں، ہمارے بہادروں کو بکثرت سامانِ خوراک اور بہادر اولاد حاصل ہو۔"

(۷: ۲۵: ۲-۳-۵-۶)

"اے گھوڑے! ہمارے دشمنوں کو بھگا دے، مال و دولت کی فتح کو آسان کر، تو مالِ غنیمت حاصل کرنے کے لئے لڑائی میں ہمارا محافظ بن۔" (۷: ۳۲: ۲۵)

"اے بہادر! ہم تیری دوستانہ معیت میں اس شخص کا مقابلہ کریں جو ہمارے خلاف

غصہ سے بھڑک رہا ہے اور اس قوم کے ساتھ لڑائی میں ثابت قدم رہیں جو کثرت سے گائیں رکھتی ہے (۸ : ۲۱ : ۱۱)

"تو گھن کھائے درخت کو ریزہ ریزہ کردے، داسوں کی قوت کا قلع قمع کردے، ہم اندر کی مدد سے وہ سب خزانے بانٹ لیں جو انھوں نے جمع کئے ہیں (۱۰ : ۴۰ : ۶)

"اے اگنی! اے دیوتا! لوگ قوت حاصل کرنے کے لئے تیری حمد کے ترانے گاتے ہیں، تو دشمن کو ڈرا دے دیگر پریشان کردے۔ اے اگنی! کیا تو مواشی حاصل کرنے اور دولت فتح کرنے میں ہماری مدد نہیں کریگی" (۸ : ۶۴ : ۱۰-۱۱)

"ہم جنگ میں ایسے ہو جائیں کہ تیری کرپا کے یقینی مستحق ہوں، دیوتاؤں کے لئے متبرک نذرانوں اور مناجاتوں سے ہمارا مدعا یہ ہے کہ ہم مال غنیمت حاصل کرسکیں" (دال کھیلہ ۵ : ۱۱)

"اے اندر! خزانوں کے خزانچی! ہم نے خزانوں کی خواہش سے تیرا سیدھا ہاتھ تھام لیا ہے، کیونکہ ہم تجھ کو جانتے ہیں، اے بہادر! مویشیوں کے مالک! ہمکو زبردست درخشاں زر و مال عطا کر، نامور رشیوں کے ساتھ مضبوط ہو کر ہمارے دشمنوں کو مغلوب کرکے ہمیں زبردست درخشاں زر و مال عطا کر، ہیے اندر! قلعوں کو مسمار کرکے دسیوں کو قتل کرکے ہمکو زبردست درخشاں زرو مال عطا کر" (۱۰ : ۴۷ : ۱-۳-۴)

"ہمارے گردوہ دسیو ہیں جنکا کوئی دھرم نہیں ہے، عقل سے محروم، انسانیت سے خارج، غیر مانوس قوانین کے پابند ہیں" (۱۰ : ۲۲ : ۸)

"دشمنوں کو قتل کرنے والے دریترا! دسیو کو ہلاک کرنے والے! تو ہمارے پاس ہر قسم کی دولت اور خزانے لا" (۱۰ : ۸۳ : ۳)

"تو ہمارے دشمنوں کو قتل کر، ان کی جائداد واملاک بانٹ دے، اپنی قوت کے کرشمے دکھا، ان لوگوں کو منتشر کردے جو ہم سے نفرت کرتے ہیں، اے مینو! ہم سے لڑنے والوں پر غالب آ، توڑتا جا، قتل کئے جا، دشمنوں کو کچلے جا" (۱۰ : ۸۴ : ۲۱ - ۳)

"لڑ، اے صداقت سے مضبوط ہو کر لڑنے والے، تو لڑائی لڑ، اور ہمکو اس دولت سے حصہ دلوا، جو ابھی تک تقسیم نہیں ہوئی ہے" (۱۰ : ۱۱۲ : ۱۰)

[illegible] تو [illegible] کے ساتھ [illegible] قوموں پر غالب [illegible]

"مجھکو اپنے [illegible] میں سانڈ بنا مجھکو اپنے حریفوں کا فتح کرنے والا بنا مجھکو اپنے دشمنوں کا قتل کرنے والا، با اختیار حکمراں، مویشیوں کا مالک بنا" (١٠ : ١٦٦ : ١)

یجروید [illegible] میں ہمکو جنگ کے متعلق حسب ذیل منتر ملتے ہیں :-

"اے اگنی ہمکو [illegible] [illegible] آسائش بخشے اور ہمارے دشمنوں کو ہمارے آگے مارتی بھگاتی چلے، وہ مال غنیمت حاصل کرنے کی جنگ میں مال غنیمت لوٹے، وہ [illegible] فاتحانہ پیش قدمی میں دشمنوں کو زیر کرے" (١٨ : [illegible])

اے اگنی! ہماری مزاحمت کرنے والی جماعتوں کو مغلوب کر ہمارے دشمنوں کو بھگا [illegible] اے اجیت! دیوتاؤں کو نہ ماننے والوں حریفوں کو قتل کر اور اپنے [illegible] کو عظمت و شوکت نصیب کر" (٩ : ٣٧)

اے دسیوں کے حق میں سب سے زیادہ تباہ کن! مجھکو پا [illegible] روشن [illegible] تو ہر لڑائی میں مال غنیمت حاصل کرتی ہے (١١ : ٣٤)

"جو شخص ہمکو نقصان پہونچانے کی فکر کرتا ہے جو ہمکو نفرت کی نگاہ سے دیکھتا ہے اور جو کوئی ہمپر تہمت لگائے اور ہمیں ایذا دے، اسے تو جلا کر [illegible] (١١ : ٨٠)

"اے آگ! تو جس کے شعلے تیری طرح تیز ہو رہے ہیں، [illegible] آگے آگے ہمیں ہمارے دشمنوں کو جلا دے۔ اے بھڑکتی ہوئی آگ! جس نے [illegible] ساتھ [illegible] ہے تو سوکھی لکڑی کی طرح بالکل بھسم کر دے۔ اے اگنی! [illegible] کو [illegible] جو ہمارے خلاف [illegible] ہیں، اپنی آسمانی طاقت کا مظاہرہ کر" ([illegible])

"اور درندہ جانور اس کے [illegible] ہیں [illegible] جانور [illegible] کا [illegible] سمجھ [illegible] کو سلام ہو، وہ ہماری حفاظت کریں [illegible] ہم [illegible] آدمی [illegible] کے [illegible] جس سے ہم نفرت کرتے ہیں اور جو ہم سے نفرت کرتا ہے (١٥ : [illegible])

[illegible] طاقت [illegible] مضبوط [illegible] زبردست [illegible] سب شہرور دخود [illegible] ہر ایک کو زیر کرنے [illegible] ہے، فتح و کامرانی کا [illegible]

سب کچھ لوٹنے والا ہے، تو دشمنوں اور بہادروں سے نکل کر اپنی فتح کی گاڑی پر سوار ہو، اصطبلوں کا کھولنے والا، گائیں لوٹنے والا، اس صاعقہ سے مسلح ہے، جو ایک پوری فوج کو شکست دیتی ہے اور طاقت سے اس کو تباہ کر دیتی ہے، بھائیو! اس کے پیچھے پیچھے آؤ، اپنے تئیں بہادروں کی طرح آزاد چھوڑ دو، اور اس اندر کی طرح اپنی شجاعت اور جسارت کا اظہار کرو، ہمارے دشمنوں کے حواس باختہ کر دے، اے اپوا![1] تو ان کو پکڑ لیجا، ان پر حملہ کر، ان کے دلوں کو آگ پر رکھ کر انھیں جلا دے، اس طرح ہمارے دشمن ہمیشہ تاریکی میں رہیں" (۱۰ : ۳۶ - ۳۸ - ۴۴)

سام وید کے جن منتروں میں جنگ کا مضمون آیا ہے وہ یہ ہیں:-

" اندر! ہماری مدد کے لئے ایسی کارآمد دولت دے جو ہنرمند ہوشیار لوگوں پر حکومت کرنی والی ہو، ہاں! وہ قوت والا ہمکو اقتدار کی دولت دے، اندر اور پوشن کو ہم دوستی اور خوش حالی کے لئے پکاریں، اور مال غنیمت لوٹنے کے لئے" (حصہ اول ۳ : ۱ : ۲۱ - ۹)

" ہم شعرا تجھے پکارتے ہیں تاکہ ہم اپنے لئے دولت اور اقتدار حاصل کریں، اے اندر! اے بہادروں کے سردار! لوگ جنگ میں تجھ کو پکارتے ہیں، گھوڑ دوڑ میں تجھکو پکارتے ہیں، عملی آدمی اپنے سچے حلیف پورندھی کے ساتھ مال غنیمت حاصل کریگا" (۳ : ۱۱ ۵ : ۲ - ۶)

" جب ہم رس نکالتے ہیں، تو اے اندر! اے بڑے بہادر! ہم تیری حمد و ثنا کرتے ہیں حتی کہ مال غنیمت لوٹتے وقت بھی، ہمیں خوش حال بنا، بڑی ہوشیاری کیساتھ ہم خاص تیری حفاظت میں فتح حاصل کریں، اے اندر! ہم تیرا سیدھا ہاتھ پکڑتے ہیں تو کہ دولت کا مالک تو ہی ہے، ہم تجھ سے خزانوں کی خواہش کرتے ہیں، چونکہ ہم تجھکو بہادر، مویشیوں کا مالک جانتے ہیں، ہمکو زبردست درخشاں زر و مال عطا کر، لڑائی اور عظمت و شان کے ہیرو! ہمکو مویشیوں کے تھان کا ایک حصہ بخش دے" (۴ : ۱ ۱ ۴ ۱ ۴ : ۵ - ۶)

---

[1] وبائی امراض کی دیوی کا نام ویدک دیومالا میں "اپوا" ہے، یہاں غالباً وہ بیماریاں مراد لی گئی ہیں جو لڑائی کے وقت فوجوں میں پھیلتی ہیں، (گرفتھ کا ترجمہ یجر وید صفحہ ۱۵۴)

"اندر ... کے ساتھ ... [illegible] ... جس نے جسموں کے ...
ملکر کالے غولوں کو بھگا دیا" (۴:۲:۱۲:۱۱)

"اے بہادر! افراد کے ساتھ گائیں رکھنے والی قوم کے خلاف جنگ میں تو ہمارا دوست ہو۔ اندر ہم اس شخص کا مقابلہ کریں جو اپنے غصہ میں بھپر جاتا ہے" (۵:۲:۱۵:۵)

"غضبناک چمکتے ہوئے اپنی چال میں تھکے بغیر وہ کالے رنگ والوں کو بھگاتے ہوئے سانڈوں کی طرح آگے بڑھے۔ اے سوم رس! تو دشمنوں کو شکار کرتا ہوا بہتا ہے۔ عقل اور مسرت بخشنے والا! تو دیوتاؤں کو نہ ماننے والے لوگوں کو بھگا دے"

(۶:۱:۱:۵-۶)

"گاڑیوں کے آگے آگے بہادر سپہ سالار مالِ غنیمت تلاش کرتا ہوا آگے بڑھتا ہے اس کی فوج خوشیاں مناتی ہے" (۶:۱:۱:۵:۱)

"مالِ غنیمت لوٹتے وقت ہم پر اس بہترین زر و مال کے دریا بہا دے جس کی سینکڑوں تمنا کرتے ہیں" (۲:۲:۱:۱:۵)

"اس کے ساتھ فتح حاصل کرنے کی کوشش میں ہم دشمن سے تمام مال و دولت چھین لیں۔ آدم زاد کی تمام عظمت و شان حاصل کریں" (حصہ دوم ۱:۱:۸:۳)

"اس سے ہم سامان خوراک ... مالِ غنیمت کے طالب ہیں جس میں سینکڑوں ہزاروں گائیں ہوں" (۱:۱:۳:۱:۳)

"اے دیوتاؤں کے محبوب! اپنے اچھے مسرت بخش ... ساتھ ... پاپیوں کو قتل کرتے ہوئے دشمنوں کو ان کی نفرت سمیت ہلاک کرتے ہوئے ... زور پکڑتے اور مالِ غنیمت حاصل کرتے ہوئے ... گھوڑوں اور گایوں کا ... کرنے والا ہے" (۳:۱:۵:۱-۲)

"اندر کی عنایات قدیم ہیں اس کی ... حفاظت بھی بند نہیں ... [illegible]

[illegible]

[illegible] ... ہے

پنے پوجاریوں کو گایوں سے بھرا ہوا مالِ غنیمت عطا کرتا ہے" (۲ : ۱ : ۳)

"اے گھوڑ! اے کرم کرنے والے! اپنی حیرت انگیز اعانتوں کے ساتھ ہم کو کسی گایوں سے بھرے ہوئے باڑے پر لے چل" (۲ : ۲ : ۱۱ : ۲)

"اے چابکدست بہادر! اکنوا کے بیٹوں کے ساتھ بے دھڑک ہو کر ہم تم دو ہزار مالِ غنیمت لوٹ" "اے سرگرم کار گھوڑ! پُرشوق دعاؤں کے ساتھ ہم زرد رنگ کے مال[1] اور گایوں کے ایک بڑے گلے کی تمنا کرتے ہیں" (۲ : ۲ : ۱۲ : ۳)

"ہم رنج و تکلیف کے پل کو عبور کر کے برکت کے پل پر پہونچ جائیں، ہم بے دین داسوں کو زیر کر لیں" (۳ : ۳ : ۱ : ۲)

"سچے دیوتاؤ! ہم تم سے وافر سامانِ خوراک حاصل کریں اور ایک سکونت کی جگہ اے مترو! ہم تمہارے اپنے ہو جائیں" "اے مترو! ہماری حفاظت کرو، اپنی حفاظتوں کے ساتھ ہمیں بچاؤ" "اے مشاق محافظو! ہم دسیو کو اپنے ہاتھ سے زیر کر لیں" (۳ : ۴ : ۴ : ۴)

"اے بہادر! اے مالِ غنیمت لوٹنے والے! تو آدمی کی گاڑی کو تیز چلا" "اے فاتح! ایک مشتعل تہاز کی طرح بے دین دسیوں کو جلا دے" (۶ : ۳ : ۲۰ : ۳)

"وہ سندر جب ہمارے گیت سنتا ہے تو اپنی گایوں کی کثیر دولت کو ہم سے بچا کر نہیں رکھتا، وہ اپنی قوت سے ہمارے لئے گایوں کا باڑہ کھول دے، خواہ وہ کسی کا ہو، جنگی طرح دسیوں کو قتل کرنے والا جاتا ہے" (۸ : ۲ : ۴ : ۲-۳)

"اندر اور اگنی! تم دونوں نے ایک زوردار کارروائی سے ۹۰ قلعوں کو سر کر لیا، جو داسوں کے قبضہ میں تھے" (۸ : ۲ : ۱۷ : ۳)

اتھروید میں جنگ کا مضمون بکثرت آیا ہے، اس میں سے چند منتروں کو یہاں نقل کیا جا[illegible]

"اے اگنی! تو یاتو دھانوں[2] کو یہاں باندھ کر لا، اور پھر اندر اپنی کڑک سے ان کے سر و[illegible]

---

[1] زرد رنگ کے مال سے مراد سونا ہے، عربی میں بھی اکثر سونے اور چاندی کا نام لینے کے بجائے صفراء اور بیضاء بولتے ہیں[illegible]

[2] یہ لفظ کبھی ارواحِ خبیثہ کے لئے استعمال کیا جاتا ہے اور کبھی غیر آریہ دشمنوں کے لئے، جیسا کہ ڈاکٹر بریڈ لیتھ کہتا ہے، یہ تمیز کرنا بہت مشکل[illegible] کہ یہ القاب کس جگہ غیر آریہ دشمنوں کیلئے استعمال کئے گئے ہیں، اور کس جگہ ارواحِ خبیثہ کے لئے تاہم اندازِ بیان سے کہیں کہیں اسکا پتہ چل جا[illegible]

"اے سوم رس پینے والے! یا تو دھانوں کی آل اولاد کو کھینچ لا اور ہلاک کر ڈال، تو ہی گناہگاروں کی دونوں آنکھیں سر سے باہر نکال دے" (۱۰ : ۸۷ : ۳)

"اے منیو! اپنی قوتوں سے زیادہ طاقتور بجلی لے کر آ اور اپنے غضب[1] سے ہمارے تمام دشمنوں کو ہلاک کر دے، دشمنوں اور ورتروں اور دسیوں کو قتل کرنے والے! تو ہمارے پاس ہر قسم کی دولت اور خزانے لا" (۴ : ۴۴۲ : ۱-۳)

"بجلی کی طاقت بخشتے ہوئے راجہ! اس کو تباہ کر جو ہم کو دکھ و تکلیف دے اور جو ہم سے دشمنوں کا سا سلوک کرے، جو کوئی دکھ پائے بغیر ہمیں تکلیف دے یا دکھ پا کر ہم کو ستائے اس کو میں آگ اور ویس ونا کے دو طرفہ عذاب میں رکھ دوں" (۴ : ۳۲ : ۳۰)

"میں پشاچوں[2] کو اپنی قوت سے فتح کروں اور ان کی دولت چھین لوں، جو کوئی ہم کو ایذا دے اسے میں قتل کر دوں اور میرے [illegible] کو کامیابی ہو" (۴ : ۳۶ : ۴۴۲)

"مدد! تمہاری گردنیں توڑ دے، بے شک وہ! اور تمہاری پسلیاں چور چور کر دے، اے یا تو دھانو! یہاں ہم شان کے ساتھ ہیں، اے [illegible]۔ تو حریص [illegible] کو مار بھگا، ان کو کوئی جائے پناہ اور کوئی اطمینان کی جگہ نہ ملے، بلکہ وہ سب چڑھ چڑھ کر اکٹھے موت کے منہ میں چلے جائیں" (۶ : ۳۲ : ۳)

"ہمارے یہ دشمن بے ہاتھ کے ہو جائیں، ہم ان کے سست بازوؤں کو بیکار کر دیں اور اس طرح اے اندر! ہم ان کی ساری دولت آپس میں بانٹ لیں" (۱۰ : ۲۲ : ۳)

"ان کو بیل کی کھال میں سی دو، ان کو ہرن کی طرح بزدل بنا دو، دشمن بھاگ جائیں اور ان کے مواشی ہمارے پاس آ جائیں" (۶ : ۴۷ : ۳۰)

"ہم اندر کی مدد سے دشمن کے تمام جمع کئے ہوئے خزانہ کو بانٹ لیں، وید منتر کے قانون کے مطابق تیرے غرور اور تیری شرارت کا سر نیچا کر دوں" (۱۰ : ۸۰ : [illegible])

---

[1] غضب کا دیوتا۔ [2] پشاچ عموماً بھوت [illegible] ہوتا ہے کہ اس لفظ سے انسانی دشمن مراد ہیں۔

"اے آگ کے دیوتا! تو یا تو دھانوں کی کھال میں گھس جا، تیرا تباہ کن تیر (یعنی شعلہ) ان کو بھسم کر ڈالے ... اے جات ویدا! ان کے جوڑوں کو کچل ڈال، کچا گوشت کھانے والا اور گوشت کی تلاش کرنے والا اسکو ہلاک کر دے" (۸: ۳: ۴)

"اے آگ کے راجہ! جہاں کہیں تو کسی یا تو دھان کو کھڑے ہوئے یا پھرتے ہوئے دیکھے یا اس کو جو ہوا میں اڑتا ہے تو غصہ سے مشتعل ہو کر اسے تیر سے چھید ڈال" (۸: ۳: ۵)

"یا تو دھانوں کے دلوں کو تیر سے چھید ڈال اور ان کے بازوؤں کو جو تجھ پر حملہ کرنے کے لئے اٹھیں توڑ دے۔ ان شیطانوں کے سامنے بھڑک کر، اے اگنی! انھیں مار گرا، مردار خوار چیکبرے گدھ ان کو کھائیں، اس پلید کو آدمیوں میں سے آدم خور کی طرح تاک کر اس کے تینوں اوپر کے اعضا کو توڑ ڈال، اپنے شعلوں سے اس کی پسلیوں کو کچل دے، اے اگنی! اس کے نیچے کے اعضا کو تین ٹکڑے کر دے" (۸: ۳: ۶-۷-۱۰)

"اے اندر اور سوما! تو خبیث دشمن کو جلا دے، تباہ کر دے، اے دیوتا آ! جو رنج پر رنج پہونچاتے ہیں انھیں نیچا دکھا، ان احمقوں کو نیست و نابود کر دے، جلا ڈال، ذبح کر دے، ہمارے پاس سے دفع کر اور ان مبتذہ ظلم راکششوں کو ٹکڑے ٹکڑے کر دے" (۶: ۳: ۴: ۱۔ رگ وید ۱: ۸۷: ۵: ۱۰۰)

"پس اے دیوی گائے! برہمن پر ظلم کرنے والے مجرم بخیل، دیوتاؤں کی مذمت کرنے والے کو اپنی سرگرم ہونے والی بان سے جو استرے کے پھل کی طرح تیز ہے ... کے سر کو کندھوں سے الگ کر دے، اس کے سر کے بال نوچ ڈال ... کی کھال کھینچ لے، اس ... پیچھے کھینچ لے، اس کے ڈھانچ پر سے گوشت کی بوٹی بوٹی اتار لے، اس کی ہڈیوں کو کچل دے، اس کے سر سے بھیجا نکال لے اور ... کے سب اعضا اور جوڑوں کو الگ کر دے" (۱۲: ۵: ۶۵-۷۱)

"قتعہ شکن ... الک، اندر نے دشمنوں کا ناس کر دیا اور بجلی کی سی ... کے ساتھ ... دسوں کو مغلوب کر لیا، اس نے اپنی قوت، اپنی ہر ایک پر غالب

آنے والی جرات، اپنی حیرت انگیز مہارت فن سے برہمن دیوداس کو [illegible]
سونے کے خزانے فتح کرکے، اس نے دیو کو تہس نہس کردیا، اور آریہ نسل کے لوگوں
کو محفوظ کردیا (۲۰: ۱۱۱۱-۶-۹)

ویدوں کی تعلیم پر ایک نظر

اور جنگ کے متعلق چاروں ویدوں کے منتر لفظ بلفظ نقل کردیے گئے ہیں، اور ان کی اصلی اسپرٹ کو ظاہر کرنے کے لئے ایک ایک مضمون کے کئی کئی منتروں کو نقل کیا گیا ہے، ان کے مطالعہ سے جن اہم نکات پر روشنی پڑتی ہے وہ مختصراً یہ ہیں:-

۱۔ آریوں کی جنگ ایک ایسی قوم سے تھی جو رنگ، نسل، مذہب، اور وطنیت میں ان سے مختلف تھی، اور یہی اختلاف ان کے درمیان بنائے عداوت ونفرت تھا۔

۲۔ وہ اس قوم کو بھوت پریت، شیطان اور ارواح خبیثہ میں سے سمجھتے تھے، انھیں داس، داسیو، راکشش، یاتو دھان، اور پشاچ وغیرہ نفرت انگیز ناموں سے یاد کرتے تھے اور ان کو انسانیت سے خارج عقل وشعور سے عاری، اور آریہ نسل کے مقابلہ میں ذلیل وکمینہ خیال کرتے تھے، انھیں خیالات کے ماتحت انھوں نے اپنے ان دشمنوں کو وہ درجہ دینے سے انکار کردیا جو برابر کے ابنائے نوع کو دیا جانا چاہیے،

۳۔ ان کے پیش نظر جنگ کا کوئی بلند اخلاقی مقصد نہ تھا، انھیں دولت اور خزانوں کی تلاش تھی، گائے بیل گھوڑے اور دوسری قسم کے مویشیوں کی [illegible] چاہتے تھے، زرخیز زمینوں، آرام دہ مکانوں، اور سامان خوراک سے بھرپور ذخائر کے خواہشمند تھے، اور بعد میں ان کے اندر قوموں کو مغلوب کرنے، ہمسروں میں شجاعت وبہادری کی شہرت حاصل کرنے، اور ملکوں پر رعب وشوکت کے ساتھ حکمرانی کرنے کی خواہش پیدا ہوگئی تھی، ویدوں میں ہمیں ان مقاصد کے سوا کوئی اور مقصد نظر نہیں آتا،

۴۔ غیر آریہ قوم کے لوگوں سے ان کی جنگ کسی قابل تصفیہ نزاع پر مبنی نہ تھی، بلکہ ایک ایسی نزاع پر مبنی تھی جو فریقین میں سے کسی ایک کے کلیۃً مٹ جانے یا پامال ومغلوب ہوجانے کے سوا کسی اور صورت سے ختم نہ ہوسکتی تھی۔ ان کی جنگ اس بنا پر تھی کہ یہ قومیں آریہ نہیں اور آریوں کے دیوتاؤں کی پرستش نہ کرتی تھیں، یہی وجہ کا رفع ہونا تو جب تک ناممکن تھا کیونکہ

نسل کوئی بدلنے کی چیز نہیں ہے، اب رہی دوسری وجہ تو وہ بھی اس لئے رفع نہ ہو سکتی تھی، کہ آریوں کا مذہب تبلیغی مذہب نہ تھا، ویدوں سے کہیں اشارۃً بھی یہ نہیں معلوم ہوتا کہ آریوں نے غیر آریہ قوموں کو اپنے مذہب کی طرف دعوت دی تھی، برعکس اس کے ہمیں اس امر کی بین شہادتیں ملتی ہیں، کہ آریہ ورن کے لوگ غیر آریہ لوگوں کو فطرۃً ذلیل و نجس سمجھتے تھے اور اس قابل نہیں سمجھتے تھے کہ ان کی مذہبی عبادت میں شریک ہو سکیں، یا ان کی دینی کتابوں کو ہاتھ لگا سکیں، یہی وجہ ہے کہ ان دونوں حریفوں کی جنگ اس وقت تک ختم نہ ہوئی جب تک ملک کے اصلی باشندوں نے شودر بننا یا جنگلوں اور پہاڑوں کی طرف نکل جانا قبول نہ کر لیا،

ویدوں کے منتروں سے یہ تو معلوم نہیں ہوتا کہ آریہ حملہ آور اپنے دشمنوں کے ساتھ جنگ میں فی الواقع کیا سلوک کرتے تھے، مگر اتنا ضرور معلوم ہوتا ہے کہ ان کے دل میں ان لوگوں کو سخت ہولناک عذاب دینے کی خواہش موجود تھی، زندہ آدمی کی کھال کھینچنا، اس کی بوٹیاں کاٹنا، اسے آگ میں جلانا، اس کے اعضا کا مُثلہ کرنا، اس کو درندہ جانوروں سے پھڑوانا، اسے جانوروں کی کھال میں سی دینا، اس کے بال بچوں تک کو ذبح کر ڈالنا، یہ وہ مرغوب سزائیں ہیں جنکا ذکر بار بار وہ اپنے منتروں میں کرتے ہیں،

یہ جنگ اصول اور فروع دونوں کے لحاظ سے اسلام کی جنگ کے ساتھ کلّی اختلاف رکھتی ہے، اسلام بنی نوع انسان میں عقیدہ کی بنا پر امتیاز قائم کرتا ہے، اور وید نسل و رنگ کی بنا پر، اسلام نے ہر کافر کے لئے اپنی برادری کے دروازے کھول رکھے ہیں، مگر ویدوں کے مذہب نے آریہ نسل ہی نہیں بلکہ "ہند و آریہ" (INDO ARYAN) نسل کو اپنے اندر لیکر باقی سب کے لئے اپنا دروازہ بند کر لیا ہے، اسلام اپنے پیرووں کو صرف حفاظت نفس اور دفع فساد کے لئے جنگ کی اجازت دیتا ہے، اور باقی تمام اغراض کے لئے خوں ریزی کو گناہ عظیم سمجھتا ہے، مگر ویدوں کا مذہب ملک گیری، حصول مال و زر، اور شہرت و ناموری کی دھاک بٹھانے سے زیادہ کسی بلند مقصد سے واقف نہیں ہے، اسلام دشمن کے ساتھ جنگ میں ہر قسم کے وحشیانہ سلوک کو ناجائز قرار دیتا ہے، مگر وید اپنے اندر ان اعمال کی جانب خاص رغبت پنہاں رکھتے ہیں، اب عقل سلیم خود بہتر فیصلہ کر سکتی ہے کہ دونوں میں سے کون حق پر ہے،

گیتا کا فلسفۂ جنگ ہندو مذہب میں گیتا کو جو عظمت حاصل ہے اس کی خاص وجہ یہ ہے کہ وہ
سری کرشن جیسے ممتاز مذہبی پیشوا کی طرف منسوب ہے، مسٹر تلک کے بقول وہ "بھاگوت دھرم کا
سب سے بڑا گرنتھ ہے" اس میں ہندو مذہب کے فلسفہ کو جس وضاحت اور فصاحت و بلاغت کے ساتھ
بیان کیا گیا ہے، اس کی مثال پورے سنسکرت لٹریچر میں نہیں ملتی گو اس میں ہندو تصوف کے بیسیوں
مسائل زیر بحث آئے ہیں لیکن[1] اس کا اصل مرکزی نقطہ جنگ ہی ہے، کیونکہ وہ ایک پست ہمت
سپاہی کو جنگ پر ابھارنے اور اس کے خوں ریزی سے بیزار دل میں رزم آرائی کا شوق پیدا کرنے
کے لئے لکھی گئی ہے،

تاریخ ہند کا یہ ایک مشہور واقعہ ہے کہ جب ہندوستان میں قدیم آریہ تہذیب پورے عروج پر تھی
تو ہستنا پور کے شاہی خاندان میں دولت و اقتدار کی خواہش نے پھوٹ ڈالدی، کورو اور پانڈو دو
مقابل فریق بن گئے، اور دونوں کی تائید میں ہندوستان کے بڑے بڑے امراء و اعیان کھڑے ہوگئے
اول اول سمجھوتے کی کوششیں کی گئیں مگر کامیابی نہ ہوئی، آخر دونوں نے قاضی شمشیر کو حکم بنایا، اور
میدانِ جنگ کی عدالت میں اپنی قسمت کا فیصلہ کرنے کے لئے جمع ہوگئے، کرشن جی اس جنگ
میں پانڈووں کے حامی تھے، پانڈوں کا سردار ارجن ان کا چیلا تھا، اور اس کی فوج کو کامیابی
کی منزل تک پہونچانے کے لئے انھوں نے خود اس کے ساتھ رتھ کی باگیں اپنے ہاتھ میں لی تھیں
جب میدانِ کارزار میں دونوں فوجیں آمنے سامنے کھڑی ہوئیں، اور ارجن نے اپنی آنکھوں سے
اپنے دوستوں، عزیزوں اور بھائیوں کو آمادۂ قتال دیکھا تو اس کا دل ٹوٹنے لگا، اور اس نے
محبت کے لطیف جذبات سے متاثر ہوکر ارادہ کیا کہ جنگ سے پھر جائے، اس پر کرشن جی نے
اس کو ایک طویل اپدیش دیا، جو جنگ کے فلسفہ اور اس کے مختلف پہلوؤں پر حاوی تھا، یہی
اپدیش بھاگوت گیتا ہے[2]،

---

[1] میرے پیش نظر گیتا کی دو مستند [illegible] متن شرحیں ہیں، ایک سنسکرت [illegible] مشہور [illegible]
مسٹر شانتی نرائن لاہوری نے کیا ہے، دوسری مسٹر کے ٹی تیلنگ کی شرح جو سلسلہ کتب مقدسہ مشرق [illegible]
(BOOK OF THE SERI[illegible]) میں اکسفورڈ سے شایع ہوئی ہے، [2] یہ اپدیش در اصل [illegible]
کے مصنف نے اس کے معرض تحریر میں آنے اور عام طور پر شایع ہونے کی وجہ یہ بیان کی ہے کہ جب کوروؤں کے [illegible]

اس اپدیش کا آغاز اس طرح ہوتا ہے کہ جب ارجن کا دل اپنے عزیزوں کو دیکھ کر جنگ سے بیزار
نے لگا تو اس نے غمزدہ ہو کر کرشن جی سے کہا:۔

"اے کرشن! جنگ کرنے کی خواہش سے جو لوگ یہاں جمع ہوئے ہیں، ان رشتہ داروں
کو دیکھ کر میرے اعضاء بے حس و حرکت ہوئے جا رہے ہیں، منہ خشک ہو رہا ہے جسم پر لرزہ
چڑھ کر میرا رواں رواں کھڑا ہو گیا ہے، کمان میرے ہاتھ سے گری پڑتی ہے . . .
. . . . . اے کیشو! مجھے تمام لچھن الٹے نظر آ رہے ہیں، اپنے عزیزوں کو مار کر مجھے کوئی
بھلائی حاصل ہوتی نظر نہیں آتی، اے کرشن! مجھے فتح کی خواہش نہیں، نہ راج چاہئے
اور نہ سکھ اے گووند! راج بھوگ اور زندگی ہی سے ہمیں کیا لطف مل جائیگا جن کے
لئے راج کی عیش و عشرت کے ساز و سامان کی، اور سکھ کی خواہش کیجاتی ہے وہی لوگ
زندگی اور خوش حالی کی امید چھوڑ کر یہاں جنگ کے لئے کھڑے ہوئے ہیں . . . . . .
اگرچہ یہ ہمیں مارنے کے لئے کھڑے ہیں، مگر پھر بھی اے مدھوسودن! تین لوک کے راج
کے لئے بھی میں انھیں مارنا پسند نہیں کرتا، پھر اس دنیا کی تو ہستی ہی کیا ہے" . . . . . .
خود اپنے رشتہ دار کوروؤں کو مارنا ہمارے لئے کسی طرح مناسب نہیں ہے، کیونکہ اے
مادھو! اپنے عزیزوں کو مار کر ہم کس طرح سکھی ہو سکیں گے؟ . . . . . ہمیں وہ خرابیاں
صاف نظر آ رہی ہیں، جو خاندان کی تباہی سے پیدا ہوتی ہیں، اس لئے کیونکر ممکن ہے
کہ ہمارے دل میں اس پاپ سے بچنے کا خیال نہ آئے؟ . . . . خاندان کی
تباہی سے تمام پرانے خاندانی دھرم تباہ ہو جاتے ہیں، اور خاندان کے ان دھرموں

بقیہ حاشیہ ص ۲۸۵: دھرت راشٹر نے اپنی آنکھوں سے اپنے خاندان کی تباہی کا منظر دیکھنا پسند نہ کیا، تو ویاس جی نے ایک رتھبان کو جسکا نام سنجے تھا، اس کے پاس مقرر کر دیا، تاکہ وہ جنگ کی مفصل کیفیت من و عن بیان کرتا جائے، اس رپورٹر نے کیفیت جنگ کے سلسلہ میں اس گفتگو کا بھی پورا حال دھرت راشٹر کو سنا دیا، جو پانڈوؤں کے لشکر میں کرشن جی اور ارجن کے درمیان ہوئی تھی"، "وہ اپدیش بھی نقل کر دیا جو ارجن کی ہمت افزائی کے لئے کرشن جی نے ارشاد فرمایا تھا، بعد میں یہی سنجے کی روایت مہابھارت کی پوتھی "بھیشم پرب" میں نقل کر دی گئی اور اس کا نام "بھاگوت گیتا" رکھا گیا (دیکھو تیلنگ کا مقدمہ بھاگوت گیتا صفحہ ۳، اور تلک کی شرح گیتا حصہ چہارم صفحہ اول)

کے مٹ جانے سے خاندان پر ادھرم کی دھاک جم جاتی ہے۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ہے جناردن!
ہم ایسا سنتے آئے ہیں کہ جن انسانوں کے خاندانی دھرم غائب ہو جاتے ہیں وہ یقینی
طور پر نرک ہو جاتے ہیں۔ دیکھو تو سہی ہم شاہانہ عیش کے لالچ سے اپنے عزیزوں
کو مارنے کھڑے ہوئے ہیں، یہ ہم نے بڑا پاپ کرم کرنے کی طیاری کی ہے۔ اس سے
تو میرے لئے یہ زیادہ بہتر ہوگا کہ اپنے ہتھیار پھینک دوں، انھیں کچھ روک ٹوک
نہ کروں، اور ہتھیار بند کورو مجھے میدان جنگ میں مار ڈالیں" (ادھیائے ۱، اشلوک ۴۲-۴۶)

ارجن کے ان پاکیزہ اور لطیف خیالات کو سنکر کرشن جی نے تعجب کے ساتھ پوچھا:-
" اے ارجن! اس نازک موقع پر تیرے من میں یہ غلط خیال کہاں سے آگیا۔ جسکی
طرف اعلیٰ انسان نے کبھی توجہ نہیں کی، اور جو ذلیل حالت کو پہونچانے والا و
بدنامی کا باعث ہے؟ اے پارتھ! ایسا نامرد نہ بن۔ یہ تیری شان کے شایاں
نہیں، دل کی کمزوری کو چھوڑ اور کھڑا ہو جا" (۲: ۲-۳)

اس پر ارجن نے کہا:-
" ان مہاتما گورووں کو مارنے سے اس دنیا میں بھیک مانگ کر پیٹ بھرنا اچھا
ہے، کیونکہ اگر ان مال و دولت کے لوبھی بزرگوں کو میں نے مار لیا تو مجھے ان کے
خون سے رنگے ہوئے سامان عیش و عشرت کو اس دنیا میں استعمال کرنا پڑے گا۔ ۔ ۔
۔ ۔ ۔ ۔ جنکو مار کر ہمیں زندہ رہنے کی خواہش نہیں ہو سکتی، وہی کورو ہمارے سامنے
صف آرا ہیں" (۲: ۵-۶)

ارجن کی اس تقریر سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ یہ ایک خانہ جنگی تھی جس میں ایک خاندان کے
دو فریق حکومت و بادشاہی حاصل کرنے کے لئے ایک دوسرے کو مٹا دینا چاہتے تھے۔ ارجن کے
ضمیر نے اس برادر کشی اور حرص و جاہ کے خلاف ملامت کی، اور اس سرزنش سے متاثر ہو کر
وہ بہادر سپاہی جنگ سے متنفر ہونے لگا۔ مگر کرشن جی نے اس کے ان جذبات کی تردید کی اور
اس کے سامنے ایک جدید فلسفہ پیش کیا، جسے گیتا کے راوی نے ان الفاظ میں نقل کیا ہے:-
" ارجن کا شوک نہیں کرنا چاہئے تو انھیں کا شوک کر رہا ہے۔ اور پھر گیان کی باتیں

میں تجھے بتاتا ہوں جو تو چاہتا ہے کسی کی جان جائے یا رہے، گیانی اس کا کچھ افسوس نہیں کرتے .... جس طرح جسم میں رہنے والے کو اسی جسم میں بچپن، جوانی، بڑھاپا حاصل ہوتا ہے، اسی طرح آئندہ دوسرا جسم بھی ملا کرتا ہے، اس لئے گیانی لوگ اس بارے میں کچھ موہ نہیں کرتے" (۲ : ۱۱-۱۳)

"جسم کی مالک آتما غیر فانی اور ناقابل ادراک ہے، اور اس کو حاصل ہونے والے اجسام فانی ہیں، اس لئے اے ارجن! تو جنگ کر، جو شخص سمجھتا ہے کہ آتما مارتی ہے اور یہ آتما ماری جاتی ہے، اس کو سچا گیان حاصل نہیں ہے، کیونکہ یہ آتما نہ تو مارتی ہے اور نہ ماری جاتی ہے، یہ آتما نہ کبھی پیدا ہوتی ہے اور نہ مرتی ہے، اور ایسا بھی نہیں ہے کہ یہ ایک مرتبہ ہونے کے بعد کبھی پھر نہ ہوتی ہو، یہ کبھی بوڑھی نہ ہونے والی، دائم مسلسل اور قدیم ہے، اس لئے جسم کے مارے جانے سے یہ نہیں ماری جاتی، اے پارتھ! جس نے یہ جان لیا کہ یہ آتما غیر فانی، دائم، کبھی نہ بوڑھی ہونے والی، اور کبھی نہ مٹنے والی ہے وہ ایک انسان کو کیسے مار ڈالے گا یا مروا دیگا؟ جس طرح کوئی شخص پرانے کپڑوں کو اتار کر نئے کپڑے پہن لیتا ہے، اسی طرح جسم کی مالک آتما بھی پرانے جسم کو چھوڑ کر نیا جسم اختیار کر لیتی ہے، اس آتما کو ہتھیار نہیں کاٹ سکتے، آگ نہیں جلا سکتی، نہ اسے پانی تر کر سکتا ہے، اور نہ ہوا خشک کر سکتی ہے، .... اس لئے اس آتما کو اس طرح کا سمجھ کر اس کے لئے افسوس کرنا تجھے مناسب نہیں ہے" (۲ : ۱۸ تا ۲۵)

"اگر تو یہ مانتا ہے کہ آتما دائمی نہیں ہے، جسم کے ساتھ ہی پیدا ہوتی ہے، مرتی ہے تب بھی، اے مہاباہو! اس کے لئے افسوس کرنا تجھے مناسب نہیں، کیونکہ جو پیدا ہوا ہے اس کی موت یقینی ہے اور جو مرتا ہے، اس کا پیدا ہونا لابد ہے، اس لئے اس اٹل بات پر افسوس کرنا تیرے شایانِ شان نہیں ہے" (۲ : ۲۶-۲۷)

"سب کے جسموں میں رہنے والی جسم کی مالک آتما کو کبھی نہیں مار سکتا، اس لئے اے بھارت! کسی جاندار کے لئے افسوس کرنا تجھے مناسب نہیں" (۲ : ۳۰)

آگے چلکر کرشن جی نے ایک اور فلسفہ بیان کیا، جس کی تقریر خود ان کے الفاظ میں نقل

کی جاتی ہے :-

"اگر تو سب پاپیوں سے بھی زیادہ پاپ کرنے والا ہو، تب بھی اس گیان کی کشتی سے ہی تو پاپوں کو پار کر جائیگا جس طرح روشن کی ہوئی آگ تمام ایندھن کو جلا کر خاک کر دیتی ہے، اسی طرح اے ارجن! یہ گیان روپ کی آگ بھی سب کاموں کی نیکی و بدی کی قیود کو جلا ڈالتی ہے۔" (۴ : ۳۶ - ۳۷)

"اے دھننجے! اُس تم گیانی شخص کو کرم اپنی قیود میں نہیں پھنسا سکتے، جس نے کرم یوگ کے سہارے سے کرموں کی قیود کو ترک کر دیا ہے، اور جس کے سب شکوک و شبہات گیان سے دور ہو گئے ہیں، اس لئے تیرے دل میں اگیان (عدم عرفان) سے جو شبہہ پیدا ہو گیا ہے اسے تو گیان روپ کی تلوار سے کاٹ دے اور کرم یوگ کا سہارا لیکر جنگ کے لئے کھڑا ہو جا۔" (۴ : ۴۱ - ۴۲)

"جو کرم یوگ میں لگ گیا، جس کا دل پاک ہو گیا، جس نے اپنے من اور اپنے حواس پر قابو پا لیا، اور سب جانداروں کی آتما ہی جس کی آتما ہو گئی، وہ سب کام کرنے کے باوجود کرموں کے عذاب و ثواب سے غیر متاثر رہتا ہے۔" (۵ : ۷)

"جو برہم کے ارپن کر کے اور کرم کے تعلق سے بالاتر ہو کر کام کرتا ہے، اس کو اسی طرح پاپ نہیں لگتا، جس طرح کنول کے پتے کو پانی نہیں لگتا۔" (۵ : ۱۰)

<u>گیتا کے فلسفہ پر نظر</u>: کرشن جی کی اس تعلیم کا ماحصل صاف الفاظ میں یہ ہے :-

(۱) چونکہ عقیدۂ تناسخ کی رو سے انسان ایک دفعہ مر کر پھر دوسرے جنم میں آ جاتا ہے، اس لئے اسے قتل کر دینا کوئی بری بات نہیں ہے۔ مرنے کے بعد وہ پھر جنم لے لیگا، اور اس کی غیر فانی روح پر قتل کا کوئی اثر نہ ہوگا۔

(۲) روح کے لئے جسم کی حیثیت وہی ہے جو جسم کے لئے کپڑوں کی ہے، لہذا کسی کے جسم سے روح کا تعلق قطع کر دینا بالکل ایسا ہی ہے جیسے کسی کے پرانے کپڑے پھاڑ دے، اس انقطاع کو موت سے تعبیر کرنا اور اس پر رنج کرنا جہالت ہے۔ اگر کوئی شخص کسی کو قتل کرتا ہے، تو اسے یقین ہے

بلکہ صرف روح پر سے جسم کا بادہ اُتار دیتا ہے، اور یہ کوئی افسوس کی بات نہیں ہے، افسوس کی بات تو اس وقت ہوتی جب قتل سے روح پر بھی موت واقع ہوتی،

(۳) جو چیز حادث ہے، اس کا فنا ہو جانا یقینی ہے، پھر جب انسان کو ایک دن مرنا ہی ہے تو اسے مار ڈالنے میں کیا برائی ہے، ؟ جو اٹل بات ہے وہ تو ہو کر رہیگی، خواہ ہمارے ہاتھ سے ہو یا قدرت کے ہاتھ سے،

(۴) جس شخص کو گیان حاصل ہو اس کے لئے نیکی اور بدی کی کوئی قید باقی نہیں رہتی، اور تمام اعمال مباح ہو جاتے ہیں، اعمال میں نیک و بد کا امتیاز صرف ان لوگوں کے لئے ہے جو گیانی نہیں ہیں۔

اس تعلیم کا قدرتی نتیجہ یہ ہونا چاہئے، کہ انسان کے دل میں انسانی جان کی کوئی قدر و قیمت ہی باقی نہ رہے، جس کا جی چاہے اپنے دوسرے بھائی کے جسم کو پرانا کپڑا سمجھ کر پھاڑ دے، اور جب باز پرس ہو تو جسم کی فنا پذیری اور روح کی دائمی زندگی کا مسئلہ پیش کر کے قتل کی ذمہ داری سے بری ہو جائے، پھر جو شخص گیانی ہونے کا مدعی ہو، اس کے لئے تو قتل کیا معنی، کوئی جرم، جرم اور کوئی گناہ گناہ ہی نہیں رہتا، اور وہ آزادی کے ساتھ ہر قسم کے جرائم کا ارتکاب کر کے بھی بے جرم و بے قصور رہجاتا ہے۔

ایک طرف گیتا نے اس قدر آزادی کے ساتھ جنگ کی تلقین کی ہے، اور دوسری طرف ہم دیکھتے ہیں کہ اپنے پورے ۱۸ ابواب میں ایک جگہ بھی اس نے یہ نہیں بتایا کہ جس خوں ریزی پر وہ اس طرح انسان کو تحریض کر رہی ہے اس کا مقصد کیا ہے ؟ اور کن اغراض کے لئے وہ بنی نوع انسان کا خون بہانا یا ارواح و اجساد کے تعلق کو قطع کرنا جائز سمجھتی ہے ؟ جنگ کے مسئلہ میں مقصد جنگ کا سوال درحقیقت ایک بنیادی سوال ہے، کیونکہ اس خطرناک کام کو اگر کوئی چیز مقدس بنا سکتی ہے تو وہ صرف مقصد کی پاکی و طہارت ہی ہے۔ ورنہ ناجائز مقاصد کے لئے تو خواہ کتنی ہی شرافت کے ساتھ جنگ کیجائے، بہر حال وہ ناجائز ہوگی اور قانون اخلاق کی نظر میں درندگی و بہیمیت کے سوا کچھ نہ ہوگی۔ لیکن گیتا نے اس بنیادی سوال کو صاف نظر انداز کر دیا ہے، اور اس باب میں انسان کی رہنمائی کرنے کا کوئی اہتمام نہیں کیا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے، کہ کرشن جی

کے زمانہ میں عالم انسانی کا اخلاقی شعور ترقی کے اس درجہ تک نہیں پہونچا تھا جہاں افعال کے جواز و عدم جواز کا فیصلہ صرف ضرورت و عدم ضرورت پر نہیں ہوتا بلکہ مقصد کے صلاح و فساد پر منحصر ہوتا ہے۔

تاہم بعض اشلوکوں کے انداز بیان سے اتنا ضرور معلوم ہوسکتا ہے کہ مقصد جنگ کے بارے میں گیتا کا نقطۂ نظر کیا ہے، ایک جگہ کرشن جی فرماتے ہیں:۔

"ہے ارجن! یہ جنگ ایک سورگ کا دروازہ ہے جو تیرے لئے خود بخود کھل گیا ہے، ایسا موقع خوش قسمت کشتریوں ہی کو ملا کرتا ہے، لہٰذا اگر تو اپنے دھرم کی پیروی میں یہ جنگ نہ کریگا تو اپنے دھرم اور شہرت کو برباد کرکے پاپ جمع کریگا، بلکہ سب لوگ تیری کبھی نہ ختم ہونے والی مذمت کے گیت گاتے رہیں گے، یہ مذمت و بدنامی انسان کے لئے موت سے بدتر ہے۔" (۲: ۳۲-۳۴)

دوسرے مواقع پر انھوں نے اسی قسم کے خیالات ظاہر کئے ہیں، چنانچہ فرماتے ہیں:۔

"سب مہارتھی یہ سمجھیں گے کہ تو خوفزدہ ہوکر میدان جنگ سے بھاگ گیا، جنکی نظروں میں آج تو نہایت تعظیم کے قابل بنا ہوا ہے وہ تجھے ناقابل سمجھنے لگینگے، اسی طرح تیرے زور و طاقت کی مذمت کرکے تیرے بدخواہ اور دشمن ایسی ایسی بہت سی باتیں کہیں گے جو نہ کہی جانی چاہئیں، پھر اس سے بڑھکر دکھ کی بات اور کیا ہوگی؟ اگر تو مرگیا تو سورگ کو جائیگا اور اگر فتحیاب ہوا تو دنیا کے راج کو بھوگیگا، اس لئے جنگ کرنے کا مستقل ارادہ کرکے اٹھ۔" (۲: ۳۵-۳۷)

"علاوہ ازیں اگر تو اپنے دھرم کی طرف بھی دیکھے تو اس وقت ہمت ہارنا تجھے مناسب نہیں ہے، کیونکہ دھرم کی رو سے حق بجانب جنگ سے بڑھکر اور کوئی بات کشتری کے لئے بھلائی کی نہیں ہوسکتی" (۲: ۳۱)

"میں لوگوں کا خاتمہ کرنے والا اور بڑھا ہوا کال ہوں، یہاں لوگوں کا ناش کرنے آیا ہوں، تو اگر نہ ہو تب بھی فوجوں کی صفوں میں یہ جتنے جنگ آزما کھڑے ہیں سب تباہ ہونے والے ہیں، اس لئے تو اٹھ، نیکنامی حاصل کر اور دشمنوں کو

مغلوب کر کے وسیع سلطنت کا لطف اٹھا، میں نے انہیں پہلے ہی مار دیا ہے،

(۱۱: ۳۲-۳۳)

یہ خیالات ان عام خیالات سے کچھ بھی مختلف نہیں ہیں جو جنگ کے موقع پر ہمیشہ سپاہیوں کو لڑنے کی ترغیب دینے کے لئے استعمال کئے جاتے ہیں، نہ یہ مقاصد جنگ، ان مقاصد سے کچھ بلند ہیں، جن کے لئے اہل دنیا اپنے ابنائے نوع کا خون بہایا کرتے ہیں، وہی مال و زر کی خواہش، وہی شہرت و ناموری کا شوق، وہی حکومت و سلطنت کی طلب، وہی شکست کی ذلت و بدنامی کا خوف یہاں بھی جنگ کی تحریک کر رہا ہے، جو عام دنیا پرست لوگوں میں جنگ کا جوش اور قتل و غارتگری کی خواہش پیدا کرتا ہے، اس میں کوئی بلند پایہ تعلیم نہیں ہے، کوئی اعلیٰ اخلاقی ہدایت نہیں ہے، کوئی بہتر نصب العین نہیں ہے، اور حیوانی خواہشات و جذبات سے بلند تر کسی جذبہ و خواہش کی طرف انسان کی رہنمائی نہیں کی گئی ہے، اس کے مقابلہ میں اسلام نے اخلاقی اور قانونی حیثیت سے جنگ کے لئے جو واضح اور مکمل حدود مقرر کی ہیں، ان پر نظر ڈالنے کے بعد کسی صاحب عقل و خرد انسان کے لئے اس سوال کا فیصلہ کرنا کچھ مشکل نہیں رہتا کہ اس بارے میں اسلام نے انسان کی بہتر رہنمائی کی ہے یا گیتا نے؟

منو کے احکام جنگ، منو کی دھرم شاستر ہندوؤں کے مذہبی قوانین کا بہترین مجموعہ ہے، اور تقریباً ۲ ہزار برس سے اس کے احکام ہندو قوموں اور سلطنتوں میں معمول بہا ہیں اس کے مصنف کی شخصیت بڑی حد تک تاریکی میں ہے، اس کی تصنیف کا زمانہ بھی متعین نہیں ہے[1] مگر یہ

---

[1] میرے پیش نظر منو کے دو انگریزی ترجمے ہیں، ایک سر ولیم جونز کا ترجمہ جو سنہ ۱۷۹۴ء میں فورٹ ولیم کالج کلکتہ سے شایع ہوا تھا، اور دوسرا ڈاکٹر برنل کا ترجمہ مع شرح جسے پروفیسر ہاپکنس نے ایڈٹ کر کے سنہ ۱۸۸۴ء میں شایع کیا، انہیں سے اول الذکر ترجمہ گورنمنٹ کے حکم سے ہوا تھا، اور آج تک نہایت معتبر سمجھا جاتا ہے، سر ولیم جونز کا خیال ہے کہ اس کی تدوین سنہ ۱۲۵۰ تا سنہ ۵۰۰ ق م کے درمیان ہوئی ہے، پروفیسر مونیر سنہ ۵۰۰ ق م کا اندازہ لگاتا ہے، جرمن مستشرق یوہانگن کی رائے میں سنہ ۳۵۰ ق م اس کی صحیح تاریخ ہے، شیلگل کی رائے ہے کہ سنہ ۱۰۰۰ ق م کے قریب اس کی تصنیف ہوئی ہے، پروفیسر کروک کہتا ہے کہ وہ سنہ ۲۰۰ عیسوی سے زیادہ پرانی نہیں ہے، مگر ڈاکٹر برنل کی تحقیق یہ ہے کہ وہ سنہ ۱۰۰ء سے سنہ ۵۰۰ء تک کسی زمانہ میں مدون ہوئی ہے، اور غالباً جالندھر کے کسی راجہ نے اس کو اپنی سلطنت کا دستور العمل بنانے کے لئے لکھوایا تھا،

حقیقت یہ ہے کہ جب آریہ قوم نے اس مجموعہ کی تصنیف کی ہے، اس وقت ہندو تمدن زیادہ ترقی کرچکا تھا، اور سلطنتوں کے شئون و احوال کی تنظیم کے لئے باقاعدہ مرتب کئے ہوئے دساتیر عمل کی ضرورت پیدا ہوگئی تھی۔ اس مقصد کے لئے منو کے علاوہ اور بھی بہت سی شاستریں اور سمرتیاں لکھی گئی ہیں، مگر ان سب پر منو کو ترجیح حاصل ہے، کیونکہ دوسری کتابیں یا تو منو کی خوشہ چین ہیں یا اس سے تناقض واقع ہونے کی صورت میں ہندو علماء نے ان کو رد کردیا ہے۔ مذہبی کتابوں میں عام طور پر یہ خیال ظاہر کیا جاتا ہے کہ "جو کچھ منو کہتا ہے وہی صحیح ہے" اور "جو سمرتی منو کے خلاف ہے وہ معتبر نہیں"۔ پس ہندو مذہب کے قوانین معلوم کرنے کے لئے ہمارے پاس اس سے بہتر اور کوئی ذریعہ نہیں ہے۔

چونکہ یہ مجموعہ ایک ایسے زمانہ میں مرتب ہوا ہے جبکہ ہندوستان میں آریہ قوم کی باقاعدہ سلطنتیں قائم ہوچکی تھیں، اور تہذیب و تمدن کی ترقی نے اس کو اپنے معاملات کے اجرا میں ایک مخصوص ضابطہ کی پابندی کرنا سکھا دیا تھا، اس لئے ہم کو اس میں جنگ کے تمام ضروری پہلوؤں کے متعلق احکام و قوانین ملتے ہیں، اور ان سے اسلام کے قوانین کا مقابلہ کرکے اس مسئلہ میں دونوں مذہبوں کے طریقوں کا موازنہ کرنا زیادہ آسان ہے۔

جنگ کا مقصد: سب سے پہلا سوال مقصدِ جنگ کا ہے۔ منو نے اس پر کچھ زیادہ تفصیل کے ساتھ بحث نہیں کی ہے، تاہم حسب ذیل تصریحات سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ وہ کن مقاصد کے لئے جنگ کو جائز رکھتا ہے:۔

"روئے زمین کے جو حکمراں ایک دوسرے کو نیچا دکھانے یا قتل کرنے کی خواہش سے اپنی تمام قوت کے ساتھ جنگ کرتے ہیں، اور کبھی منہ نہیں موڑتے، وہ مرنے کے بعد سیدھے بہشت کی طرف جاتے ہیں" (۷ : ۸۹)

"جس راجہ کی فوجیں ہر وقت جنگ کے لئے طیار رہتی ہیں، اس سے تمام دنیا خوف زدہ و مرعوب رہتی ہے، پس ایسے راجہ کو اپنی مستعد فوج کے ساتھ تمام مخلوق کو اپنا تابع فرمان بنانے کی کوشش کرنی چاہئے" (۷ : ۱۰۳)

"اس طرح فتح کی طیاری کرنے کے بعد اپنے تمام مخالفین کو یا تو صلح و رضا کے ساتھ اپنا تابع فرمان بنانا چاہئے یا اگر وہ بخوشی اطاعت قبول نہ کریں تو

ے ذرایع اختیار کرنا چاہئیں یعنی رشوت، توڑ جوڑ اور اصلی طاقت" (۷ : ۱۰۷)
یبانی کے ان چاروں ذرائع میں سے عقلمند لوگ سلطنت کی توسیع کے لئے
د صا، ور جنگی طاقت کو زیادہ پسند کرتے ہیں (۷ : ۱۰۹)

س طرح جب راجہ دھرم کے مقرر کئے ہوئے تمام فرائض ادا کرلے تو اس کو
علاقوں پر قبضہ کرنے کی کوشش کرنی چاہئے، جو ابھی تک اس کے قبضہ میں نہ
ہوں، اور اپنے مقبوضہ ممالک کی خوب حفاظت کرنی چاہئے" (۹ : ۲۵۱)
دھرم کے مطابق عمل کرنے والے راجہ کا خاص فرض یہ ہے کہ وہ ممالک
کرے اور جنگ سے کبھی نہ ٹلے" (۱۰ : ۱۱۹)

اشلوکوں سے معلوم ہوتا ہے کہ مقصد کے سوال میں منو کی پرواز فکر بھی کرشن جی
دنچی نہیں ہے، سلطنت کی توسیع، ممالک کی فتح و تسخیر، اور ہمسایہ قوموں اور حریف
نیچا دکھانے کی جہانگیرانہ خواہش سے بلند تر کسی اخلاقی نصب العین تک اس کی بھی رسائی
عام دینداروں کی طرح وہ بھی حکومت و بادشاہی کو طاقتوروں کا منتہائے مقصود
ور انھیں ترغیب دیتا ہے کہ وہ اپنی قوت کو ہر وقت اسی ملک گیری کے کام میں صرف
فرماں روائی کے استحقاق اور قوت کے مصرف کا یہ تصور ہرگز کسی اخلاقی بلند نظری
کا نتیجہ نہیں ہوسکتا۔ اخلاق کی نظر میں بادشاہوں کی حرصِ جہانگیری سے انسان کا
کی آزادی، اور ملکوں کا امن و سکون زیادہ قیمت رکھتا ہے، کسی کی حرص و ہوس کو
اخلاق کا مقتضی نہیں ہوسکتا، وہ تو بنی نوع انسان کی مجموعی صلاح و فلاح کا خواہشمند
ہے جیسے جنگ عمل کی اجازت صرف اسی صورت میں دے سکتا ہے جبکہ انسان
جانی اور اخلاقی زندگی کو حریص طاقتوں کے ہاتھوں تباہ ہونے سے بچانے کے لئے
کوئی دوسری صورت باقی نہ رہے، لیکن معلوم ہوتا ہے کہ اس نظریہ تک منو کیا،
غی ورتقنن کی رسائی نہیں ہوئی، اور جنھوں نے کچھ اونچے اڑنے کی کوشش کی وہ
سے گذر کر منافی کی سرحدمیں پہونچ گئے، جو انسان کی مجموعی صلاح و فلاح کے لئے
کی عملی اجازت سے کچھ کم نقصان رساں نہیں ہے، بلکہ عملاً دونوں کا نتیجہ ایک ہی ہے

یعنی قوموں اور ملکوں کی تباہی اور شریر و مفسد لوگوں کا غلبہ و تسلط

جنگ کے اخلاقی حدود: ہندوؤں نے جنگ کے فنی پہلو میں بہت کچھ ترقی کی تھی اور عام جنگ [illegible] بھی بنائے تھے۔ منو نے اس کے لئے ایسی حدود مقرر کی ہیں جو بڑی حد تک اسلام کی مقرر کردہ حدود سے ملتی جلتی ہیں۔ ذیل میں ہم اس کے احکام لفظ بلفظ نقل کرتے ہیں:-

"کوئی شخص جو جنگ میں مشغول ہو اپنے دشمن کو چھپے ہوئے ہتھیاروں یا زہر میں بجھے ہوئے یا کانٹے دار تیروں یا آگ میں گرم کئے ہوئے تیروں سے قتل نہ کرے" (۷: ۹۰)

"نہ گاڑی یا گھوڑے پر سوار ہوتے ہوئے وہ پیدل کو قتل کرے نہ زنانے کو نہ اسکو جو ہاتھ جوڑ کر جان کی امان مانگے، نہ اسکو جس کے بال کھل گئے ہوں، نہ اس کو جو بیٹھا ہو، اور نہ اس کو جو کہے کہ میں تیرا قیدی ہوں (۷: ۹۱) نہ اسکو جو سوتا ہو، نہ اسکو جس کے پاس زرہ نہ ہو، نہ اسکو جو ننگا ہو، نہ اس کو جو نہتا ہو، نہ اس کو جو محض تماشائی ہو شریک جنگ نہ ہو، نہ اسکو جو کسی دوسرے سے گتھا ہوا ہو" (۷: ۹۲)

"شریف آدمی کے فرض کو یاد رکھتے ہوئے وہ ایسے شخص کو قتل نہ کرے جس کا ہتھیار ٹوٹ گیا ہو، یا جو غم زدہ ہو، یا سخت مجروح ہو، یا دہشت زدہ ہو، یا جو پیٹھ پھیر دے" (۷: ۹۳)

"گاڑی، گھوڑا، ہاتھی، چھتری، لباس، [illegible] جو اس وقت لوٹے ہوئے ہوں، غلہ، مویشی، عورتیں اور ہر قسم کی چیزیں اور دھاتیں سوائے چاندی سونے کے اس شخص کی جائز ملک ہیں جو انہیں لوٹ کر جیتے" (۷: ۹۶)

"ان چیزوں میں جو قیمتی ترین ہوں ان کا ایک حصہ لوٹنے والے راجہ کو پیش کریں .... اور جو چیزیں [illegible] انھیں راجہ تمام فوج میں تقسیم کر دینا چاہئے" (۷: ۹۷)

"جب وہ دشمن کا محاصرہ کرے تو خیمہ زن ہو کے بیٹھ رہے اور دشمن کے ملک کو تاراج کرے، [illegible] دشمن کو غارت کرتے رہنا چاہئے" [illegible]

اسے تالاب، کنویں، اور خندقیں سب کو برباد کر دینا چاہئے، وہ دن اور رات دشمن کو خوف زدہ اور پریشان کرتا رہے،، (۷ : ۱۹۶)

،، ملک کو فتح کرنے کے بعد وہ دیوتاؤں کی عبادت کرے اور نیکوکار برہمنوں کی بھی، وہ لوگوں میں داد و دہش کرے اور ظلم و زیادتی سے بے خوفی کی عام منادی کر دے،،

(۷ : ۲۰۱)

،، مگر ان لوگوں کے طرز عمل اور ارادوں کا حال اچھی طرح معلوم کرنے کے بعد وہ اس ملک میں خود وہیں کے شاہی خاندان سے کسی فرد کو حکمراں بنا دے، اور اس کو باقاعدہ ہدایات دے،، (۷ : ۲۰۲)

ہے منو کے شاستر لکھنے والے نے دیوتاؤں سے مراد مفتوح ملک کے دیوتا لئے ہیں لیکن ساتھ ہی لفظ ،، برہمن،، اس امر کی طرف اشارہ کرتا ہے کہ یہ حکم غیر آریہ قوموں کے لیے نہیں ہے نیز یہ بھی امید نہیں کی جا سکتی کہ منو نے آریوں کو غیر آریہ قوموں کے دیوتاؤں اور معبودوں کی پرستش کا حکم دیا ہوگا لہٰذا یہ حکم بھی صرف آریہ قوموں کی (اور صحیح تر یہ ہے کہ ہندو آریہ قوموں کی) باہمی جنگ سے متعلق ہے کیونکہ اشلوک نمبر ۲۰۲ کوئی مستقل اشلوک نہیں ہے بلکہ نمبر ۲۰۱ سے نمبر ۲۰۳ تک ایک مسلسل جملہ کا جزو ہے۔ اس خیال کی تائید دوسرے ذرائع سے بھی ہوتی ہے۔ پروفیسر ہاپکنس لکھتا ہے :-

،، یہ معلوم کرنا دلچسپی سے خالی نہ ہوگا کہ منو اور وشنو دونوں کہتے ہیں کہ جب ایک راجہ کسی بیرونی دشمن کو مغلوب کرے تو وہ خود اس ملک کے (نہ کہ اپنے ملک کے) ایک شاہزادہ کو وہاں کا راجہ بنا دے، اسے اپنے دشمن کے شاہی خاندان کو برباد نہ کرنا چاہئے مگر یہ اس صورت میں جائز ہے جبکہ وہ شاہی خاندان نیچ ذات کا ہو،، (Cambridge History of India. vol. I. P 290)

تاریخ ہند قدیم کا ایک اور ماہر پروفیسر ہیول (Havell) جو ہند و تہذیب کا بڑا دلدادہ ہے اپنی تاریخ میں لکھتا ہے :-

،، مختلف آریہ قبائل کے درمیان لڑائیاں ،، اور آریوں سے غیر آریہ وحوش (داس اور دسیو) کی جنگیں اکثر ہوتی رہتی تھیں، مگر چونکہ مقدم الذکر صورت میں (یعنی آریوں کی باہمی لڑائیوں میں) یہ ایک مقررہ قاعدہ تھا کہ جنگ محض توسیع مملکت کی غرض سے نہ ہونی چاہیے اور یہ کہ ایک مغلوب آریہ راجہ کو معزول نہ کیا جائے بلکہ غالب اسے اپنا باج گذار بنا لے، اس لئے قبائلی نزاعات نے آریوں کے اجتماعی نظام کو درہم و برہم نہ ہونے دیا،، (History of Aryan rule in India P. 30)

... اور وہ ان کے قوانین کو جس شان و شان سے یہاں بیان کئے گئے ہیں مستند قرار دے اور (منو کے راجہ) اور دوسرے امراد کو زرو جواہر کے عطایا سے ممنونِ احسان بنائے (۷ : ۲۱۳)

ان احکام میں سے بعض ایسے بھی ہیں جنھیں معرکۂ کارزار میں ملحوظ رکھنا قطعاً ناممکن ہے، مثلاً یہ کہ سوار پیدل کو قتل نہ کرے، دشمن کے بال کھل جائیں تو اس پر حملہ نہ کیا جائے، دشمن کے پاس زرہ نہ ہو تو اسے چھوڑ دیا جائے، ننگے یا نہتے یا غمزدہ یا دہشت زدہ کو قتل نہ کیا جائے، دشمن کسی دوسرے شخص سے لڑنے میں مشغول ہو تو اس پر وار نہ کیا جائے۔ اس قسم کے احکام میں اصلاح کے جذبہ پر غایتی خیال غالب آگیا ہے، اس لئے ضروریاتِ جنگ اور اخلاقی حدود کا توازن برقرار نہیں رہا۔ ظاہر ہے کہ جب میدانِ جنگ میں گھمسان کی لڑائی ہوتی ہو تو سپاہی ان باتوں کا لحاظ نہیں رکھ سکتا۔ اور یہی نظر کرے تو لڑ نہیں سکتا۔ دوسری طرف بعض احکام میں منو نے ضروریاتِ جنگ پر اخلاقی ذمہ داری کے احساس کو قربان بھی کر دیا ہے، مثلاً یہ حکم کہ دشمن کے ملک میں پیشقدمی کرتے وقت تباہی و دغابازی کا بازار گرم کر دیا جائے اور خورد و نوش کے تمام وسائل کو برباد کر کے سارے ملک کو بھوکا مار دیا جائے، کسی طرح شریف تر اخلاقی حیات کے مناسب نہیں ہو سکتا۔ تاہم مجموعی حیثیت سے منو کے یہ احکام بہت مہذب ہیں اور ایسے تربیت یافتہ اخلاقی شعور کا پتہ دیتے ہیں جو عداوت و غضب کی حالت میں بھی محاربین کے انسانی فرائض کا احساس رکھتا ہے اور اس حد تک اخلاقی تعین تک پہونچ چکا ہے، کہ انسان پر انسانی حیثیت سے اس کے دشمن کے بھی کچھ حقوق ہیں جنھیں ہر حال اسے ملحوظ رکھنا چاہیے۔ اس معاملہ میں اصولاً منو کے احکام اس قدر بہت قریب تر ہیں کہ موجودہ مہذب اور ترقی یافتہ نہیں ہیں۔

مفتوح قوموں کے ساتھ

اوپر بیان کیا جا چکا ہے کہ منو کا قانون اس عہد میں مدون ہوا تھا جب غیر آریہ اقوام کی سیاسی قوت فنا ہو چکی تھی اور ہندوستان میں ان کی ایک بھی حکومت باقی نہ رہی تھی جس سے آریوں کی جنگ ہوتی۔ اس لئے منو کی مجموعۂ شاستر میں ایسے قوانین کی تلاش فضول ہے، جو آریہ اور غیر آریہ اقوام کی جنگ سے متعلق ہوں۔ اس زمانہ میں وہ تمام غیر آریہ قومیں جو ویدوں میں داس، دسیو، راکشش، اور اسر وغیرہ ناموں سے یاد کی گئی ہیں

[illegible] پہاڑوں میں پناہ گزیں ہو چکی تھیں، یا مغلوب و مفتوح ہو کر ملک کی آبادی کا [illegible] بن چکی تھیں، اور مجموعی طور پر ان کا نام "شودر" رکھ دیا گیا تھا۔ پس منو سے ہم کو جو کچھ معلوم ہو سکتا ہے وہ صرف یہ ہے کہ ہندو قانون مفتوح غیر آریہ اقوام کو سوسائٹی میں کیا درجہ دیتا ہے، اور ان کے ساتھ کس قسم کا برتاؤ جائز رکھتا ہے۔ اس کے لیے ہمیں شودروں کے متعلق منو کے احکام پر نظر ڈالنی چاہیے۔

(۱) منو شودروں کو فطرۃً ذلیل قرار دیتا ہے اور اعمال کی بنا پر نہیں بلکہ پیدائش کی بنا پر ان کو سب سے ادنیٰ مخلوق سمجھتا ہے۔

"برہما نے اپنے منہ سے برہمن کو، ہاتھ سے کشتری کو، ران سے ویش کو اور پاؤں سے شودر کو پیدا کیا۔" (۱ : ۳۱)

"برہمن کے نام کا پہلا حصہ تقدس کو ظاہر کرنے والا ہو، کشتری کا طاقت کو، ویش کا دولت کو اور شودر کا ذلت کو۔" (۲ : ۳۱)

"برہمن کے نام کا دوسرا حصہ خوشحالی کو ظاہر کرے، کشتری کا تحفظ کو، ویش کا دولت کو اور شودر کا غلامی و خدمت گاری کو۔" (۲ : ۳۲)

"دویج ذاتیں صرف تین ہیں، برہمن، کشتری اور ویش، چوتھی شودر کی ذات کا صرف ایک جنم ہے۔" (۱۰ : ۴)

"ہاتھی، گھوڑے، شودر، قابل نفرت ملچھ لوگ، شیر، تیندوے، اور سؤر (تناسخ کے) وہ ادنیٰ مدارج ہیں جو تاریکی سے حاصل ہوتے ہیں۔" (۱۲ : ۴۳)

(۲) منو شودروں کو بالذات نجس و ناپاک اور کمینہ سمجھتا ہے اور معاشرت میں دویج یعنی آریہ قوموں کو ان سے کامل پرہیز کا حکم دیتا ہے۔

"شودر کی لڑکی کو اپنے پلنگ پر بٹھانے سے برہمن نرک میں جاتا ہے۔" (۳ : ۱۷)

"وہ کسی برادری سے خارج کیے ہوئے شخص، یا چنڈال[2] .... کے ساتھ ایک درخت کے سایہ میں بھی نہ ٹھہرے۔" (۴ : ۷۹)

---

[1] [illegible] (۱ : ۳۱) ، [illegible] (۲۰۹ : ۱)، اور بھاگوت پران (۳ : ۵ : ۳۴) میں بھی آیا ہے۔ [2] جو شخص برہمن عورت کے بطن اور شودر مرد کے نطفہ سے پیدا ہو وہ چنڈال ہے (منو ۱۰ : ۱۲)

"جو کوئی شودر کو دھرم کی تعلیم دیگا [illegible] شودر کے ساتھ ہی اسم ورت نامی جہنم میں جائیگا" (۴ : ۸۱)

"وہ شودر کے سامنے وید نہ پڑھے" (۴ : ۹۹)

"وہ شودر کا کھانا نہ کھائے" (۴ : ۲۱۱)

"شودر کا کھانا نورانی نور کو زائل کرتا ہے" (۴ : ۲۱۸)

"اگر برہمن بھولے سے شودر کا کھانا کھائے تو تین دن تک روزہ رکھے اور اگر عمداً کھائے تو اس کو وہی کفارہ ادا کرنا چاہیے جو حیض، پیخانہ یا پیشاب پینے اور کھانے والے کے لئے مقرر ہے" (۴ : ۲۲۲)

"جس شخص نے چنڈال کو چھو لیا ہو وہ صرف نہانے ہی سے پاک ہو سکتا ہے" (۵ : ۸۵)

"شودر کا جنازہ شہر کے جنوبی حصہ سے جائے اور دویجوں کے جنازے مغربی شمالی اور مشرقی سمتوں سے" (۵ : ۹۲)

"اگر کسی برہمن کی اپنی ذات کا آدمی موجود نہ ہو تو اس کی میت کو شودر کے ہاتھ سے نہ اٹھوانا چاہیے کیونکہ جو مراسم تجہیز ایک شودر کا ہاتھ لگنے سے آلودہ ہو جائیں وہ بہشت کی طرف نہیں جا سکتے" (۵ : ۱۰۴)

"شودر مرد سے ویش یا کشتری یا برہمن عورت کے ہاں جو اولاد پیدا ہو وہ مخلوط نسل کی ہوگی، ان کے نام علی الترتیب ایوگو، کشترا اور چنڈال ہیں اور یہ سب ادنیٰ مخلوق ہیں" (۱۰ : ۱۲)

ے "اگر کوئی شخص [illegible] کی عبارت پڑھے تو [illegible] (گوتم ۱۲ : ۴ - ۶) [illegible] نہیں ہے (واسشٹھ [illegible]) [illegible] آئندہ جنم میں وہ [illegible] (واسشٹھ [illegible])

"چنڈال اور سوپاس لوگوں کی سکونت بستی کے باہر ہونی چاہیے، انھیں تابت برتن استعمال نہ کرنے چاہئیں، ان کی جائداد صرف کتے اور گدھے ہوں، ان کو مردوں کے کپڑے پہننے چاہئیں، ان کے کھانے کے برتن ٹوٹے ہوئے ہوں، ان کے زیور لوہے کے ہوں، وہ ہمیشہ خانہ بدوش پھرتے رہیں، جو شخص اپنے دینی و دنیوی فرائض کا پابند ہو وہ ان سے کوئی ربط ضبط نہ رکھے، ان کے تمام تعلقات آپس ہی میں ہوں، اور برابر والوں ہی میں وہ شادی بیاہ کریں، ان کو کھانا ٹھیکروں میں دیا جائے، مگر دینے والا اپنے ہاتھ سے ان کے ہاتھ میں نہ دے، راتوں کو وہ بستیوں میں نہ پھریں، دن کو کام کاج کے لئے آئیں، تو راجہ کے مقرر کئے ہوئے مخصوص نشانات ان کے بدن پر لگے ہوئے ہوں، وہ لاوارث مردوں کو لیجانے کا کام کریں، جن لوگوں کو قانوناً سزائے موت دی گئی ہو انھیں چنڈال قتل کریں اور وہی مقتولوں کے کپڑے بچھونا اور زیور لے لیں"۔ (۱۰: ۵۱، ۵۶)

"برہمن، شودر سے کبھی دان نہ لے، اگر وہ اس سے دان لیکر قربانی کریگا تو آیندہ جون میں چنڈال پیدا ہوگا"۔ (۱۱: ۲۴)

"اگر کوئی برہمن شودر کا جھوٹا پانی پی لے تو اسے تین دن رات تک کوش گھانس کے ابلے ہوئے پانی کے سوا کچھ نہ پینا چاہیے" (۱۱: ۱۴۹)

"اگر کوئی برہمن شودر کا جھوٹا کھانا کھالے تو وہ سات دن تک آتش جو کے سوا کچھ نہ کھائے پیے"۔ (۱۱: ۱۵۳)

(۳) منو شودروں کو دویجوں کی غلامی پر مجبور کرتا ہے، اس کے نزدیک شودر کا پیدائشی اور فطری وظیفہ ہی یہ ہے کہ وہ دویجوں کی خدمت کرے،

"قادر مطلق نے شودر کے لئے صرف ایک فرض رکھا ہے اور وہ یہ ہے کہ وہ بے چون وچرا ان تینوں (برہمن، کشتری، اور ویش) کی خدمت کرتا رہے" (۱: ۹۱)

"برہمن کی خدمت میں لگا رہنا شودر کا سب سے بہتر کام ہے، اس کے سوا جو کام وہ کریگا وہ اسے کچھ فائدہ نہ دیگا"۔ (۱۰: ۱۲۳)

(۳) یا جیسے ہر شودر ذات کے آدمی کو دویجوں کی خدمت کا حکم دیتا ہے (۸ : ۴۱۰)

"شودر ذات کا ہر آدمی خواہ خریدہ ہو یا ناخریدہ، اسے برہمن اپنی خدمت پر مجبور کر سکتا ہے، کیونکہ اس کو واجب الوجود نے برہمن کی غلامی ہی کے لئے پیدا کیا ہے۔" (۸ : ۴۱۳)

"شودر کو اگر اس کا آقا آزاد کر دے تب بھی وہ آزاد نہیں ہو سکتا، کیونکہ جو حالت اس کی فطرت میں ودیعت کی گئی ہے اس سے کون اس کو نکال سکتا ہے؟"

(۸ : ۴۱۴)

(۴) منو شودر کو اس کی اپنی کمائی ہوئی دولت و جائداد پر بھی حقوقِ ملکیت دینے سے انکار کرتا ہے۔

"ایک برہمن بلا تامل اپنے شودر غلام کا مال لے سکتا ہے، کیونکہ کوئی مال بھی شودر کی ذاتی ملک نہیں ہے۔ وہ ایک ایسی ہستی ہے جس کی جائداد اس کا آقا لے سکتا ہے۔" (۸ : ۴۱۷)

"شودر اگر مال و دولت حاصل کرنے کی قوت رکھتا ہو تب بھی اسے حاصل نہ کرنا چاہئے، کیونکہ جو غلام دولت جمع کر لیتا ہے، وہ برہمن کو اذیت دیتا ہے۔"

(۱۰ : ۱۲۵)

(۵) قانونِ وراثت میں بھی منو نے دویجوں اور شودروں کے درمیان امتیاز رکھا ہے۔ جس حالت میں وہ شودر کو حقِ میراث سے بالکل محروم کرتا ہے اور بعض حالات میں دویجوں سے کمتر درجہ دیتا ہے۔

"اگر برہمن کی چاروں ذاتوں کی بیویاں ہوں اور چاروں سے اس کے بیٹے پیدا ہوں تو ان کے درمیان تقسیم اس طرح ہوگی کہ شودر ... کے گھوڑے گاڑیاں، زیورات اور مکان برہمنی کے بیٹے کو ملیں گے۔ ... کو الگ کرنے کے بعد جو مال بچ گیا اس میں بھی اس کی ذات کے لحاظ سے اس کا حصہ ... زیادہ ہوگا۔"

"برہمن کے ترکہ میں سے تین سہام لے، کشتری عورت کا لڑکا دو سہام، ویش عورت کا لڑکا ڈیڑھ سہام اور شودر عورت کا لڑکا ایک سہم"

"یا پھر ایک عالم قانون داں آدمی مجموعی طور پر تمام جائداد کو دس حصوں میں تقسیم کرکے اس طرح بانٹے:۔ برہمنی کے لڑکے کو چار حصے، چھتر انی کے لڑکے کو ۳ حصے، ویشی کے لڑکے کو ۲ حصے اور شودرانی کے لڑکے کو ایک حصہ"

"اس برہمن کے ہاں خواہ پہلی تین ذاتوں کی بیویوں سے بیٹے ہوں یا نہ ہوں، بہر صورت شودرانی کے لڑکے کو ⅒ سے زیادہ نہ ملے گا"

"شودر عورت کے پیٹ سے برہمن، کشتری یا ویش مرد کا لڑکا باپ کے ترکہ میں سے کوئی حصہ نہ پا سکے گا۔ اس کا باپ جو کچھ اسے دیدے وہی اس کی ملک ہے[1]"

"دویج ذات کے مردوں کی جو اولاد خود اپنی ذات کی عورت سے پیدا ہوئی ہو وہ باہم ترکہ کی مساویانہ تقسیم کرے" (۹: ۱۴۹-۱۵۲)

(۴) فوجداری قوانین میں منو نے شودروں کے ساتھ انتہائی سختی برتی ہے، وہ ان کی جان، وعزت کو قانون کی پناہ دینے میں حد درجہ بخل سے کام لیتا ہے، اور اس کے مقابلہ میں دویجوں کے حقوق کی تعیین اور تحفظ میں اتنی فیاضی برتتا ہے، کہ شودروں کی آئینی حیثیت بالکل صفر کے برابر رہجاتی ہے؛

"ایک شودر اگر دویج کی شان میں گستاخی کرے تو اس کی زبان کاٹ دیجائے کیونکہ وہ برہما کے حصۂ اسفل سے پیدا ہوا ہے" (۸: ۲۷۰)

"اگر وہ ان کا نام اور ان کی ذات کا نام لیکر توہین کرے تو دس انگل لمبی لوہے کی سلاخ آگ میں سرخ کرکے اس کے حلق میں اتار دیجائے" (۸: ۲۷۱)

"اگر وہ غرور کی راہ سے برہمن کو اس کے فرائض کے متعلق ہدایت دے تو راجہ

---

[1] اس اشلوک کا مضمون اوپر کے اشلوک سے صریحاً متناقض ہے، اس تناقض کو منو کے شارحین (کلوکا اور میدھاتیتھی) نے بھی محسوس کیا ہے اور اس کی تاویل وہ یہ کرتے ہیں کہ شودرانی کے لڑکے کو حصہ ملنے کا انحصار اس کے [illegible] پر ہے، اگر وہ نیکوکار ہو اور اس کی ماں با[illegible] اس کے نکاح میں آئی ہو تو اسے حصہ مل سکتا ہے،

اس کے منہ اور کان میں جلتا ہوا تیل ڈالنے کا حکم دے" (۸ : ۲۷۲)

"جو ادنیٰ ترین ذات کا آدمی (شودر) اعلیٰ ذات کے آدمی (برہمن) کے برابر بیٹھنے کی نیت سے ایک ہی جگہ بیٹھ جائے اس کے پچھلے حصہ پر نشان لگا کر راجہ یا تو اس کو ملک بدر کردے یا اس کے سرین کٹوا دے" (۸ : ۲۸۰)

"اگر وہ برہمن پر غرور سے تھوک دے تو راجہ اس کے دونوں ہونٹ کٹوا دے اگر وہ اس پر پیشاب کرے تو اس کی شرمگاہ کو قطع کرادے، اگر وہ برہمن کی طرف گوز صادر کرے تو اس کی جائے مخصوص کو کٹوا ڈالے" (۸ : ۲۸۲)

"اگر وہ برہمن کے سر کے بال یا اس کے پاؤں یا اس کی ڈاڑھی یا اس کا گلا یا خصیے پکڑے تو راجہ بلا تامل اس کے ہاتھ کٹوا دے" (۸ : ۲۸۳)

"اگر ایک شودر کسی دویج عورت سے زنا کرے تو اس عورت کے غیر محصنہ ہونے کی صورت میں اس کا وہ عضو کاٹا جائیگا جس سے اس نے ارتکاب جرم کیا ہو اور اس کی تمام جائداد ضبط کیجائیگی، اور اگر وہ عورت محصنہ ہو تو وہ اپنی ہر چیز حتیٰ کہ جان سے بھی محروم کر دیا جائیگا۔

برہمن عورت سے زنا کرنے کا جرم اگر ویش سے سرزد ہو تو اسے ایک سال قید اور کل جائداد کی ضبطی کی سزا دیجائیگی، اگر کشتری یہ فعل کرے تو اس پر ایک ہزار پن جرمانہ کیا جائیگا، یا گدھے کے پیشاب سے اس کی ڈاڑھی مونچھ مونڈ دی جائیگی اور اگر وہ برہمن عورت غیر محصنہ ہو تو ویش کو ۵۰۰ اور کشتری کو ۱۰۰۰ پن جرمانہ دینا ہوگا، اگر ایک برہمن مرد کسی محصنہ عورت سے زنا بالجبر کرے تو اس پر ۱۰۰۰ پن جرمانہ کیا جائیگا اور اگر اس کی مرضی سے کرے تو صرف ۵۰۰ پن" (۸ : ۳۷۴ - ۳۷۸)

"راجہ کسی برہمن کو ہرگز قتل نہ کرے خواہ وہ کیسے ہی گناہ کا مرتکب ہوا ہو، وہ برہمن مجرم کو اس کی ذات و جائداد سے دفع تعرض کئے بغیر صحیح سالم جلا وطن کر سکتا ہے روئے زمین پر برہمن کے قتل سے زیادہ عظیم گناہ دوسرا کوئی نہیں ہے اس لئے بادشاہ کبھی دل میں بھی اس کا

تا ہے بچی نہ نکلے۔ (۸ : ۲۸۰-۲۸۱)

"نیچ ذات کا آدمی اگر بارادہ برہمن کو دکھ پہنچائے تو راجہ اس کو مختلف قسم کی عبرتناک جسمانی سزائیں دے۔" (۹ : ۲۴۸)

"ایک کشتری کو قتل کرنے کا کفارہ اس سے چوتھائی ہے جو برہمن کو قتل کرنے والے کے لیے مقرر ہے۔ ویش کو قتل کرنے کا کفارہ اس کا آٹھواں حصہ ہے اور شودر اگر نیکوکار ہو تو اس کو قتل کرنے کا کفارہ اس سے سولھواں حصہ۔" (۱۱ : ۱۲۷)

"اگر برہمن کسی کشتری کو بلا ارادہ قتل کرے تو وہ اپنے آپ کو گناہ سے پاک کرنے کے لئے ایک سانڈ اور ایک ہزار گائیں دان دے یا تین سال تک نفس کشی ریاضت کرے۔ اور اگر وہ بلا ارادہ کسی نیکوکار ویش کو قتل کرے تو ایک سال نفس کشی ریاضت کرے یا سو گائیں اور ایک سانڈ دان دے اور اگر شودر کو بلا ارادہ قتل کر دے تو بھی ریاضت چھ مہینہ تک کرے یا دس سپید گائیں اور ایک سانڈ برہمنوں کو دان دے" (۱۱ : ۱۲۸، ۱۳۱)

"اگر برہمن کسی بلی یا نیولے یا چڑیا، یا مینڈک، یا کتے، یا چھپکلی یا الو یا کوے کو مار ڈالے تو اس کا وہی کفارہ ہے جو شودر کو مارنے پر مقرر کیا گیا ہے۔" (۱۱ : ۱۳۲)

یہ احکام اپنی تفسیر و تشریح آپ کر رہے ہیں، ہندو قانون مفتوح قوموں کو جس ذلت کی نظر سے دیکھتا ہے، اور سوسائٹی میں ان کو جو ادنیٰ درجہ دیتا ہے اس کی کیفیت ان احکام سے صاف ظاہر ہو جاتی ہے، اس کے مقابلہ میں اگر اسلام کے ماتحت غیر مسلم ذمیوں کے حقوق کو دیکھا جائے تو زمین و آسمان کا فرق نظر آئے گا۔

نسلی امتیاز:۔ موجودہ زمانہ کے بعض ہندو اہل قلم نے عہد جدید کے افکار سے متاثر ہو کر یہ دعویٰ کیا ہے کہ ہندو مذہب میں ذاتوں کی تقسیم پیدائش اور نسل پر نہیں بلکہ گن اور کرم پر ہے، مگر افسوس ہے کہ ہماری تحقیق میں ان کا یہ دعویٰ ہندو قانون کے الفاظ اور اسپرٹ دونوں کے خلاف ہے۔ ہم نے جہاں تک اس کا مطالعہ کیا ہے اس سے تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ ہندو مذہب، اعمال اور خصائل کی

ے ۱پستمبھ دھرم شاستر سے معلوم ہوتا ہے کہ قتل، چوری، اور ڈاکہ کے شدید جرائم کی پاداش میں برہمن کو صرف اتنی سزا دی جا سکتی ہے کہ ... (۲ : ۲۷ : ۱۷) لیکن اگر شودر یہی جرائم کا ارتکاب کرے تو اس کے لئے موت کی سزا ہے (۲ : ۲۷ : ۱۶)

بنا پر ذاتی مراتب کے تعین سے تعلق رکھتا ہے۔ اس میں انسانوں کی تقسیم کرم پر نہیں بلکہ ذات پر
مبنی ہے۔ ابتدائی زمانہ میں جن لوگوں کو داس اور دسیو کے خطاب دیئے گئے تھے اور بعد میں جنھیں
شودر قرار دیا گیا، ان کی یہ تذلیل اس بنا پر نہ تھی کہ وہ بد اعمال تھے، بلکہ اس بنا پر تھی کہ وہ غیر آریہ
نسل سے پیدا ہوئے تھے۔ وید، قانونِ وراثت، قانونِ تعزیرات اور قوانینِ معاشرت کے جو احکام
نقل کئے گئے ہیں، ان پر ایک سرسری نظر ڈال لینے ہی سے یہ حقیقت روشن ہوجائیگی۔ ان میں
آپ دیکھیں گے کہ نیکوکار شودر کو بھی وہ حقوق نہیں دیئے گئے ہیں جو بدکار اور شدید جرائم کا ارتکاب کرنے
والے برہمن کو حاصل ہیں۔ برہمن کا لڑکا اگر شودرانی کے پیٹ سے پیدا ہو تو نیکوکار ہونے کے باوجود
اس کو خود اپنے اس بھائی کے برابر حقوق نہیں دیئے جاتے جو اس کے باپ کی برہمن بیوی سے
پیدا ہوا ہے۔ شودر مرد کی اولاد اگر برہمن عورت کے پیٹ سے پیدا ہو تو یہ پیدائش ہی اس کو
چنڈال بنادیگی اور اس کو وہ ذلیل زندگی بسر کرنی ہوگی جو منو نے چنڈالوں کے لئے مخصوص کردی ہے۔
یہ کس لئے؟ کیا یہ کرم کا پھل ہے کہ شودر کے ہاں پیدا ہونا بھی کوئی بدعملی اور برہمن کے ہاں پیدا
ہونا کوئی نیکوکاری ہے؟ اگر ایسا نہیں ہے تو ہم سوا اس کے اور کیا کہہ سکتے ہیں کہ یہ نیکی اور
بدی کا نہیں، نسل اور قومیت کا امتیاز ہے، اور ہندو مذہب نے شرافت اور ذلت کو انسان کے
ذاتی اعمال و خصائل سے نہیں بلکہ نطفہ و بطن سے مخصوص رکھا ہے۔ اس باب میں خود منو نے بھی
کافی تصریح سے کام لیا ہے۔ وہ کہتا ہے:-

"جو شخص شریف مرد اور کمینہ عورت سے پیدا ہو وہ اپنے اچھے اعمال سے شریف
ہوسکتا ہے، مگر جو کمینہ مرد سے شریف عورت کے ہاں پیدا ہو وہ کمینہ ہی رہیگا۔"

(۱۰: ۶۷)

"جس طرح اچھا درخت صرف اچھے بیج اور اچھی زمین ہی سے پیدا ہوتا ہے، اسی طرح
جو شخص شریف مرد اور شریف عورت سے پیدا ہو وہی پورے دویج کا درجہ حاصل کر
سکتا ہے" (۱۰: ۶۹)

"خود برہما نے دویجوں کے کرم کرنے والے شودر اور شودروں کے کرم کرنے و

ف۔ [illegible]

دویج کا موازنہ کر کے فیصلہ کیا کہ "دونوں نہ مساوی ہیں اور نہ غیر مساوی" یعنی نہ وہ رتبہ میں مساوی ہیں نہ برے اعمال میں غیر مساوی[1] " (۱۰ : ۴۳)

ان تصریحات کے بعد کون کہہ سکتا ہے کہ ہندو مذہب میں انسانی برادریوں کی تقسیم نسل پر نہیں بلکہ عمل پر مبنی ہے؟

نئے زمانہ کے ہندو محققین نے یہ ثابت کرنے کی بھی کوشش کی ہے کہ شودر دراصل غیر آریہ دیسی باشندے نہیں تھے، بلکہ خود آریہ نسل کے ادنیٰ طبقات سے تعلق رکھتے تھے، لیکن افسوس ہے کہ علمی تحقیق کی روشنی میں یہ دعویٰ بھی قابلِ قبول نہیں ہے، اس میں شک نہیں کہ شودروں میں آریہ نسل کے وہ لوگ بھی شامل کر دیے جاتے تھے، جو ورن آشرم کے قوانین کی خلاف ورزی کرنے کے باعث برادری سے خارج کر دیے جاتے تھے[2] مگر اس سے انکار نہیں کیا سکتا، کہ شودروں کا طبقہ بالعموم ان اقوام پر مشتمل تھا جنھوں نے اپنے گھر بار چھوڑ کر پہاڑوں میں نکل جانے کے بجائے، آریہ فاتحین کی غلامی میں رہنے کو پسند کر لیا تھا، لسانی اور تاریخی تحقیقات سے یہ ثابت ہو چکا ہے، کہ شودر دراصل ایک قدیم ہندوستانی قبیلہ کا نام تھا جسے آریوں نے اٹک دریا کی وادی میں سب سے پہلے مغلوب کیا تھا، اس کے بعد جو ہندی قبائل آریوں کی حکومت کے تابع ہو جاتے، ان کو شودر کے نام سے موسوم کیا جاتا، اور جو قبائل برسرِ جنگ ہوتے ان کو دسیو اور ملیچھ کہا جاتا تھا[3] تیترے برہمن میں ایک جگہ لکھا ہے کہ "برہمن ایک جاتی ہے جو دیوتاؤں سے نکلی ہے، اور شودر ایک دوسری جاتی ہے، جو اسروں یا ارواحِ خبیثہ سے نکلی ہے" یہ عبارت اس بات کو بالکل واضح کر دیتی ہے کہ شودر انھیں اسلاف کے اخلاف ہیں جنھیں ابتدائی زمانہ میں ارواحِ خبیثہ کہا گیا تھا،

---

[1] رتبہ میں مساوی نہ ہونے کا مطلب یہ ہے کہ ذاتی طور پر دویج اور شودر کا درجہ سوسائٹی میں وہی رہیگا جو ان کے لئے مقرر ہے، البتہ شودر کا اچھا عمل دویج کے برے عمل سے ضرور افضل ہوگا، یعنی عمل پر عمل کو فضیلت ہوگی، مگر عامل کو عامل پر فضیلت نہ ہوگی،

[2] Vedic Index of Names

[3] Wilson Indian and subjects 1912-vol. II. P. 265. 388-391

Muir, Sanskrit Texts, 14 & Caste. vol. I. P. 11

تاریخ ہند قدیم کے تمام مستند محققین کی [illegible] میں [illegible] ان میں سے

چند کے نتائج تحقیق یہاں نقل کرتے ہیں،

راگوزن لکھتا ہے:-

"یہ تقسیم آریوں اور دسیوں کے درمیان ہوتی ہے۔ مقدم الذکر کو ہم خوب جانتے ہیں۔ موخرالذکر، سوطبعی مناسبت ہمکو اس نتیجہ کی طرف لیجاتی ہے کہ وہ دیسی باشندوں یعنی غیر آریہ اقوام کے سوا اور کوئی نہیں ہیں۔ یہ وہ لوگ ہیں جنکو آریہ مہاجرین نے اس ملک میں پایا اور ایک طویل دور جنگ ونزاع کے بعد کم وبیش ایک غیر مرغوب انقیاد کی حالت تک پہونچا دیا۔ اسمیں کسی شک کی گنجائش نہیں ہے کہ یہیں سے ذاتوں کی تقسیم کا ابتدائی سررشتہ ہمارے ہاتھ لگتا ہے، کیونکہ یہی مجموعی تقسیم اس تقسیم سے مناسبت تام رکھتی ہے جو موجودہ زمانہ میں دِوِجوں اور شودروں کے درمیان پائی جاتی ہے۔ علاوہ [illegible] جات پات کے لئے آریوں کی زبان میں لفظ "ورن" استعمال کیا گیا ہے جس کے معنی "رنگ" کے ہیں۔ [illegible] ہم دیکھیں گے کہ گورے فاتحین اور سیاہ رنگ دیسی باشندوں کے درمیان اسی رنگ کے فرق کو ویدک نظموں میں جگہ جگہ بیان کیا گیا ہے۔ پھر خود لفظ دسیو بھی ان معنوی تغیرات کے ساتھ جو اس پر گذرے ہیں، ہمارے سامنے ایک واضح داستان بیان کرتا ہے۔ یہ ایک قدیم آریہ لفظ ہے جسے ایرانی لوگ اس کے اصلی بے ضرر معنی (قوم اور گروہ) میں استعمال کرتے تھے۔ .... ہندوستان [illegible] اس نے ایک معاندانہ رنگ اختیار کر لیا، وہ دشمن کے معنی میں بولا جانے لگا، پھر [illegible] معنی سے ترقی کر کے ویدک [illegible] کی سرزمین میں اس نے آسانی بھوت پریت [illegible] خبیثہ کا مفہوم اختیار کر لیا [illegible] اور قحط سالی کی قوتیں مراد لیجانے لگیں جنسے [illegible] ہمیشہ برسر پیکار رہتا ہے، اور جنکو وہ [illegible] دوسری روشنی کی قوتوں سے منسوب کرتا ہے۔ یہ تحول جس قدر منطقی اور فطری ہے، اسی قدر وہ ویدوں کے فہم وتعبیر کی مشکلات میں اضافہ کرتا ہے، کیونکہ جب اندر [illegible] سے دسیوں کو نکالنے اور ہلاک کرنے کی درخواست کیجاتی ہے [illegible] جب بیان کیا جاتا ہے کہ اس نے دسیوں کی طاقت کو [illegible] تو اس وقت یہ فیصلہ کرنا مشکل ہوجاتا ہے کہ اس سے کون سے دشمن مراد ہیں [illegible] دشمن [illegible]

اس لفظ میں آخری تغیر معنی خیز ہے، وہ محض خادم اور غلام کے معنی میں بولا جانے لگا، اور ذرا سا لفظی تغیر کرکے اسے داس بنا دیا گیا، اس طرح وہ تکمیل فتح کی خبر دیتا ہے، اور زیادہ جدید لفظ شودر کے قریب جا پہونچتا ہے، بس اس ترتیب کے مطابق ہم یہ صحیح مساوات قائم کرسکتے ہیں:-

آریہ - دسیو، د دیج شودر اگر اس امر کا کوئی مزید ثبوت کہ شودر جاتی کو فتح کے ذریعہ سے خادم طبقہ بنایا گیا تھا، درکار ہو تو وہ ہمکو منو کے مجموعۂ قوانین میں ملتا ہے، جسمیں دویج کے لئے ایک شودر کی بیعت بہر حال میں ممنوع قرار دی گئی ہے، خواہ وہ شودر راجہ ہی کیوں نہ ہو، اب ایک شودر راجہ اس کے سوا اور کیا ہو سکتا ہے کہ اس سے ایک دیسی حکمراں مراد ہے،

گرچہ آریہ اور دسیو یا اس کے لفظ، دردیج اور شودر کے الفاظ کا مقابل اصطلاحیں ہونا ایک پوری طرح ثابت اور صریح واقعہ ہے تاہم یہ سمجھنا ایک غلطی ہے کہ دسیو اور شودر کسی خاص قوم کے نام ہیں، در اصل نکا اطلاق ان تمام قوموں پر ہوتا ہے جو آریہ نہیں ہیں، بالکل اسیطرح جیسے قدیم زمانہ میں وہ تمام لوگ "برابرہ" کہلاتے تھے، جو رومی یا یونانی نہ تھے[1]"

پروفیسر ریپسن لکھتا ہے:-

"رگ وید کے شعرا ان محدود معنوں میں جات پات سے واقف نہ تھے، جو اس لفظ نے بعد میں حاصل کرلئے، مگر وہ اتنا جانتے ہیں کہ آدمیوں کے مختلف طبقات ہیں، مذہبی طبقہ یا برہمن اشرافت یعنی راجنیہ یا کشتری، زمین جوتنے والے یعنی وش یا ویشیہ اور خدمت پیشہ طبقات یعنی شودر، پہلے تین طبقات اور چوتھے طبقہ کے درمیان ایک وسیع خلیج حائل ہے، مقدم الذکر آریہ ہیں، اور موخر الذکر محکوم دسیو، ان کے درمیان فرق رنگ (ورن) کا ہے، آریہ مجموعی حیثیت سے گورے رنگ کے لوگ سمجھے جاتے ہیں اور دسیو کالے رنگ کے[2]"

ڈاکٹر بریڈیل کیتھ لکھتا ہے:-

آریوں اور داسوں میں بڑا اور اہم فرق رنگ کا ہے، آریہ ورن اور کالے رنگ کا امتیاز بلاشک وشبہہ ہندوستان کے ورن آشرم (Caste-system) کے اہم ترین ماخذوں سے

[1] Cambridge History of Vedic India, P. 282.83
[2] -India vol. I. P84

یک سب لوگ سے چھوٹے کو مغلوب کرنا در اصل ویدک ہندو کے نہایت اہم اعمال میں سے ہے۔
. . . . اگرچہ رگ وید میں زیادہ تر داسوں کے خلاف جنگ و پیکار اور ان سے نئی
نئی زمینیں چھیننے کے لیے دریاؤں کے عبور کرنے کا تذکرہ آتا ہے لیکن یہ بات صحیح ہے کہ آریوں
نے اصل باشندوں کو بالکل تہس نہس کرنے کی کوشش نہیں کی۔ بے شک بہت سے قدیم باشندے
آریوں کے حملوں سے بھاگ کر شمال و جنوب کے پہاڑوں میں پناہ گزیں ہو گئے، مگر دوسرے
لوگ (جو باقی بچ رہے) غلام بنا لیے گئے۔"

پروفیسر ہاپکنس لکھتا ہے :-
"غلام شودر اور نیچے طبقے کے لوگ اجتماعی عبادت کے جز تسلیم کیے گئے ہیں۔ خود یہ نام
ہی بتاتا ہے کہ شودر اصل میں مفتوح قوم کے لوگ تھے جس طرح ایتھنز میں لفظ "کارین"
(KARIAN) "غلام" کا مترادف ہو گیا تھا۔ اسی طرح شودر بھی غلام کا ہم معنی ہو گیا ہے۔ تاہم شودر
یا ریاد (انسانی جماعت سے خارج) نہیں تھے بلکہ گھریلو زندگی میں شامل کر لیے گئے تھے۔ اور بعض
خانگی رسموں میں حصہ لیتے تھے۔"

آگے چل کر یہی مصنف لکھتا ہے :-
"گوتم (۱۲ : ۲) نے ایک آریہ عورت سے ایک شودر کے ناجائز تعلقات پیدا کرنے
کے متعلق جو قوانین بیان کیے ہیں ان کو جب وسشٹھ دھرم شاستر (۲ : ۲۶، ۲۰، ۲۷، ۹) سے
مقابلہ کر کے دیکھا جاتا ہے تو قطعی طور پر ثابت ہو جاتا ہے کہ آریہ نسل برتر و بہ رنگ گوری
سے ممتاز ہے . . . . مسٹر لیننگر نے اپنی کتاب "ہندوستان میں ذاتوں کی تقسیم
کی تاریخ" (ص ۰۰) میں یہ رائے ظاہر کرنے میں بے احتیاطی سے کام لیا ہے کہ آریوں اور
دراوڑوں کے درمیان کوئی نسلی امتیاز محسوس نہیں ہوتا تھا۔ یہ سچ ہے کہ جو لوگ جات
برادری سے خارج کر دیے جاتے وہ پھر آریہ نہیں کہلاتے تھے مگر کوئی شودر بھی آریہ نہیں سمجھا
گیا۔ آریہ نے رگ وید کے زمانہ سے لے کر بعد تک ہمیشہ نسلی امتیاز ظاہر کیا ہے۔"

[illegible]

[illegible]

ان شہادتوں کے مطالعہ سے یہ بات صاف ہوجاتی ہے کہ ہندو قانون میں جنلوگوں کو شودر قرار دیا گیا ہے، وہ درحقیقت غیر آریہ مفتوح اقوام ہیں، اور ان کے لئے جو قوانین ہندو دھرم شاستروں میں بیان کئے گئے ہیں، وہ ان قوموں کے ساتھ ہندو دھرم کے برتاؤ کو ظاہر کرتے ہیں جو مفتوح و مغلوب ہوکر اس کی حکومت کے تابع ہوجائیں،

یہودی مذہب

یہودی مذہب کے قوانین کی تلاش وتحقیق میں ہمکو وہ دقتیں نہیں پیش آتیں جو ہندو مذہب کے قوانین تلاش کرنے میں پیش آتی ہیں، جس طرح ایک قرآن کو لیکر اسلام کی حقیقت، اسکی تعلیم اس کے اصول ومبادی، اور اس کے قوانینِ شریعت سب کچھ معلوم کرلئے جاسکتے ہیں، اسیطرح ایک کتاب توراۃ کو لیکر ہم یہودی مذہب کی تعلیم اور اس کے احکام وقوانین معلوم کرسکتے ہیں اور اس میں یہودیت کو اس کے اصلی رنگ میں دیکھا جاسکتا ہے، اگرچہ متاخرین علمائے یہود نے شریعت موسویہ کے قوانین کو مرتب کرنے کے لئے بہت سی کتابیں لکھی ہیں، جو جزئیات کی تفصیل پر حاوی ہیں، مثلاً عقیبہ بن یوسف کی مشناہ اور ہدراش جو دوسری صدی عیسوی کی تصنیفیں ہیں، اور تالمود جو مشناہ اور گیمارا کو ملاکر چھٹی صدی عیسوی میں مرتب کی گئی، اور اسحاق الفاسی کی ہلاخوث جو گیارہویں صدی میں لکھی گئی ہے اور تالمودی قوانین کی بہترین شرح سمجھی جاتی ہے، اور موسیٰ میمونی کی مشنہ توراۃ جو بارہویں صدی کے اواخر میں مرتب ہوئی اور یعقوب بن اشہر کی طور جو چودھویں صدی کی یادگار ہے، اور یوسف قارو کی شولحان ارخ جو سولہویں صدی میں لکھی گئی ہے، اور جسمیں یہودی احکام وعبادات کے سارے احکام روایات قدیمہ کے مطابق مرتب کئے گئے ہیں، لیکن ہمارے لئے ان کتابوں سے احتجاج چنداں مفید نہیں ہے، کیونکہ ان میں سے کوئی بھی ایسی نہیں ہے جو یہودیوں کے تمام فرقوں میں متفق علیہ ہو، اور نہ کسی کو یہ رتبہ حاصل ہے کہ اسے یہودی مذہب کی اساس وبنیاد قرار دیا جائے۔ یہی نہیں بلکہ بسا اوقات یہودیوں نے ان کتابوں سے بیزاری ظاہر کی ہے، اور توراۃ کے سوا سب کو تسلیم کرنے سے انکار کردیا ہے، چنانچہ جولائی ۱۸۴۵ء میں ربیوں

[illegible] توراۃ [illegible]

خلاف علانیہ انتہا پر بغاوت کر دیا تھا، لہذا ہم ان سب کتابوں کو نظر انداز کر کے مسئلہ جنگ میں صرف توراۃ کی طرف رجوع کرتے ہیں۔

مقصدِ جنگ، توراۃ میں نہایت کثرت سے لڑائیوں کا ذکر آیا ہے اور جگہ جگہ جنگ کا حکم دیا گیا ہے، مگر سوائے اس ایک مقصد کے جو استثنا باب ۲۰ اور عدد باب ۳۳ میں بیان کیا گیا ہے۔ اور کسی مقصد کا نشان ہم کو نہیں ملتا۔ یہ مقصد کتاب عدد میں اس طرح بیان کیا گیا ہے:

> "اور خداوند نے مواب کے میدانوں میں یردن کے کنارے یریحو کے مقابل موسیٰ کو خطاب کر کے فرمایا: بنی اسرائیل کو خطاب کر اور انھیں کہہ جب تم یردن سے پار ہو کر زمین کنعان میں داخل ہو تو تم ان سب کو جو اس زمین کے باشندے ہیں اپنے سامنے سے بھگاؤ، ان کی مورتیں فنا کر دو، اور ان کے ڈھالے ہوئے بتوں کو توڑ دو"

[illegible] یہاں [illegible] ضروری ہے کہ توراۃ سے متعلق [illegible] توراۃ سے متعلق [illegible]

حضرت موسیٰ پر نازل ہوئی تھی، بلکہ اس توراۃ سے متعلق ہوگا جو آج عہد عتیق [illegible]

وجود ہے۔ ہماری تحقیق یہ ہے کہ "عہد عتیق" کی کتب خمسہ ([illegible] Torah [illegible]) اصل توراۃ نہیں ہیں [illegible]

نیاست [illegible] ہے۔ اس نظریہ کی [illegible] خود عہد عتیق [illegible] ہوتی ہے۔ اس سے ہم کو معلوم ہوتا ہے کہ حضرت موسیٰ نے اپنی زندگی

کے آخری زمانہ میں حضرت یشوع کی مدد سے توراۃ کو مرتب کر کے ایک صندوق میں رکھ دیا تھا (استثنا [illegible])۔

[illegible] کے انتقال کے بعد بعض صدی قوم میں جب بخت نصر نے بیت المقدس [illegible] تو وہ [illegible]

[illegible] کتابوں کے ساتھ [illegible] جو حضرت موسیٰ کے بعد [illegible] کے [illegible] مرتب کی تھیں [illegible]

[illegible] ڈھائی سو برس بعد حضرت [illegible] بائبل کی روایت کے مطابق [illegible]

[illegible] الہام سے اس کتاب کو [illegible] مرتب [illegible]

[illegible] نسخہ کو بھی اپنی اصلی صورت میں [illegible] صورت [illegible]

[illegible] کو بھی [illegible] توراۃ [illegible]

[illegible] رفتہ رفتہ اصل عبرانی نسخہ [illegible] یونانی ترجمہ [illegible]

[illegible] حضرت موسیٰ تک نہیں ہو سکتی۔

اور ان کے سب ڈھلے ہوئے بتوں کو ڈھا دو، اور ان کو جو اس زمین کے بسنے والے ہیں خارج کر دو اور وہاں آپ بسو، کیونکہ میں نے وہ سرزمین تمکو دی ہے کہ اس کے مالک ہو" (۳۳: ۵۰-۵۴)

اور کتاب استثنا میں ہے:-

"سو تم اٹھو، کوچ کرو، اور نہر ارنون کے پار جاؤ، دیکھو میں نے حسبون کے بادشاہ اموری سیحون کو اس کی سرزمین سمیت تیرے ہاتھ میں دیا ہے، سو اس کی میراث لینا شروع کر اور جنگ میں اس کا مقابلہ کر" (۲: ۲۴)

"لیکن حسبون کے بادشاہ سیحون نے ہمکو اپنے ہاں سے گذرنے نہیں دیا کیونکہ خداوند تیرے خدا نے اس کا مزاج کڑا کر دیا، اور اس کے دل کو سخت، تاکہ اسے تیرے ہاتھ میں دیوے جیسا آج ہے، پھر خداوند نے مجھے فرمایا، دیکھ میں نے سیحون کو اس کی سرزمین سمیت تجھے دینا شروع کیا، تو میراث لینا شروع کر، تاکہ اسکی زمین کا وارث ہو جائے، تب سیحون یہص میں ہمارے مقابلہ کے لئے نکلا، وہ اور اس کی ساری قوم تاکہ ہم سے لڑیں، سو خداوند ہمارے خدا نے اسے ہمارے حوالہ کر دیا اور ہم نے اسے اور اس کے بیٹوں کو اور اس کی سب قوم کو ہلاک کیا اور ہم نے اسی وقت اس کے سارے شہروں کو لے لیا اور مردوں اور عورتوں اور بچوں کو ہر ایک شہر میں حرم کیا (یعنی قتل کیا) اور کسی کو باقی نہ چھوڑا، سوا چارپایوں کے جنھیں ہم نے اپنے لئے غنیمت جان کر پکڑا اور اس مال کے جو ہم نے شہروں میں سے لوٹا" (۲: ۳۰-۳۵)

"تب ہم پھرے اور بسن کی راہ میں چڑھ گئے، اور بسن کا بادشاہ عوج اور عی میں وہ اور اس کی ساری قوم ہمارے مقابلہ کے لئے نکلی، تاکہ ہم سے لڑے، اور خداوند نے اس وقت مجھے فرمایا، اس سے مت ڈر کہ میں اس کو اور اسکی ساری قوم کو اس کی سرزمین سمیت تیرے قبضہ میں کر دوں گا، تو اس سے وہی کر جو تو نے اموریوں کے بادشاہ سیحون سے جو حسبون میں رہتا تھا، کیا"

چنانچہ خداوند ہمارے خدا نے حسبون کے بادشاہ سیحون کو بھی اس کی ساری قوم سمیت
ہمارے قابو میں کر دیا، اور ہم نے انھیں یہاں تک مارا کہ ان میں سے
کوئی باقی نہ رہا، اور ہم نے اسی وقت اس کے سب شہر لے لیے۔......

اور ہم نے ان کو یعنی ان کے مردوں اور عورتوں اور لڑکوں کو ہر ایک شہر میں
حسبون کے بادشاہ سیحون کی طرح حرم کیا، لیکن سارے مواشی اور شہروں کا
مال اسباب کو ہم نے اپنے واسطے لوٹ لیا۔ (۳: ۱-۷)

ان عبارات سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ توراۃ کی جنگ کا مقصد ملک گیری ہے۔ ایک ملک کے باشندوں کو تلوار کے زور سے مغلوب کرنا اور قوت کے حق کی بنا پر ان کے مال املاک اور خود ان کی جانوں کو اپنے قبضہ میں لے لینا اس کی نگاہ میں جائز ہے اور اس کے نزدیک یہی قہر و تسلط اس وراثت ارضی کا مفہوم ہے جس کے عطا کرنے کا خدا نے بنی اسرائیل سے وعدہ کیا ہے۔

اس میں شک نہیں کہ قرآن مجید میں بھی "وراثت ارضی" کا ذکر موجود ہے۔ مثلاً ایک جگہ کہا گیا ہے کہ:۔

ان الارض یرثها عبادی الصالحون	زمین کے وارث تو میرے صالح بندے ہوں گے

ایک دوسرے مقام پر فرمایا:۔

ان الارض للہ یورثها من یشاء من عبادہ والعاقبة للمتقین (۷: ۱۲۸)	زمین خدا کی ہے اور اس کا وارث وہ اپنے بندوں میں سے جس کو چاہتا ہے بناتا ہے، اور انجام کار کی بہتری

صرف پرہیزگاروں کا حصہ ہے

لیکن اس وراثت کا مفہوم توراۃ کے مفہوم سے بالکل مختلف ہے۔ توراۃ زمین کی وراثت صرف بنی اسرائیل کو دیتی ہے جیسا کہ عدد (۳۳: ۵۰) سے صاف ظاہر ہوتا ہے۔ قرآن اسے کسی ایک نسل یا قوم کا نہیں بلکہ صالحین کا حق قرار دیتا ہے۔ دراصل یہ حقیقت اس بات کے قانون کی تفسیر و تعبیر ہے، جسے تمام دنیا کے ارباب فکر تسلیم کرتے ہیں۔ توراۃ میں وراثت ارضی کا مفہوم یہ ہے کہ ایک قوم دوسری قوم کو مار کر ملک [illegible]

مگر قرآن میں اللہ تعالیٰ کی جانب سے کسی قوم کو وراثت ارضی دیئے جانے کا مطلب یہ ہے کہ جب کوئی قوم اپنی بد عملیوں کے باعث ناکارہ ہو جاتی ہے اور زندہ رہنے کی صلاحیت کھو بیٹھتی ہے، تو اللہ تعالیٰ دوسری قوم کو جو اس سے بہتر اور اصلح ہو اس کی جگہ کھڑا کر دیتا ہے، پھر توراۃ میں میراث زمین حاصل کرنے کے لئے جنگ کا حکم دیا گیا، مگر قرآن میں کہیں یہ نہیں کہا گیا، کہ فلاں ملک تمہاری میراث ہے، اس لئے تم اسے لڑ کر فتح کرلو، پس توراۃ کی "وراثت ارضی" کھلی کھلی ملک گیری ہے، اور اسلام کے جہاد فی سبیل اللہ کے برعکس اس کی جنگ کا مقصد محض ملک و دولت کا حصول اور دوسری قوموں پر ایک خاص قوم کی برتری قائم کرنا ہے،

حدودِ جنگ جنگ کے حدود و ضوابط کے متعلق ہمکو توراۃ میں کچھ زیادہ تفصیلات نہیں ملتیں، تاہم اس سے اتنا معلوم ہوتا ہے کہ دین یہود اپنے پیروں کو دشمن کیساتھ کس قسم کا سلوک کرنے کی ہدایت کرتا ہے، اس کے لئے ذیل کے احکام قابلِ مطالعہ ہیں،

کتاب استثناء میں ہے :-

"اور جب تو کسی شہر کے پاس اس سے لڑنے کے لئے آ پہونچے تو پہلے اس سے صلح کا پیغام کر، تب یوں ہوگا کہ اگر وہ تجھے جواب دے کہ صلح منظور ہے، اور دروازہ تیرے لئے کھول دے، تو ساری خلق جو اس شہر میں پائی جائے تیری خراج گذار ہوگی، اور تیری خدمت کرے گی، اور اگر وہ تجھ سے صلح نہ کرے، بلکہ جنگ کرے تو تو اس کا محاصرہ کر اور جب خداوند تیرا خدا اسے تیرے قبضہ میں دیدے تو وہاں کے ہر ایک مرد کو تلوار کی دھار سے قتل کر، مگر عورتوں اور لڑکوں اور مواشی کو اور جو کچھ اس شہر میں ہو، اس کا سارا لوٹ اپنے لئے لے اور تو اپنے دشمن کی اس لوٹ کو جو خداوند تیرے خدا نے تجھے دی ہے کھائیو (۲۰ : ۱۰ - ۱۴)

"اور جب تم کسی شہر کو اس ارادہ سے کہ لڑائی کر کے اسے لو، مدت تک محاصرہ کئے رہو تو تبر چلا کر اس کے درختوں کو خراب مت کیجیو کیونکہ ہو سکتا ہے کہ تو ان کا میوہ کھائے سو تو انھیں محاصرہ کے کام میں لانے کے لئے کاٹ نہ ڈالیو، کیونکہ میدان کے درخت آدمی کی زندگی ہیں،" (۲۰ - ۱۹)

"لیکن ان قوموں کے شہروں میں جنہیں خداوند تیرا خدا تیری میراث کر دیتا ہے کسی چیز کو جو سانس لیتی ہے جیتا نہ چھوڑیو، بلکہ تو ان کو حرم کیجیو۔" (۲۰ : ۱۶-۱۷)

"اور جبکہ خداوند تیرا خدا انھیں تیرے حوالہ کرے تو تو انھیں ماریو اور حرم کیجیو، نہ تو ان سے کوئی عہد کریو اور نہ ان پر رحم کریو۔ تم ان کے مذبحوں کو ڈھا دو، ان کے بتوں کو ڈھا دو، ان کے گھنے باغوں کو کاٹ ڈالو اور ان کی تراشی ہوئی مورتیں آگ میں جلا دو۔" (۷ : ۲-۵)

"تم ان سب جگہوں کو جہاں ان قوموں نے جن کے تم وارث ہوگے اپنے معبودوں کی بندگی کی ہے، اونچے پہاڑوں پر اور ٹیلوں پر اور ہر ایک ہرے درخت کے نیچے نیست و نابود کر دیجیو، ان کے مذبحوں کو ڈھا دیجیو اور ان کے ستونوں کو توڑ دیجیو اور ان کے گھنے باغوں میں آگ لگائیو اور ان کے معبودوں کی گھڑی ہوئی مورتوں کو چکنا چور کیجیو اور ان کے ناموں کو اس جگہ سے مٹا دیجیو۔" ([illegible])

کتاب خروج میں ہے :-

"آج کے دن جو حکم میں تجھے کرتا ہوں تو اسے یاد رکھیو کہ میں اموریوں اور کنعانیوں اور حتیوں اور فرزیوں اور حویوں اور یبوسیوں کو تیرے آگے سے نکالتا ہوں۔ خبردار رہنا نہ ہووے کہ تو اس سرزمین کے باشندوں سے جس میں تو جاتا ہے کچھ عہد باندھ لیوے۔ ایسا نہ ہو کہ وہ تیرے درمیان پھندا ہو، بلکہ تم ان کی قربان گاہوں کو ڈھا دو اور ان کے بتوں کو توڑ دو اور ان کی یسیرتوں کو کاٹ ڈالو۔" (۳۴ : ۱۱-۱۳)

کتاب اعداد میں ہے :-

"پھر خداوند نے موسیٰ کو خطاب کر کے فرمایا کہ مدیانیوں سے بنی اسرائیل کا انتقام لے اور تو بعد اس کے اپنی قوم کے لوگوں سے جا ملے گا۔ تب موسیٰ نے لوگوں کو فرمایا کہ بعضے تم میں سے لڑائی کے لیے تیار ہوں .... سو ہزاروں بنی اسرائیل میں ہر فرقے کے ایک ایک ہزار حاضر ہوئے، یہ سب جو لڑائی کے لیے ہتھیار بند تھے ۱۲ ہزار ہوئے .... اور انھوں نے مدیانیوں

سے بڑی نبی کی جب خداوند نے موسیٰ سے فرمایا تھا، اور سارے مردوں کو قتل کیا ...... اور بنی اسرائیل نے مدیان کی عورتوں اور ان کے بچوں کو اسیر کیا اور ان کے مواشی اور بھیڑ بکری اور مال و اسباب سب کچھ لوٹ لیا۔ اور ان کے سارے شہروں کو جن میں وہ رہتے تھے، اور ان کے سب قلعوں کو پھونک دیا، اور انھوں نے ساری غنیمت اور سارے اسیر انسان اور حیوان لئے، اور وہ قیدی اور غنیمت اور لوٹ، موسیٰ اور الیعزر کاہن اور بنی اسرائیل کے پاس خیمہ گاہ میں، موآب کے میدانوں میں یردن کے کنارے جو یریحو کے مقابل ہے، لائے .... اور موسیٰ لشکر کے رئیسوں پر اور ان پر جو ہزاروں کے سردار تھے، اور ان پر جو سینکڑوں کے سردار تھے، جو جنگ کر کے پھرے تھے، غصہ ہوا، اور ان کو کہا کہ کیا تم نے سب عورتوں کو جیتا رکھا؟ .... سو تم ان بچوں کو جتنے لڑکے ہیں سب کو قتل کرو، اور ہر ایک عورت جو مرد کی صحبت سے واقف تھی جان سے مارو، لیکن وہ لڑکیاں جو مرد کی صحبت سے واقف نہیں ہوئیں ان کو اپنے لئے زندہ رکھو" (۳۱ : ۱ - ۱۸)

کتاب یشوع میں ہے:۔

"اور انھوں نے ان سب کو جو شہر میں تھے کیا مرد کیا عورت، کیا جوان، کیا بوڑھا، کیا بیل، کیا بھیڑ، کیا گدھا، سب کو یک لخت تہ تیغ کر کے حرم کیا .... پھر انھوں نے اس شہر کو اس سب سمیت جو اس میں تھا پھونک دیا، مگر روپا اور سونا اور پیتل اور لوہے کے ظروف خداوند کے خزانہ میں داخل کئے" (۶ : ۲۱ - ۲۵)

"اور انھوں نے عی کے بادشاہ کو جیتا پکڑا اور اسے یشوع پاس لائے اور ایسا ہوا کہ جب اسرائیل میدان میں اس بیابان کے درمیان جہاں ان کا پیچھا کیا، عی کے لوگوں کو قتل کر چکے اور جب وہ سب تہ تیغ ہو گئے یہاں تک کہ بالکل کھپ گئے، تو سارے بنی اسرائیل عی کو پھرے اور اسے تلوار کی دھار سے مارا، چنانچہ وہ جو اس دن مارے گئے مرد اور عورت ۱۲ ہزار تھے، یعنی عی کے سب لوگ، کیونکہ یشوع نے اپنا ہاتھ جس سے بھالا اٹھایا جب تک عی کے سارے رہنے والوں کو حرم

نہ کرلیا نہ چھینی، اسرائیل نے اس شہر کے فقط مویشی اور اسباب کو لوٹ لے لیا،
خداوند کے حکم کے مطابق جو اس نے یشوع کو فرمایا تھا۔ (۸ : ۲۳ - ۲۰)

ان عبارات سے ظاہر ہوتا ہے کہ دین یہود اپنے دشمنوں کو دو قسموں پر تقسیم کرتا ہے۔ ایک وہ جنھیں خداوند نے بنی اسرائیل کی میراث میں نہیں دیا ہے۔ اور دوسرے وہ جنھیں اس نے ان کی میراث میں دیا ہے۔ ان دونوں کے ساتھ اس کا معاملہ جدا جدا رنگ کا ہے۔

پہلی قسم کے دشمنوں کے لئے اس کا حکم یہ ہے کہ پہلے انھیں صلح کا پیغام دیا جائے۔ اور اگر وہ اسے قبول کرکے اپنا ملک بنی اسرائیل کے سپرد کردیں تو ان کو باج گذار اور خدمت گذار بنالیا جائے۔ لیکن اگر وہ صلح نہ کریں، تو ان کے ساتھ جنگ کیجائے اور فتح پانے کے بعد ان کے تمام مردوں کو قتل کردیا جائے۔ عورتوں اور بچوں کو غلام بنالیا جائے۔ اور مال اسباب پر قبضہ کرلیا جائے۔ دوران جنگ میں وہ باغوں اور کھیتوں اور میوہ دار درختوں کو خراب کرنے کی ممانعت کرتا ہے، مگر اس لئے نہیں کہ ایک مفسدانہ فعل ہے، بلکہ اس لئے کہ انھیں اس طرح خراب کردینے سے، فتح حاصل کرنے کی صورت میں فاتح کو کوئی فائدہ نہ پہنچ سکے گا۔

دوسری قسم کے دشمنوں کو وہ تمام انسانی حقوق اور رعایات سے محروم کردیتا ہے۔ اس کا حکم یہ ہے کہ ان قوموں سے کوئی صلح و معاہدہ نہ کیا جائے۔ ان کے خلاف بلا تامل جنگ چھیڑ دی جائے اور اس میں ان کی بستیوں کو تباہ و برباد کیا جائے۔ ان کی کھیتیاں، باغات، عمارتیں، اور عبادت گاہیں، سب تہس نہس کردی جائیں۔ ان کی عورتیں، مرد، بچے حتیٰ کہ جانور تک تہ تیغ کردئیے جائیں۔ اور روئے زمین سے ان کا نام و نشان مٹا دیا جائے۔ اس جنگ کا مقصد اس نے صراحت کردیا ہے کہ میراث میں دی ہوئی قومیں کلیتہً نیست و نابود کردی جائیں، کیونکہ وہ ان قوموں کے سامنے کوئی ایسی شرط پیش نہیں کرنا چاہتا جس کو پورا کرنے کے بعد ان کی جان بخشی ممکن ہو۔

اس تعلیم پر کسی تبصرہ کی حاجت نہیں۔ وہ اپنے اوپر آپ تبصرہ کررہی ہے۔

بودھ مذہب

یہاں تک ان مذاہب کا ذکر تھا جن سے اسلام کا اختلاف نفس جنگ کے جواز و عدم جواز میں نہیں بلکہ محض اس کی اعتقادی اور عملی نوعیت میں تھا، اب دوسری قسم ان مذاہب کی ہے جو سرے سے جنگ ہی کے مخالف ہیں اور اسلام سے اس بنا پر اختلاف رکھتے ہیں کہ وہ جہاد بالسیف کی اجازت ہی کیوں دیتا ہے؟ ان مذاہب میں تاریخی ترتیب کے اعتبار سے پہلا نمبر بودھ مذہب کا ہے، اور ہمیں سب سے پہلے اسی کو تحقیق کی کسوٹی پر کس کر دیکھنا ہے، کہ اس مسئلہ میں اس کی تعلیمات کس حد تک عقل اور فطرت کے مطابق ہیں،

بودھ مذہب کے ماخذ مسئلۂ زیر بحث میں بودھ مذہب کے طریقہ کی تحقیق کرنے سے قبل یہ امر ذہن نشین کر لینا چاہئے کہ آج ہمارے پاس یہ معلوم کرنے کا کوئی یقینی ذریعہ نہیں ہے، کہ فی الواقع بودھ کی تعلیم کیا تھی؟ بودھ نے اپنی زندگی میں کوئی کتاب نہیں لکھی، اور اپنے قائم کردہ مذہب کے عقائد اور احکام کا کوئی ایسا مجموعہ بھی مرتب نہیں کرایا، جس سے اس کی تعلیمات خود اسکی زبان سے معلوم کیجا سکتی ہوں، تاریخ سے ثابت ہوتا ہے کہ اس کے کسی پیرو نے بھی اس کی زندگی میں یا اس کے بعد کسی قریبی زمانہ میں اس کی تعلیمات کو ضبط تحریر میں لانے کی کوشش نہیں کی بعض روایات سے اتنا معلوم ہوتا ہے کہ اس کے انتقال کے بعد راج گرہیہ میں ایک بڑی مجلس منعقد ہوئی تھی، جس میں اس کے ایک و مخصوص مریدوں نے اس کی تعلیمات پر زبانی لکچر دیے تھے، لیکن اول تو خود انھیں روایات سے ثابت ہوتا ہے کہ ان لکچروں کو ضبط تحریر میں نہیں لایا گیا، دوسرے تاریخی حیثیت سے یہ بھی پوری طرح ثابت نہیں ہوتا کہ آیا یہ کونسل فی الواقع منعقد ہوئی بھی تھی یا نہیں، مہاپرنبان، سوتر، جو ہمارے پاس بودھ کی زندگی اور اس کے بعد کے حالات معلوم کرنے کا سب سے زیادہ مستند ذریعہ ہے، اس کونسل کے بارے میں بالکل خاموش ہے۔[1] اب رہیں موجودہ کتابیں جو اس

---

[1] Buddhist Suttas, by Rhys Davids ...

ہب کے متعلق ہماری معلومات کا تمام ذریعہ یہی سوتر ہیں جو بدھ کے بہت بعد کی تصنیف ہیں۔
نتقال پر ایک صدی گذر چکی تھی جب ویسالی میں اس مذہب کے بھکشوؤں کی ایک کونسل
منعقد ہوئی۔ اور بڑے مباحثہ کے بعد اس کے قوانین اور عقائد و احکام کو مرتب کرنے کی کوشش کی گئی۔
اس کے متعلق دیپ وںسا کا مصنف ہمکو خبر دیتا ہے کہ اس میں بھکشوؤں نے اصل مذہب کے
صول بدل دیئے۔ اس کے عقائد اور احکام میں بہت کچھ ترمیم و تنسیخ کی اور اصل سوتروں کو بدل
کر نئے سوتر بنا لئے۔ اسی زمانہ سے بودھ مذہب کو ضبط تحریر میں لانے کا سلسلہ شروع ہوا
اور پہلی صدی عیسوی یعنی ۴۰۰ سو برس تک یہ سلسلہ جاری رہا۔ لیکن آخری زمانہ میں اس مذہب
کو پھر تحریف سے دوچار ہونا پڑا۔ یہاں تک کہ اس کے بنیادی اصول بھی بدل گئے۔ ابتدائی بودھ مت
میں خدا کا کوئی وجود نہ تھا۔ مگر اب ایک غیر فانی ہستی کا وجود مان لیا گیا جو تمام کائنات سے برتر ہے
اور جس کا محض ایک مادی ظہور بودھ کی شکل میں ہوا ہے۔ ابتدائی بودھ مت میں جنت اور
دوزخ کا کوئی تصور نہ تھا۔ مگر اب اعمال حسنہ کا صلہ جنت اور افعال سیئہ کا عوض دوزخ کو تسلیم
کر لیا گیا۔ ابتدائی بودھ مت میں زاہدانہ زندگی کے قواعد بے انتہا سخت تھے۔ مگر اب ان کو
بدل کر ضروریات کے لحاظ سے نسبتاً نرم کر دیا گیا۔ بودھ مت میں یہ آخری تحریف کنشک کے
زمانہ میں ہوئی جو پہلی صدی عیسوی میں گذرا ہے۔ اور تاریخ سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کے ماتحت
کشمیر میں جو کونسل منعقد ہوئی تھی، اسمیں اسی تحریف و نسخ کے ساتھ بودھ مذہب کے
قوانین مرتب کیے گئے تھے۔ ان جدید قوانین کو ایک چھوٹے سے فرقہ نے رد کر دیا۔ مگر پیروان
بودھ کے سواد اعظم نے جو اصطلاح میں مہایان فرقہ کہلاتا ہے انھیں تسلیم کر لیا۔

اس سے ظاہر ہے کہ صحیح معنوں میں جس چیز پر "مذہبی کتاب" کا اطلاق ہوتا ہے، وہ
بودھ مذہب میں موجود نہیں ہے۔ اور ہم کسی سندی بنا پر وثوق کے ساتھ یہ معلوم نہیں کر سکتے
کہ بودھ کی اصلی تعلیم کیا تھی۔ زیادہ سے زیادہ اعتماد ان تحریروں پر کیا جا سکتا ہے جو عہد کنشک
کی آخری عمل تحریف سے بچ کر ہم تک پہنچی ہیں۔ اور وہ پالی زبان میں ہیں۔

[illegible]

[illegible] Religion by [illegible] P. 55

۱۔ ونایا پٹک جو زاہدانہ زندگی کے قوانین کا مجموعہ ہے اور ۳۵۰ ق م سے تقریباً ۲۵۰ ق م تک مختلف ایام میں مرتب ہوا ہے، مگر اس کے مصنف یا مصنفوں کا پتہ نہیں ملتا،

۲۔ ست پٹک جس میں حصولِ نجات کے طریقے یا بودھ مت کے فلسفۂ اخلاق پر زیادہ تر بودھ کے اقوال جمع کئے گئے ہیں، اس مجموعہ کے مصنف اور زمانہ تصنیف کے متعلق بھی تاریخ میں کسی قسم کی معلومات محفوظ نہیں ہیں،

۳۔ ابھی دھم پٹک جو زیادہ تر بودھ مت کے فلسفۂ اخلاق و مابعد الطبیعات پر مشتمل ہے، اس کے متعلق ہم صرف اتنا جانتے ہیں، کہ یہ تیسری صدی قبل مسیح کے خاتمہ سے پہلے موجود تھی[1]۔

آیندہ صفحات میں ہم بودھ کے متعلق جو کچھ کہیں گے وہ دراصل اس بودھ کے متعلق ہوگا جسے یہ کتابیں ہمارے سامنے پیش کرتی ہیں، نہ کہ اس بودھ کے متعلق جس کو ہم نہیں جانتے کہ وہ دراصل کس چیز کی تعلیم دیتا تھا،

اہنسا کی تعلیم

بودھ مت ایک اہنسائی مذہب ہے، اس میں ہر ذی روح شے کو معصوم قرار دیا گیا ہے، اور انسان سے لیکر چھوٹے سے چھوٹے کیڑے تک ہر جاندار کی عصمت اس معنی میں تسلیم کی گئی ہے کہ اس پر کسی حال میں تجاوز نہیں کیا جا سکتا، بودھ کے احکام عشرہ میں سب سے پہلا تاکیدی حکم یہ ہے کہ کسی جاندار کو ہلاک نہ کرو، جو بھکشو عمداً کسی جاندار شے کو اس کی زندگی سے محروم کرے وہ اس کے قانون میں ناقابلِ عفو جرم کا مرتکب[2] ہے، حد یہ ہے کہ وہ بھکشوؤں کو برسات کے تین مہینوں میں گوشۂ عزلت سے باہر نکلنے تک کی ممانعت کرتا ہے، تاکہ زمین پر چلنے سے حشرات الارض نہ کچلے جائیں[3]، ان شدید اہنسائی احکام کے ساتھ جنگ کی اجازت تو درکنار، اس کا تصور بھی ناممکن ہے جب جان کا احترام اس کی نگاہ میں اس قدر بڑھا ہوا ہے تو لامحالہ اسے ایک ایسے عمل کو شدید نفرت کی نظر سے دیکھنا چاہئے جسمیں کیڑوں کی نہیں آدمیوں

---

[1] مزید تفصیل کے لئے سلسلہ کتب مقدسہ شرق کی گیارھویں جلد کے مقدمہ کی طرف رجوع کرنا چاہئے جو پروفیسر ریس ڈیوڈز کی تحقیق کا نتیجہ ہے۔ [2] Vinaya Texts by Rhys Davids. vol

[3] [illegible]

[illegible]

ہیں یہی وجہ ہے کہ بودھ مت نے بھکشو کو اس کی اجازت بھی نہیں دی ہے کہ وہ میدان جنگ میں تماشائی کی حیثیت سے جا کر خون ریزی کا نظارہ کرے چنانچہ پکتیہ [illegible] نمبر انیسویں دفعہ ہے:-

"جو بھکشو بلا کسی وجہ معقول کے ایک ایسی فوج کو دیکھنے جائے جو [illegible] صف بستہ ہو تو وہ پکتیہ جرم کا مرتکب ہوگا۔"

اور دفعات ۴۹ و ۵۰ کے الفاظ یہ ہیں:-

"اگر کسی بھکشو کے فوج کی طرف جانے کی کوئی معقول وجہ ہو تو وہ صرف دو یا تین راتوں تک وہاں ٹھہر سکتا ہے۔ اگر وہ اس سے زیادہ ٹھہرے تو یہ پکتیہ ہے۔"

"اور اگر وہ وہاں دو یا تین رات کے دوران قیام میں میدان جنگ کی صف [illegible] یا افواج کی بیشماری یا قوت حرب کی صف بندی یا مقابلہ کے موقع پر جائے تو یہ بھی پکتیہ جرم ہے۔"

بودھ کا فلسفہ

ان احکام جنگ کے متعلق بودھ کا مذہب صاف معلوم ہوتا ہے لیکن اس مذہب کے [illegible] کا صحیح اندازہ کرنے کے لئے صرف ان مختصر احکام ہی کا جان لینا کافی نہیں ہے بلکہ اس [illegible] کو سمجھنا ضروری ہے جس کا ایک جز [illegible]

[illegible]

کوشش ہی نہیں کی ہے، کہ انسان دنیا میں کیوں پیدا ہوا ہے، اور اس کی زندگی کا مقصد کیا ہے؟ اس لئے قدرتی طور پر وہ اس سوال سے بھی کوئی بحث نہیں کرتا کہ اس دنیا میں اس کے لئے زندگی بسر کرنے کا کون سا طریقہ بہتر ہے، جو اس کی اور اس کے ابنائے نوع کی حقیقی فلاح کا موجب ہو، اس نے اپنی پوری توجہ صرف اس سوال کے حل کرنے میں صرف کردی ہے کہ انسان کی زندگی میں تغیر و انقلاب کیوں ہوتا ہے؟ بچپن، جوانی، بڑھاپا، تندرستی، بیماری، پیدائش، موت، رنج، خوشی، راحت، مصیبت، اور اسی قسم کے مختلف تغیرات کی علت کیا ہے؟ اور اس چکر سے نجات حاصل کرنے کی کیا صورت ہے؟ انسان کی پوری انفرادی اور اجتماعی زندگی میں اس کو صرف یہی ایک سوال قابل توجہ نظر آیا ہے، اور تمام دوسرے علمی و اعتقادی مسائل سے اس نے بالکل آنکھیں بند کرلی ہیں۔

اس بنیادی سوال پر کئی سال تک گیان دھیان کرنے کے بعد وہ اس نتیجہ پر پہونچا ہے کہ زندگی فی نفسہ ایک مصیبت ہے، جس میں انسان مبتلا ہوگیا ہے، اور پیدائش سے لیکر موت تک اس پر جتنے انقلابات گذرتے ہیں، وہ سب اسی مصیبت کے مظاہر ہیں، اس کے دنیا میں آنے کا کوئی مقصد نہیں ہے، وہ محض عبث اور بیکار پیدا ہوا ہے، یا اگر اس کا کوئی کام ہے تو وہ صرف مصیبت سہنا، اور تکلیف اٹھانا ہے، اس لئے یہ دنیا اس کے رہنے کی جگہ نہیں ہے، یہاں اس کو حقیقۃً کوئی راحت اور مسرت نہیں ہے، کیونکہ ہر راحت کے پیچھے ایک تکلیف، ہر مسرت کے پیچھے ایک رنج، ہر فائدہ کے پیچھے ایک نقصان، ہر شگفتگی کے پیچھے ایک پژمردگی، اور ہر پیدائش کے پیچھے ایک موت لگی ہوئی ہے، اور یہ سب کچھ تحول و انقلاب کے ایک دائمی عمل کے تابع ہے، جو خود ایک مصیبت ہے۔

اس مصیبت میں انسان کیوں مبتلا ہے؟ اس کا جواب بودھ یہ دیتا ہے کہ خواہش، احساس اور شعور، اس کو زندگی کی مصیبت میں مبتلا کرتے ہیں، نفس کی انھیں قوتوں کے باعث دنیا سے انسان کا تعلق قائم ہوتا ہے۔ اور وہی تعلق اسے بار بار دنیا میں لاتا ہے، وہ بار بار اس کو ایک جون سے دوسرے جون میں، ایک قالب سے دوسرے قالب میں، اور ایک زندگی سے دوسری زندگی میں لئے پھرتا ہے، اور جب تک خواہش کا یہ پھندا اس کی گردن سے نہیں نکلتا اس وقت تک وہ بار بار مرنے اور بار بار زندہ ہوکر کسی نہ کسی شکل میں پھر پیدا ہونے کے سلسلہ سے چھٹکارا نہیں پا سکتا،

پھر اس مصیبت اس زندگی کے چکر سے نجات حاصل کرنے کی کیا صورت ہے؟ اس سوال کو بودھ نے صرف ایک لفظ "نروان" سے حل کیا ہے، وہ کہتا ہے کہ جب زندگی مصیبت ہے اور خواہش اس مصیبت کی جڑ ہے، تو انسان کے لئے اصلی راحت صرف نیستی، فنا اور عدم محض میں ہے، اور وہ خواہش احساس اور شعور کو بالکل مٹا دینے سے حاصل ہو سکتی ہے، انسان دنیا کے تمام علائق سے منقطع ہو جائے، کسی چیز کی محبت، کسی شے کی تمنا، کسی لذت کی چاشنی، غرض اس دنیا کی کسی چیز کی طرف اپنے دل میں انجذاب نہ رکھے، اور اپنے تمام جذبات، احساسات، اور خواہشات کو اس طرح فنا کر دے کہ اس دنیا سے اس کا کوئی واسطہ و تعلق باقی ہی نہ رہے، جو اسے یہاں دوبارہ آنے کا موجب ہو، اس طرح وہ "وجود کی قید سے نکل کر" عدم یا فنائے محض" کی حالت میں چلا جائیگا یہی "نروان"[1] ہے اور یہی بودھ کے نزدیک انسان کا منتہائے نظر ہے۔

اب چوتھا سوال یہ ہے کہ نروان تک پہونچنے کی صورت کیا ہے؟ یہاں پہونچ کر بودھ کا مذہب عملی شکل اختیار کرتا ہے اس نے نروان تک پہونچنے کے لئے طریق ہشت گانہ تجویز کیا ہے[2] اور وہ مختصر الفاظ میں یہ ہے:-

(۱) صحیح عقیدہ، یعنی چاروں بنیادی صداقتوں کو اچھی طرح سمجھنا۔

(۲) صحیح ارادہ، یعنی ترکِ لذات کا مصمم فیصلہ اور دوسروں کو تکلیف پہونچانے اور ذی روح ہستیوں کو ایذا دینے سے کامل پرہیز۔

(۳) صحیح گفتار، یعنی بدزبانی، بیہودہ گوئی، غیبت اور جھوٹ سے احتراز۔

---

[1] نروان [illegible] نزدیک وہ نفس کی ایک حالت ہے جس میں وہ مصیبت اور خواہش سے پاک دنیوی زندگی [illegible] شعور سے متمتع ہو لیکن میکس مولر [illegible] جیسے محققین [illegible] تعریف [illegible] نہیں کرتے، بلکہ [illegible] تصریح کرتے ہیں کہ اس سے مراد انسان کا معدوم ہو جانا یا ہستی کا نیست [illegible] ہو جانا ہے، [illegible] یہ چار مسائل یعنی مصیبت، وجہ مصیبت، اور طریق دفع مصیبت بودھ مذہب کی اصطلاح میں حقائق اصلیہ [illegible] کہلاتے ہیں۔

[2] [illegible]

(۴) صحیح چلن، یعنی بدکاری، قتل نفس اور خیانت سے اجتناب،
(۵) صحیح معیشت، یعنی جائز طریقہ سے روزی حاصل کرنا،
(۶) صحیح کوشش، یعنی دھرم کے احکام کے مطابق عمل کرنا،
(۷) صحیح حافظہ، یعنی اپنے گذشتہ اعمال کو یاد رکھنا،
(۸) صحیح تخیل، یعنی راحت، اور مسرت سے بے نیاز ہو کر عدم محض (نروان) کی طرف دھیان لگانا[1]
اس طریق ہشت گانہ کو عملی شکل میں لانے کے لئے بودھ نے دس اخلاقی احکام دیئے ہیں جن میں سے پانچ موکد ہیں اور پانچ غیر موکد، یہ احکام حسب ذیل ہیں[2]:-
(۱) کسی کی جان نہ لو،
(۲) چوری نہ کرو،
(۳) زنا نہ کرو،
(۴) جھوٹ نہ بولو،
(۵) نشہ آور چیزیں نہ پیو،
(۶) مقرر وقت کے سوا کھانا نہ کھاؤ،
(۷) کھیل تماشے اور گانے بجانے سے پرہیز کرو،
(۸) پھول، عطر وغیرہ سے پرہیز کرو،
(۹) اچھے اور نرم بستر پر سونے سے پرہیز کرو،
(۱۰) سونا چاندی اپنے پاس نہ رکھو،

یہی طریق ہشت گانہ اور احکام عشر بودھ مذہب کے پورے اخلاقی نظام کی بنیاد ہیں، بودھ نے اپنے پیرووں کو معیشت و معاشرت کے متعلق جتنی ہدایات دی ہیں، ان سب کا بنیادی پتھر "نفس کشی" اور "ترک دنیا" ہے، چونکہ اس کی منزلِ مقصود "نروان" ہے، اور وہ بغیر نفس کشی کے حاصل نہیں ہو سکتی، اس لئے وہ خودی کو مٹانے کے لئے نہایت سخت ریاضتیں تجویز کرتا ہے، مثلاً داڑھی، مونچھ اور سر کے بالوں کو نوچنا تاکہ غرور حسن خاک میں ملجائے، ہمیشہ کھڑے رہنا، کانٹوں

[1] Vinaya Texts Part. I. P. 211 [2] Budhism in Translations by Warren. P. 373

یا کیمونتی کے بستر پر لیٹنے، ہمیشہ ایک ہی پہلو پر سونا، بدن پر خاک ڈالنے سے پرہیز، اور اسی قسم کے دوسرے احکام جو جسم کو تمام [illegible] تکلیف میں مبتلا کرنے [illegible] اور احساس کو باطل کرنے والے ہیں، ان کے علاوہ زندگی بسر کرنے کے عام طریقوں کے متعلق بھی بودھ نے ایسے ہی احکام دیے ہیں، اس جگہ ان سب کی تفصیل دینا بہت مشکل ہے، کیونکہ وہ کئی جلدوں پر محیط ہیں، تاہم مثال کے طور پر چند نقل کیے جاتے ہیں،

چار چیزیں جن سے پرہیز کی سخت تاکید ہے، یہ ہیں، (۱) عورت اور مرد کا فطری تعلق[1]، (۲) چوری حتیٰ کہ گھاس کے ایک تنکے کی بھی (۳) کسی جاندار حتیٰ کہ چھوٹے سے چھوٹے کیڑے کو بھی عمداً ہلاک کرنا، (۴) اپنی طرف کسی فوق العادہ کیفیت کو منسوب کرنا[2]،

مذہبی زندگی اختیار کرنے کے بعد انسان نئے کپڑے نہ پہنے، کوڑے پر پڑے ہوئے چیتھڑے، قبرستان سے مردوں کے کفن لیکر ان کی گدڑیاں سی لینی چاہئیں[3]، مگر اس قسم کی گدڑیاں بھی ایک وقت میں تین سے زیادہ نہ ہوں،

بسر اوقات کے لئے کوئی پیشہ نہ کرے، ایک لکڑی کا چینی لیکر خاموشی کے ساتھ در بدر بھیک مانگتے پھرنا چاہیے[4]،

---

[1] بودھ [illegible] اس قسم کی بہت سی [illegible] تفصیلیں بجیویں [illegible] حتی قسمیں [illegible] (Buddha [illegible]) میں ملیں گی [2] [illegible] کا کوئی امتیاز نہیں ہے، [illegible] ایک واقعہ ہے کہ ایک بھکشو نے مذہبی زندگی اختیار کرنے کے بعد اپنی منکوحہ بیوی سے صحبت کا تعلق [illegible] اس فعل سے اس کو سختی کے ساتھ منع کر دیا (حصہ اول صفحہ ۲۳۳) [3] [illegible] Texts [illegible]

36 ـ 23 [illegible] [4] [illegible] کا ایک واقعہ مشہور ہے، جب [illegible] ایک قریب کے قبرستان میں سے دفن کر دیا [illegible] ان کی قبر [illegible] کو [illegible] بچا کر اس کو دھویا اور اپنے ہاتھ سے اس کا ایک کرتا سی کر پہن لیا [illegible] Religion [illegible]

[5] خود بودھ اپنے زمانہ [illegible] بھیک [illegible] وہ اپنے پیروؤں کو بھکشو اور خود اپنے آپ کو مہا بھکشو یعنی سب سے بڑا بھکشو [illegible] Buddhism [illegible]

[illegible] Religion P 101

رہنے کے لئے کوئی مکان نہ بنائے جنگل میں رہنا چاہیے اور درختوں کے سایہ میں پناہ لینی چاہیے،

بیمار ہو تو کوئی دوا استعمال نہ کرے پیشاب کی تحلیل اس کے لئے کافی وسیلۂ علاج ہے[1]،

اپنے جسم کو صاف رکھنے کی کوشش بھی نہ کرے، حد سے حد پندرہ دن میں ایک دفعہ نہانا جائز ہے[2]،

اپنے پاس روپیہ پیسہ بالکل نہ رکھے، تجارت میں لین دین، خرید و فروخت اور تمام ایسے کاموں سے پرہیز کرنا چاہیے جنمیں چاندی سونا استعمال کیا جاتا ہو[3]

اچھی قسم کا بستر بھی نہ رکھے، ایک موٹا جھوٹا کمبل رکھنا چاہیے اور اس ایک کمبل کو کم از کم چھ سال چلانا چاہیے[4]،

بودھ مذہب کی اصلی کمزوری یہ اس مذہب کے اخلاقی نظام کا خلاصہ ہے جسکا ایک جزو اہنسا کی تعلیم ہے، بلاشبہ اسمیں بعض نہایت عمدہ اخلاقی ہدایت بھی موجود ہیں، اور نا انصافی ہوگی اگر ہم اس تقویٰ اور پاک سیرتی کی تعریف نہ کریں جسکی تعریف بودھ نے دی ہے، اور جسکا ایک مکمل عملی نمونہ خود اس نے اپنی پر عظمت زندگی میں پیش کیا ہے لیکن فروع میں اپنے اندر بہت سی خوبیاں رکھنے کے باوجود، اصول میں یہ پورا نظام اول سے لیکر آخر تک غلط ہے، اسکی بنیاد ایک غلط عقیدہ پر ہے، حیات انسانی کے متعلق اسکا نظریہ غلط ہے، اس نے ایک غلط مقام سے انسان اور اسکی زندگی پر نظر ڈالی ہے ایک غلط مقام کو انسان کی منزل مقصود قرار دیا ہے، اور ایک غلط راستہ اس تک پہونچنے کے لئے تجویز کیا ہے، بودھ دراصل دنیا کے حوادث و تغیرات اور زندگی کے انقلاب و تحول کو دیکھکر مبہوت ہو گیا ہے، وہ انکی اصلی علت کو سمجھنے انکی گہرائیوں تک پہونچ کر حقیقت کا پتہ لگانے، اور مردانگی کیساتھ انکا مقابلہ کرکے کسی بلند تر نصب العین کی طرف اقدام کرنے کے بجائے [illegible] کا ایک سطحی مطالعہ کرتا ہے، اور ایک سرسری نظر ڈال کر اس نتیجہ پر پہونچ جاتا ہے کہ انسان کی زندگی عبث ہے یہ سارا کارخانۂ دنیا بے معنی ہے، اسمیں انقلاب اور گردش کا جو سلسلہ جاری ہے، وہ کسی سبب و علت اور مقصد و منشا کے بغیر صرف انسان کو دکھ دینے اور ستانے کیلئے چل رہا ہے، انسان کو عقل، احساس، ادراک، شعور، جذبات، خواہشات اور جسمانی قوتیں جو کچھ حاصل ہیں سب اسے مصیبت میں مبتلا کرنے کے لئے، اور ان کا کوئی اعلیٰ مصرف نہیں ہے، دنیا کی دولت و ثروت، اسکی تہذیب، اس کا تمدن، اس کی سیاست، اس کی حکومت، اس کی صنعت و تجارت غرض اس کے سارے کاروبار بے فائدہ ہیں، یہ سب تعلقات کے پھندے ہیں،

---

[1] Vinaya Texts, Part I. PP. 13-4 [2] Vinaya Texts, Part II. P. 44.

[3] " Part I. PP. 26-27

[4] " Part. PP. 24-25.

جو انسان کو بار بار زندگی کی [illegible]
اس دنیا میں بجز اس کے انسان کا اور کوئی کام نہیں ہے، کہ وہ اپنی ذات کے سوا تمام خارجی تعلقات سے منقطع ہوجائے، اور اپنی ذات کو بھی ہر قسم کی لذتوں سے محروم کرکے، طرح طرح کی تکلیفوں میں مبتلا کرکے، اس حد تک مٹا دے کہ وہ "ہستی" اور وجود کی قید سے آزاد ہوکر "نیستی" اور عدم کی حد میں چلا جائے۔

اب یہ ظاہر ہے کہ جو شخص دنیا کے مصائب سے خوف زدہ ہوکر خود دنیا ہی کو چھوڑ دیتا ہے، اس کے تمام تمدنی و اجتماعی علایق سے الگ ہوکر صرف اپنی نجات کی فکر میں لگ جاتا ہے، اور اس نجات یا عدم کی منزل تک پہونچنے کے لئے بھی وہ راستہ اختیار کرتا ہے، جو دنیا کے اندر سے نہیں بلکہ باہر ہی باہر گذر جاتا ہے، اس سے یہ ہرگز امید نہیں کیجا سکتی، کہ وہ اپنے خاندان اپنی قوم، اپنے وطن، اور اپنے ابنائے نوع کی فلاح و بہبود کے لئے کوئی سعی و جدوجہد کرے، اپنے دل و دماغ کی قوتوں اور اپنے مادی و معنوی وسائل کو پوری آزادی کے ساتھ سوسائٹی کی ترقی و اصلاح کے کام میں لگائیگا، ظلم و عدوان، فتنہ و فساد، طغیان و سرکشی، اور گمراہی و ضلالت سے بے دریغ جنگ کرکے دنیا میں عدل و انصاف، امن و امان اور حق و صداقت کا علم بلند کریگا، اور ان مشکلات کا مردانہ مقابلہ کریگا، جو قدرتی اسباب کے ماتحت ہر کام میں انسان کو پیش آتی ہیں، یہ جد و جہد، یہ عملی سرگرمی، یہ سرفروشی و جانبازی، یہ میدان جنگ کی مصیبتیں، یہ تیر و تفنگ کی جراحتیں، یہ سیاست و فرمانروائی کی بوجھل ذمہ داریاں تو وہی شخص اٹھا سکتا ہے، جو اس دنیا کو جائے عمل سمجھتا ہے، جس کے پیش نظر زندگی کا ایک بلند نصب العین، اور اعلیٰ مقصد ہے، جو اپنے آپ کو ایک اہم خدمت پر مامور، اور ایک بالاتر ہستی کے سامنے جوابدہ سمجھتا ہے، اور جس کو یہ یقین ہے کہ اس دنیا میں وہ جتنا زیادہ عمل کریگا، اتنا ہی زیادہ انعام مستقبل کی دائمی زندگی میں پائیگا، ورنہ جو غریب پہلے ہی اپنی جان سے بیزار ہو، اپنے عمل کے نتائج سے مایوس ہو، اپنے گرد و پیش کی مشکلات سے شکستہ خاطر ہو، دنیا کے ہر حادثہ سے ڈر کر، ہر مصیبت سے سہم کر، ہر انقلاب سے خوف کھا کر، عدم کی گود میں پناہ لے رہا ہو، اس بزدل، پست ہمت اور بیچارہ مغموم انسان سے کب یہ امید کیجا سکتی ہے، کہ وہ ذمہ داریوں کے اس بھاری بوجھ کو اٹھائیگا، وہ

وہ خواہ مخواہ اپنی جان کو جہاد و قتال اور سیاست و فرماں روائی کی مصیبت میں مبتلا کریگا؟ اس نے تو پہلے ہی دنیا کے بکھیڑے کو چھوڑ کر موت اور دائمی موت کو اپنی زندگی کا منتہائے نظر بنا لیا ہے، پھر اُسے کیا پڑی ہے کہ شمشیر بکف ہو کر میدان عمل میں نکلے، اور اس دنیا کے انتظام میں اپنا وقت ضائع کرے جس کی زندگی کو وہ بیکار، اور جس کے سارے کارخانہ کو بے معنی و بے نتیجہ سمجھتا ہے؟

پس بودھ مذہب جو اہنسا کا قائل ہے تو اس کی وجہ یہ نہیں ہے کہ وہ دنیا اور اس کے معاملات کی ذمہ داریوں کو قبول کرتا ہے اور اس کے باوجود جنگ و خوں ریزی کو غیر ضروری سمجھتا ہے، بلکہ دراصل اس کی وجہ یہ ہے کہ اس دنیا اور اس کے معاملات سے کوئی سروکار ہی نہیں ہے، اس لئے قدرتی طور پر اس کو جنگ و پیکار سے بھی اجتناب ہے، اس نے اہنسا کو اس لئے اختیار کیا ہے کہ ترکِ دنیا اور رہبانیت کی زندگی میں تلوار کا کوئی کام نہیں ہے، اور اس نصب العین تک پہونچنے میں اس سے کسی قسم کی مدد نہیں ملتی جو ایک بودھ سنیاسی کا منتہائے نظر ہے،

پیروانِ بودھ کی زندگی پر اہنسا کا اثر، بودھ مذہب کی اس تعلیم کا نتیجہ یہ ہے کہ وہ دنیا میں کوئی طاقتور تہذیب قائم نہ کر سکا، اس میں اتنی قوت کبھی پیدا نہیں ہوئی کہ کسی تہذیب کو شکست دیکر اپنا اثر قائم کر دے جن جن ملکوں میں وہ پہونچا ان کی اخلاقی زندگی میں ایک منفی تغیر پیدا کرنے میں تو اسے ضرور کامیابی ہوئی، مگر ان کے طرزِ سیاست اور ان کے نظامِ تمدن کو بدل کر ایک بہتر نظام قائم کرنے میں نہ وہ کامیاب ہو سکا اور نہ اس کی اس نے کوشش کی، بلا شبہہ اس کو دنیا میں بہت اشاعت نصیب ہوئی، شرقِ اوسط اور شرقِ اقصیٰ میں اس کو جتنا عروج حاصل ہوا، کسی اور کو نہ ہو سکا، انسانی آبادی نے اس کو اتنی کثرت سے قبول کیا کہ آج بھی اس کے پیروؤں کی تعداد دنیا کے ہر مذہب سے بڑھی ہوئی ہے، لیکن تاریخ میں اس قسم کی ایک مثال بھی نہیں ملتی کہ بودھ مذہب کے اثر سے کسی قوم کی زندگی میں کوئی بڑا انقلاب ہوا ہو، یا اس نے دنیا میں کوئی عظیم الشان کارنامہ انجام دیا ہو، بخلاف اس کے ہم دیکھتے ہیں کہ جہاں کہیں اس کا مقابلہ کسی طاقتور تہذیب سے ہوا، اس کو سخت شکست اٹھانی پڑی، ہندوستان جو اس کی جنم بھومی ہے ایک عرصہ تک اس کا حلقہ بگوش رہا،

لہ بودھ مذہب نے ترکِ دنیا کی جو تعلیم دی ہے اس پر یہاں تبصرہ نہیں کیا گیا، چونکہ آگے چل کر مسیحت کے باب میں ہم کو یہی بحث کرنی ہے، اس لئے یہاں اسے چھوڑ دیا گیا ہے،

پہلی صدی عیسوی میں تقریباً سارا ملک اس کا پیرو تھا تیسری صدی میں بھی تین چوتھائی سے زیادہ
آبادی بودھ مذہب رکھتی تھی، چوتھی صدی میں جب فاہیان ہندوستان آیا ہے تو اس وقت بھی
یہاں اس مذہب کا بول بالا تھا، لیکن اس کے بعد جب برہمنی مذہب نے کروٹ بدلی تو اس کو تین
صدی کے اندر اندر اس کے لئے میدان خالی کر دینا پڑا اور اس ملک سے اس کا نام ایسا مٹ گیا
کہ آج ۳۴ کروڑ کی آبادی میں مشکل سے تین لاکھ بودھ ملتے ہیں[1] اسی طرح افغانستان میں اشوک
کے اثر سے بودھ مذہب کو کافی اشاعت نصیب ہوئی اور دوسری صدی عیسوی میں تو خود کابل کا
بادشاہ مینانڈر (یا ملندا) بودھ مذہب کا پیرو ہو گیا تھا[2] مگر جب اسلام کی طاقتور تہذیب سے اس کا
مقابلہ ہوا تو وہ ایک لمحہ کے لئے بھی نہ ٹھہر سکا، چین میں اس کو جو کچھ ثبات نصیب ہوا وہ صرف
تاؤازم (Taoism) کی مساعدت کا نتیجہ تھا اور کنفیوشس کے مذہب نے تو اس کا خاتمہ
ہی کر دیا تھا[3] جاپان میں بھی شنٹو مذہب سے بہت جھگڑے رہے کہ اسے مصالحت کرنی پڑی حتی کہ اس کے
مقابلہ میں اپنی ہستی کو برقرار رکھنے کے لئے اپنے بنیادی عقائد بھی بدل دینے پڑے[4] باقی رہے دوسرے
ممالک مثلاً سیلون، برما، تبت وغیرہ تو وہاں کوئی ایسی طاقتور تہذیب ہی نہ تھی جو اس کی مزاحمت
کرتی، اس لئے وہ آسانی سے ان پر چھا گیا لیکن تاریخ شاہد ہے کہ اس نے کسی زمانہ میں بھی ان ملکوں
میں تہذیب و تمدن کی روح نہیں پھونکی جس طرح پہلے وہ سب جاہل اور غیر متمدن تھے اسی طرح
اس کے عہد میں بھی رہے۔

[illegible]
...رتے ہوئے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ برہمنی مذہب کے پیرو [illegible]
[illegible]
...ت کی کمی پر دلالت کرتا ہے، لیکن [illegible]
یہ مذہب معنوی قوت کے اعتبار سے [illegible]

[illegible] 225 ؎۲
[illegible] Religion 83 ؎۳
[illegible] Religion ... 91 ؎۴

علاوہ ازیں یہ ایک ناقابلِ انکار حقیقت ہے کہ بودھ مذہب نے کسی جگہ حکومت کا مقابلہ کرنے اور سوسائٹی کے بگڑے ہوئے نظام کو درست کرنے کی جرأت نہیں کی، بودھ کے دستور العمل میں سیاست کو ذرہ برابر دخل نہیں ہے۔ اس نے حکومت میں حصہ لینے یا اس کو بدلنے کے بجائے ہر حال میں اس کی اطاعت کرنے کا حکم دیا ہے عام اس سے کہ وہ جابر و ظالم ہو یا عادل و منصف[1]، اسی پر بس نہیں بلکہ اس نے شیطانی قوت کے مقابلہ میں عجز و انکسار، اور ظلم کے مقابلہ میں مجبورانہ برداشت کی ایسی تعلیم دی ہے کہ اس کا کوئی پیرو سخت سے سخت مظالم پر بھی اف نہیں کرسکتا، اس کا یہ قول ہے کہ انسان پر اس زندگی میں جتنے مصائب نازل ہوتے ہیں سب ان گناہوں کا نتیجہ ہیں جو اس نے اپنی پہلی زندگی میں کیے تھے، لہذا جب کسی شخص پر کوئی دشمن ظلم کرے تو اسے یہ سمجھنا چاہئے کہ یہ ظالم قصوروار نہیں ہے، بلکہ میں خود قصوروار ہوں، میں نے گذشتہ جنم میں کوئی ایسا ہی گناہ کیا ہوگا جس کی یہ سزا مجھکو مل رہی ہے[2]، یہ مذہبی عقیدہ بودھ کے پیرووں میں غیرت و انتقام کے جذبات کو ٹھنڈا کرکے ایک ایسی انفعالی کیفیت پیدا کردیتا ہے کہ وہ خوشی خوشی ساتھ ہر تذلیل و توہین اور ظلم و جور کو برداشت کرلیتے ہیں،

ظاہر ہے کہ ایک جابر حکومت کے لئے اس سے زیادہ مرغوب چیز اور کوئی نہیں ہوسکتی، ایسا مذہب اس کے لئے خطرہ ہونے کے بجائے مزید استحکام کا موجب ہوتا ہے، جو رعایا اس قسم کے عقائد پر ایمان رکھتی ہو اسے اطمینان کے ساتھ ہر قسم کے ظالمانہ قوانین اور جابرانہ احکام کا تابع بنایا جاسکتا ہے، اس کو ہر طرح ٹیکسوں اور رشوتوں کے ذریعہ لوٹا جاسکتا ہے، اس کی جان و مال اور عزت و آبرو پر ہر قسم کے حملے کیے جاسکتے ہیں، اور اسے ظالم حکمرانوں کی شیطانی خواہشات کے لئے ہر طرح استعمال کیا جاسکتا ہے، یہی وجہ ہے کہ بودھ مذہب کو حکومتوں سے بہت کم مقابلہ کی نوبت پیش آئی ہے، بلکہ اکثر ملکوں میں حکومتوں نے اس کی مزاحمت کرنے کے بجائے سرگرمی کے ساتھ تائید و حمایت کی ہے، بودھ کی دعوت شروع ہوتے ہی مگدھ کے راجہ بمبسار نے اس کو ہاتھوں ہاتھ لیا، اور اس کے مذہب کی حمایت میں ایک فرمان شائع کیا[3]، اس کے بعد اس کا بیٹا اجات سترو بھی بودھ کا معتقد اور اس کے مذہب کا سرگرم حامی رہا، کوسالا کے راجہ پسنادی

---

[1] Vinaya Texts Part 1. P 301

[2] Budha and his Religion PP. 150 - 51

[3] Vinaya Texts Part 1. PP 136-197

... کی وقت ... نے خود اس کو اپنے ملک میں آنے کی دعوت دی اس نے مذہب کو قبول کیا ... اس سے
تعلقات بڑھانے کے لئے[1] تیسا کی رانی کی ایک لڑکی سے شادی کرلی[2] اس کے علاوہ روایات سے معلوم
ہوتا ہے کہ سوراسینا اس کا راجہ اونتی پتر اور ایک دوسرا راجہ اونتیا بھی بودھ کا مرید اور اس کا موید
تھا[3] اس دور سے گذر کر تیسری صدی قبل مسیح میں ہم دیکھتے ہیں کہ اشوک نے اس مذہب کی سرپرستی
کی اور اپنے تمام شاہانہ وسائل استعمال کرکے نہ صرف اطراف واکناف ہند میں بلکہ دور دور کے
ممالک میں بھی پھیلادیا پھر پہلی صدی عیسوی میں کنشک نے اس مذہب کی سرگرمی کے ساتھ حمایت کی
اس کے بعد تیسری صدی عیسوی میں ورنا جیت اول نے خود برہمنی مذہب رکھتے ہوئے باوجود بودھ مت
کی سرپرستی کی اور اس کو تقویت پہونچائی ساتویں صدی میں پھر ایک طاقتور راجہ ہرش کی حمایت
اس کو حاصل ہوئی اور اس نے اتنے زور کے ساتھ اس کی حمایت کی کہ برہمنی مذہب کے پیشوا اس کے
قتل کی سازشیں کرنے لگے[4] ہندوستان سے باہر تبت اور منگولیا میں قبلائی خان نے اس مذہب
کی اشاعت میں اپنی ساری قوت صرف کردی کیونکہ وہ اس کے وجود سے اپنی مملکت کے لئے اس کو
مفید سمجھتا تھا[5] چین میں شاہ منگ تی نے خود اس کے مبلغوں کو دعوت دی اور بڑی عزت سے [illegible] معتقد
ہوگیا[6] اس کے بعد بھی اکثر بادشاہ اس کی تائید و حمایت کرتے رہے یہی حال دوسرے ممالک[7] کا بھی ہے
جنکا حال تاریخ کا تتبع کرنے سے اچھی طرح معلوم ہوسکتا ہے

پس بودھ مذہب کو دنیا میں جو اشاعت نصیب ہوئی اور صدیوں کے پیہم صدمات کے
باوجود وہ اکثر ممالک میں زندہ رہا اس کی وجہ یہ نہیں ہے کہ وہ کوئی طاقتور مذہب تھا یا اس کی قوت
حیات مضبوط تھی بلکہ اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ وہ بادشاہوں اور والیوں کے آگے ہمیشہ سر جھکاتا رہا
اس نے ظلم کے مقابلہ کی کبھی جرات نہیں کی اور انسانیت کو سرکش حکمرانوں کے تشدد سے نجات
دلانا کیا معنی اس کا خیال تک نہیں کیا اس لئے حکومت نے ہمیشہ اس کی تائید کی اور اس کے ذریعہ

---

[1] [illegible] [2] Buddhist India ص [illegible] [3] ایضاً ص [illegible]

[4] Smith Early History of India ص [illegible]

[5] Buddhism as a Religion ص [illegible]

[6] ایضاً ص [illegible]

کو اپنے غلبہ و قہر کے لئے مفید سمجھا،

اس مختصر تبصرہ سے معلوم ہو سکتا ہے، کہ جنگ کے معاملہ میں اسلام اور بودھ مذہب کے درمیان کس قسم کا اختلاف ہے، اسلام کے نزدیک دنیا میں انسان ایک بہت بڑے مقصد کے لئے پیدا کیا گیا ہے، اور اس کی نجات کا راز اسی دنیا کو بہترین اسلوب سے برتنے میں مضمر ہے، اس لئے وہ انسان کو ہر اس طریق عمل کے اختیار کرنے کا حکم دیتا ہے جو اس کی اور اس کے ابنائے نوع کی اخلاق و مادی فلاح اور دنیوی زندگی کے بہترین انتظام کے لئے ضروری و مفید ہے، بخلاف اس کے بودھ مذہب کی نظر میں انسان کی زندگی کا کوئی مقصد نہیں ہے، اور اس کی نجات بس اسی میں ہے، کہ اس دنیا اور اس کے تمام تعلقات حتیٰ کہ خود اپنی ذات سے بھی کنارہ کش ہو جائے اس لئے وہ اس کو کسی ایسی عملی کوشش یا ذہنی دلچسپی کی اجازت نہیں دیتا جس کی بدولت دنیا کی کسی چیز سے اس کا ربطہ تعلق قایم رہتا ہو، اب عقل سلیم خود فیصلہ کر سکتی ہے کہ آیا اسلام کا جہاد انسانیت کے لئے زیادہ مفید ہے یا بودھ مذہب کی اہنسا؟

مسیحیت

دوسرا مذہب جو جنگ کے مسئلہ میں اسلام سے اصولی اختلاف رکھتا ہے، مسیحی مذہب ہے یہودی مذہب کی طرح اس کے متعلق بھی ہماری معلومات کا واحد ذریعہ ایک ہی کتاب ہے، جس کو تمام مسیحی دنیا اپنے مذہب کی بنیادی کتاب تسلیم کرتی ہے، اور وہ انجیل ہے، لیکن قبل اس کے کہ ہم اصل مسئلہ کے متعلق اس سے استفتا کریں یہ ظاہر کر دینا ضروری ہے کہ آج وہ جس صورت میں موجود ہے اس سے صرف موجودہ مسیحیت کے معتقدات ہم کو معلوم ہو سکتے ہیں، ورنہ یہ سوال کہ فی الاصل حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی تعلیم کیا تھی، اس سے حل نہیں ہوتا، چونکہ آیندہ مباحث کو سمجھنے کے لئے اس مقدمہ کو ذہن نشین کر لینا ضروری ہے، اس لئے آگے بڑھنے سے پہلے انجیلی صحائف کی تاریخی حیثیت پر ایک نظر ڈال لیجئے،

ماخذ کی تحقیق آج ہم جس مجموعہ کو انجیل کہتے ہیں وہ دراصل چار بڑے صحیفوں پر مشتمل ہے متی، مرقس، لوقا، یوحنا، لیکن ان میں سے کوئی صحیفہ حضرت عیسیٰ کا نہیں ہے، جس طرح قرآن مجید میں وہ تمام منزل من اللہ آیات و سور جمع ہیں جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل ہوئی تھیں، مگر

کی کتاب ہیں وہ [illegible] حضرت عیسیٰ علیہ السلام [illegible]
مواعظ ونصائح بھی ہمکو خود حضرت عیسیٰؑ کے اپنے الفاظ میں کہیں نہیں ملتے جو انھوں نے اپنی پیغمبرانہ
زندگی کے زمانہ میں مختلف مواقع پر ارشاد فرمائے تھے، یہ صحیفے جو ہم تک پہونچے ہیں نہ خدا کا کلام ہیں
نہ حضرت عیسیٰؑ کا، بلکہ وہ دراصل حضرت عیسیٰؑ کے حواریوں بلکہ حواریوں کے بھی شاگردوں کی لکھی ہوئی
کتابیں ہیں جنہیں ان لوگوں نے اپنے اپنے علم وفہم کے مطابق ان کے حالات اور ان کی تعلیمات کو
جمع کیا ہے،

لیکن یہ کتابیں خود اس قدر مجہول الاصل ہیں کہ ان پر کوئی اعتماد نہیں کیا جا سکتا، پہلی کتاب
مسیح کے حواری متی کی طرف منسوب ہے، اور یہ تاریخ سے ثابت ہے کہ وہ متی کی لکھی ہوئی نہیں ہے،
متی کی اصل کتاب جس کا نام لوجیا (Logia) تھا مفقود ہے، اور جو کتاب اس کی طرف
منسوب کیجاتی ہے اس کا مصنف کوئی گمنام شخص ہے جس نے دوسری کتابوں کے ساتھ لوجیا سے
بھی استفادہ کیا تھا، خود متی کا ذکر اس میں اس طرح کیا گیا ہے، جیسے کسی غیر آدمی کا کیا جاتا ہے[1]
اس کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ زیادہ تر مرقس کی انجیل سے ماخوذ ہے، [illegible]
میں سے [illegible] بعینہ وہی ہیں جو مرقس کی انجیل میں آئی ہیں، حالانکہ اگر اس کا مصنف متی حواری ہوتا تو
اس کو ایک ایسے شخص کی کتاب سے استفادہ کرنے کی ضرورت نہ تھی جو نہ حواری تھا اور نہ حضرت
عیسیٰؑ سے کبھی ملا تھا، بعض علما کا خیال ہے کہ یہ کتاب [illegible] میں لکھی گئی، [illegible] بعد لکھی گئی ہے اور
بعض کا خیال ہے کہ [illegible] کی تصنیف ہے۔

دوسری کتاب مرقس کی طرف منسوب ہے، اور عموماً تسلیم کیا جاتا ہے کہ مرقس خود ہی اس کا
مصنف ہے لیکن یہ ثابت ہے کہ وہ حضرت عیسیٰؑ سے کبھی نہیں ملا، اور نہ ان کا حواری ہوا، وہ دراصل

[1] متی باب ۹ آیت ۹ میں عبارت یہ ہے:

یسوع نے وہاں سے آگے بڑھ کر متی نام ایک شخص کو محصول کی چوکی پر بیٹھے دیکھا،

ظاہر ہے کہ مصنف خود اپنا تذکرہ اس طرح نہیں کر سکتا تھا،

[2] بعض لوگوں کا خیال ہے کہ حضرت عیسیٰؑ کو صلیب پر چڑھائے جانے کے وقت وہ [illegible] کی حیثیت سے [illegible] موجود تھا، مگر اس کا
بھی کوئی ثبوت نہیں ہے،

پطرس حواری (St. Peter) کا مرید تھا، وہ جو کچھ ان سے سنتا تھا اسے یونانی زبان میں لکھ لیا کرتا تھا، اسی وجہ سے عیسائی مصنفین اس کو عموماً "پطرس کا ترجمان" کہا کرتے ہیں، خیال کیا جاتا ہے کہ یہ کتاب سنہ [illegible] اور سنہ [illegible] کے درمیان کسی زمانہ میں لکھی گئی ہے،

تیسری کتاب لوقا کی طرف منسوب ہے، اور یہ بالکل مسلم ہے کہ لوقا نے کبھی مسیح کو نہیں دیکھا اور نہ ان سے استفادہ کیا، وہ پولوس (St. Paul) کا مرید تھا، ہمیشہ اسی کی صحبت میں رہا، اور اس نے اپنی انجیل میں اسی کے خیالات کی ترجمانی کی چنانچہ خود پولوس اس کی انجیل کو اپنی انجیل کہتا ہے، لیکن یہ ثابت ہے کہ سینٹ پال خود بھی مسیح کی صحبت سے محروم تھا، اور مسیحی روایات کے مطابق واقعہ صلیب کے [illegible] برس بعد اس مذہب میں داخل ہوا تھا، اس لئے لوقا اور مسیح کے درمیان سلسلۂ روایت کی ایک کڑی بالکل غائب ہے، انجیل لوقا کی تاریخ تحریر بھی متعین نہیں ہے، بعض اس کو سنہ [illegible] کی تصنیف بتاتے ہیں، اور بعض سنہ [illegible] کی، مگر ہارنک، میگگفرٹ اور بلوم جیسے محققین کی رائے یہ ہے کہ وہ سنہ [illegible] سے پہلے نہیں لکھی گئی،

چوتھی کتاب جو یوحنا کی انجیل کہلاتی ہے جدید تحقیقات کے مطابق مشہور یوحنا حواری کی لکھی ہوئی نہیں ہے، بلکہ کسی اور مجہول الاحوال شخص کی ہے، جس کا نام یوحنا تھا، یہ کتاب مسیح سے بہت بعد سنہ ۹۰ء میں یا اس کے بھی بعد لکھی گئی ہے، اور ہارنک اس مدت کو سنہ ۱۱۰ء تک بڑھا دیتا ہے،

ظاہر ہے کہ ان کتابوں میں سے کسی ایک کا سلسلہ بھی مسیح تک نہیں پہونچتا، اور ان کی سند کے وثوق کے ساتھ یہ نہیں کہا جا سکتا کہ مسیح نے کیا کہا تھا، اور کیا نہیں کہا تھا، لیکن زیادہ عمیق تحقیقات سے ان کتابوں کی دستاویزی حیثیت اور بھی زیادہ مشکوک ہو جاتی ہے،

اولاً چاروں انجیلوں کے بیانات میں اختلاف ہے حتیٰ کہ پہاڑی کے وعظ کو بھی، جو مسیحی تعلیم کا اصل الاصول ہے، متی، مرقس، اور لوقا تینوں نے مختلف اور متضاد طریقوں سے بیان کیا ہے،

ثانیاً، چاروں انجیلوں میں ان کے مصنفین کے خیالات و تاثرات صاف طور پر نمایاں

میں متی کے مخاطب یہودی معلوم ہوتے ہیں اور وہ ان پر اتمام حجت کرتا نظر آتا ہے، مرقس کے مخاطب [illegible]
ہیں اور وہ ان کو اسرائیلیات سے روشناس کرانا چاہتا ہے، لوقا سینٹ پال کا وکیل ہے اور دوسرے
حواریوں کے خلاف اس کے دعاوی کی تائید کر رہا ہے، یوحنا ان فلسفیانہ خیالات سے متاثر نظر آتا ہے جو
پہلی صدی عیسوی کے اواخر میں مسیحیوں کے درمیان پھیل گئے تھے۔ اس طرح ان چاروں انجیلوں کے
درمیان معنوی اختلافات لفظی اختلاف سے بھی زیادہ ہو گیا ہے۔

ثالثاً، اناجیل سب کی سب یونانی زبان میں لکھی گئی ہیں حالانکہ حضرت عیسیٰؑ اور ان کے تمام
حواریوں کی زبان عبرانی تھی۔ زبان کے اختلاف سے خیالات کی تعبیر میں اختلاف ہو جانا
قدرتی بات ہے۔

رابعاً، اناجیل کو ضبطِ تحریر میں لانے کی کوئی کوشش دوسری صدی عیسوی سے پہلے نہیں
کی گئی۔ ۱۵۰ء تک عام خیال یہ تھا کہ زبانی روایت تحریر سے زیادہ مفید ہے۔ دوسری صدی کے ختم
میں لکھنے کا خیال پیدا ہوا، لیکن اس زمانہ کی تحریروں کو مستند نہیں سمجھا جاتا۔ عہد جدید (New
Testament) کا پہلا مستند متن قرطاجنہ کی کونسل میں منظور کیا گیا جو ۳۹۷ء میں
منعقد ہوئی تھی۔

خامساً، اناجیل کا قدیم ترین نسخہ جو اس وقت دنیا میں موجود ہے، چوتھی صدی عیسوی کے
وسط کا ہے۔ دوسرا نسخہ پانچویں صدی کا ہے، اور تیسرا ناقص نسخہ بھی جو پاپائے روم کے کتب خانہ میں
ہے، چوتھی صدی عیسوی سے زیادہ قدیم نہیں ہے۔ پس یہ کہنا مشکل ہے کہ پہلی تین صدیوں میں
جو انجیلیں رائج تھیں ان سے موجودہ اناجیل کس حد تک مطابقت رکھتی ہیں۔

سادساً، اناجیل کو قرآن کی طرح حفظ کرنے کی بھی کوشش نہیں کی گئی۔ ان کی اشاعت
کا انحصار ابتداءً روایت بالمعنی پر رہا جس میں حافظہ کی خطا اور راویوں کے ذاتی خیالات کا
اثر آنا قدرتی امر ہے۔ بعد میں جب کتابت کا سلسلہ شروع ہوا تو وہ نقل نویسوں کے رحم پر تھیں۔ نقل
کرتے وقت ہر شخص کے لئے آسان تھا کہ جس چیز کو اپنے عقائد کے خلاف دیکھے حذف کر دے
اور جس کی کمی پائے بڑھا دے۔

ٹ ؎ پوری عبارت [illegible]

یہ وجوہ ہیں جن کی بنا پر ہم وثوق کے ساتھ یہ نہیں کہہ سکتے کہ اناجیل اربعہ میں ہمکو اصلی مسیحیت کی تعلیم ملتی ہے پس آیندہ صفحات میں مسیحیت کے متعلق جو کچھ کہا جائیگا، وہ اس مسیحیت کے متعلق ہوگا جس کی تعلیم مسیح علیہ السلام نے دی تھی، بلکہ اس مسیحیت کے متعلق ہوگا جس پر آج کل کی مسیحی دنیا اعتقاد رکھتی ہے۔

"محبت کی تعلیم" انجیل کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ مسیحیت جنگ کی سخت مخالف ہے، عام اس سے کہ جنگ حق کے لئے ہو یا غیر حق کے لئے، مسیح کے نزدیک مذہب کا سب سے بڑا حکم یہ ہے کہ "خدا سے محبت رکھنے کے بعد اپنے پڑوسی سے محبت رکھو" (متی ۲۲ : ۳۹) اور اس محبت کے ساتھ یہ بھی لازم ہے کہ "تو اپنے بھائی پر غصہ نہ کر" (متی ۵ : ۲۲) لیکن وہ صرف محبت کرنے اور غصہ نہ کرنے ہی پر بس نہیں کرتے، بلکہ صاف الفاظ میں ایک سچے مسیحی کو ہدایت کرتے ہیں کہ وہ ظلم اور شرارت کے مقابلہ میں سر جھکا دے، اور دوسروں کی حفاظت کرنا تو درکنار خود اپنے حق کی حفاظت بھی نہ کرے، ان کی تعلیم کا کل سرمایہ پہاڑی کا وعظ ہے، جس پر مسیحی اخلاق کی بنیاد قایم ہے، اسمیں وہ فرماتے ہیں:-

"تم سن چکے ہو کہ کہا گیا تھا کہ آنکھ کے بدلے آنکھ اور دانت کے بدلے دانت لیکن میں تم سے کہتا ہوں کہ تم شریر کا مقابلہ نہ کرو، بلکہ جو کوئی تیرے دہنے گال پر طمانچہ مارے تو دوسرا بھی اس کی طرف پھیر دے، اور کوئی تجھ پر نالش کرکے تیرا کرتہ لینا چاہے تو چوغہ بھی اسے لینے دے، اور جو کوئی تجھے ایک کوس بیگار میں لیجائے تو اس کیساتھ دو کوس چلا جا ...... تم سن چکے ہو کہ کہا گیا تھا کہ اپنے پڑوسی سے محبت رکھو اور اپنے دشمن سے عداوت، مگر میں کہتا ہوں کہ اپنے دشمن سے محبت رکھو، جو تم پر لعنت کریں، ان کے لئے برکت چاہو، جو تم سے نفرت کریں ان سے اچھا سلوک کرو، جو تمھیں [illegible] کریں، اور تمھیں ستائیں [illegible] دعا مانگو۔" (متی ۵ : ۳۸-۴۴)

[illegible] تم [illegible] کہتا ہوں کہ اپنے دشمن سے محبت رکھو، جو تم سے عداوت

(حاشیہ صفحہ قبل)
Dummelow's Commentary on The Holy Bible.
Encyclopaedia Biblica, by T. K. Cheyne.
Millman's History of Christianity.

[illegible] برکت چاہو [illegible] جو تمہاری بے عزتی
کریں ان کے لئے دعا مانگو۔ جو تیرے ایک گال پر طمانچہ مارے اس کے سامنے دوسرا بھی
پھیر دے۔ جو تیرا چوغہ لے اس کو کرتہ لینے سے بھی منع نہ کر۔ جو کوئی تجھ سے مانگے اسے دے
اور جو تیرا مال لے لے اس سے طلب نہ کر۔ جیسا تم اوروں سے برتاؤ چاہتے ہو تم
بھی ان کے ساتھ ویسا ہی کرو۔ اگر تم اپنے محبت رکھنے والوں ہی سے محبت رکھو تو
تمہارا کیا احسان ہے؟ کیونکہ گنہگار بھی اپنے محبت رکھنے والوں سے محبت
رکھتے ہیں۔" (لوقا ۶: ۲۷-۳۳)

یہ تعلیم مسیحیت کی اصل الاصول ہے اور اس کا منشا خود اس کے الفاظ سے ظاہر ہے، مگر کا
[illegible] مطلب یہ ہے کہ ایک سچے مسیحی کو [illegible] اپنے دشمن [illegible] چاہتا ہو
اور [illegible]
قوت [illegible]
ہو جانا چاہئے۔
مسیحیت کا فلسفہ اخلاق [illegible]
[illegible]

تک پہنچنے کے لئے انسانی جماعت کو طیار کرنا ہے،

لیکن آسمانی بادشاہت "مسیحیت کی نگاہ میں زمین کی بادشاہت کی ارتقائی صورت کا نام نہیں ہے، وہ ان دونوں کے درمیان بیج اور پھل کا تعلق تسلیم نہیں کرتی، بلکہ ان دونوں میں تضاد اور کلی اختلاف کی قائل ہے، اس کے نزدیک دنیوی بادشاہت اور آسمانی بادشاہت دو الگ الگ چیزیں ہیں اور دونوں بالکل اسی طرح باہم نہیں ہو سکتیں جس طرح آگ اور پانی باہم نہیں ہو سکتے۔ ان دونوں چیزوں کو ایک دوسرے کی ضد سمجھنے کا قدرتی نتیجہ یہ ہے کہ وہ آسمانی بادشاہت حاصل کرنے کا راستہ بھی، زمین کی بادشاہت کے راستہ سے بالکل الگ اختیار کرتی ہے، ہر وہ چیز جو زمین کی بادشاہت کے ساز و سامان میں داخل ہے، آسمانی بادشاہت کے ساز و سامان سے خارج ہے، اور صرف خارج ہی نہیں بلکہ اس کا وجود انسان کو آسمانی بادشاہت میں داخل ہونے سے روکنے والا ہے، اسی لئے مسیحیت قدم قدم پر انسان کو تاکید کرتی ہے، کہ اگر وہ آسمانی بادشاہت میں داخل ہونا چاہتا ہے تو زمین کی بادشاہت کے سر و سامان سے کلی اجتناب کرے، اور اگر اس سے اجتناب نہیں کر سکتا تو آسمانی بادشاہت کی امید نہ رکھے، اسی اصل پر وہ انسانی زندگی کے تمام شعبوں میں رہبانیت کی تعلیم دیتی ہے، اور تمدن و تہذیب سے الگ کر کے انسان کو کلیتہً تارک الدنیا بنا دینا چاہتی ہے، اس کی توضیح کے لئے مسیح ؑ کے چند احکام نقل کر دینا کافی ہے:۔

"اگر کوئی میرے پاس آئے اور اپنے باپ اور ماں اور بیوی اور اولاد اور بھائیوں اور بہنوں بلکہ اپنی جان سے بھی نفرت نہ رکھے تو وہ میرا شاگرد نہیں ہو سکتا،" (لوقا ۱۴: ۲۶)

"کیا تم گمان کرتے ہو کہ میں زمین پر صلح کرانے آیا ہوں؟ میں تم سے کہتا ہوں کہ نہیں، بلکہ تفریق کرانے، کیونکہ اب سے ایک گھر کے پانچ آدمی آپس میں مخالفت رکھیں گے، تین دو کے خلاف اور دو تین کے خلاف، باپ بیٹے سے مخالفت رکھے گا، اور بیٹا باپ سے، ماں بیٹی سے اور بیٹی ماں سے، ساس بہو سے اور بہو ساس سے،" (لوقا ۱۲: ۵۱ - ۵۳)

"تم نے مفت پایا مفت دیدو۔ نہ سونا اپنے کیسہ میں رکھو نہ چاندی۔ نہ پیسے۔ اپنے سفر کے لئے نہ جھولی لو، نہ دو دو کرتے، نہ جوتیاں اور نہ لاٹھی۔" (متی ۱۰: ۸-۱۰)

"اے چھوٹے گلے نہ ڈر! کیونکہ تمہارے باپ کو پسند آیا کہ تمہیں بادشاہت دے۔ اپنا مال اسباب بیچ کر خیرات کر دو۔ اور اپنے لئے ایسے بٹوے بناؤ جو پرانے نہیں ہوتے یعنی آسمان پر ایسا خزانہ جو خالی نہیں ہوتا۔" (لوقا ۱۲: ۳۲-۳۳)

"اگر تو کامل ہونا چاہتا ہے تو جا اپنا مال اسباب بیچ کر غریبوں کو دیدے اور میرے پیچھے ہو لے، تجھے آسمان پر خزانہ ملے گا۔"[1] (متی ۱۹: ۲۱)

"میں تم سے سچ کہتا ہوں کہ دولت مند کا آسمان کی بادشاہت میں داخل ہونا مشکل ہے۔ اور پھر تم سے کہتا ہوں کہ اونٹ کا سوئی کے ناکے سے نکل جانا آسان ہے بہ نسبت اس کے کہ دولتمند خدا کی بادشاہت میں داخل ہو" (متی ۱۹: ۲۳-۲۴)

"اپنے لئے زمین میں مال نہ جمع کرو جہاں کیڑا اور زنگ خراب کرتا ہے ... ... بلکہ آسمان پر جمع کرو۔" (متی ۶: ۱۹)

"اگر تم آدمیوں کے قصور معاف کرو گے تو تمہارا آسمانی باپ بھی تمہیں معاف کریگا۔ اور اگر تم آدمیوں کے قصور معاف نہ کرو گے تو تمہارا باپ بھی تمہیں معاف نہ کریگا۔" (لوقا ۶: ۱۴-۱۵)

"میں تم سے کہتا ہوں کہ نہ اپنی جان کی فکر کرو کہ ہم کیا کھائیں گے یا کیا پئیں گے، نہ اپنے بدن کے لئے کہ کیا پہنیں گے، کیا جان خوراک سے اور بدن پوشاک سے بہتر نہیں؟ ہوا کے پرندوں کو دیکھو کہ نہ بوتے ہیں نہ کاٹتے ہیں نہ کوٹھیوں میں جمع کرتے ہیں پھر بھی تمہارا آسمانی باپ ان کو کھلاتا ہے۔ کیا

[1] [illegible] جھوٹ سے پرہیز کرتا تھا، اپنے ماں باپ کی خدمت کرتا تھا، وہ اپنے پڑوسی سے اپنے مانند محبت رکھتا تھا۔ یسوع نے اس سے کہا کہ تو کامل اس وقت ہوگا جب اپنا سارا مال اسباب بیچ کر خیرات کر دیگا۔

تم ان سے زیادہ قدر نہیں رکھتے؟ تم میں ایسا کون ہے؟ فکر کرکے اپنی عمر میں ایک گھڑی بھی بڑھا سکے؟ اور تم لباس کے لئے کیوں فکر کرتے ہو؟ جنگلی سوسن کے درختوں کو دیکھو کہ وہ کیسے بڑھتے ہیں۔ نہ محنت کرتے ہیں، نہ کاتتے ہیں، پھر بھی میں تم سے کہتا ہوں کہ سلیمانؑ بھی اپنی ساری شان و شوکت کے باوجود ان میں سے کسی کے مانند پوشاک پہنے ہوئے نہ تھا۔ پس جب خدا میدان کی گھاس کو جو آج ہے اور کل تنور میں جھونکی جائیگی، ایسی پوشاک پہناتا ہے تو اے کم اعتقادو! تم کو ضروری پہنا دیگا۔ اس لئے فکرمند ہو کر یہ نہ کہو کہ ہم کیا کھائیں گے؟ کیا پئیں گے؟" (متی ۶: ۲۵-۳۱)

ان اقوال سے صاف ظاہر ہے کہ آسمانی بادشاہت کی طرف لیجانے کے لئے مسیح کی تعلیم جس ڈھنگ پر انسانی جماعت کی تربیت کرنا چاہتی ہے، وہ تمدن اور تہذیب سے کامل انقطاع پر مبنی ہے۔ ہر شخص جانتا ہے کہ خاندانی تعلقات تمدنی زندگی کی بنیاد ہیں، جماعت سے انسان کا ابتدائی تعلق اپنے رشتہ داروں ہی کے واسطہ سے ہوتا ہے، انھیں کے باہمی روابط سے ہیئت اجتماعیہ کی تشکیل ہوتی ہے، اور درحقیقت انسان کے لئے اخلاق کی بہترین درس گاہ بھی یہی ہے، مگر مسیح کے تیشہ کا پہلا وار اسی اصل الاصول پر پڑتا ہے، اور وہ سب سے پہلے اس رشتہ کو کاٹ دیتا ہے، جو آدمی کو سوسائٹی سے منسلک کئے ہوئے ہے، دنیا کو برتنے اور اس کے معاملات میں حصہ لینے کے لئے سب سے پہلے جو شے انسان کو عمل پر مجبور کرتی ہے، وہ پیٹ بھرنے اور تن ڈھانکنے کی فکر ہے، لیکن مسیح اس ابتدائی محرک ہی کو معطل کر دینا چاہتے ہیں، تاکہ آدمی دنیا میں ویسی ہی بے عمل زندگی بسر کرے جیسی ہوا کے پرندوں اور جنگلی سوسن کے درختوں کی ہے، انسان کی راحت و آسائش اور انفرادی و اجتماعی فلاح کے لئے مال و دولت حاصل کرنا ناگذیر ہے، مگر مسیح کے نزدیک روحانی ترقی اور آسمانی بادشاہت کے لئے اس کو چھوڑ دینا ضروری ہے، دنیا میں نظام امن و عدل کا قیام سیاست و تعزیر اور قصاص و انتقام کے قانون پر منحصر ہے، مگر مسیح کہتے ہیں کہ آسمانی باپ اس وقت تک تمہارے قصور معاف نہ کریگا جب تک مکافات عمل کے اس پورے قانون کو لپیٹ کر نہ رکھ دیا جائیگا، غرض یہ کہ مسیح کے نزدیک دینداری دراصل ترک دنیا کا نام ہے، جو شخص دنیا اور اس کے اسباب کو نہیں چھوڑتا، اجتماعی تعلقات کو قطع نہیں کرتا، دنیوی کاروبا

دولت نہیں کرتا، اور کامل ترک و تجرید کی زندگی بسر نہیں کرتا، اس کے لئے [illegible] کی بادشاہت میں کوئی

جگہ نہیں ہے، انسان بیک وقت ان دونوں بادشاہتوں میں داخل نہیں ہو سکتا، دین اور دنیا دونوں کو پالینا اس کے لئے ناممکن ہے، مسیح کے ارشاد کے مطابق "تم بیک وقت خدا اور دولت دونوں کی خدمت نہیں کر سکتے" یہ دو متضاد چیزیں ہیں اس لئے جو ایک کا طالب ہو اسے دوسرے کی طلب چھوڑنی پڑے گی،

مسیح کی اس تعلیم کو خود مسیحی علما جس رنگ میں پیش کرتے ہیں، اس کا اندازہ کرنے کے لئے ریورینڈ ڈمیلو کی تفسیر انجیل کے چند فقرات یہاں نقل کر دینا کافی ہے، یہ تفسیر ۲۰ سے زیادہ مسیحی علما کی مدد سے طیار کی گئی ہے، اور انجیل کی بہترین تفاسیر میں سے ہے، اس کے مقدمہ میں ایک مستقل مقالہ "تعلیمات مسیح" کے عنوان پر ہے جس میں لکھا ہے کہ:-

> "مسیح نے انسانی سیرت کے لیے وہ طرز پسند کیا ہے جو بڑی حد تک دنیا کے پسند کیے ہوئے طرز سے مختلف ہے، خودداری کے بجائے فروتنی، اپنے حقوق پر جمے رہنے کے بجائے بدی کے آگے سر جھکا دینا، اور وسعت طلبی کی جگہ قناعت، عجز، صبر، ہمدردی، مصیبت میں خوش ہونا، اور دوسرے کی راحت حاصل کرنا، یہ دنیا کو مسیحیت کے عطایا ہیں.........مگر ایک مسیحی کے کیریکٹر کی سب سے زیادہ جامع تعریف غالباً یہ ہے کہ وہ ایک ایسا آدمی ہوتا ہے، جو ایک پاؤں دنیا میں، اور دوسرا دین (چرچ) میں نہیں رکھ سکتا، وہ ایک ہی وقت میں خدا اور متاع دنیا دونوں کی خدمت نہیں کر سکتا.........مسیح کے نزدیک دنیا کے پاس انسان کو اپنی خدمت پر مجبور کرنے کا سب سے بڑا ذریعہ دولت ہے، لہذا ایک مسیحی بننے کے لئے پہلی اور سب سے ضروری شرط یہ ہے کہ انسان دولت سے بے تعلق ہو جائے"

مسیحی اخلاقیات کا اصل نقص اب یہ اچھی طرح معلوم ہو گیا کہ مسیحیت میں جس عفو و درگذر، حلم و [illegible] اور ضعف و [illegible] کی جو تعلیم دی گئی ہے وہ ایک ایسے اخلاقی نظام کے اجزا ہیں جس سے

[illegible]

جو رہبانیت کی بنیاد پر قائم کیا گیا ہے، چونکہ اس نے اخروی نجات کا راستہ دنیوی کامیابی کے راستہ سے الگ اختیار کیا ہے، اس لئے وہ دنیوی معاملات کو دنیا داروں پر چھوڑ دیتی ہے، اور خود اپنے دینداروں کو لیکر الگ ہو جاتی ہے تاکہ گوشۂ عزلت میں بیٹھکر، آسمانی بادشاہت حاصل کرنے کی طیاری کریں، ایسے مذہب میں جنگ نہ ہونے کے یہ معنی نہیں ہیں کہ وہ دنیا اور اس کے معاملات کی ذمہ داریاں قبول کرتی ہے اور اس کے باوجود ان سے عہدہ برآ ہونے کے لئے قوت کے استعمال کی ضرورت نہیں سمجھتی، بلکہ دراصل اس کے معنی یہ ہیں کہ جب اس کو دنیا کے معاملات ہی سے کچھ تعلق نہیں ہے تو قدرتی طور پر جنگ و خوں ریزی سے بھی انکار ہے، وہ یہ نہیں کہتا کہ فساد کو فرو کرنے کے لئے تلوار کی ضرورت نہیں ہے، بلکہ وہ کہتا ہے کہ خود فساد ہی کو فرو کرنے کی ضرورت نہیں، وہ نہیں کہتا کہ شرارت کا استیصال جنگ کے بغیر بھی ہو سکتا ہے، بلکہ وہ کہتا ہے کہ اس کے استیصال کے بجائے تم اس کے قہر و غلبہ کے آگے سر جھکا دو، وہ نہیں کہتا کہ ظلم و تعدی کے مقابلہ میں حق کی حفاظت خوں ریزی کے بغیر بھی ممکن ہے، بلکہ وہ کہتا ہے، کہ تم حق کی حفاظت ہی نہ کرو، اگر ظالم تمھارا حق چھینتا ہے تو چھین لینے دو، وہ نہیں کہتا کہ مجرموں کو تشدد کے بغیر بھی سزا دی جا سکتی ہے، اور مظلوموں کا قصاص قوت کے بغیر بھی لیا جا سکتا ہے، بلکہ وہ کہتا ہے کہ تم سرے سے سزا اور قصاص ہی کو چھوڑ دو، اور کوئی "سات دفعہ نہیں سات کے ستر گنے تک" قصور کئے جائے، تو اسے معاف کرتے رہو، غرض یہ کہ دنیا میں امن قائم کرنا، اس کو بدی و شرارت سے پاک کرنا، اسمیں عدل و انصاف کی حکومت قائم کرنا، اور انسانیت کو ظلم و فساد کے تسلط سے نجات دلانا، سب کچھ مسیحیت کے دائرۂ عمل سے خارج ہے، اور اس نے اپنے لئے محکومی و مغلوبی، اور مظلومی و منکوبی کی زندگی پسند کر لی ہے، اس لئے اگر وہ جنگ کی مخالف ہے، اور بلا تمیز حق و غیر حق نفس جنگ ہی کو برا سمجھتی ہے، تو یہ کوئی تعجب کی بات نہیں، بلکہ ایسی زندگی کے لئے یہی زیادہ موزوں ہے،

لیکن سوال یہ ہے کہ یہ تذلل و انفعال کی تعلیم انسان کے لئے ایک دائمی اور عالمگیر قانون بننے کی کہاں تک صلاحیت رکھتی ہے؟ اس کا جواب مسیحیت خود اپنے منہ سے دے رہی جب یہ ثابت ہو چکا ہے کہ جنگ سے احتراز کا حکم خود کوئی مستقل قانون نہیں ہے، بلکہ یہ

ترک دنیا کے ایک وسیع قانون کی دفعات میں سے ایک دفعہ ہے، تو اس سے یہ بھی لازم آتا ہے کہ اس
کا نفاذ اسی صورت میں ہو سکتا ہے جب وہ پورا قانون نافذ ہو، یعنی خود مسیحیت کی تعلیم کے مطابق اس
انفعالی زندگی کو انسان اسی وقت اختیار کر سکتا ہے، جبکہ وہ دنیا کو چھوڑ دے اور اس کی مختلف عمرانی
ذمہ داریوں سے دست بردار ہو جائے، اور ان سب ذمہ داریوں کو قبول کرنے اور پورا کرنے کے ساتھ
اس طریقہ کو اختیار کرنا نہ تو ممکن ہے اور نہ خود واضع کے منشا کے مطابق ہے، اب اگر اس کو عالمگیر
قانون قرار دیا جائے، تو لامحالہ تمام بنی نوع انسان کو تمدن وتہذیب سے کنارہ کش ہو جانا پڑیگا
کیونکہ جب انسان کی منزل مقصود "آسمانی بادشاہت" ٹھہری، اور یہ مان لیا گیا کہ دنیوی زندگی
کے تمام معاملات اس بادشاہت میں داخل ہونے سے روکتے ہیں، تو ضروری ہو گیا کہ نوع بشر
ساری کی ساری اس منزل تک پہونچنے کے لئے اس روکنے والی چیز سے اجتناب کرے اور
راہبانہ زندگی اختیار کر کے نفس کشی وریاضت میں لگ جائے، لیکن ظاہر ہے کہ ایسا ہونا غیر ممکن
ہے، تمام دنیا بیک وقت اپنے کاروبار بند نہیں کر سکتی، معاش کی فکر چھوڑ کر "ہوا کے پرندوں اور
جنگلی سوسن کے درختوں" کی سی زندگی اختیار نہیں کر سکتی، تجارت، صنعت، زراعت، اور تمام دوسرے
مشاغل کو ترک کر کے تعطل وبیکاری کی حالت قبول نہیں کر سکتی، حکومت اور اس کے انتظام کو
چھوڑ کر خانقاہوں میں نہیں بیٹھ سکتی، اور اگر بالفرض محال وہ ایسا کر بھی لے تو ہرگز اس شرف
وعزت کی مالک نہیں رہ سکتی جو اس کو اللہ تعالیٰ نے دیگر مخلوقات کے مقابلہ میں عطا فرمایا ہے
بلکہ سچ یوں ہے کہ زندہ بھی نہیں رہ سکتی، انسانی سوسائٹی کی یہ ایک ایسی حالت ہے جس کا متحقق
ہونا ایک شاعرانہ تخیل کے سوا کسی خارجی عالم میں ممکن نہیں ہے، اور جو خدانخواستہ ممکن ہو بھی
جائے تو کم از کم وہ کسی ذی عقل انسان کو مطلوب ومرغوب نہیں ہو سکتی، پس یہ کہنا بالکل بعید
از عقل ہے، کہ مسیحیت کا قانون اخلاق تمام بنی نوع انسان کے لئے ایک دائمی اور عالمگیر قانون
ہے کیونکہ عالمگیر اور دائمی قانون صرف وہی ہو سکتا ہے جس پر تمام دنیا کے باشندے ہر حالت
میں عمل کر سکتے ہوں،

پھر یہ قانون کسی ایک پوری قوم کے لئے بھی قابل عمل نہیں ہے، اگر کوئی قوم من حیث القوم
اس کی پابندی قبول کرے، اور "آسمانی بادشاہت" میں داخل ہونے کے لئے اس کی تمام

بیرونیت پرعمل پیرا ہونے لگے، تو اس کو سب سے پہلے اپنی حکومت کا سارا نظام معطل کرنا پڑیگا، فوج اور پولیس منتشر کرنی ہوگی، سرحدوں کی حفاظت اور قلعوں کی نگہبانی چھوڑنی پڑیگی، اور جب اس کی کوئی ہمسایہ قوم میدان خالی دیکھ کر حملہ کرے، تو مسیحی تعلیم کے مطابق وہ "شریر کا مقابلہ" نہ کریگی، بلکہ "ایک گال" کے ساتھ "دوسرا گال" بھی "اور" "کرتے" کے ساتھ "چوغہ" بھی پیش کر دیگی، پھر وہ اپنی ساری دولت، اپنی تجارتی کوٹھیاں، اپنی دوکانیں، حتیٰ کہ اپنے گھروں کا مال اسباب بھی چھوڑ دیگی کیونکہ "دولتمند آسمانی بادشاہت میں داخل نہیں ہو سکتا" اور حکم ہے کہ "تو اپنا سارا مال بیچ کر خیرات کر دے" اس کے بعد وہ کسب معاش کے لئے محنت مزدوری کرنا بھی چھوڑ دیگی، اپنے کارخانے بند کر دے گی، صنعت و حرفت، خدمت سب کچھ ترک کر دیگی، اور اس کے تمام کاروباری آدمی اپنے اپنے کام چھوڑ کر صومعوں میں جا بیٹھیں گے، کیونکہ تم خدا اور دولت دونوں کی ایک ساتھ خدمت نہیں کر سکتے، اور مسیح کا حکم ہے کہ "تم اپنی جان کی فکر نہ کرو" آخر میں اس کے لئے صرف ایک یہ ذریعہ معاش رہ جائیگا کہ زمین کی کاشت کرے اور اپنی خوراک کے لئے غلہ حاصل کرے، لیکن آسمانی بادشاہت میں داخل ہونے کے لئے اسے یہ بھی چھوڑنا پڑیگا کیونکہ مسیح کا ارشاد ہے کہ "ہوا کے پرندوں کو دیکھو کہ نہ بوتے ہیں نہ کاٹتے ہیں پھر بھی تمہارا آسمانی باپ ان کو کھلاتا ہے" اس طرح وہ قوم اپنی حکومت، اپنی زمین، اپنی دولت، اپنی صنعت، تجارت، غرض اپنا سب کچھ ان بیرونی حملہ آوروں کے سپرد کر دیگی، اور ساری کی ساری قوم اس کی غلام بن جائیگی، پھر وہ "ایک کوس بیگار میں لیجائیں گے" تو یہ "دو کوس" جائیگی، وہ ظلم کریں گے اور یہ ان کے لئے "دعا مانگے گی" وہ اس پر "محنت" کریں گے اور یہ ان کے لئے "برکت" چاہے گی، وہ اس کی عزت و حرمت پر حملے کرین گے، اور یہ انھیں خاموشی کے ساتھ برداشت کرتی رہیگی، مسیحی نقطۂ نظر سے یہ اس کے اخلاق کا منتہائے کمال ہے اور اس کے بعد کوئی چیز اسکو آسمانی بادشاہت میں داخل ہونے سے نہیں روک سکتی، مگر عقل و دانش کے نقطۂ نظر سے یہ ایک قوم کی پستی و تنزل کا انتہائی درجہ ہے، جس کے حصول کی کوشش کو ایک عقلمند آدمی خودکشی کے سوا کسی اور لفظ سے تعبیر نہیں کر سکتا، ظاہر ہے کہ اس معنی میں دنیا کی کوئی قوم بھی مسیحیت کے قانون اخلاق کو اپنا قانون حیات نہیں بنا سکتی، کیونکہ اس کی فطرت اسے اپنے وجود کی حفاظت اور اپنی ضروریات کی تکمیل کے لئے اس قانون کی ایک ایک دفعہ کو توڑنے پر مجبور کر دیگی، اور عملاً

[illegible] کی عداوت و [illegible] سے [illegible] متفق [illegible] [illegible] حاصل ہو گی۔

اب تیسری صورت یہ ہے کہ اس کو ایک عالمگیر قانون نہ مانا جائے بلکہ ایک خاص گروہ کے لئے مخصوص سمجھ لیا جائے۔ جیسا کہ خود مسیح کی تعلیمات سے ظاہر ہوتا ہے یہ صورت یقیناً ممکن العمل ہے۔ اگر انسانی جماعت کے مختلف گروہ اس کی مختلف ضروریات کو انجام دیتے رہیں کوئی تجارت میں مشغول ہے کوئی صنعت و حرفت کا کام کرے کوئی زراعت کرتا ہے کوئی سیاسی امور کی تنظیم میں لگا ہے اور اس طرح تمدن کا کارخانہ برابر چلتا ہے۔ تو یہ ممکن ہے کہ سوسائٹی اپنے ایک قلیل حصہ کو ہوا کے پرندوں اور جنگلی سوسن کے درختوں کی طرح بے عمل اور بیکار زندگی بسر کرنے کے لئے چھوڑ دے اور اس کے چند افراد مسیحی اخلاق کے اس انتہائی کمال تک پہونچنے کی کوشش میں مشغول ہو جائیں جو ترک اسباب [illegible] ترک [illegible] اور نفس کشی وغیرہ [illegible] سے حاصل ہوتا ہے مگر ایک مخصوص گروہ [illegible] اس قانون کو محدود مان لینے اور دوسری طرف صرف اسی کو برحق اور ذریعہ نجات تسلیم کرنے کے معنی یہ ہیں کہ ہم نجات یا آسمانی بادشاہت کو راہبوں اور سنیاسیوں کی ایک مختصر جماعت کا اجارہ سمجھ لیں اور یہ مان لیں کہ اس چھوٹی سی جماعت کے سوا [illegible] کے سواد اعظم کو چارہ نہیں [illegible] جو لوگ نظام تمدن کو چلاتے ہیں، حکومت و سیاست کا انتظام کرتے ہیں، قوم و ملک کی حفاظت میں جان دیتے ہیں اور مختلف انسانی ضروریات کو [illegible] کے لئے مختلف قسم کے کاروبار میں لگے ہوئے ہیں وہ سب کے سب آسمانی بادشاہت کے دروازہ [illegible] بند ہیں کیونکہ مسیحیت کا اصل [illegible] یہ ہے کہ انسان ایک وقت میں دو [illegible] نہیں رکھ سکتا، اور آسمانی بادشاہت کا دروازہ اسی وقت کھل سکتا ہے جب [illegible] چھوڑ کر مسیح کی بتائی ہوئی دینی زندگی اختیار کرے۔ اس طرح صرف ایک مختصر سے گروہ کو آسمانی باپ کی بادشاہت میں داخل ہونے کا موقع ملتا ہے اور باقی [illegible] مخلوق [illegible] محروم کر دیجاتی ہے حتیٰ کہ ان لوگوں کو بھی [illegible] نہیں [illegible] جو دنیا [illegible] ہیں، قتل نہیں کرتے زنا نہیں کرتے چوری اور جھوٹ وغیرہ سے پرہیز کرتے ہیں [illegible] کی عزت کرتے ہیں، اپنے پڑوسی سے [illegible] محبت رکھتے ہیں [illegible] [illegible] رحم [illegible]

نہیں کر سکتے،

اس نظریہ کو صحیح مان لینے کے معنی یہ ہیں کہ ہم پھر پہلی صورت کی طرف رجوع کر رہے ہیں، اگر یہ مان لیا جائے کہ "آسمانی بادشاہت" یعنی نجات کی منزل تک پہونچنے کا ذریعہ صرف مسیحیت کا قانون اخلاق ہی ہے، اور جو کوئی اس پر عمل نہیں کرتا وہ اس منزل تک نہیں پہونچ سکتا، تو پھر لازمی طور پر یہ بھی ماننا پڑیگا کہ نوع انسانی کے لئے وہ ایک عالمگیر قانون ہے، کیونکہ نجات ہر انسان کی منزل مقصود ہے، اور کسی راستہ کو اس تک پہونچنے کا واحد راستہ قرار دینا یہی معنی رکھتا ہے، کہ وہ تمام انسانوں کے لئے بنایا گیا ہے، اور اس کی طرف سب کو دعوت دینا مطلوب ہے، لیکن یہ ثابت ہو چکا ہے کہ اس راستہ پر تمام نوع انسانی کا جمع ہو جانا اور بالاتفاق گامزن ہونا عقلاً و عملاً ناممکن ہے، لہٰذا نتیجہ یہ نکلا کہ مسیحیت کا بنایا ہوا قانون جس طرح دائمی اور عالمگیر نہیں ہے، اسی طرح رحق اور واحد ذریعۂ نجات بھی نہیں ہے[1]، عالمگیر دائمی اور واحد ذریعۂ نجات صرف وہی قانون ہو سکتا ہے، جس پر حاکم حاکم رہتے ہوئے، تاجر تاجر رہتے ہوئے، کسان کسان رہتے ہوئے اور ہر شخص اپنے اجتماعی و انفرادی فرائض ادا کرتے ہوئے عمل پیرا ہو سکتا ہے، اور جس کی تعمیل میں کسی انسان کیلئے ناقابلِ عبور مشکلات، ناقابلِ برداشت خطرات و مصائب، اور مالا یطاق تکالیف نہ ہوں، جو قانون ایسا نہیں ہے، وہ نہ حق کا سیدھا راستہ ہے، نہ نجات کا واحد ذریعہ ہے، اور نہ فطرت کا سچا قانون ہے،

لیکن ہم اس نقطہ پر بھی نہیں ٹھہر سکتے، ہمکو ایک قدم اور آگے بڑھکر کہنا چاہئے، کہ مسیحیت کا قانون اخلاق اپنی موجودہ شکل میں فطرت کے بالکل خلاف ہے، وہ دراصل اخلاقی فضیلت کے ایک غلط تصور کا نتیجہ ہے، جسمیں بے اعتدالی کے ساتھ بعض فضائل پر ضرورت سے زیادہ زور دیا گیا ہے اور بعض کو بلا ضرورت معطل کر کے انسانیت کو مفلوج کر دیا گیا ہے، اس نے انسانی اخلاق کی جن خوبیوں پر زور دیا ہے ان کی فضیلت یقیناً مسلم ہے، فروتنی، عجز و انکسار، عفو و درگذر، حلم و بردباری، صبر و تحمل

[1] اس اشکال کو خود مسیحیوں نے بھی محسوس کیا ہے اور اسی لئے یہ مسئلہ پیدا کیا گیا ہے کہ نجات کے لئے مسیحیت کے قانون پر پوری طرح عملدر آمد کرنے کی ضرورت نہیں ہے، کیونکہ مسیح نے خود صلیب پر چڑھکر تمام اہل ایمان کا کفارہ ادا کر دیا ہے، اور مسیح ان تمام لوگوں کے نجات دہندہ ہیں، جو ان پر ایمان رکھتے ہیں، مگر اس مسئلہ کی کمزوری ظاہر ہے، اس کو تسلیم کر لینے کے بعد تو مسیحیت کے قانونِ اخلاق کی کوئی قیمت باقی ہی نہیں رہتی،

کی فضیلت سے کس کو انکار ہو سکتا ہے، مگر یہ [illegible]
ہو سکتا۔ اگر دنیا سے بدی و شرارت بالکل مٹ جائے، زمین پر انسانوں کی جگہ فرشتے بسنے لگیں
اور شیطان اپنی ذریات کو لیکر کسی اور کرہ میں چلا جائے، تب تو یہ ممکن ہے کہ انسان اپنی جسمانی قوت
و شدت کا استعمال کئے بغیر اپنے حقوق، اپنی عزت اور خود اپنے وجود کی حفاظت کر سکے۔ لیکن جب
دنیا میں نیکی کے ساتھ بدی بھی موجود ہے، یزداں کے ساتھ اہرمن بھی لگا ہوا ہے، اور انسانی فطرت
سے وہ شیطانی ملکات مٹ نہیں گئے ہیں جو ملکوتی فضائل کو مغلوب کرنے کے لئے ہر وقت مستعد
رہتے ہیں، تو ایسی صورت میں نیکی کو تنہا چھوڑ دینا اور اللہ کی دی ہوئی قوتوں کو اس کی حفاظت
کے لئے استعمال نہ کرنا صرف خودکشی ہی نہیں، بلکہ بدی و شرارت کی بالواسطہ امداد ہے۔ حقیقۃً یہ کوئی
نیکی ہی نہیں ہے کہ ظالموں کو ظلم کا موقع دیا جائے اور مفسدوں کو جان بوجھ کر فساد پھیلانے کی
آزادی دیدی جائے۔ اس کو ہم کمزوری کہہ سکتے ہیں، بزدلی و کم حوصلگی سے موسوم کر سکتے ہیں، مگر خیر و
صلاح اور نیکی و احسان سے تعبیر نہیں کر سکتے۔ نیکی دراصل صلاح کا دوسرا نام ہے، اور وہ محبت
و غضب دونوں کے معتدل امتزاج سے پیدا ہوتی ہے۔ اگر بدی کی صلاح عفو و درگزر، صبر و تحمل
اور لطف و کرم سے ہو سکے تو اس سے کرنی چاہئے، لیکن اگر یہ محبت کی قوتیں اسمیں کامیاب نہ ہوسکیں
تو پھر سیاست و تعزیر اور قصاص و انتقام کی قوتوں سے کام لینا چاہئے، کیونکہ اصل مقصود اصلاح
ہے، اور انسان کا فرض ہے کہ ضرورت کی حد تک ہر اس طریقے کو استعمال کرے جو اس مقصد کے
حصول کے لئے مفید اور ناگزیر ہو۔ اسمیں طریقوں کا امتیاز نہ کرنا اور ایک ہی طریقہ پر اس حد تک
اصرار کرنا کہ وہ اصلاح کے بجائے مزید فساد کا موجب ہو جائے، نہ تو عقلمندی ہے اور نہ نیکی۔

مسیحیت کا یہ نظریہ کہ دین کا اصل الاصول محبت ہے، اور اس کے سوا انسان کے تمام
جذبات اور اخلاقی خصائص باطل ہیں، جنکو مٹانے ہی سے دینداری کو نشو و نما حاصل ہو سکتا ہے،
دراصل ایک غلط تخیل پر قائم ہے۔ اس نظریہ کے موجدوں کی نظر اس حقیقت تک نہیں پہنچ سکی
کہ اللہ تعالیٰ نے دنیا میں کوئی چیز عبث نہیں پیدا کی ہے۔ اس لئے انہوں نے سمجھ لیا کہ غضب،
شہوت، اور حب نفس وغیرہ جذبات فی نفسہ مذموم ہیں، اور انسانی سیرت میں شجاعت و خودداری،
جرأت و شہامت، تدبر و سیاست، عدل و انصاف وغیرہ کا کوئی مصرف نہیں ہے، حالانکہ یہی

بل مصرف اور ایک مدعا رکھتے ہیں جس طرح انسان کا کوئی عضو حتی کہ کوئی رونگٹا بھی
یں ہے، اسی طرح انسان کی کوئی ذہنی و جسمانی قوت، اسکا کوئی ظاہری و باطنی ملکہ، اور
نفسانی جذبہ و داعیہ بھی بیکار نہیں ہے، ناظر کائنات نے اس کو بغیر کسی مصلحت کے نہیں بنایا
ر یہ قوتیں غلط صورتوں میں ظاہر ہوں اور غلط راستے اختیار کرلیں، تو اس کے یہ معنی ہرگز
یں کہ وہ فی نفسہ غلط اور مذموم ہیں، بلکہ اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ انسان نے انکا صحیح مصرف
مجھا، اور اس کے شعور نے اتنی ترقی نہیں کی کہ اون کے صحیح استعمال کی طرف اس کی رہنمائی
ے، مثال کے طور پر شہوت ایک جذبہ ہے، جس کی بدولت انسان نے اتنے گناہ کئے ہیں
اید کسی اور جذبہ کے اثر سے نہ کئے ہوں گے، مگر اس کی بنا پر یہ فیصلہ نہیں کیا جاسکتا، کہ اس کو
مٹا دینا چاہئے، کیونکہ اس پر بقائے نوع کی بنیاد قائم ہے، حرص ایک جذبہ ہے جو انسان کو
غرض بناکر بدترین گناہوں پر آمادہ کردیتا ہے، مگر اس کو بالکل فنا کردینے کا فیصلہ نہیں کیا
سکتا، کیونکہ یہی چیز عمل کی اصلی محرک ہے، غضب ایک جذبہ ہے جس سے دنیا میں بے شمار جھگڑے
و ستم کرائے ہیں، مگر اس سے یہ نتیجہ نہیں نکالا جاسکتا، کہ وہ سراسر بدی ہی بدی ہے اور اس میں
فائدہ متصور نہیں ہے، کیونکہ یہی چیز دنیا میں امن وامان کی ضامن ہے، ورنہ بدی و شرارت
قوتیں اس کو تباہ و برباد کرڈالیں، بالکل یہی حال ان جذبات و ملکات کا ہے، جو لطیف اور عمدہ
ل سمجھے جاتے ہیں، ان میں بھی جہاں بہت سی خوبیاں ہیں، وہاں بہت سی خرابیاں بھی ہیں، شجاعت
سے بڑھ جائے تو تہور اور حماقت کے درجہ تک پہونچ جاتی ہے، دوراندیشی اگر افراط کا پہلو اختیار
ے تو بزدلی و نامردی بنجاتی ہے، رحم اگر اپنی قدرتی حدود میں نہ رہے، تو جرائم و معاصی کا مددگار
تا ہے، فیاضی اگر حد سے گذر جائے تو اسراف و تبذیر کی صورت اختیار کرلیتی ہے، کفایت شعاری
زیادہ ہوجائے تو بخل اور کنجوسی سے بدل جاتی ہے، محبت اگر اپنی حدود میں نہ رہے تو انسان کی
ل کو اندھا کردیتی ہے، مروت اگر بے موقع استعمال کی جائے تو بدکاریوں میں جسارت پیدا کی
ا کردیتی ہے، حلم و بردباری اگر بے محل ہو تو گستاخی اور ظلم کی محرک بن جاتی ہے، فروتنی و انکساری
بے محل ہو تو خودداری و عزت نفس خاک میں ملجاتی ہے، غرض یہ کہ نفس انسانی کو جتنی قوتیں

[illegible] ہیں سب اپنے اپنے موقع پر [illegible]

بھلائی یا برائی کا فیصلہ کیا جا سکتا ہے، ورنہ کسی کے ترک اور کسی کے اختیار کا فتویٰ دیا جا سکتا ہے
اس طرح ہم یہ نہیں کہہ سکتے کہ انسان کے لیے صرف ہاتھ پاؤں اور قلب و دماغ ہی مفید ہیں، آنکھ
[illegible] معدہ وجگر وغیرہ کی ضرورت نہیں محض قوت سامعہ اور لامسہ کافی ہے باصرہ اور شامہ کی
ضرورت نہیں محض شعور و ادراک کفایت کرتا ہے، حافظہ اور تمیز کی ضرورت نہیں، بالکل اسی طرح
یہ بھی نہیں کہہ سکتے کہ انسان میں صرف محبت و رحم، عفو و درگذر، عجز و فروتنی ہی کی ضرورت ہے
[illegible] نفرت و غضب، شجاعت و شہامت، خودداری و عزت نفس، غیرت و حمیت وغیرہ کی ضرورت
نہیں ہے، اگر معدہ کی کمی قلب پوری نہیں کر سکتا، اور جگر کی جگہ دماغ کام نہیں دے سکتا، تو یقیناً
[illegible] انتقام کی جگہ محبت و رحم، اور سیاست و تعزیر کی جگہ عفو و درگذر بھی مفید نہیں ہے، جس طرح
[illegible] کی صحت کا انحصار تمام جسمانی قوتوں کے اعتدال پر ہے، اور جس طرح صحت عقل اسی وقت
[illegible] ہوتی ہے جب تمام قوائے ذہنی اپنا اپنا کام کرتے رہیں، ٹھیک اسی طرح کمال اخلاق کی
[illegible] متحقق ہوتا ہے جب جذبات و خواہشات میں اعتدال ہو، نفس کی تمام قوتیں اپنے اپنے
موقع و محل پر استعمال کی جائیں، اور قدرت کے دیے ہوئے تمام جذبات کو اپنی اپنی حدود میں
[illegible] کرنے کا موقع دیا جائے، ایک فطری مذہب کا کام اسی اعتدال کی طرف رہنمائی کرتا
[illegible] نہ کہ ایک بے اعتدالی سے بچا کر دوسری بے اعتدالی اور افراط کے مقابلہ میں تفریط
[illegible] پیدا کر دینا،

مسیحیت اس حقیقت کبریٰ کے فہم سے قاصر رہی [illegible] اس نے انسان کو ترک
[illegible] اور رہبانیت کی تعلیم دی اور فیصلہ کر دیا کہ انسان محض تحمل و عفو ہی کو [illegible]
[illegible] دستور العمل بنائے، مگر یہ قول اخلاق کا کوئی درجہ [illegible] ورنہ انسانیت کی کوئی خدمت
[illegible] سچ یہ ہے کہ یہ انسانیت پر ایک ظلم عظیم ہے، کیونکہ اس طرح زندگی کو [illegible]
[illegible] اپنی ذات کو ان جائز لذتوں اور آسائشوں سے محروم کر لیتے ہیں جو قدرت نے ان کے
لیے [illegible] ہیں اور دوسری طرف اپنے وجود کو بیکار و معطل کر کے انسانی جماعت کو [illegible]
محروم کر دیتے ہیں، مسیحیت نے دنیوی بادشاہت کو آسمانی بادشاہت سے الگ کر دیا ہے

خدا و دولت دو متضاد قوتیں قرار دی ہیں، اور سچے دینداروں کو حکم دیا ہے کہ وہ دولت کو چھوڑ کر خدا کے ہو جائیں، اور دنیوی بادشاہت سے دستکش ہو کر صرف آسمانی بادشاہت کے ہو رہیں، اس کا قدرتی نتیجہ یہ ہونا چاہئے کہ دیندار، خدا ترس، ایماندار اور سچے لوگ تو دنیا کو چھوڑ کر الگ ہو جائیں، اور دنیا کا تمام کاروبار سوسائٹی کے ان ادنیٰ طبقوں کے ہاتھ میں چلا جائے جو خدا ترسی و ایمانداری کے جوہر سے خالی ہوں، حکومت پر ظالموں کا قبضہ ہو، تجارت طماع اور بددیانت لوگوں کے حصہ میں آئے، صنعت و حرفت پر دھوکہ باز اور جعلساز قابض ہو جائیں، اور شر و فساد کی قوتیں سوسائٹی کے سارے نظام کو درہم برہم کر دیں، جب وہ نیکوکار لوگ جو سوسائٹی کو صحیح راستہ پر چلا سکتے ہیں، ہاتھ پاؤں توڑ کر بیٹھ جائیں گے تو یقیناً بدکار لوگ برسر کار آئیں گے، اور ان کی بدکاریوں کی کم از کم آدھی ذمہ داری ان نیکوکاروں پر بھی عائد ہو گی جنہوں نے اپنی کمزوری سے ان کو اس کا موقع دیا،

دعوتِ مسیح کی حقیقت اس بحث سے یہ بات اظہر من الشمس ہو جاتی ہے کہ مسیحیت میں جنگ اور سیاست و تعزیر کا نہ ہونا، اس کے کمال کی دلیل نہیں، بلکہ نقص کی دلیل ہے، اور مسیحیت جس شکل میں ہمارے سامنے پیش کی گئی ہے وہ اتنے نقائص سے بھری ہوئی ہے کہ اس کے بتائے ہوئے طریقہ کی پیروی دنیا کی کوئی قوم نہیں کر سکتی،

لیکن مسیحیت اور اس کی تاریخ کے گہرے مطالعہ سے ایک اور حقیقت منکشف ہوتی ہے جب ہم مسیح کی تعلیمات پر نظر ڈالتے ہیں، تو ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ ان میں عقائد کی موٹی موٹی باتوں کے سوا کچھ نہیں ہے، نہ ان کی کوئی شریعت ہے، نہ کوئی مستقل ضابطۂ قوانین اخلاق ہے نہ حقوق و فرائض اور معاملات کے متعلق کسی قسم کی ہدایات ہیں، حتیٰ کہ عبادت کا کوئی طریقہ بھی متعین نہیں ہے، ظاہر ہے کہ ایسا مذہب، کوئی مستقل مذہب نہیں ہو سکتا، عقائد اور چند اخلاقی ہدایات کی تعلیم حاصل کرنے کے بعد، بہت سی ایسی چیزیں باقی رہ جاتی ہیں، جن کے لئے ایک مذہب کے پیروؤں کو اپنی زندگی کے مختلف شعبوں میں ہدایات کی ضرورت پیش آتی ہے، اور جس مذہب میں یہ ہدایات موجود نہ ہوں، اس میں ایک جداگانہ دینی نظام بننے کی صلاحیت نہیں ہوتی، اب قدرتی طور پر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا مسیح نے ایسے ہی غیر مکمل مذہب کو ایک مستقل مذہب بنایا تھا

اور کیا مسیح اس حقیقت سے ناواقف تھے کہ یہ مذہب تمام نوع بشری کیلئے کسی ایک قوم کے لئے بھی ہر حالت میں اور ہر زمانہ میں قابل عمل نہیں ہو سکتا؟ مسیحیت کے متبعین اس سوال کا جواب اثبات میں دیتے ہیں، مگر جب ہم مسیحیت کی تاریخ کا مطالعہ کرتے ہیں، اور ان حالات پر نظر ڈالتے ہیں جنہیں وہ پیدا ہوئی تھی، اور ان اغراض کی تحقیق کرتے ہیں، جن کے لئے وہ وجود میں آئی تھی تو ہمیں اسکا جواب کچھ اور ملتا ہے۔

واقعہ یہ ہے کہ مسیحی مذہب خود کوئی مستقل مذہب نہیں تھا، بلکہ موسوی شریعت کی تکمیل و اصلاح کے لئے پیدا ہوا تھا، موسوی شریعت جس زمانہ میں بھیجی گئی تھی وہ بنی اسرائیل کی ذہنی طفولیت کا زمانہ تھا، ان میں کسی گہری اخلاقی تعلیم کو قبول کرنے کی صلاحیت نہیں تھی، اس لئے حضرت موسیٰ نے ان کو ایک سادہ عقیدہ اور ایک سیدھے سے ضابطۂ اخلاق کی تعلیم دیکر چھوڑ دیا تھا جس میں اخلاقی فضائل، روحانی پاکیزگی، اور ایمانی روح کی بہت کمی تھی چند صدیوں تک بنی اسرائیل اس شریعت کے پابند رہے، مگر بعد کے زمانہ میں جب ان کے معاملات نے وسعت اختیار کی تو وہ کمی جو شریعت میں رہ گئی تھی، رنگ لانے لگی، اور رفتہ رفتہ بنی اسرائیل کی اخلاقی حالت خراب ہوتی چلی گئی، اس فساد اخلاق کا طبیعی نتیجہ اضمحلال قویٰ کی شکل میں ظاہر ہوا پہلے ان کی جماعت کا شیرازہ منتشر ہوا، پھر منتشر اجزاء میں باہم تصادم شروع ہوا، اور آخر میں غلامی کی لعنت ان پر مسلط ہوگئی جس نے انھیں پستی و تنزل کی انتہا کو پہونچا دیا، مسیح کی پیدائش سے ۷۲۰ برس پہلے اشوریوں نے ان کو مغلوب کیا، اور ۲ صدی تک وہ اور ان کے بعد اہل بابل انھیں پیستے رہے پھر ۵۳۶ ق م میں ایرانی آئے اور دوسو برس تک ان کا دور دورہ رہا، ان کے بعد سکندر اعظم کی قیادت میں یونانیوں نے ان کو مغلوب کیا (۳۳۴ - ۳۳۳ ق م) اور سکندر کی وفات کے بعد مصر کے بطالسہ (PTOLEMES) نے ان کو اپنا حلقہ بگوش بنا لیا، اس طرح ایک صدی تک بنی اسرائیل یونانیوں کی غلامی میں رہے، پھر ۱۹۸ ق م میں ایک دوسرے یونانی خاندان سلیوکیڈیا (SELEUCIDIA) نے ان پر اپنی حکومت قائم کر لی اور جبراً ان میں صنم پرستی کو داخل کیا، دوسری صدی قبل مسیح کے وسط میں یہودیوں کو کچھ آزادی کا احساس ہوا، اور انھوں نے بغاوت کرکے ۱۴۱ ق م میں ایک آزاد یہودی حکومت قائم کر لی جو تقریباً ۸۰ برس تک زندہ رہی، مگر آخ

نفاق اس قدر بڑھ چکے تھے کہ جماعت کا شیرازہ بندھنا مشکل تھا، اس لئے ان میں پھوٹ پڑی اور انھوں نے خود ہی رومیوں کو اپنے ملک میں آنے کی دعوت دی، چنانچہ مسیح کی پیدائش سے ۶۰ برس پہلے انھوں نے فلسطین پر حملہ کیا اور جب مسیح نے آنکھ کھولی تو ان کی پوری قوم رومیوں کی غلامی میں جکڑی ہوئی تھی، سات آٹھ صدی تک بابل و نینوا کے ستارہ پرستوں، ایران کے آتش پرستوں اور یونان و روم کے صنم پرستوں کے ماتحت غلامانہ زندگی بسر کرنے کے باعث، اس کے اندر اخلاق، شرافت، دینداری اور انسانیت کا نام و نشان تک باقی نہ تھا،

خود بائبل کے عہد عتیق میں یہودیوں کے اس اخلاقی و روحانی تنزل کی تفصیلات ہمکو بکثرت ملتی ہیں، ساتویں صدی قبل مسیح میں یروشلم کے بادشاہ منسی (MANESSAH) نے اہل بابل کے اثر سے ارض مقدس میں جن گمراہیوں کو رواج دیا، اس کی کیفیت ۲ سلاطین باب ۲۱ میں اس طرح بیان کی گئی ہے:-

"اس نے ان اونچے مکانوں کو جنھیں اس کے باپ حزقیاہ نے ڈھایا تھا پھر بنا دیا اور بعل کے لئے مذبح اٹھائے، اور یسیرت بنائی جس طرح اسرائیل کے بادشاہ اخی اب نے کیا تھا، اور آسمان کی ساری فوج (یعنی اجرام فلکی) کی پرستش کی اور ان کی بندگی کی، اس نے خداوند کے اس گھر میں جس کی بابت خداوند نے فرمایا تھا کہ میں یروشلم میں اپنا نام رکھونگا، مذبح بنائے، اس نے آسمان کی ساری فوج کے لئے خداوند کے گھر کے دونوں صحنوں میں مذبح بنائے، اس نے اپنے بیٹے کو آگ میں گذارا، اور ساعتوں کو مانا اور جادوگری کی، اور دیووں اور افسوں گروں سے یاری کی.........اس نے یسیرت کی مورت کو عین اس گھر میں نصب کیا جس کی بابت خداوند نے داؤد کو اور اس کے بیٹے سلیمان کو کہا تھا کہ اسی گھر میں اور یروشلم میں جسے میں نے بنی اسرائیل کے سارے فرقوں میں سے چن لیا ہے میں اپنا نام ابد تک رکھونگا"،

اس عہد کی اخلاقی حالت کو ہوسیع نبی (۷۸۴ء - ۷۲۵ء ق م) نے اس طرح بیان کیا ہے:-

"اس سرزمین کے بسنے والوں سے خداوند کا ایک جھگڑا ہے کیونکہ ملک میں نہ
راستی ہے نہ شفقت نہ خدا شناسی۔ لوٹنے اور جھوٹ بولنے اور خون اور چوری
اور حرام کاری کرنے کے سوا کچھ نہیں ہوتا۔ وہ پھوٹ نکلے ہیں اور خون پر خون
ہوتا ہے۔ اس لئے سرزمین ماتم کریگی اور ہر ایک جو اس میں رہتا ہے جنگل کے جانوروں
اور ہوا کے پرندوں سمیت ناتوان ہو جائیگا" (۴: ۱-۳)

حضرت یسعیاہ جنہیں قوم میں یسعیاہ نبی کہتے ہیں۔

"تمام سر بیمار ہے اور دل بالکل سست ہے۔ تلوے سے لیکر چندیا تک اس میں کہیں
صحت نہیں ہے بلکہ زخم اور چوٹ اور سڑے ہوئے گھاؤ ہیں .... تمہارا
ملک اجاڑ ہے تمہاری بستیاں جل گئیں۔ پردیسی لوگ تمہاری زمین کو تمہارے
سامنے نگلتے ہیں۔ وہ ویران ہے گویا کہ اسے اجنبی لوگوں نے اجاڑا ہے" (۱: ۵-۷)

"وہ بستی جو سراسر پاک دامن تھی کیسی چھنال ہو گئی! وہ تو انصاف سے معمور تھی
راستبازی اس میں بستی تھی پر اب خونی رہتے ہیں۔ تیری چاندی میلی ہو گئی تیرے
مے میں پانی مل گیا۔ تیرے سردار گردن کش چوروں کے شریک ہیں۔ ان میں سے
ہر ایک رشوت دوست اور انعام طلب ہے۔ وہ یتیموں کا انصاف نہیں کرتے
اور بیواؤں کی فریاد ان تک نہیں پہونچتی" (۱: ۲۱-۲۳)

"اور ان کے جشن کی محفلوں میں بربط اور بین اور دف اور بانسری اور مے کا دور
ہے۔ لیکن وہ خداوند کے کام پر غور نہیں کرتے اور اس کے ہاتھوں کی کاریگری
کو نہیں دیکھتے اس لئے میری قوم اسیری میں مبتلا ہو گئی ہے کیونکہ وہ علم نہیں رکھتی۔ ان کے
عزت والے بھوکوں مرتے اور عوام پیاس سے خشک ہوئے جاتے ہیں۔ اس سے دوزخ
نے وسعت اختیار کرلی ہے اور اپنا منہ بے انداز پھاڑ دیا ہے۔ ان کے شان و شوکت والے
اور عوام اور تمام فخر کرنے والے اس میں جا پڑیں گے" (۵: ۱۲-۱۴)

"ان پر واویلا ہے جو مے پینے میں زور آور اور نشے کی چیزیں ملانے میں طاقتور ہیں جو رشوت
کی خاطر بدکاروں کو صادق ٹھہراتے ہیں اور صادقوں سے ان کا حق چھین لیتے ہیں۔ اس لئے جس

تک بھوسی کو کھا جاتی ہے اور جلتا ہوا بھوس بیٹھ جاتا ہے، اسی طرح ان کی جڑ بوسیدہ ہوگی اور ان کی کلی گرد کی طرح اڑ جائیگی، کیونکہ انھوں نے رب الافواج کی شریعت کو ناجائز ٹھہرایا اور اسرائیل کے قدوس کے سخن کو ذلیل جانا" (۵ : ۲۲-۲۴)

اسی عہد کے ایک اور نبی حضرت میکاہ کہتے ہیں:۔

"اے یعقوب کے سردارو! اور بنی اسرائیل کے قاضیو! تم وہ ہو جو نیکی سے کینہ رکھتے ہیں اور بدی کو پیار کرتے ہیں، جو لوگوں کا پوست ان پر سے کھینچتے ہیں اور ان کی ہڈیوں پر سے گوشت نوچتے ہیں، اور جو میری قوم کا گوشت کھاتے ہیں اور ان کی کھال ان پر سے کھینچتے ہیں، اور ان کی ہڈیوں کو توڑتے ہیں، اور انھیں ٹکرے ٹکرے کرتے ہیں" (۳: ۱-۳)

"تم کہ عدالت سے عداوت رکھتے ہو اور ساری راستی کو الٹا دیتے ہو، اس بات کو سنو تم صیہون کو خون ریزی سے، اور یروشلم کو بے انصافی سے تعمیر کرتے ہو، اس کے سردار رشوت لیکر عدالت کرتے ہیں، اور اس کے کاہن اجرت لیکر تعلیم دیتے ہیں، اور اس کے غیب گو نقد لیکر رمالی کرتے ہیں" (۳ : ۹-۱۱)

انبیائے بنی اسرائیل کے ان اقوال سے اچھی طرح معلوم ہو جاتا ہے کہ اس زمانہ میں یہودیوں سے شریعت کی اصلی روح یعنی ایمان، صداقت، دیانت، عدل انصاف اور پاکیزگی اخلاق رخصت ہو چکی تھی، حرام خوری، حرص و طمع، ظلم و جفا اور بے حیائی و بدکاری نے ساری قوم کو گھیر لیا تھا، ان کے حاکم ظالم، ان کے پیشوا ریاکار، ان کے سردار خائن، اور ان کے عوام معصیت پیشہ ہو گئے تھے، انھوں نے شریعت کے الفاظ اور ظاہری رسوم و شعائر ہی کو اصل شریعت سمجھ لیا تھا، اور اس معنوی حقیقت کو فراموش کر دیا تھا جو ہر شریعت حقہ کے احکام میں مقصود اصلی ہوتی ہے، اس روز افزوں پستی و ظاہر پرستی کو دیکھ کر مسیح سے بہت پہلے بنی اسرائیل کے انبیاء اصلاح کی ضرورت محسوس کر چکے تھے، اور انھوں نے مواعظ و نصائح سے ان کو یہ بھولی ہوئی حقیقت یاد دلانی شروع کر دی تھی کہ خدا محض قربانیوں اور دعاؤں سے خوش نہیں ہوتا، بلکہ صداقت، ترحم اور حسن معاملت سے خوش ہوتا ہے، اور اس کی مہربانی حاصل کرنے کے لئے عفو و درگذر اور محبت و ایثار کی ضرورت ہے، چنانچہ بائبل میں انبیاء متاخرین کے ایسے نصائح ہم کو بکثرت ملتے ہیں۔ یسعیاہ نبی فرماتے ہیں:۔

خداوند فرماتا ہے تمہارے ذبیحوں کی کثرت سے مجھے کیا کام؟ میں مینڈھوں کی سوختنی قربانیوں اور فربہ بچھڑوں کی چربی سے سیر ہو چکا ہوں، میں بیلوں اور بھیڑوں اور بکروں کا لہو نہیں چاہتا........ اب میرے سامنے جھوٹے نذرانے مت لاؤ۔ لوبان سے مجھے نفرت ہے، اور نوچندی اور سبت اور جماعت عیدیں بھی کیونکہ میں عید اور بے دینی دونوں کو برداشت نہیں کر سکتا۔ میرا جی تمہاری نوچندیوں اور تمہاری عیدوں سے بیزار ہے، وہ مجھ پر وبال ہیں، میں ان کے اٹھانے سے تھک گیا۔ جب تم اپنے ہاتھ پھیلاؤ گے میں تم سے اعراض کروں گا۔ جب تم دعاؤں پر دعائیں مانگو گے تو میں نہ سنوں گا، کیونکہ تمہارے ہاتھ تو لہو سے بھرے ہوئے ہیں۔ اپنے تئیں دھو کر پاک کرو، اپنے برے کاموں کو میرے سامنے سے دور کرو، بدکاری سے باز آؤ، نیکوکاری سیکھو، انصاف کے پیرو ہو، مظلوموں کی مدد کرو، یتیموں کی فریاد رسی کرو، بیوہ عورتوں کے حامی ہو........ اگر تم راضی اور فرماں بردار ہو گے تو زمین کے اچھے پھل کھاؤ گے اور اگر انکار کرو گے اور بغاوت اختیار کرو گے تو تلوار کا لقمہ بن جاؤ گے۔" (۱: ۱۱ - ۲۰)

ایک دوسرے موقع پر یسعیاہ نبی عبادات و اعمال کی معنوی روح اور حقیقت کا درس اس طرح دیتے ہیں:-

"تم اس مقصد سے روزہ رکھتے ہو کہ لڑائی جھگڑا کرو اور شرارت کے مکے مارو۔ اس طرح کا روزہ جیسا کہ آج کل تم رکھتے ہو مطلوب نہیں ہے۔ کیا یہ وہ روزہ ہے جو مجھ کو پسند ہے؟ ایسا دن جس میں آدمی اپنی جان کو فضول دکھ دے، اور اپنے سر کو جھاؤ کی طرح جھکائے اور ٹاٹ اور راکھ کی طرح بچھائے؟ کیا تم اس کو روزہ اور خدا کا منظور نظر دن کہو گے؟ کیا وہ روزہ جو میں چاہتا ہوں یہ نہیں ہے کہ ظلم کی زنجیریں توڑی جائیں، جوئے کے بندھن کھولے جائیں، مظلوموں کو آزاد کیا جائے بلکہ ہر ایک جوئے کو توڑ ڈالا جائے؟ کیا یہ نہیں کہ تو اپنی روٹی بھوکوں کو کھلائے اور مسکینوں کو جو آوارہ ہیں اپنے گھر میں پناہ دے، اور جب کسی کو ننگا دیکھے تو اسے پہنائے، اور تو اپنے ہم جنسوں سے منہ نہ چھپائے؟...... اگر تو اپنے دل کو بھوکے کی طرف مائل کرے اور آزردہ

تب تو سیر ہو سے تو تیرا نور تاریکی میں طلوع کریگا، اور تیری تیرگی دوپہر کی طرح چمک اٹھے گی"۔ (۵۸: ۴-۱۰)

ایک اور نبی حضرت میکاہ اسی روحانی تعلیم کی اس طرح تجدید کرتے ہیں:۔

"میں کیا لے کے خداوند کے حضور میں جاؤں گا؟ کیونکر خدائے تعالیٰ کو سجدہ کروں؟ کیا سوختنی قربانیوں اور یکسالہ بچھڑوں کو لیکر اس کے آگے جاؤنگا؟ کیا خداوند ہزاروں مینڈھوں سے یا تیل کی دس دس ہزار نہروں سے خوش ہوگا؟ کیا میں اپنے پہلوٹھے کو اپنا گناہ کے عوض، اپنے پیٹ کے پھل کو اپنی روح کی خطا کے عوض دے سکوں گا؟ نہیں اے انسان اس نے تجھے وہ راہ دکھادی ہے جو نیک ہے، خداوند تجھ سے اس کے سوا اور کیا چاہتا ہے، کہ تو انصاف کرے، رحم دلی کو پیار کرے اور اپنے خدا کے ساتھ فروتنی سے پیش آئے"۔ (۶: ۶-۸)

یہ تعلیم سات صدیوں تک بہرے کانوں سے ٹکرا کر واپس آتی رہی، اور بنی اسرائیل کی حالت روز بروز بگڑتی چلی گئی، ان میں جو اخلاقی مفاسد جڑ پکڑ گئے تھے، انھیں دور کرنے کے لئے ایک زیادہ طاقتور مصلح کی ضرورت تھی، اس لئے اللہ تعالیٰ نے حضرت مسیح کو مبعوث فرمایا، اور انھوں نے اسی میکاہ اور یسعیاہ والی تعلیم کو نئے جوش اور نئی روح کے ساتھ پیش کیا، انبیا سابقین کی طرح ان کی تعلیم بھی شریعت موسویہ کو منسوخ کرنے اور اس کی جگہ کوئی الگ مذہب قایم کرنے کے لئے نہیں تھی، بلکہ اس کا مقصد صرف اس کمی کو پورا کرنا تھا جو موسوی شریعت میں باقی رہ گئی تھی، اور اس اخلاقی فضیلت کی روح کو ملت یہودیہ میں پھونکنا تھا، جس کی وہ ضرورت مند تھی، اس وقت یہودی اخلاق میں راستبازی، دیانت، حلم، عفو، زہد، قناعت، سیرچشمی، خداپرستی، رحم، فروتنی اور ایثار کی کمی تھی، وہ حد سے زیادہ طماع، دنیاپرست، بندۂ غرض اور دنی الطبع ہو گئے تھے، ان میں دینداری کی روح باقی نہ رہی تھی، جو انسانیت کی جان ہے، اس لئے مسیح نے اپنی پوری قوت انھیں نقائص کو دور کرنے میں صرف کی اور اصل یہودی شریعت کو برقرار رکھ کر صرف ان چیزوں کا اس میں اضافہ کیا، جن کی اس وقت کے حالات کے لحاظ سے ضرورت تھی، پس دین مسیحی کو الگ

ے اس حقیقت کو ... بھی تسلیم کرتے ہیں، چنانچہ ایک مشہور مسیحی فاضل ڈین انگے نے جن کو

[illegible] حقیقت [illegible]

بالکل یہی بات خود انجیل میں حضرت مسیح کی زبان سے ادا کی گئی ہے، وہ کہتے ہیں :-

" یہ نہ سمجھو کہ میں توریت یا نبیوں کی کتابوں کو منسوخ کرنے آیا ہوں، منسوخ کرنے نہیں بلکہ پورا کرنے آیا ہوں کیونکہ میں تم سے سچ کہتا ہوں کہ جب تک آسمان اور زمین ٹل نہ جائیں توریت کا ایک نقطہ یا ایک شوشہ بھی پورا ہوئے بغیر نہ ٹلے گا پس جو کوئی ان چھوٹے سے چھوٹے حکموں میں سے بھی کسی کو توڑے گا اور آدمیوں کو ایسا کرنے کی ہدایت کریگا وہ آسمان کی بادشاہت میں سب سے چھوٹا کہلائیگا لیکن جو ان پر عمل کریگا اور ان کی تعلیم دیگا وہ آسمان کی بادشاہت میں سب سے بڑا کہلائیگا پس میں تم سے کہے دیتا ہوں کہ اگر تمہاری راست بازی فقیہوں اور فریسیوں کی راست بازی سے زیادہ نہ ہوگی تو تم آسمان کی بادشاہت میں داخل نہ ہو سکوگے " (متی ۵: ۱۷-۲۰، لوقا ۱۶: ۱۷)

ایک دوسری جگہ اپنے پیروؤں کو حکم دیتے ہیں :-

" فقیہہ اور فریسی موسیٰ کی گدی پر بیٹھے ہیں پس جو کچھ وہ تمہیں بتائیں سب عمل میں لاؤ اور مانتے رہو لیکن ان کے سے کام نہ کرو، کیونکہ وہ جو کچھ کہتے ہیں کرتے نہیں ہیں وہ ایسے بھاری بوجھ جنہیں اٹھانا بھی مشکل ہے، دوسروں کے کندھوں پر رکھ دیتے ہیں مگر آپ انگلی سے بھی ہلانا نہیں چاہتے " (متی ۲۳: ۱-۴)

یوحنا نے بھی اپنی انجیل میں تصریح کی ہے کہ :-

" شریعت موسیٰ کی معرفت دی گئی، اور فضل و صداقت یسوع مسیح کی معرفت پہونچی " (۱: ۱۷)

ان اقوال سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ مسیحیت میں موسوی شریعت کے تمام احکام باقی رکھے

(بقیہ حاشیہ صفحہ [illegible]) [illegible] کا سب سے بڑا منصب [illegible] تھا [illegible] حضرت [illegible]
مسیح نے بھی موسوی تعلیم سے انحراف نہیں کیا [illegible] موسوی [illegible]
[illegible] میں وہ [illegible] تھے [illegible] سے
موسوی شریعت سے الگ ہونا [illegible] مسیح نے عیسائیوں کے لئے خود کوئی شریعت تجویز نہیں کی۔

گئے ہیں، اور ان پر صرف تفسیت و صداقت کا اضافہ کر دیا گیا ہے۔

مسیحیت میں جنگ نہ ہونے کی وجہ: اب یہ کہنے کی حاجت نہیں کہ مسیحیت میں جنگ اور صلح، حکومت، سیاست، تعزیرات وغیرہ کے متعلق وہ تمام احکام باقی رکھے گئے تھے جو توراۃ میں مذکور تھے، اور دینِ مسیحی ان میں سے کسی کا حتی کہ ایک نقطہ اور ایک شوشے کا بھی منکر نہ تھا۔ لیکن مسیح نے ان احکام کی تنفیذ اس لئے نہیں کی کہ جس عہد میں وہ پیدا ہوئے تھے اس میں ان کی تنفیذ کا کوئی موقع ہی نہ تھا۔ اوپر بیان ہو چکا ہے کہ مسیح کی بعثت کے وقت ان کی قوم سات آٹھ سو برس سے غیر قوموں کی غلامی میں مبتلا تھی۔ ان کی ولادت سے ۶۳ برس پہلے ہی روم کی فوج نے فلسطین پر حملہ کیا تھا، اور اسے اس سرے سے اس سرے تک پامال کرتی چلی گئی تھی۔ جس وقت مسیح نے آنکھ کھولی تو ان کی پوری قوم رومیوں کی قید غلامی میں جکڑی ہوئی تھی۔ خود ان کا وطن یہودیہ ۶ء میں براہ راست رومی صوبہ داروں کے زیر انتظام آگیا تھا جو پروکیوریٹر (Procurator) کہلاتے تھے۔ جب ان کی پیغمبرانہ دعوت کا آغاز ہوا تو یروشلم کا پروکیوریٹر پونتوس پیلاطس (Pontius Pilate) جیسا بے انصاف اور بے ضمیر شخص تھا، اور ان بے دین آقاؤں کی غلامی میں بنی اسرائیل کی ذہنی و اخلاقی حالت اس حد تک خراب ہو چکی تھی کہ وہ کلمۂ حق سننے کے لئے بھی تیار نہ تھے۔ مسیح کی آنکھوں کے سامنے گلیل کا رئیس ہیرودیس محض ایک رقاصہ کو خوش کرنے کے لئے حضرت یحییٰ (John the Baptist) کو قتل کرا چکا تھا، اور خود مسیح کی قدر و قیمت بھی ان کی قوم میں جیسی کچھ تھی اس کا حال اس سے ظاہر ہے کہ آخر میں انھوں نے براباؔ نامی ڈاکو کی جان کو مسیح کی جان سے زیادہ قیمتی سمجھا۔ ایسی حالت میں مسیح کے لئے کیونکر ممکن تھا کہ جنگ کرنے اور آزاد قومی حکومت قائم کرنے کا خیال بھی دل میں لاتے۔ وہ دیکھ رہے تھے کہ یہودیوں کی روح نکل چکی ہے، ان کی سیرت میں کوئی مضبوطی اور ان کی قومیت میں کوئی زندگی باقی نہیں ہے، اس لئے ان کا سب سے پہلا کام یہی تھا کہ اپنی قوم کو اس اخلاقی پستی کے گڑھے سے نکالتے جس میں وہ گری ہوئی تھی، اور اس میں فضیلتِ اخلاق کی وہ روح پھونکتے جس کے بغیر کوئی قوم غلامی کی زنجیروں کو توڑنے اور دنیا میں اپنے آزاد وجود کو برقرار رکھنے پر قادر نہیں ہو سکتی۔ چنانچہ اول اول انھوں نے قومی سیرت کے اسی پہلو کی طرف توجہ کی، اور اپنے اس کام کو تکمیل تک پہنچانے کے لیے ایک ایسی پُرامن فضا پیدا کرنے کی کوشش کی جس میں حکومتِ وقت سے کسی قسم کے تصادم کا موقع نہ آئے، کیونکہ اگر ابتدا

[illegible] حکومت سے مقابلہ شروع ہوتا [illegible] اور اس سے [illegible] حکومت سے

مقابلہ میں بھی ناکامی ہوتی، اس لئے انھوں نے حکومت کی اطاعت کا حکم دیا، اور کہا کہ:-

”جو قیصر کا ہے وہ قیصر کو دو، اور جو خدا کا ہے وہ خدا کو دو۔“ (لوقا ۲۰ : ۲۲)

انھوں نے حکم دیا کہ شریر کا مقابلہ نہ کرو، جو تم پر ظلم کرے اسے دعا دو اور اس کے لئے برکت چاہو، جو تمھیں بیگار میں پکڑے اس کے ساتھ ایک کوس کے بجائے دو کوس جاؤ، جو تمھارا کرتہ چھینے اس کو چوغہ بھی اتار دو، جو تمھارے ایک گال پر طمانچہ مارے اس کے سامنے دوسرا گال بھی پیش کر دو۔ ابتداً ان سب احکام کا مدعا یہ تھا کہ حکومت سے تصادم نہ ہو، اور قوم میں مصیبت جھیلنے کی قوت پیدا ہو جائے۔ اس کے بعد انھوں نے آہستہ آہستہ اپنی قوم کو استقامت، صبر، تحمل، اور بے خوفی کی تعلیم دینی شروع کی۔ ان کو مصائب و شدائد کا مقابلہ کرنے کے لئے طیار کیا، اور ان کے دل سے موت کا خوف اور حاکمانہ قہر و طاقت کا ڈر نکالنے کی کوشش کی۔ انھوں نے کہا کہ جب تم حاکموں اور بادشاہوں کے سامنے پیش کئے جاؤ اور تمھیں اذیتیں دی جائیں تو اس وقت ثابت قدم رہنا (مرقس ۱۳)۔ انھوں نے جان کی محبت دلوں سے نکالنے اور مرنے کی آمادگی پیدا کرنے کے لئے کہا کہ:-

”جو کوئی اپنی جان بچانا چاہے وہ اسے کھوئے گا اور جو کوئی میری خاطر اپنی جان کھوئے گا وہی اسے بچائے گا۔“ (لوقا ۹ : ۲۴)

انھوں نے حکومت اور اس کی عنایت پر بھروسہ رکھنے کے بجائے خدا [illegible] پر بھروسہ رکھنے کی تعلیم دی تاکہ غلامی کی وہ سب سے بڑی کمزوری دور ہو جو ایک غلام قوم کو ظالم قوت کے تسلط میں گرفتار رکھتی ہے۔ انھوں نے کہا کہ:-

”جب تم [illegible] تو تم [illegible] وہ تم کو [illegible] دے گا۔“ (لوقا [illegible] : ۳)

انھوں نے حکومت کا رعب داب لوگوں کے دلوں سے دور کرنے کی کوشش کی اور کہا کہ جو لوگ محض جسم کو قتل کر سکتے ہیں اور روح کو قتل نہیں کر سکتے ان سے ڈرنے کی ضرورت نہیں ہے، اصل میں ڈرنا اس سے چاہئے جو روح اور جسم دونوں کو ہلاک کر سکتا ہے (متی ۱۰ : ۲۸)۔

یہ سب باتیں ایک صدیوں کی غلام قوم میں آزادی حاصل کرنے کی صلاحیت پیدا کرنے [illegible]

ضروری تھیں، اور بعد میں مسیح نے انھیں تک اپنی تعلیم کو محدود رکھا۔ اس مرحلہ کو طے کرنے کے بعد آخری زمانہ میں وہ جہاد و قتال کے مضمون کی طرف بڑھ رہے تھے، اور کبھی کبھی اپنے دشمنوں کو قتل کرنے کی خواہش ظاہر کرنے لگے تھے، چنانچہ ایک موقع پر فرماتے ہیں کہ:-

"میرے ان دشمنوں کو جنھوں نے نہ چاہا کہ میں ان پر بادشاہی کروں، یہاں لاکر میرے سامنے قتل کرو۔"

اسی طرح انھوں نے اپنے متبعین کو تلوار رکھنے کا حکم بھی دیا تھا، جیسا کہ لوقا نے لکھا ہے کہ:-

"اس نے ان سے کہا کہ اب جس کے پاس بٹوا ہو وہ اسے لے اور اسی طرح جھولی بھی اور جس کے پاس نہ ہو وہ اپنی پوشاک بیچ کر تلوار خریدے .... انھوں نے کہا کہ اے خداوند! دیکھ یہاں دو تلواریں ہیں، اس نے کہا بہت ہیں"

لیکن مسیح کو اپنی قوم کی ہدایت و رہنمائی کے لئے صرف ڈھائی تین سال کی مدت نصیب ہوئی، اور یہ مختصر مدت ایک پوری قوم کو آزادی کی جنگ کے قابل بنانے کے لئے کافی نہیں تھی، اس عرصہ میں نہ تو ان کے پیرووں کی تعداد اس حد تک پہونچی تھی کہ وہ رومیوں کے مقابلہ پر ان سے کوئی کام لے سکتے، اور نہ خود ان لوگوں کی جو ان کے پیرو ہو چکے تھے، اخلاقی تربیت اس قدر مکمل ہوئی تھی کہ وہ رسول عربی کے صحابیوں کی طرح جرأت و عزیمت کے ساتھ ہر قسم کے خطرات کا مقابلہ کرتے، گھر بار چھوڑ کر ہجرت کر جاتے اور بڑی سے بڑی طاقتوں کے مقابلہ میں بھی بے خوف ہو کر جانیں لڑا دیتے، ان لوگوں کے ایمان بھی اتنے بھی قوی نہ ہوئے تھے کہ وہ علانیہ اظہار حق کی جرأت کرتے، مسیح کے سب سے زیادہ محبوب اور معتمد علیہ حواری پطرس کا یہ حال تھا کہ ان کی گرفتاری کے وقت جب اس سے پوچھا گیا کہ کیا تم بھی مسیح کے پیرو ہو؟ تو اس نے "مرغ کے دو دفعہ بانگ دینے سے پہلے تین دفعہ مسیح کا انکار کر دیا،" (مرقس ۱۴: ۳۰) ان کے ایک اور حواری یہوداہ اسکریوتی نے چاندی کے ۳۰ سکوں کے خاطر ان کو گرفتار کرا دیا، (متی ۲۶: ۱۴-۱۶) اور جب ان کو گرفتار کر لیا گیا تو "ان کے سارے شاگرد انھیں چھوڑ کر بھاگ گئے" (متی ۲۶: ۵۶)

ظاہر ہے کہ جب ان کے خاص حواریوں اور بھروسہ کے شاگردوں کا یہ حال تھا تو وہ ایسی ناقابل اعتماد فوج کو لیکر جہاد کی جرأت کیونکر کر سکتے تھے، اگر رسول عربی کی طرح ان کو بھی تعلیم و تربیت کا کافی موقعہ ملتا تو ممکن تھا کہ وہ بھی اپنے حواریوں میں وہی مجاہدانہ روح پیدا کر دیتے جو صحابہ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم

سے پیدا کی تھیں ان کی سرکش قوم نے ان کی نبوت کو جو تین سال بھی برداشت نہ کیا اور جیسا
اتنی مہلت ہی نہ دی۔ وہ اس کی قدرت و بہبود کے لیے کوئی بڑا کام کرسکتے اس قلیل مدت میں زیادہ سے
زیادہ اتنا ہی کام ہو سکتا تھا جتنا حضرت مسیح نے کیا خود وہ علیہ السلام علیہ الصلوٰۃ والتسلیم کی زندگی
کے ابتدائی تین سال پر اگر نظر ڈالی جائے تو اس میں بھی ہمیں جہاد و قتال کا نشان نہ ملے گا، وہی صبر
تحمل اثبات و استقامت خشیۃ و توکل الی اللہ تزکیۂ نفس و تنزیہ اخلاق کی تعلیمات پائی جائیں گی
جو مسیح کی حیات نبویہ میں پائی جاتی ہیں۔

مسیحیت اور موسوی شریعت کا تعلق اس علم و بصیرت کی روشنی میں اگر مسیح کی تعلیمات کا تجزیہ کیا
جائے تو وہ دو بڑی اقسام پر منقسم ہو جائے گی۔

ایک قسم وہ ہے جس میں مسیح نے شریعت موسویہ کی تصدیق کی ہے اور اس میں جو اور ی
اضافے کیے ہیں موسوی شریعت میں رافت رحمت اور شفقت و محبت کی کمی تھی مسیح نے اس کا
ازالہ کیا۔ اس کے قوانین میں لچک بالکل نہ تھی اور [illegible]
میں مسیح نے اس کو پورا کیا اور بنی اسرائیل کو [illegible] نوع انسان کے ساتھ محبت کرنے کی
تلقین کی، اس میں انسان کے محض [illegible] اور احسان یا فضیلت اخلاق کے حصول
کو چھوڑ دیا گیا تھا مسیح نے سب سے زیادہ اسی پہلو پر [illegible]
[illegible] تعلیم کا یہ حصہ [illegible] موسوی شریعت [illegible] تکمیل تھا۔

دوسری قسم وہ ہے جس میں مسیح [illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible] خود پسند، نفس پرست، متکبر [illegible]
[illegible] قوم [illegible]
[illegible]
[illegible]

جذبات کی معنوی قوت پیدا کرنے کے لئے صبر و استقامت، بے خوفی و پختگی عزم و ارادہ کی قوت پیدا کرنے کی کوشش کی۔ مسیح کی تعلیم کا یہ دوسرا حصہ بنی اسرائیل کی خاص اسی حالت کے لئے مخصوص تھا جس میں بعثت مسیح کے وقت وہ مبتلا تھے۔ اس کو کوئی دائمی اور عالمگیر قانون بنانا ہرگز مقصود نہ تھا۔ خصوصیت کے ساتھ تذلل و انفعال کی یہ تعلیم کہ "شریر کا مقابلہ نہ کر، جو کوئی تیرے ایک گال پر طمانچہ مارے اس کے آگے دوسرا گال بھی پیش کر دے، جو کوئی تیرا کرتہ چھینے اسے چوغہ بھی اتار دے" یہ دراصل غلامی و بے بسی کی ایک مخصوص حالت کے لئے تھی۔ اس کو کسی آزاد قوم کی سیاسی پالیسی بنانا نہ تو مطلوب تھا اور نہ یہ کسی طرح درست اور معقول ہو سکتا تھا۔

شریعت اور مسیحیت کی علیحدگی۔ لیکن مسیح کے اس دنیا سے اٹھ جانے کے چند ہی برس بعد ان تمام اصول و قواعد کو یک لخت منہدم کر دیا گیا جن پر انھوں نے اپنے مذہب تجدید و اصلاح کی بنیاد رکھی تھی۔ دراصل مسیحی مذہب کو ایسا بدل دیا گیا کہ دنیا میں اس کے وجود کا نام و نشان تک نہ رہا۔ اس عمل تحریف و تنسیخ کا محرک سینٹ پال (پولوس) تھا۔ ہم اس کی نیت کے متعلق کچھ نہیں کہہ سکتے۔ ممکن ہے کہ مسیح کی زندگی میں، اور ان کے بعد بھی ۶ برس تک ان کی دعوت کا شدید دشمن رہنے کے باوجود وہ سچے دل سے مسیح کا پیرو اور وکیل بن گیا ہو، لیکن اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ وہ مسیح کا صحبت یافتہ نہ تھا۔[1] ان کی تربیت میں رہ کر اسے مسیحیت کی اصلی روح کو سمجھنے کا کوئی موقع نہیں ملا تھا، اور وہ ان حواریوں کے مقابلہ میں جو مسیح کے زیر تربیت رہ چکے تھے مسیحی تعلیمات کو زیادہ سمجھنے کی صلاحیت نہ رکھتا تھا۔ اس لئے جب اس نے پطرس جیسے حواریوں کی رائے کے خلاف مسیحیت کی تعبیر و تاویل کی اور اسے اپنی نو ایجاد بنیادوں پر قائم کیا، تو یہ بدنیتی نہ سہی جہل و نا واقفیت کی بنا پر یقیناً ایک کھلی ہوئی تحریف تھی۔[1]

اس سلسلہ میں پولوس نے مسیحیت کے اصول میں جو تحریفات کیں ان میں سب سے پہلی تحریف یہ تھی کہ مسیحیت کو تمام عالم انسانی کے لئے ایک عام پیغام قرار دیا حالانکہ دراصل وہ محض بنی اسرائیل

---

[1] خود سینٹ پال کے شاگرد لوقا کی کتاب اعمال سے ثابت ہوتا ہے کہ مسیح کی زندگی میں اس کو ان کی صحبت اور تربیت سے فائدہ اٹھانے کا کوئی موقع نہیں ملا تھا، نیز یہ کہ جب اس نے مسیحیت میں تحریف شروع کی تو مسیح کے خاص تربیت یافتہ حواریوں نے اس کی سخت مخالفت کی تھی۔ پس خود انجیل کی سند پر کہا جا سکتا ہے کہ سینٹ پال کے ایجاد کردہ اصول نہ صرف مسیحیت کی اسپرٹ کے خلاف تھے بلکہ خود مسیح کی صریح ہدایات کے بھی خلاف تھے۔

[illegible] نے بھی [illegible] زندگی [illegible] دعوت [illegible] قوم [illegible] پر یہ حکم دیا تھا کہ:-

"غیر قوموں کی طرف نہ جانا اور سامریوں کے کسی شہر میں داخل نہ ہونا، بلکہ اسرائیل کی کھوئی ہوئی بھیڑوں ہی کے پاس جانا۔" (متی ۱۰: ۵-۶)

خود مسیح نے اپنے پورے عہدِ نبوت میں کبھی ایک لمحہ کے لئے بھی غیر اسرائیلی قوموں کو اپنے دین کی طرف دعوت نہیں دی، اور نہ کسی غیر اسرائیلی کو داخلِ دین کیا۔ سینٹ پال کے ظہور سے پہلے مسیح کے حواری بھی صرف اسرائیلیوں کو دین کی دعوت دیتے رہے۔ مسیحیت کے مبلغ بھی اسرائیلی تھے اور اس کے مخاطب بھی اسرائیلی۔ اس وقت تک مسیحی مذہب یہودی مذہب کا ایک اصلاحی فرقہ شمار ہوتا تھا [illegible] ایک مسلم مسئلہ تھا کہ انجیل کی منادی صرف ان لوگوں کے لئے ہے جو شریعت موسویہ کے پیرو ہیں۔ پیروانِ مسیح کی جو مجلسِ عام ۴۹ء میں بمقام یروشلم منعقد ہوئی تھی اس میں [illegible] جماعت [illegible] کی موید تھی [illegible] مسیحیت کی حقیقت مسیح کی تصریحات [illegible] یہ فیصلہ کیا کہ مسیح کی دعوت تمام دنیا کی قوموں کے لئے ہے اور اس فیصلہ کو حق بجانب قرار دینے کے لئے یہ دعویٰ کیا گیا کہ صلیب پر چڑھنے اور وفات پا جانے کے بعد اپنے شاگردوں کے پاس آ کر یہ حکم دیا تھا کہ تم جا کر سب قوموں کو شاگرد بناؤ۔ (متی ۲۸: ۱۹)

لیکن غیر اسرائیلی قوموں کو موسوی قوانین کا پابند [illegible] مشکل تھا [illegible] قوموں کو نفرت تھی [illegible] قوموں کو مسیحیت کی [illegible] بجائے [illegible] شریعت کی پابندی [illegible] مسیح [illegible] تھیں وہ [illegible] تھے [illegible] سکتے تھے [illegible] نہیں مل سکتا [illegible]

[illegible]

کی بادشاہت میں وہی داخل ہو سکتا ہے، جو توراۃ کے حکموں پر عمل کرے۔" ان تصریحات کے بعد کسی
سچے مسیحی کے لئے ممکن نہ تھا، کہ مسیحیت کو موسوی شریعت سے الگ کرتا، مگر پولوس نے انکے علی الرغم
یہ فیصلہ کیا کہ ہر غیر اسرائیلی مسیحی بن سکتا ہے، خواہ شریعت پر عمل کرے یا نہ کرے، چنانچہ وہ تمام غیر اسرائیلی
مشرکین جو شریعت موسویہ کے کلی یا جزوی طور پر منکر تھے، مسیحیت میں داخل کر لئے گئے،

اس ترمیم و تنسیخ پر عام ناراضی کا اظہار کیا گیا (اعمال باب ۲۱) اور خود مسیحیت کے اعیان نے
بھی اس کی سخت مخالفت کی، مگر پولوس نے سینٹ پیٹرس اور سینٹ برناباس جیسے جلیل القدر
حواریوں کو ریاکار اور گمراہ قرار دیا (گلیتوں ۲: ۱۴) اور علی الاعلان شریعت موسویہ کی مخالفت
شروع کردی، وہ گلیتوں کے نام اپنے خط میں لکھتا ہے:۔

"ہم یہ جان کر یسوع مسیح پر ایمان لائے کہ آدمی شریعت کے اعمال سے نہیں بلکہ
صرف یسوع مسیح پر ایمان لانے سے برحق ٹھہرتا ہے .... شریعت کے
اعمال سے کوئی بشر برحق نہ ٹھہریگا .... حقانیت اگر شریعت ہی کے وسیلہ سے
ملتی تو مسیح کا مرنا عبث ہوتا" (۲: ۱۶ - ۲۱)

"جو لوگ شریعت کے اعمال پر تکیہ کرتے ہیں سب لعنت کے ماتحت ہیں ....
شریعت کے وسیلے سے کوئی شخص خدا کے نزدیک راستباز نہیں ٹھہرتا، کیونکہ لکھا ہے کہ
راستباز ایمان سے جیتا رہے گا اور شریعت کو ایمان سے کچھ واسطہ نہیں ....
مسیح نے ہمارے لئے لعنتی بنکر اور ہمیں خرید کر شریعت کی لعنت سے چھڑایا"

(۳: ۱۰ - ۱۳)

"شریعت ایمان (یعنی مسیح کی تعلیم) تک پہنچانے کے لئے ہماری استاد بنی تاکہ
ہم ایمان کے سبب راستباز ٹھہریں، مگر جب ایمان آچکا تو ہم استاد کے ماتحت
نہ رہے" (۳: ۲۴ - ۲۵)

"مسیح نے ہمیں آزاد رہنے کے لئے آزاد کیا ہے، پس قائم رہو، اور دوبارہ غلامی
(یعنی شریعت کی پابندی) کے جوئے میں نہ جتو .... تم جو شریعت کے وسیلہ

[illegible]

[illegible] کے منتظر ہیں [illegible]

[illegible] شریعت سے الگ ہو کر تمدن و معاشرت و سیاست [illegible]

[illegible] زندگی کے تمام [illegible] قوانین منسوخ ہوگئے [illegible]

[illegible] شریعت کے [illegible] ایک خاص قوم کی خاص حالت [illegible]

[illegible] مستقل [illegible] مذہب [illegible]

[illegible] سیرت [illegible] مذہب [illegible]

[illegible]

[illegible] قانون کے [illegible]

[illegible] قوموں کے [illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

... اور سینکڑوں عیسائی عورتوں، مردوں اور بچوں کو روم کے اکھاڑوں میں وحشیانہ کھیلوں
کا تختۂ مشق بنایا جانے لگا۔ ۷۰ء میں تیٹوس (TITUS) کے زیر قیادت بیت المقدس
پر چڑھائی کی گئی۔ ۹۰ ہزار آدمی گرفتار کر کے غلام بنا لئے گئے۔ گیارہ ہزار آدمیوں کو بھوکا مار دیا گیا، ہزاروں آدمی پکڑ کر روم کے
اکھاڑوں اور مصری تھیٹروں میں جنگلی جانوروں کا لقمہ بننے یا سپاہیوں کی شمشیر زنی کا تختۂ مشق بننے کے لئے بھیجے گئے
نیرو کے بعد مارکوس اریلیوس، سپٹیموس سیورس، ڈیسیوس اور ویلیریان نے مسیحیت اور
اس کے پیروؤں کو کچلنے کی کوششیں کیں۔ اور آخر میں ڈایوکلیشیان نے ظلم و ستم کی حد کر دی۔ اس نے عام
حکم جاری کر دیا کہ کلیسا مسمار کر دیئے جائیں، انجیلیں جلا دی جائیں، اور کلیساؤں کے اوقاف ضبط کر لئے
جائیں ۳۰۳ء میں خود شہنشاہ نے نیکومیڈیا کے مرکزی کلیسا کو پیوندِ خاک کر دیا، اور مقدس کتابیں
جلوا دیں ۳۰۴ء میں اس نے عام حکم دیا کہ جو شخص مسیحی مذہب پر اصرار کرے وہ قتل کر دیا جائے۔ اس کے
بعد سختیاں اور بڑھیں یہاں تک کہ جو لوگ مسیحی مذہب چھوڑنے سے انکار کرتے ان کے بدن زخمی کر کے
ان پر سرکہ اور نمک ڈالا جاتا اور بعد میں ان کی بوٹی بوٹی کاٹی جاتی تھی، بعض اوقات ان کو کنیسوں میں
بند کر کے آگ لگا دی جاتی، اور زیادہ لطف اٹھانے کے لئے ایک ایک عیسائی کو پکڑ کر دہکتے ہوئے
انگاروں پر لٹا دیا جاتا تھا، یا لوہے کے کانٹے اس کے بدن میں بھونکے جاتے تھے، یہ وہ وقت تھا جب کہ
تمام سلطنت میں عیسائی پھیلے ہوئے تھے، سلطنت کے بڑے سے بڑے اور چھوٹے سے چھوٹے
عہدے بکثرت ان کے ہاتھ میں تھے اور خود شہنشاہ کے قصر میں عیسائیوں کی ایک کثیر جماعت موجود
تھی لیکن مسیحیوں کو یقین دلایا گیا تھا کہ اس کثرت و قوت کے زمانہ میں بھی وہی شریر کا مقابلہ نہ کرنے
اور ایک گال کے ساتھ دوسرا گال بھی پیش کر دینے کی تعلیم واجب العمل ہے جو اسرائیلیوں کو انتہائی
بے بسی اور کمزوری کی حالت میں دی گئی تھی، اس لئے شام، فلسطین، عراق، مصر، افریقہ، اسپین، گال،
سسلی، اٹلی، الیریا، ایشیائے کوچک غرض کہیں بھی کسی عیسائی نے ان مظالم پر دم نہ مارا اور ساری
قوم ان تجاوزات کو خود کشانہ بے عملی کے ساتھ برداشت کرتی رہی۔[1][2] حالانکہ رسول عربی صلعم کی امت

[1] GIBBON VOL. II. CH. 16 - EARLY DAYS OF CHRISTIANITY. P. 48 & 89

[2] CONSTANTINE THE GREAT BY REUCUTTS. P.P. 55-60

ں کو جہاد کی تعلیم دی گئی تھی جب ڈھائی تین سو کی تعداد ہو چکی تھی تو اس نے تمام عرب کو ایک وقت
چیلنج دیدیا اور دنیا کو بتا دیا کہ جس قوم میں یہ مجاہدانہ اسپرٹ موجود ہو وہ قلت تعداد اور بے سروسامانی
کے باوجود کسی سے دب کر نہیں رہ سکتی۔

یہ تو مسیحیت کی تفریط تھی۔ اس کے بعد جب قسطنطین اعظم نے اس کو قبول کر لیا اور وہ عملاً سلطنت کا
مذہب بن گئی تو وہ تفریط کے انتہائی نقطہ سے افراط کے انتہائی نقطہ پر پہونچ گئی۔ پہلی خرابی تو اس سے
پیدا ہوئی تھی کہ ہو بہو مسیحیت کو سیاست و تمدن سے کوئی تعلق نہ تھا۔ اس کے پیروؤں نے اپنے مذہب
کی پابندی کرتے ہوئے ایک خالص انفعالی زندگی اختیار کر رکھی تھی۔ مگر جب اتفاق وقت سے ان
پر سلطنت کی ذمہ داریاں آن پڑیں تو دوسری اور پہلے سے زیادہ شدید خرابی یہ پیدا ہوئی کہ جہانبانی
و حکمرانی کے لئے مسیحیت نے ان کی کوئی رہنمائی نہ کی تھی۔ معاملات سلطنت میں تو جنگ بھی ہے صلح بھی
ہے، سیاست بھی ہے، تعزیر بھی ہے، انتقام بھی ہے، عفو بھی ہے۔ مگر موسوی شریعت سے بدلی ہوئی
مسیحیت کے پاس ان میں سے کسی کام کے لئے بھی کوئی ضابطہ و قانون اور دستور العمل موجود نہ تھا۔ اس نے
زندگی کے معاملات کے لئے بجز اس ایک قانون کے کہ شریر کا مقابلہ نہ کر، اور اگر تیری قمیص لے تو چوغہ
بھی اتار دے، اور کوئی قانون نہ بنایا تھا۔ مگر اس انفعال و تذلل کی تعلیم کے تنگ دائرے میں رہ کر مسیحیوں
کے لئے ناممکن تھا کہ سلطنت کے اہم معاملات کو انجام دے سکتے۔ اس لئے وہ اس دائرے کو توڑ دینے
پر مجبور ہوئے۔ اور جب اسے توڑ کر باہر نکل آئے تو وہ اپنے نفس کی خواہشات کی پیروی کرنے میں بالکل آزاد
تھے کیونکہ اس عملی دنیا میں ان کے لئے کوئی ایسی دینی ہدایت اور الٰہی روشنی موجود نہ تھی جو صحیح
راستہ دکھا سکتی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ عیسائیوں نے خدا کی زمین میں فتنہ و فساد برپا کرنا شروع کیا اور طغیان
و سرکشی کا ایسا ہنگامہ برپا کیا کہ آج تک سرد نہ ہو سکا۔

قسطنطین کے عہد میں سلطنت کے تقریباً نصف باشندے صنم پرست تھے۔ اس لئے
ان لوگوں پر زیادہ ظلم کرنے کی جرأت نہ کی۔ اور صرف اسی پر اکتفا کیا کہ مندروں کے دروازے
بند کر دئیے، ان کی چھتیں منہدم کرا دیں، بتوں کے پردے اور زیور اتروا لئے، اور ان کو معبدوں سے باہر پھینکوا دیا۔
چند سال بعد جب کلیسا کو مکمل اقتدار حاصل ہو گیا تو مسیحیت کے معتقدوں نے وثنیت کو بیخ

CUTTS, CONSTANTINE THE GREAT P.278

[illegible] اور [illegible] قوانین کے حسب ذیل دو اصول مقرر کئے جن سے غیر مذاہب کو جڑ سے مٹانے کے سب تمام احکام مستنبط ہوتے تھے۔

(۱) جن [illegible] کو مجسٹریٹ منع نہ کرے یا ان پر سزا نہ دے ان کی ذمہ داری میں وہ خود بھی ایک حد تک شریک ہوتا ہے۔

(۲) مصنوعی دیوتاؤں اور حقیقی ارواح خبیثہ کی بت پرستانہ عبادت خالق برتر کی بزرگی کے خلاف سخت قابل نفرت جرم ہے،

ان اصول موضوعہ کو عملی جامہ پہنانے کے لئے سب سے پہلے رومن سینٹ نے باضابطہ قرار [illegible] کی کہ رومیوں کا مذہب جوپیٹر (JUPITER) کی عبادت نہیں بلکہ مسیح کی عبادت ہے۔ اس کے بعد بتوں کی پرستش، اور ان پر نذر و نیاز چڑھانا، اور قربانیاں کرنا سب کچھ قانوناً ممنوع قرار دیدیا گیا، اور ان افعال کے مرتکبوں کے لئے شدید سزائیں مقرر کی گئیں، شاہ تھیوڈوسیوس نے اپنے فرامین میں ہر قسم کی غیر مسیحی عبادتوں کو خواہ وہ علانیہ کیجائیں یا گھروں میں چھپا کر، حکومت وقت کے خلاف بغاوت، اور جرم مستلزم سزائے موت قرار دیا، اس کے ساتھ ہی اس نے مندروں کو توڑنے، ان کی جائدادیں ضبط کرنے، اور عبادت کے سامان کو مٹا دینے کا بھی عام حکم دیدیا، اس حکم کے مطابق سب سے پہلے مرکز حکومت میں وثنیت کا جبراً خاتمہ کیا گیا، پھر صوبوں میں یہی مشق کی گئی، گال کے صوبہ میں ٹورس کے بشپ نے دین دار پادریوں کی ایک پوری فوج لے کر مندروں، معبدوں، اور بتوں کو حتی کہ ان درختوں کو بھی جو مقدس سمجھے جاتے تھے پیوند خاک کر دیا، شام میں مسیحیت کے مقدس پیشوا مارسیلوس (MORCELLUS) نے جو حلقہ اپامیا (DI[illegible]C ESS OF [illegible]) کا بشپ تھا جوپیٹر کے عظیم الشان مندر کو تباہ کر دیا، اور ایک پوری فوج فراہم کی جسے ساتھ لیکر وہ اپنے حلقہ کے غیر مسیحی معابد کو توڑتا پھرتا تھا، اسکندریہ میں مصر کے آرچ بشپ تھیوفیلوس (THEOPHILUS) نے سیراپیس کے مندر کو جو یونانی فن تعمیر کا بے نظیر نمونہ تھا، مسمار کر دیا، اس کے کتبخانہ کو جسمیں خاندان بطالسہ نے علوم و فنون کا بہترین ذخیرہ جمع کیا تھا نذر آتش کر دیا،[1] سراپیس کے

---

[1] اس کتبخانہ کو [illegible] دیکھو [illegible] کتبخانہ کی خالی الماریوں کو دیکھکر سر دو دل [illegible] اور [illegible] تعصب [illegible] جو مذہبی تعصب سے بالکل سیاہ نہ ہو گیا ہو، یہی کتبخانہ ہے جس کے جلانے کا الزام بعض عیسائی مورخوں نے مسلمانوں پر لگایا ہے۔

[illegible]

[illegible] دیکھ رہی تھیں [illegible]

[illegible] میں بھی مذہبی دیوتاؤں کی بے پورتی قوت کسی [illegible] نظم و تربیت

[illegible] باشندوں پر حملے کرتی، اور قدیم فن تعمیر کے بہترین نمونوں کو برباد کرتی رہتی تھی

ان مظالم کا نتیجہ یہ ہوا کہ وقتی [illegible] مذہب کو قبول کر لیا [illegible]

[illegible] دل سے پسند نہ کرتی تھی [illegible] اعتقاد [illegible]

[illegible] عظیم الشان سلطنت سے وثنیت کا نام و نشان مٹ گیا [illegible]

[illegible] کے زور سے جیت سکی تھی

[illegible] کے بعد سے مسیحی اور غیر مسیحی سلطنتوں کے ساتھ جب [illegible]

[illegible] کے بادی [illegible]

[illegible] جن کے ہولناک [illegible]

[illegible] استعمال سے جن طریقوں [illegible]

[illegible] جو موریشن [illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible] شخص [illegible]

[illegible] مذہبی عدالت سے [illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

مذہبیت کے احکام میں پابندی کی تو حد سے زیادہ نرم بن گئے، اور مقاومت کی استطاعت کے باوجود ظلم و ستم کو برداشت کرکے تین سو برس تک اپنی قومیت کو تباہ کراتے رہے۔ اور دوسرا نتیجہ یہ ہے کہ جب زمانہ کے انقلاب نے ان کو قوت بخشی اور سلطنت کی ذمہ داریاں ان پر آپڑیں تو انھیں مسیحیت کے تنگ دائرے سے نکلنا پڑا، اور یہاں مذہب کی ہدایت و رہنمائی نہ پاکر انھوں نے اپنے ابنائے نوع پر ہر قسم کے ظلم و ستم کرنے شروع کئے، اور نفس کی پیروی میں آزادی کے ساتھ جو چاہا کیا۔

اس میں شک نہیں کہ ظلم و ستم بعض مسلمان بادشاہوں نے بھی کئے ہیں، جنگ کے وحشیانہ طریقے مسلمانوں کی بھی بعض لڑائیوں میں پائے جاتے ہیں، اور مذہب کے نام پر غیر مذہبی جنگ کرنے کے داغ سے مسلمانوں کا دامن بھی پاک نہیں ہے، مگر دونوں میں اصولی فرق یہ ہے، کہ مسلمانوں کے کسی عمل کی ذمہ داری اسلام پر نہیں آتی، کیونکہ اس نے ان کی تمام فطری ضروریات کے لحاظ سے مکمل قوانین بنا کر دیئے ہیں جنھیں نہ تو غیر طبعی حدود و قیود ہیں کہ ان کی پابندی ناممکن ہو، اور نہ ایسی بے قیدی اور کھلی ہوئی آزادی ہے، کہ انسان جو چاہے کرے، اس لئے پیروانِ اسلام سے جو نامناسب حرکات سرزد ہوتی ہیں وہ دراصل قانون شکنی کی تعریف میں آتی ہیں جنکی کوئی ذمہ داری قانون پر نہیں آتی بخلاف اس کے مسیحیت نے اپنے پیرووں کو ان کی عملی زندگی کے لئے کوئی قانون بنا کر نہیں دیا، اس نے نہیں بتایا کہ اگر دوسری قوموں سے صلح ہو تو کن اصول پر ہو؟ جنگ ہو تو کن مقاصد کے لئے ہو؟ میدانِ جنگ میں جائیں تو دشمن سے کیا برتاؤ کریں؟ دشمن پر فتح پائیں تو اس کے ساتھ کیا سلوک کریں؟ غیر مذاہب کے باشندوں سے مراعات کریں تو کس حد تک؟ اور ان پر سختی کریں تو کن امور میں؟ اس لئے پیروانِ مسیحیت نے پہلے اس کے دائرے میں رہکر اور پھر اس کے دائرے سے نکل کر جتنے اخلاقی گناہ کئے ہیں، اس کی ذمہ داری میں خود مسیحیت بھی شامل ہے، کیونکہ اس نے انھیں سیدھی راہ نہیں بتائی، اسلام کی طرح مسیحیت اپنے پیرووں کے گناہوں سے اس بنا پر تبری نہیں کر سکتی کہ انھوں نے اسکے بتائے ہوئے اصول و قواعد کی پیروی نہیں کی، وہ ان دو صورتوں میں ایک کو اختیار کرنے پر مجبور ہے کہ یا تو ان سب عیسائیوں کو گنہگار قرار دے جنھوں نے سیاست و حکم رانی کی ذمہ داری قبول کی ہے، خواہ حق کے ساتھ اسے انجام دیا ہو یا غیر حق کے ساتھ، یا پھر اسے ان تمام

[illegible]

امور کو بھی مرد یہ جو اوحق کے ساتھ یا غیر حق کے ساتھ تو وہ ان دونوں سے [illegible] کوئی تیسری صورت اختیار نہیں کر سکتی۔ اور یہ بالکل ظاہر ہے کہ یہ دونوں صورتیں غیر معقول ہیں۔

مذاہب اربعہ کی تعلیم پر ایک نظر

ہم نے یہاں جنگ کے مسئلہ میں دنیا کے چار بڑے بڑے ادیان کے مذاہب بیان کر دیے ہیں۔ یہ مذاہب افراط اور تفریط کے دو مختلف نمونے پیش کرتے ہیں۔ مقدم الذکر دو مذہب جنگ کو جائز سمجھتے ہیں مگر اس طرح کہ انسان کو ان تمام اغراض کی جانب جنگ کی اجازت دیتے ہیں جن کے لیے اس کا نفس خواہشمند ہو، وہ اغراض و مقاصد میں حق و ناحق کا تمیز نہیں کرتے، انسان کے سامنے کوئی بلند نصب العین نہیں پیش کرتے، اس کو کسی اخلاقی مقصد کی طرف توجہ نہیں دلاتے بلکہ خالص حیوانی فطرت پر اس کو یہ حق دیتے ہیں کہ اپنے ابنائے جنس پر جب چاہے جس طرح چاہے جس غرض کے لیے چاہے دست درازی کرے اور جو کچھ چاہے ان سے حاصل کر لے۔ تہذیب کی جانب اگر کچھ پیش قدمی کی بھی ہے تو وہ صرف اتنی کہ اس دست درازی کے کچھ ضابطے مقرر کر دیے ہیں۔ اپنے پیروؤں سے مطالبہ یہ ہے کہ جب بھی وہ اپنے ابنائے جنس کو شکار بنائیں تو فلاں طریقے سے کریں اور فلاں طریقے سے نہ کریں۔ [illegible] جماعتِ انسانی دو اصول پر تقسیم کی ہے [illegible] سے باقی تمام ابنائے نوع [illegible] کہ انسان کو خود [illegible] کا شکار کرنے کی [illegible] انتہائی مقصد [illegible] جاتا ہے وہ [illegible] سے جنگ [illegible] کرتے گئے ہیں۔ اللہ نے انسان کی [illegible] کے لیے [illegible] قوتیں ودیعت کی ہیں، وہ ان [illegible] دیتے ہیں [illegible] کی کوشش کرتے ہیں [illegible] جو [illegible]

ہوتی ہیں جس پر نہیں ... نفس و شہوت کی تسکین کی جیسی صورت ہو کرتے ہیں ...

یقیناً فطرت نے جب آپ کو ان کی تعلیم کے قابل نہیں پایا تو وہ اپنے انسانی فرائض ادا کرنے پر مجبور ہوتے ہیں تو ان کو زندگی کے کسی شعبہ میں ہدایت کی روشنی نہیں ملتی اور وہ ناچار خود اپنے ... قیاس ... پر اعتماد کر کے کبھی ادھر بھی ادھر بھٹکتے پھرتے ہیں۔ افراط و تفریط کے ان دو انتہائی نقطوں کے درمیان اسلام نے توسط و اعتدال کی ایک درمیانی راہ پیدا کی ہے۔ وہ انسانی فطرت انسانی ضروریات کے صحیح تقاضا اور ... انسانیت کی اصلاح کے مقصد کو پیش نظر رکھ کر جنگ کو دو حصوں پر تقسیم کرتا ہے۔ ایک ... جو ملک و مال، جاہ و اقتدار اور نفسانی اغراض کے حصول کیلئے کیجاتی ہے۔ اور دوسری وہ جنگ جو حق کی حفاظت اور ظلم وغیرہ کو دفع کرنے کے لئے کیجاتی ہے۔ پہلی جنگ کو وہ فتنہ و فساد سے تعبیر کرتا ہے اور اس کو ایک بدترین معصیت قرار دیکر اس سے کامل اجتناب کا حکم دیتا ہے۔ دوسری جنگ اس کے نزدیک اگر خالص حق کے لئے کیجائے اور اس میں کوئی نفسانی غرض شامل نہ ہو تو وہ جہاد فی سبیل اللہ ہے۔ ایک بہترین عبادت ہے۔ ایک مقدس ترین فرض ہے۔ اور ایک ایسی چیز ہے جس سے زیادہ افضل و احسن انسانی خدمت کوئی نہیں ہے پھر اس عبادت کے لئے اس نے حدود مقرر کئے ہیں، اس کے مواقع بتائے ہیں، اس کے مقاصد کی تفصیل کی ہے۔ اور اس کے طریقے پوری وضاحت کے ساتھ بیان کئے ہیں تاکہ خدا کے نام سے شیطان کی عبادت نہ ہونے لگے، اور انسان اپنے نفسانی میلانات و خواہشات کی پابندی اختیار کر کے غلط راستے پر نہ پڑ جائیں۔ یہ ایک ایسا مکمل ضابطہ قانون ہے جس کی نظیر اسلام کے سوا کسی مذہب اور کسی تہذیب میں نہیں پائی جاتی۔ کہیں مناہج عمل تجویز ہیں تو مقاصد کار کی تعیین نہیں ہے کہیں مقاصد کار موجود ہیں تو مناہج کار کا پتہ نہیں، کہیں مقاصد و مناہج کو کسی حد تک مقرر کیا گیا ہے، تو اس میں وہ بلندی و فضیلت نہیں ہے جو اسلام کی امتیازی خصوصیت ہے۔ یہ حقیقت آج قطعی طور پر آشکار ہے، کہ جنگ کو کامل طریقہ پر کسی قدرتی حدود میں محدود کرنے، اور اسے ایک نظام عدل کے درجہ تک اور معصیت سے نیکی اور فرض کے درجہ تک پہونچانے کی اگر کسی نے کوشش کی ہے تو وہ صرف اسلام ہے۔ اور اسی کے قانون کو اختیار کر کے دنیا اس لعنت سے بھی بچ سکتی ہے جس کا نام "جنگ" ہے۔ اور اس لعنت سے بھی بچ سکتی ہے جس کا نام غلامی و تعبد ہے۔

جنگ تہذیب جدید میں

اب تک جو کچھ کہا گیا وہ زیادہ تر مذہبی گروہ کی تسکین کے لئے تھا۔ مذاہب و ادیان کے تقابل
ے کسی مذہبی قانون کی صداقت وحقانیت کا اثبات صرف انھیں لوگوں کے حق میں مفید ہوسکتا
ہ جو مذہب کو صداقت کا معیار تسلیم کرتے ہوں۔ لیکن دنیا میں ایک گروہ ایسا بھی ہے جس کے
یک صداقت کا معیار مذہب نہیں بلکہ تہذیب حاضر ہے۔ یہ لوگ مذہب کو عہد قدیم کی ایک
رس گراں کار رفتہ سمجھتے ہیں۔ ان کی رائے میں صدیوں پہلے کے نکلے ہوئے اور احکام و قوانین
قابل نہیں ہیں کہ انسان کی موجودہ ترقی یافتہ زندگی کا دستور العمل بن سکیں۔ ان کا خیال ہے
نسانی دماغ نے علم وفن کی ترقی اور تہذیب وتمدن کے نشوونما سے آج جو مناہج اور قوانین
ت وضع کئے ہیں وہی صحیح ہیں، اور وہی صحت و درستی کا معیار بن سکتے ہیں۔ اس خیال کے لوگ
ے گذشتہ مباحث کو دیکھیں گے تو بلا تامل کہدیں گے کہ بیشک اسلام نے اپنے عہد کی تہذیب
بڑی قابل قدر اصلاح کی، اور جنگ کے لیے مقاصد و مناہج کی طرف انسان کی رہنمائی
یں سے اس کے ہمعصر تمدن اور ادیان ناآشنا تھے، مگر آج صدیوں کی ترقیات کے
ے متعلق انسانی نظریہ میں جو جوش پیدا ہوگیا ہے، اور اس کی بدولت جو ضابطے و قوانین
ب وجود میں آئے ہیں ان سے اس عہد کے قوانین و افکار کا کیا مقابلہ ہوسکتا ہے جب کہ
ن کے قوے فکریہ نسبتاً عالم طفلی میں تھے؟ اس کے جواب میں ایک دوسرے تقابل کی
رت ہے جس میں اسلام اور تہذیب جدید کو آمنے سامنے رکھ کر دیکھا جائے کہ جنگ کے متعلق
ے کے مقاصد ومناہج زیادہ صحیح، زیادہ مفید اور زیادہ منضبط ہیں۔ یہی تقابل اس باب
موضوع سخن ہے۔

قبل اس کے کہ اس تقابل کا سلسلہ شروع کیا جائے یہ سمجھ لینا ضروری ہے کہ ہمیں

ہے کہ مغربی تہذیب کا جنگی قانون معلوم کرنے کے لیے کس چیز کی طرف رجوع کرنا چاہیے۔ ایک
مسئلہ میں کسی انسانی جماعت کے عقائد اور طریقہ کار کا حال عموماً تین چیزوں سے معلوم ہوتا ہے: ایک
مذہب، دوسرے ادبیات، تیسرے حیاتِ اجتماعیہ کا تعامل۔ ان تینوں چیزوں میں سب سے زیادہ قطعی
و یقینی چیز جو اس جماعت کے اصلی خیالات کی مظہر اور اس کے حقیقی قانونِ عمل پر حجت بن سکتی ہے
مذہب ہے۔ لیکن مغربی اقوام جس مذہب کی پیرو ہیں اس میں سرے سے جنگ کا کوئی وجود ہی
نہیں ہے، اور حقیقۃً ان کی پوری تہذیب میں مذہب کا عامل سب سے زیادہ کمزور اور بے اثر ہے۔ اس لیے
مذہب کے ذریعہ سے ہم بالکل نہیں معلوم کر سکتے کہ مغربی تہذیب میں جنگ کے جائز و ناجائز مقاصد کے
درمیان تمیز کے اصول کیا ہیں، اور جنگ کے واقع ہونے کی صورت میں ان کے طریقِ عمل کو کن
قواعد سے منضبط کیا جاتا ہے؟ اب رہی دوسری چیز یعنی ادبیات، سو اس میں شک نہیں کہ اس کا
ایک بہت بڑا ذخیرہ مغرب میں موجود ہے۔ مغربی فقہا اور علمائے اخلاق نے جنگ اور متعلقاتِ جنگ
پر بہت کچھ لکھا ہے، اور ہر پہلو سے ان پر بحث کی ہے۔ لیکن اس قسم کے اہلِ قلم حضرات کے افادات
کو قومی افکار کے نشوونما میں خواہ کتنا ہی گہرا اثر حاصل ہو، اور سوسائٹی کے قوانین کی تشکیل
میں ان کے خیالات نے کیسا ہی زبردست حصہ لیا ہو، مگر وہ خود اپنے اندر کوئی ایسی قوت نہیں رکھتے
جس کی بنا پر ان کو کسی انسانی جماعت کے لیے قابلِ احتجاج قرار دیا جا سکتا ہو۔ دنیا کے بڑے سے
بڑے مصنف کو بھی یہ فخر حاصل نہیں ہے کہ اس کا کوئی قول اس کی قوم کے لیے قانون کی حیثیت
رکھتا ہو۔ یہ ضرور ممکن ہے کہ اس کے اقوال سے متاثر ہو کر اس کی قوم نے اپنے لیے بہت سے
قوانین بنا لیے ہوں، مگر وہ قوانین اس قوم پر اس دلیل سے حجت نہیں ہوں گے کہ وہ فلاں مصنف
کے اقوال ہیں، بلکہ اس بنا پر حجت ہوں گے کہ انہیں اس نے اپنے لیے قانون کے طور پر تسلیم
کر لیا ہے۔ پس جنگ کے مسئلہ میں ہمارے لیے وہ وسیع لٹریچر بھی بیکار ہے جو مغربی زبانوں
میں علمائے مغرب کی قابلِ قدر کوششوں نے مہیا کیا ہے۔ اب صرف تیسری چیز رہ جاتی ہے،
جس سے ہم مغربی تہذیب کے مقاصد و مناہجِ جنگ معلوم کر سکتے ہیں، اور وہ مغربی اقوام کا تعامل
ہے۔ یہ تعامل دو قسم کا ہے: ایک مدوّن یا لکھا ہوا (Written) جسے اصطلاح میں بین الملی
قانون (International law) کہتے ہیں، دوسرا غیر مدوّن یا بے لکھا (Unwritten

[illegible]

جنگ کا اخلاقی پہلو

[illegible]

میں لکھتا ہے :-

"جدید بین الملی قانون ان اخلاقی مسائل سے بالکل ناآشنا ہے، وہ ان کے متعلق کچھ نہیں کہتا، بلکہ انھیں صاف نظر انداز کر جاتا ہے۔ اس کے نزدیک جنگ خواہ حق بجانب ہو خواہ غیر حق بجانب، منصفانہ ہو یا غیر منصفانہ، بہرحال وہ فریقین کے تعلقات کو متعدد و مختلف صورتوں سے بدل دیتی ہے، اور اس لحاظ سے قانون کا کام صرف یہ ہے کہ وہ اس تغیر کے حدود اور قانونی صورتوں کو واضح کر دے، وہ ہم کو صرف یہ بتائے گا کہ کس طرح محاربیت (Belligerency) کا تعلق پیدا ہوتا ہے اور محاربین ایک دوسرے کے متعلق اور غیر جانبداروں کے متعلق کیا حقوق و فرائض رکھتے ہیں .... اخلاقی سوالات بذات خود خواہ کتنے ہی غور و توجہ کے مستحق ہوں، لیکن ایک بین الملی قانون کی کتاب میں وہ اسی قدر بے محل ہیں، جس قدر شخصی مراتب کے قانون میں اخلاقیاتِ ازدواج کا سوال ہو سکتا ہے[1]۔"

ایک جرمن مصنف الیتس باخر (Eltzbacher) لکھتا ہے :-

"بین الملی قانون نے ہمیشہ جنگی اعمال پر صرف اس قسم کی پابندیاں عائد کی ہیں جنکو مقاصدِ جنگ سے قابل لحاظ حد تک تعرض کئے بغیر مرعی و ملحوظ رکھنا ممکن ہو۔ اس نے صرف یہ تجویز کرنے پر اکتفا کی ہے کہ حتی الامکان دشمن کو غیر ضروری نقصانات سے معاف رکھا جائے، یعنی ایسے نقصانات پہونچانے سے پرہیز کیا جائے جو کسی طرح مقاصدِ جنگ کے حصول میں مددگار نہیں ہوتے، یا اپنے ماحصل کی نسبت سے بہت زیادہ گراں قدر ہوتے ہیں[2]۔"

پروفیسر نولڈ لکھتا ہے :-

"اس بنا پر جنگ میں گناہ کا سوال بین الملی قانون کا سوال نہیں ہے، بلکہ

---

[1] Principles of International law ص 292

[2] Yoler und Leberden Vilkerrecht 112 .

نظریات کا سوال ہے بین الملی قانون کسی جائز و ناجائز جنگ میں تمیز نہیں کر سکتا کیونکہ جنگ بین الملی قانون کے نقطۂ نظر سے ہمیشہ قانون کی مقرر سمجھی جاتی ہے"

غیر مدون قانون سے استفسار اس سے معلوم ہوا کہ جہاں تک لکھے ہوئے یا مدون بین الملی قانون کا تعلق ہے، اس میں حق اور ناحق یا جائز و ناجائز جنگ کے درمیان کوئی امتیاز قائم نہیں کیا گیا ہے، اور اس سے ہم یہ نہیں معلوم کر سکتے کہ مغربی تہذیب کن مقاصد کے لئے جنگ کو جائز رکھتی ہے، اور کن کے لئے ناجائز؟ لیکن جیسا کہ ڈاکٹر باقی نے کہا ہے ایک بین الملی قانون غیر مدون یا بے لکھا بھی ہے، اور اصلی قانون وہی ہے، اس لئے اب ہم کو دیکھنا چاہئے کہ اس بارے میں مغرب کی مہذب ترین قوموں کا عمل کیا ہے؟ وہ قومیں جن کا عمل تہذیب جدید کا معیار ہے، جن کی حرکات و سکنات تہذیب سازی کا درجہ رکھتی ہیں اور جن کے کردار و گفتار کے سوا کسی دوسری چیز کو تہذیب جدید سے تعبیر بھی نہیں کیا جا سکتا، ان کے درمیان جب جنگ برپا ہوتی ہے، تو کن اغراض و مقاصد کے لئے ہوتی ہے؟ اور کس قسم کی جنگ کو ان کے یہاں حق و انصاف کی جنگ کہا جاتا ہے؟ اس کے لئے ہم ان چھوٹی چھوٹی لڑائیوں سے بحث نہیں کریں گے جو انیسویں اور بیسویں صدی میں مہذب اور مغربی نقطۂ نظر سے غیر مہذب قوموں یا مہذب قوموں کی ایک قلیل جماعت کے درمیان ہوئیں کیونکہ ان میں جو کچھ ہوا اس کو ہم مغربی تہذیب کا مکمل نمونہ نہیں کہہ سکتے۔ ان سب کو چھوڑ کر ہم صرف بیسویں صدی کی اس جنگ عظیم پر نظر ڈالتے ہیں جس میں مغربی تہذیب کے تمام علمبردار شامل تھے [illegible] جن کی مجلس عالم میں دنیا کے تمدن کی تمام مہذب قوموں کی نمائندگی ہوتی تھی۔ اس جنگ کی روداد ہم کو بتا سکتی ہے کہ مغربی تہذیب کی نگاہ میں جائز و ناجائز جنگ کے امتیاز کا [illegible] معیار کیا ہے؟

جنگ عظیم کے اسباب و وجوہ [illegible] کی جنگ عظیم دراصل یورپ کی بڑی بڑی قوموں کے درمیان ہوئی تھی، اگرچہ ضمنی طور پر دوسری چھوٹی بڑی قومیں بھی اس میں شامل ہوئی تھیں

اس میں ایک فریق جرمنی و آسٹریا پر مشتمل تھا اور دوسرا فریق انگلستان، فرانس، روس اور اٹلی پر۔
یہ دو مقابل جتھے جن قوموں سے مرکب تھے ان میں باہم شدید اور تاریخی عداوتیں تھیں۔ انگلستان
اور فرانس قدیم دشمن تھے یہاں تک کہ ۱۸۹۸ء میں مسئلہ سوڈان پر اس کی جنگ ہوتے ہوتے رہ گئی تھی۔
روس اور انگلستان کے درمیان سخت رقابت تھی حتی کہ بیسویں صدی کے آغاز تک ہندوستان
پر روس کے حملہ کا خطرہ ہر وقت انگریزی سلطنت کو آمادۂ جنگ رکھتا تھا۔ اسی طرح فرانس اور اٹلی سے
دونوں سے جرمنی کی تقریباً نصف قرن سے عداوت و رقابت کا منبع بنا ہوا تھا۔ اور اسی کی بدولت
عین آغاز جنگ عظیم تک اٹلی جرمنی کے ساتھ حلیفانہ اتحاد رکھتا تھا لیکن بیسویں صدی کے ابتدائی
عشرہ میں ان معاند قوموں کے درمیان چند ایسے اغراض و مقاصد کا رشتہ پیدا ہو گیا جن کے باعث
وہ سب متحد ہو گئیں اور ایک دوسرے جتھے کے خلاف دوش بدوش جنگ میں شریک ہوئیں۔
دوسری طرف جرمنی ۱۸۹۸ء تک انگلستان کا دوست رہا۔ اٹلی سے ۱۹۱۴ء تک اس کے حلیفانہ تعلقات
رہے۔ روس ۱۹۰۵ء تک اس کا دوست تھا بلکہ زار و قیصر کے درمیان جنگ کی ابتدا تک گہرے دوستانہ
تعلقات تھے مگر چند دوسری اغراض تھیں جنہوں نے اس دوستی کو دشمنی میں تبدیل کر دیا۔ اور جرمنی کو
آسٹریا کے ساتھ متحد ہو کر اپنے ان قدیم دوستوں کے خلاف جنگ کرنی پڑی جو ایک زمانہ
میں اس کے حلیف رہ چکے تھے۔

قوموں کی جتھہ بندی
یہ خاص اغراض کیا تھیں؟ مذہب کا کوئی سوال نہ تھا کہ سب کے سب
عیسائی تھے۔ نسل و قومیت کا بھی کوئی سوال نہ تھا۔ کہ کسی نے کسی پر حملہ نہ کیا تھا۔ حقوق کا بھی
کوئی سوال نہ تھا کہ سب اپنے اپنے حقوق سے پوری طرح متمتع ہو رہے تھے۔ پھر کیا چیز تھی جس نے
ان کو ایک دوسرے کے خلاف لڑنے پر آمادہ کیا؟ تاریخ کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ چیز
سوائے اس کے اور کچھ نہ تھی کہ ہر قوم اپنے حصہ سے کچھ زیادہ لینا چاہتی تھی۔ اور ہر فریق کی خواہش
یہ تھی کہ دوسرے فریق کو مٹا کر اس کے منافع سے خود مستفید ہو۔ ان کے درمیان عداوت کا پہلا
بیج ۱۸۷۰ء میں بویا گیا جب کہ جرمنی نے فرانس سے السیس اور لورین کے علاقے چھین لیے۔ باوجودیکہ
السیس کی بیشتر آبادی جرمن النسل تھی۔ اور لورین کی آبادی کا ایک بڑا حصہ نسلی اور لسانی حیثیت
سے جرمن تھا، لیکن فرانس نے اس کو اپنی ایک قومی حق تلفی قرار دیا۔ اور اس وقت سے فرانسیسی

سیاست [illegible] نصب العین [illegible]

بعد جرمنی کی تجارت و صنعت نے ترقی شروع کی یہاں تک کہ انیسویں صدی کے اختتام پر

دنیا کا ایک عظیم الشان صناع اور تاجر ملک بن گیا۔ ۱۸۸۰ء میں اس نے محسوس کیا کہ دنیا کی تجارت

کے تمام وسائل پر انگلستان مسلط ہے اور اس تسلط کو ایک زبردست جنگی بیڑے کے بغیر دور نہیں

کیا جا سکتا چنانچہ اس نے اپنی بحری قوت کو تیزی کے ساتھ ترقی دینی شروع کر دی۔ اس کے بجٹ

خطرے کو انگلستان نے فوراً محسوس کیا اور پہلے اس نے کوشش کی کہ جرمنی کو دوست بنائے ۱۸۹۸ء

سے ۱۹۰۳ء تک مسٹر چیمبرلین [illegible] لینسڈاؤن [illegible] دوسرے [illegible] جرمنی [illegible] دوست

ڈالتے رہے لیکن جرمنی برطانیہ کے بحری اور تجارتی تفوق کو قبول کرنے کے لئے تیار نہیں تھا

خود دنیا کی تجارت میں بالاتر قوت بننا چاہتا تھا۔ اس سے دونوں حریف [illegible]

دنیا کی سیاست میں دفعۃً ایک انقلاب رونما ہوگیا [illegible]

[illegible] انگلستان [illegible]

اس کے جواب میں انگلستان نے [illegible]

چھوڑ کر آئندہ کے لئے اپنی اغراض کے خاطر عہد و پیمان کرے

اس کے بعد ۱۹۰۷ء میں [illegible]

مقاصد [illegible]

[illegible]

[illegible] مل سکتا تھا ان دونوں [illegible]

[illegible]

دنیا تھا جس کے لئے [illegible]

توسیع مملکت اور توسیع تجارت کی [illegible]

[illegible] قبضہ [illegible]

[illegible] ۱۹۰۸ء میں بوسینیا [illegible]

[illegible]

مار دینے میں کامیاب نہیں ہو سکتا تو روس نے اپنے اس قدیم حریف کی طرف دوستی کا ہاتھ بڑھایا اور اسے یقین دلایا کہ کسی مناسب موقعہ پر درہ دانیال اور باسفورس پر قبضہ کرنے میں وہ اس کی مدد کرے گا۔

اس طرح سنہ ۱۹۰۷ء تک دو زبردست جتھے بن گئے، ایک جتھے میں انگلستان، فرانس، اور روس تھے، اور دوسرے میں جرمنی اور آسٹریا۔ پہلے جتھے والوں کے درمیان وجہ اتحاد یہ تھی کہ وہ اپنی سلطنت کو وسیع کرنے اور اپنے تجارتی تفوق کو باقی رکھنے کے لئے جرمنی اور آسٹریا کی مزاحم قوتوں کو دو کرنا چاہتے تھے، اور دوسرے جتھے والوں کو اس خواہش نے متحد کیا تھا، کہ انھیں اپنی سلطنت کو وسیع کرنے اور دنیا کی تجارتی و اقتصادی زندگی پر فوقیت حاصل کرنے کے لئے ایک دوسرے کی مدد درکار تھی۔ اس جتھہ بندی میں ابھی اٹلی پوری طرح شریک نہ تھا، اور بظاہر وہ جرمنی کے ساتھ ایک معاہدۂ اتحاد سے مربوط تھا لیکن کس طرح وہ اپنے جرمن دوست کو چھوڑ کر فرانسیسی دشمن کے ساتھ مل گیا، یہ ایک عجیب داستان ہے۔ اٹلی نے دول خمسہ کے ساتھ اپنے تعلقات و معاہدات کچھ اس ڈھنگ پر رکھے تھے کہ جب اس کو ٹیونس کا قبضہ حاصل کرنے کے لئے فرانس کے خلاف جنگ کی ضرورت ہو تو جرمنی سے حصول امداد کا دعویٰ کر سکے، اور جب آسٹریا کے بعض علاقے (جن پر عرصے سے اٹلی کا دانت تھا) چھیننے کے لئے جنگ کی حاجت پیش آئے تو وہ دول حلفا کی اعانت حاصل کر سکے، جنگ عظیم کے آغاز میں جب اس نے دیکھا کہ انگلستان کی عظیم الشان بحری طاقت فرانس کے ساتھ ہے، اور اس کے مقابلہ پر فرانس نے ٹیونس کا علاقہ فتح کرنے میں جرمنی اس کے کام نہیں آسکتا تو اس نے دفعۃً اپنا رخ دول حلفا کی طرف پھیر دیا، اور حق پرستی کا خرقۂ فریب پہن کر دعویٰ کرنے لگا، کہ ہم جرمنی اور آسٹریا کو باطل پر سمجھتے ہیں، اس لئے ان کا ساتھ نہیں دے سکتے،

جنگ کا آغاز جون ۱۹۱۴ء میں جب آسٹریا کا ولیعہد ایک سربی انارکسٹ کے ہاتھ سے مارا گیا تو فتنہ و فساد کی وہ فصل دفعۃً پک کر کٹنے کے لئے تیار ہو گئی، جس کی تخم ریزی و آبیاری ۴۴ سال سے کی جا رہی تھی، آسٹریا نے سرویا کے سنگ راہ کو ہٹانے کے لئے اس موقع کو غنیمت سمجھا کہ بلقان کی جانب اس کی پیش قدمی میں وہی حائل تھا، جرمنی بھی اپنی تجارتی اسکیم کی تکمیل کے لئے سرویا کا استیصال ضروری سمجھتا تھا، اس لئے وہ بھی آسٹریا کا ہمنوا ہو گیا، دوسری طرف روس سرویا کا اپنا چھوٹا

بھائی سمجھتا تھا، اور حقیقت میں اس کی تمام [illegible] جرمنی [illegible]

[illegible] کے استیصال میں کامیابی ہو گئی تو پھر بلقان پر اس کے تسلط کو کوئی چیز نہ روک سکے گی

اس لئے وہ اپنے چھوٹے بھائی کی حمایت پر کھڑا ہو گیا، ادھر فرانس کو خطرہ تھا کہ روس اور سرویا کو

مغلوب کرکے جرمنی اور آسٹریا کی قوت اتنی بڑھ جائیگی کہ السس اور لورین کو واپس لینا تو درکنار خود

پیرس پر بھی قابض رہنا ناممکن ہو جائیگا، اس لئے وہ بھی روس کے ساتھ جنگ پر آمادہ ہو گیا، ان

حلیفوں کے بعد انگلستان کے لئے علیحدہ رہنا ناممکن تھا، اس حق پرست نے اپنے ذمہ بہت سی اخلاقی

ذمہ داریاں لے رکھی تھیں جنکی انجام دہی کے لئے ضروری تھا کہ جرمنی کے بڑھتے ہوئے خطرہ کو مٹایا جائے

بحری اور تجارتی تفوق کے راستے سے ہمیشہ کیلئے ہٹا دیا جاتا، اس لئے وہ بھی ہتھیار لے کر اٹھ کھڑا ہوا، اور

دنیا میں "مہذب قوموں" کی وہ عظیم الشان جنگ برپا ہوئی جس کے سامنے پچھلی غیر مہذب قوموں

کی لڑائیاں ہیچ ہو گئیں۔

شرکائے جنگ کے اغراض و مقاصد اس جنگ میں شریک ہونے والی ہر قوم کا دعویٰ یہ

تھا کہ وہ اپنے مقدس حقوق کی حفاظت کے لئے جنگ پر مجبور ہوئی ہے اور صرف اپنے حقوق

کی حفاظت نہیں بلکہ دنیا کی دوسری ضعیف و کمزور قوموں کو آزادی دلانا اور جابر و ظالم قوتوں کو

مغلوب کرکے دنیا میں حق و انصاف اور امن و امان کا بول بالا کرنا بھی ان کا مقصد تھا [illegible]

دوران جنگ میں اور اختتام جنگ کے بعد ان حق پرستوں نے جس طرح قوموں اور ملکوں [illegible]

[illegible] دین کیا، اور سلطنتوں کا بانٹ [illegible] قوموں کی [illegible] [illegible]

[illegible] دیکھ کر معلوم ہو جاتا ہے کہ [illegible] تہذیب میں حق [illegible] کیا ہے

۱۹۱۶ء میں آسٹریا ہنگری کے [illegible] کارل نے [illegible] اپنے [illegible] سے [illegible]

انگلستان فرانس [illegible] کے ساتھ علیحدہ صلح کرنے، اس مقصد کے [illegible]

[illegible] Secret [illegible] کی معرفت [illegible] سے گفت و شنید کا سلسلہ

شروع کیا تھا، اور اس گفت و شنید کے تمام [illegible] سے خود اپنے قلم سے لکھے تھے، [illegible]

[illegible] Peace [illegible] کی تقدیم [illegible] نام سے شائع ہوئے [illegible]

مطالعہ سے اس کاروبار کی پوری حقیقت معلوم ہوتی ہے [illegible] قوموں کی [illegible]

فرانس اور انگلستان نے اٹلی کو اس وعدے کے ساتھ شرکت جنگ پر آمادہ کیا تھا کہ آسٹریا کا جنوبی علاقہ اس کے حصہ میں دیا جائیگا اس تقسیم کی بنا پر اٹلی نے آسٹریا کے ساتھ علیحدہ صلح کی مخالفت کی فرانس خصوصیت کے ساتھ یہ چاہتا تھا کہ آسٹریا کو جرمنی سے توڑ لے اس لئے اس نے قبول صلح کیلئے اٹلی پر بہت زور دیا لیکن اٹلی نے اس کی اتنی سختی کے ساتھ مخالفت کی کہ دول حلفا کو یہاں تک اندیشہ پیدا ہو گیا کہ کہیں وہ "حق" کا ساتھ چھوڑ کر "باطل" (یعنی جرمنی!) کے ساتھ نہ ہو جائے، ایم پال کامبوں جو اس وقت لندن میں فرانس کا سفیر تھا پرنس سکستہ سے ایک ملاقات کے دوران میں کہتا ہے کہ:-

"اٹلی کی حرص اسے ہر قسم کی بدمعاشیوں پر آمادہ کر سکتی ہے[1]"

ایک دوسری ملاقات میں وہ بیان کرتا ہے کہ

"اٹلی نے بار بار اس امر کا اعلان کیا ہے کہ وہ جنگ میں محض ان علاقوں کو حاصل کرنے کے لئے شریک ہوا ہے جنکو وہ آسٹریا سے حاصل کرنے کی خواہش رکھتا تھا[2]"

پال کامبوں کا بھائی ایم ژول کامبوں جو پہلے برلن میں فرانس کا سفیر تھا اس گفت وشنید کی مخالفت اس بنا پر کرتا ہے کہ:-

"اگر آسٹریا کے ساتھ صلح کر لی گئی تو بلاشک وریب اس صلحنامہ پر دستخط ہونے کے ۴۸ گھنٹے کے اندر اندر اٹلی جرمنی کی گود میں ہوگا[3]"

ایک دوسرے موقع پر وہ کہتا ہے کہ:-

"اٹلی ہمارے لئے کچھ نہیں کریگا، وہ صرف ایک ہی خیال رکھتا ہے اور وہ یہ ہے کہ جنگ کے بعد جب دوسرے حلفا بالکل تھک کر چور ہو چکے ہوں تو وہ اقتصادی جدوجہد میں ان پر سبقت لیجانے کی کوشش کرے[4]"

یہ ان "حق پرستوں" کے اندرونی مقاصد تھے اور یہ خیالات تھے ان لوگوں کے خود ایک دوسرے کے متعلق جو باہم مل کر "حق" کی خاطر جنگ کر رہے تھے آخر جب یہ بات تحقیق ہو گئی کہ اٹلی کسی طرح

---

[1] Austria's peace offer P 28 [2] P 173 "
[3] P 173 "

توسیعِ مملکت کے ارادوں کو چھوڑ کر [illegible] ہیں سے توس کے حق پرست
حلیفوں نے آسٹریا سے [illegible] کہ تم [illegible] سے ان علاقوں کو چھوڑ دو جن کی وہ طمع رکھتا ہے اور اس کے
عوض ہم تم کو سلیشیا اور بویریا کے علاقے جرمنی سے چھین کر دلوا دیں گے، جیسا کہ معلوم ہے یہ دونوں
صوبے خالص جرمن نسل کے لوگوں سے آباد ہیں اور جرمنوں کے وطن قومی کے غیر منفک اجزا
ہیں لیکن "حق پرست" اتحادی ان کو بالکل اس طرح آسٹریا کے حوالے کرنے پر آمادہ ہوگئے گویا
وہ انھیں کی ملک ہیں اور لطف یہ ہے کہ "حق پرست" آسٹریا نے بھی انھیں قبول کرنے سے اس بنا پر
انکار نہیں کیا کہ وہ اس کے دوست جرمنی کے علاقے تھے بلکہ صرف اس بنا پر کیا کہ وہ فی الحال غیر
کی ملک نہیں ہے اور یہ امر مشتبہ تھا کہ فرانس انھیں چھین کر اس کے حوالے کرنے کی قدرت بھی
رکھتا ہے یا نہیں! اس کے بعد کچھ اور علاقوں کی تلاش شروع ہوئی تاکہ انھیں آسٹریا کے حوالے
کرکے اس کے نقصان کی تلافی کی جائے پہلے طرابلس پر نگاہ دوڑائی گئی مگر اٹلی نے اسے چھوڑنے سے
انکار کر دیا، کیونکہ وہ قدیم رومن سلطنت کا خواب دیکھ رہا تھا اور اس کے لیے قرطاجنہ کا پورا
رقبہ اسے درکار تھا، پھر مصوع ([illegible]) اور سومالی لینڈ پر نظر گئی، لیکن ان دونوں
علاقوں سے کوئی خاص دلچسپی نہ رکھتا تھا اور آسٹریا بھی انھیں قبول کرنے پر راضی تھا، لیکن
بعض وجوہ کی بنا پر یہ معاملہ بھی نہ پٹ سکا، اور اٹلی کی طمع کی بنا پر دول حلفا کے ساتھ آسٹریا کے
مذاکرات صلح منقطع ہوگئے۔

خفیہ معاہدات | اس کاروبار کی داستان کا ایک دوسرا باب وہ خفیہ معاہدات ہیں جو
دورانِ جنگ میں دول حلفا کے درمیان ہوئے تھے۔ ان معاہدات کو [illegible] میں روس کی
بالشویکی حکومت نے شائع کر دیا تھا جس نے "حق پرست" اتحادیوں کے ارادوں و منصوبوں
کی اصلی تصویر دکھا کر دنیا کو حیران کر دیا۔ ان کی کوئی دفعہ ایسی نہیں ہے جس میں مخالف سلطنتوں
کے کسی نہ کسی علاقہ یا ان کی اقتصادی ثروت کے کسی نہ کسی حصے کو دول حلفا میں تقسیم
کیا ہو۔ [illegible] شدہ امر یہ تھا کہ السیس اور لورین کو جرمنی سے چھین لیا جائے باوجودیکہ یہ دونوں
صوبے زیادہ تر جرمنی نسل کے لوگوں سے آباد ہیں اور جغرافی حیثیت سے بھی ان کا تعلق [illegible]

کے مقابلہ میں جرمنی سے زیادہ ہے، لیکن صرف اس دلیل کی بنا پر اُن کو فرانس سے ملحق کرنے کی تجویز کی گئی کہ وہ ۱۸۷۰ء سے پہلے فرانس کے قبضہ میں تھے، دوسری بات یہ طے ہوئی کہ دریائے رہائن کے مغرب میں جرمنی کا جتنا علاقہ ہے، سب فرانس سے ملحق کردیا جائے، اس تجویز کو فرانس اور روس نے خود اپنے حلیف انگلستان تک سے پوشیدہ رکھا اور اس کا اظہار اس وقت کیا گیا جب جنگ ختم ہونے کے بعد مجلس صلح میں غنائم جنگ کی تقسیم شروع ہوئی، تیسرا فیصلہ یہ تھا کہ مراکو کو جواب تک فرانسیسی سیادت میں تھا، فرانسیسی مقبوضہ تسلیم کیا جائے، نیز جرمنی کے تمام افریقی مقبوضات اس کے حصے میں آئیں اور ٹرکی کے ترکہ میں سے بھی اس کو کافی حصہ دیا جائے،

یہ تو حق پرست فرانس کا حصہ تھا، اس کے ساتھ ہی اٹلی کو بھی مطمئن کرنا ضرور تھا، کیونکہ وہ بیچارہ محض "حق" کی خاطر "باطل" کا ساتھ چھوڑ کر جنگ میں شریک ہوا تھا، اس کے لئے ترنتینو، ٹریسٹ اور جنوبی تیرول کے علاقے مخصوص کئے گئے، بحر ایڈریاٹک کے پورے سواحل اور جزائر بھی اس کے حصے میں آئے اور ٹرکی کے مقبوضات میں سے تھے اس کو بہت کچھ دینے کا وعدہ کیا گیا،

روس میں ابھی تک انقلاب نہیں ہوا تھا اور "حق" کا سب سے بڑا علمبردار یعنی زار وہاں حکمراں تھا، اس لئے اس کاروبار میں اس کی شرکت بھی ضروری تھی، اس کے ساتھ پہلا سمجھوتہ پولینڈ کے متعلق ہوا جس کا مفاد یہ تھا کہ اسکی روح حریت کو فنا کرنے کے لئے روس کو ہر مناسب اور ممکن کارروائی کرنے کا اختیار حاصل ہے، یہ وہی پولینڈ ہے جس کو آغاز جنگ میں آزادی کی امید لائی گئی تھی، اور اختتام جنگ کے بعد محض بولشویکوں کی ضد پر جس کی پشتیبانی کا فرض دوبارہ فرانس نے اپنے ذمہ لے لیا،

دوسرا عہد نامہ قسطنطنیہ اور آبناؤں کے متعلق تھا، اعلان جنگ سے چھ مہینہ پہلے فروری ۱۹۱۴ء ہی میں روس کی کراون کونسل نے یہ فیصلہ کردیا تھا کہ اب درۂ دانیال اور باسفورس کے الحاق میں زیادہ تاخیر مناسب نہیں ہے، چنانچہ ابتداءً اسی غرض کے لئے جنگی تیاریاں شروع کردی گئی تھیں، جب جنگ شروع ہوئی تو روس کو سب سے پہلے اپنے اس منصوبے کی تکمیل کا خیال پیدا ہوا، اور ۱۹۱۵ء کے خفیہ عہد نامہ میں اس نے اپنے اتحادیوں سے یہ تسلیم کرالیا کہ جنگ کے غنائم میں سے اس کو درۂ دانیال، باسفورس، قسطنطنیہ اور ایشیائے کوچک کا مشرقی حصہ ضرور دیا جائیگا

۱۹۲۲ء کا ایک روسی مورخ میرن کارنٹ [illegible] لکھتا ہے کہ

''اس خفیہ عہدنامے کی رو سے دولت عثمانیہ اور آسٹریا ہنگری غنائم جنگ قرار دیے گئے جنھیں اتحادیوں کے درمیان تقسیم کرنے کا فیصلہ کرلیا گیا۔ اس تقسیم میں قسطنطنیہ و دردانیال باسفورس قطعی طور پر روس کو تفویض کیے گئے تھے۔''

اب رہ گیا انگلستان جو تمام ''حق پرستوں'' کی رہنمائی کررہا تھا سو اس نے اپنے لیے جرمنی کے افریقی اور ایشیائی مستعمرات کو کافی نہیں سمجھا اور ایک دوسرا میدان پیدا کیا جو اس کی ہمت عالی کے شایان شان تھا۔ ترکی سے اعلان جنگ کے ۵ مہینے بعد مارچ ۱۹۱۵ء میں اس نے فرانس کے ساتھ ایک ابتدائی خفیہ معاہدہ کیا جس میں بلاد عرب کو دو منطقوں پر تقسیم کیا گیا تھا ایک منطقہ شام دوسرا منطقہ عراق۔ پہلا منطقہ فرانسیسی نفوذ و اثر کے ماتحت تسلیم کیا گیا اور دوسرے منطقہ پر برطانی سلطنت کے حقوق قائم ہوگئے۔ اس تقسیم کی کامیابی بغیر اس کے ممکن نہ تھی کہ خود اہل عرب میں برطانیہ و فرانس کا ہاتھ بٹاتے، اور اہل عرب کے لیے یہ بہت مشکل تھا کہ اپنے وطن کی اس تقسیم [illegible] ہونے کے بعد اس کی فتح میں خود دشمنوں کے معین و مددگار بننا قبول کرتے [illegible] یہ چال چلی گئی کہ تقسیم کے ابتدائی معاہدہ کو بالکل خفیہ رکھا گیا اور عرب لیڈروں [illegible] دلایا گیا کہ اگر انھوں نے دول حلفاء کے ساتھ مل کر عرب میں ترکی حکومت [illegible] اس کے عوض ایک آزاد عربی سلطنت قائم کی جائیگی جو جنوبی عراق و فلسطین [illegible] سوا تمام ممالک عربیہ پر حاوی ہوگی۔ اس آزادی کے خوش نما خواب نے عرب [illegible] نئی روح پھونک دی۔ اور اکتوبر ۱۹۱۵ء میں [illegible] برطانیہ و فرانس نے خفیہ معاہدہ [illegible] انھوں نے سر ہنری میکموہن کی معرفت دول حلفاء کے ساتھ ایک معاہدہ [illegible] جس کی [illegible] ان کی پوری قوت دول حلفاء کے ساتھ ہوگی اور اس کے عوض ان کو [illegible] میثاق مل گیا کہ اختتام جنگ کے بعد عربی ممالک کو ایک مستقل سلطنت بنا دیا جائیگا [illegible] کے بعد جون ۱۹۱۶ء میں شریف حسین نے ترکی کے خلاف بغاوت کا اعلان [illegible] ق، شام، اور فلسطین میں بھی بغاوت کی آگ بھڑک اٹھی [illegible] گئی کہ ممالک عربیہ میں ترکی حکومت [illegible] ٹھہر سکی [illegible]

نہ ہو حاصل ہو جائیں گے۔ اس لئے نومبر ۱۹۱۵ء میں دونوں سلطنتوں کے درمیان پھر گفت و شنید ہوئی، اور ایک دوسرا خفیہ عہدنامہ طے ہوا جو معاہدہ سائکس پیکو کے نام سے مشہور ہے، اس معاہدہ میں طے ہوا کہ عراق کلیۃً برطانیہ کے قبضہ میں رہے گا، شام تمامہا فرانسیسی سلطنت کے دائرے میں رکھا جائیگا، فلسطین ایک بین الملی علاقہ ہوگا، اور حیفا اپنے بندرگاہ سمیت برطانیہ کے سپرد کیا جائیگا، باقی رہے وہ ممالک جو عراق اور سواحل شام کے درمیان واقع ہیں، سو ان کو دو حلقوں میں تقسیم کیا جائے گا، ایک حلقہ برطانیہ کے زیر اثر ہوگا اور دوسرا فرانس کے زیر اثر، اس معاہدے میں انگریزی نمایندے سر مارک سائکس نے موصل کو فرانسیسی اثر میں دینے پر اتفاق کر لیا تھا، کیونکہ اس سے پہلے ۱۹۱۵ء کے ایک خفیہ عہدنامہ کی رو سے یہ طے ہو چکا تھا کہ ارمینیہ، مشرقی کردستان اور ٹرکی کے وہ علاقے جو سرحد موصل سے متصل ہیں، روس کے حصہ میں دیئے جائیں گے، اور برطانی سیاست اس امر کی مقتضی تھی کہ اس کی سرحد روس کی سرحد سے نہ ملنے پائے، لہذا اس نے روس کی ہمسایگی کے سیاسی خطرات سے بچنے کے لئے برطانی اور روسی علاقہ کے درمیان ایک فرانسیسی علاقہ کو حائل کر دینا مناسب سمجھا، لیکن موصل کے چشمہائے روغن نفت پر ابتدا سے برطانیہ کا دانت تھا، اس لئے جب روسی خطرہ جاتا رہا تو اس نے فرانس کی دوستی کی پرواہ کئے بغیر آخر انھیں حاصل کر کے چھوڑا،

جنگ کے بعد ملکوں کی تقسیم، یہ ارادے اور منصوبے تھے جنھیں لے کر "حق پرست" مغربی قومیں جنگ میں شریک ہوئی تھیں، آئیے اب ہم دیکھیں کہ جنگ کے بعد انھوں نے اپنی حق پرستی کا کس طرح ثبوت دیا،

جنگ کے آخری ایام میں دو واقعات ایسے پیش آگئے جنھوں نے اس نقشہ کو بہت کچھ بدل دیا جو ۱۹۱۵ء اور ۱۹۱۷ء کے درمیان خفیہ معاہدوں نے قایم کیا تھا، ان میں سے ایک واقعہ تو امریکہ کا شریک جنگ ہونا تھا، اور دوسرا روس کا انقلاب، امریکہ نے یورپ کے معاملات سے بے تعلق رہنے کی قدیم پالیسی کو چھوڑ کر جنگ میں صرف اس لئے شرکت کی تھی کہ اپنی تجارت کی کامیابی کے لئے وہ امن کا خواستگار تھا، لہذا اس کی انتہائی کوشش یہ تھی کہ جنگ کے بعد غنائم جنگ کی تقسیم میں ایسی بے اعتدالیاں نہ ہونے پائیں جن سے ایک دوسری جنگ

بنیہ درپیش تھی۔ دوسری طرف روس جس شاہی حکومت کے ماتحت جنگ میں شریک
ما، ۱۹۱۷ء کے آخر میں اس کا تختہ الٹ گیا، اور اس پر بولشویک جماعت کو غلبہ حاصل ہو گیا جو
نگلستان فرانس اور اٹلی کی اغراض کے لئے جرمنی سے بھی زیادہ خطرناک تھی، اس لئے غنائم جنگ
ی تقسیم میں روس کا جو حصہ مقرر کیا گیا تھا وہ سارا کا سارا منسوخ کر دیا گیا، اور حق پرست اتحادیوں
و ایک نیا نقشہ بنانا پڑا جس میں امریکہ کے امن خواہانہ جذبات کی رعایت بھی ضروری تھی،

بیان کیا جا چکا ہے کہ ۱۹۱۶ء کے خفیہ معاہدے میں فرانس نے روس کے ساتھ مل کر یہ طے کیا
ما کہ دریائے رہائن کے مغربی جانب کا تمام علاقہ جرمنی سے چھین کر فرانس کے ساتھ ملحق کر دیا جا
ن زمانہ میں پرنس سکستہ نے جب صدر جمہوریہ فرانس ایم پوانکارہ سے علاقہ رہائن کو منطقہ حیادی
(neutralised zone) قرار دینے کی تجویز کی تھی تو حق پرست فرانس
کے صدر نے مسکرا کر کہا تھا کہ :۔

"آدمی کے لئے یہ ضروری نہیں ہے کہ جو کچھ دل میں ہو اس کو ہمیشہ ظاہر بھی کر دیا کرے
مثلاً میرے خیالات بھی وہی ہیں جو آپ کے ہیں"

اس طرح فرانس نے دوران جنگ ہی میں جرمنی کے ساتھ وہی عمل کرنے کی ٹھان لی تھی
۱۸۷۰ء میں جرمنی نے اس کے ساتھ کیا تھا لیکن اسے معلوم تھا کہ رہائن کے ... علاقہ ...
ریکہ اور انگلستان دونوں کی پالیسی کے خلاف ہے اس لئے اس نے جنگ کے زمانہ میں
ں ارادہ کو پوشیدہ رکھا، اور اختتام جنگ کے بعد صلح کانفرنس میں ... پیش ...
ن امریکہ اور انگلستان دونوں نے اس تجویز کی سختی کے ساتھ مخالفت کی ... کانفرنس ...
ر تیز گفتگوئیں ہوئیں، اور فرانس کے انتہائی اصرار کے باوجود ...
نی نہ ہوئے، آخر موسیو کلیمنشو نے (جو اس وقت فرانس کے رئیس الوزرا تھے) تجویز ...
جرمنی پر جو تاوان جنگ عائد کیا گیا ہے، اس کی ضمانت کے طور پر رہائن کا علاقہ ... سال ...
سیسی احتلال (... occupation) میں دے دیا جائے، اس تجویز کے ...
فرانس کے بہت سے سیاسیین نہ سمجھ سکے ... فرانس ...

[illegible]

ایم تردن کامبوں اور ایم تاردیو جیسے لوگوں نے اس کی مخالفت کی لیکن جب ایم کلیمنشو نے کھڑے ہو کر بتایا کہ د. ساں کی تعیین کرنے کا مقصد یہ ہے کہ جرمنی کے ہاتھ سے اس کے بہترین علاقے چھین کر اس پر اتنا تاوان ڈالدیا جائے کہ وہ اس کو مدت معینہ کے اندر ادا نہ کرسکے اور ہم پندرہ سال گذرنے کے بعد علاقۂ رہائن کو ہمیشہ کے لئے ملحق کرلیں، تو اس پر تمام ایوان مطمئن ہو گیا، موسیو کلیمنشو کی اس تقریر کا ایک فقرہ خصوصیت کے ساتھ قابل ملاحظہ ہے، جس سے انکی "حق پرستی" کا حال خوب معلوم ہوتا ہے، انھوں نے موسیو پوانکارہ کو خطاب کرکے کہا:۔

"جناب صدر! آپ مجھ سے عمر میں بہت چھوٹے ہیں، ۱۵ سال کے اندر جرمنی کسی طرح معاہدے کی تمام دفعات کو پورا نہ کرسکے گا، اور مجھے یقین ہے کہ ۱۵ سال کے بعد اگر آپ میری قبر پر آنے کی عزت بخشیں گے تو ضرور مجھے خوشخبری دیں گے کہ ہم رہائن پر ہیں اور وہیں رہینگے"

یہ چال کامیاب ہو گئی، فرانس نے اپنے حلیفوں سے اس تجویز کو منظور کرالیا، اور اس کا مقصد پورا کرنے کے لئے جرمنی کو سلیشیا کے کوئلہ کی دولت سے بھی محروم کردیا گیا، تاکہ وہ اس گراں قدر تاوان کو کسی طرح ۱۵ سال کے اندر ادا نہ کرسکے، جو معاہدۂ فرسائی میں اس پر عائد کیا گیا ہے، اس کے ساتھ ہی اس نے پولینڈ کی نئی ریاست کا نقشہ اس طرح مرتب کرایا کہ اس سے مشرقی پروشیا، دولت پروشیا کے باقی علاقوں سے بالکل منقطع ہو گیا ہے، اور ایک ایسی مشکل صورت حال پیدا ہو گئی ہے، جس کا حل بغیر اس کے نہیں ہوسکتا کہ جرمنی جنگ عظیم کے مصائب سے افاقہ پاتے ہی سب سے پہلے پولینڈ کے ساتھ الجھ جائے،

پھر ۱۹۲۲ء میں جب فرانس کو اندیشہ ہوا کہ جرمنی ان تمام باتوں کے باوجود ۱۵ سال کے اندر رہائن کو واگذار کرا لینے میں کامیاب ہوجائیگا، تو اس نے اپنے شکار پر ایک اور ضرب لگا کا فیصلہ کیا، مجلس الوزراء کی مالی کمیٹی کے صدر موسیو داریک اس سوال پر غور کرنے کے لئے مقرر کئے گئے، کہ روہر کے علاقہ پر قبضہ کرنا کس حد تک مفید ہوسکتا ہے؟ انھوں نے کافی عرصہ تک غور کرنے کے بعد مجلس الوزرا کے سامنے ایک خفیہ رپورٹ پیش کی، جسمیں یہ سفارش کی گئی تھی، کہ روہر کے علاقہ پر صرف عارضی ہی نہیں بلکہ مستقل قبضہ کرلیا جائے، چنانچہ اس سفارش

کے مطابق ۱۹۲۳ء کی ابتدا میں فرانس نے روہر [illegible] جرمنی کو اس سے محروم کر دیا جس پر اس کی صنعتی و معاشی زندگی کا تمام تر انحصار تھا [illegible] اس رپورٹ میں جس وجہ کی بنا پر یہ مقابلہ کی گئی وہ بھی خود انہیں کی زبان سے سنئے وہ لکھتے ہیں کہ:-

"۱۹۱۳ء میں تمام جرمنی کی کانوں سے ۱۹۰ ملین ٹن کوئلہ نکلا تھا جس میں سے ۱۱۵ ملین ٹن صرف روہر کا تھا اس میں سے دو ملین ٹن کے قریب کوک بنایا گیا اور [illegible] ملین ٹن [illegible] پیدا کرنے میں اور [illegible] ملین ٹن دوسرے [illegible] میں استعمال کیا گیا دیگر معادن جو جرمنی میں تقریباً [illegible] ملین ٹن نکلتے تھے ان میں سے [illegible] ملین ٹن صرف روہر کے تھے علاوہ ازیں [illegible] کارخانوں سے [illegible] وہ تمام چیزیں [illegible] رنگ سازی [illegible] کارخانے روہر ہی میں ہیں جو دنیا میں [illegible] رنگ [illegible] کے تمام [illegible] سب سے بڑے [illegible] اور یہ سب [illegible] جنگ کے [illegible] ان تمام ضروریات کے لئے [illegible] روہر کا محتاج ہے کیونکہ [illegible] جو [illegible] اس کے پاس اور کوئی [illegible] نہیں رہا ہے [illegible]"

یہی حال دوسری [illegible] کا بھی ہے [illegible] ٹن [illegible] ملین ٹن [illegible] اپر سلیشیا [illegible] سے نکل چکے ہیں

ان بیانات سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ روہر کے احتلال کا مقصد صرف یہ تھا کہ جرمنی کو اس کے وسائل ثروت سے محروم کر کے بھوکا مار دیا جائے اور فرانس نہ صرف ان وسائل سے مستفید ہو بلکہ اس کے ساتھ ہی تاوانِ جنگ وصول نہ ہونے کے بہانہ سے رہائن کے مغربی علاقے پر بھی دائمی تسلط قائم کرلے،

دوسری طرف اٹلی کے حریصانہ مقاصد پورے کرنے کے لئے اسے نہ صرف ترییسٹہ اور ترنتینو کے علاقے دیئے گئے، بلکہ جنوبی تیرول (TYROL) کا علاقہ بھی اس سے ملحق کردیا گیا جو زیادہ تر جرمن قوم سے آباد ہے، باقی رہے ایڈریاٹک کے سواحل و جزائر، سو اگرچہ خفیہ معاہدات کی رو سے وہ اٹلی کا حصہ قرار پائے تھے لیکن اختتامِ جنگ پر سرویا کا ایک نئی سیاسی قوت کی شکل میں نمودار ہونا اس منصوبے کی تکمیل میں حائل ہوگیا، اور ایڈریاٹک کی تقسیم کچھ اس صورت سے کی گئی کہ نہ اٹلی کے مقاصد اس سے پورے ہوتے ہیں اور نہ یوگوسلافیا کے، چنانچہ دونوں قوموں کے درمیان باہم کشمکش جاری ہے، اور کوئی نہیں کہہ سکتا کہ اس کا انجام کب جنگ کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے،

یورپ کو اس غیر متناسب نقشہ پر تقسیم کرنے کے خطرات کو خود ان لوگوں نے محسوس کرلیا تھا جو اس وقت دنیا کی قسمت کا فیصلہ کر رہے تھے، چنانچہ ۱۹۱۹ء میں برطانیہ کے وزیر اعظم مسٹر لائڈ جارج نے صلح کانفرنس کے سامنے ایک یادداشت پیش کی تھی، جس میں انھوں نے جرمن قوم کے لاکھوں افراد کو دوسری حکومتوں کے تسلط میں دینے کو ایک خطرناک فعل بتایا تھا، اور کہا تھا کہ یہ حرکت یورپ کو دوبارہ جنگ کی مصیبت میں مبتلا کردیگی، اس یادداشت کے یہ الفاظ خصوصیت کے ساتھ قابلِ غور ہیں:۔

"یورپ کے ایک سرے سے دوسرے تک عام باشندے موجودہ نظامِ حیات پر سیاسی، معاشی اور اجتماعی، تمام حیثیات سے معترض ہیں،"...... سب سے بڑا خطرہ جو مجھے اس صورتِ حال میں نظر آرہا ہے، یہ ہے کہ کہیں جرمنی اپنی قسمت بولشوزم کے ساتھ وابستہ نہ کردے، اور اپنے وسائلِ ثروت، اپنے دماغ اور اپنی زبردست تنظیمی قوت ان انقلابی مجنونوں کے ہاتھ میں نہ دیدے

جو دنیا کو [illegible]

مسٹر لائڈ جارج کوئی بے بس اخبار نویس نہ تھے، بلکہ اس وقت صلح کانفرنس کے چار رکنی [illegible] میں سب سے زیادہ بااثر شخصیت کے مالک تھے، اگر وہ چاہتے تو یورپ کو ایسے غیر متناسب طریقہ پر تقسیم نہ کرتے جس کے خطرات وہ خود اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے تھے، لیکن حرص و طمع نے "ان حق پرستی" نے جسکی خاطر دول حلفا جنگ میں شریک ہوئے تھے انکو اور ان کے رفقا کو وہ سب کچھ کرنے پر آمادہ کردیا جسے خود وہ بھی ایک دوسری جنگ کا پیش خیمہ سمجھتے تھے.

یہ "حق پرستی" کا مظاہرہ تو یورپ میں ہوا، آؤ اب ایشیا کو دیکھیں کہ یہاں "حق کی خاطر" جنگ کرنے والوں نے لڑائی جیتنے کے بعد کیا کیا۔ عرب کی تقسیم کے متعلق ۱۹۱۵ء اور ۱۹۱۶ء میں جو خفیہ سمجھوتے ہوئے تھے، ان کا حال اوپر گذر چکا ہے، ان سمجھوتوں کے متعلق دوران جنگ ہی میں عراق، شام اور فلسطین برطانیہ اور فرانس کے درمیان تقسیم ہو چکے تھے، لیکن جنگ کے آخر تک عربوں کو برابر یقین دلایا جاتا رہا کہ یہ جنگ محض ان کو ترکی کے پنجہ ستم سے آزاد کرانے اور ان کو ایک مستقل سلطنت بنانے کے لئے لڑی جا رہی ہے۔ [illegible] ۱۹۱۷ء میں جب جنرل سر اسٹینلے ماؤڈ (MAUD) بغداد میں داخل ہوا تو اس نے اہل عراق کے نام ایک عام اعلان شائع کیا جس کے الفاظ یہ تھے:-

"ہم آپ کے شہر میں فاتحانہ حیثیت سے داخل نہیں ہوئے ہیں، ہم آپ کے دشمن نہیں ہیں بلکہ نجات دہندہ ہونے کی حیثیت سے آپ کو آزادی دلوانے آئے ہیں......... بغداد کے باشندوں کو جان لینا چاہئے کہ ہم ان کے ملک پر حکومت نہیں کرنا چاہتے، ہمارا مقصد تو یہ ہے کہ ان کے علما و فقہا کی دیرینہ آرزوئیں پوری ہوں، ان کا ملک ایک مرتبہ پھر زندہ ہو، اور اس میں ایسے آئین و قوانین نافذ ہوں، جو ان کی مقدس شریعت اور قومی روایات کے مطابق ہوں"

جنگ کے خاتمہ پر بھی فرانس اور انگلستان کی جانب سے ایک مشترک [illegible] بلاد عرب میں شائع کیا گیا جسمیں نہایت بلند آہنگی سے یہ [illegible]

یہ جنگ جو دنیا کو جرمنی کے مطامع استعمار یہ سے بچانے کے لئے برپا کی
گئی تھی اس کے خطرات و مصائب کو مشرق تک وسیع کرنے کی وجہ
صرف یہ تھی کہ برطانیہ اور فرانس ان تمام قوموں کو جو ایک طویل زمانہ سے
ترکوں کے جور وستم کی تختۂ مشق بنی ہوئی تھیں کامل آزادی دلانا چاہتے تھے
اور ان کا مقصد یہ تھا کہ ایسی وطنی حکومتیں اور ادارات قائم کئے جائیں جو
خود ان قوموں کی اپنی رغبت و خواہش پر مبنی ہوں اور جنمیں کوئی دوسرا
دخیل نہ ہو "

لیکن ان لفظی علانات کے ساتھ جب عربوں نے اتحادیوں کا عمل یہ دیکھا کہ شام کے سواحل پر فرانس کی فوجیں مسلط ہیں اور عراق و فلسطین میں انگریزوں کا پنجۂ استبداد مستولی ہے تو ان کو معلوم ہو گیا کہ حقیقۃً ان کے ساتھ غدر کیا گیا ہے، اور یہ چال محض ترکوں اور عربوں میں نفاق ڈال کر ملک چھیننے کے لئے چلی گئی ہے، آخر انھوں نے عراق، شام اور فلسطین میں آزادی کی جد وجہد شروع کی اور شام میں امیر فیصل بن حسین کے ماتحت ایک وطنی حکومت قائم کر دی، اسی اثنا میں خود حلفاء کے درمیان غنائم جنگ کی تقسیم پر تنافس و تباغض کا سلسلہ شروع ہو گیا، سائکس پیکو کے معاہدہ کی رو سے موصل کا علاقہ فرانسیسی منطقۂ نفوذ میں دیا گیا تھا، مگر وہاں تیل کے چشموں کی کثرت دیکھ کر برطانیہ کے جذبۂ حرص کو حرکت ہوئی اور اس نے خود اس پر قبضہ کر لیا، اسی طرح فلسطین کے متعلق یہ طے ہوا تھا کہ وہ ایک بین الدولی علاقہ رہے گا اور صرف حیفا پر برطانی حکومت قائم ہو گی، مگر مصر کی شورش نے برطانیہ کو مجبور کر دیا کہ ہندوستان کے راستہ کی حفاظت کے لئے نہر سویز کے دوسری جانب بھی اپنے اقتدار کو مضبوط کرلے، اور ممکن ہو تو حیفا سے بصرہ تک ایک دوسرا راستہ اپنے لئے پیدا کرے لہذا فلسطین پر بھی اس نے پورا پورا قبضہ جمانے کا تہیہ کر لیا، دوسری طرف شام پر بھی فرانسیسی نفوذ و اثر برطانیہ کو ناگوار تھا اور وہ اپنی مصلحت کے لئے زیادہ بہتر یہ سمجھتا تھا کہ اس کے زیر اثر کوئی وطنی حکومت وہاں قائم ہو جائے، ان مسائل پر تقریباً ڈیڑھ سال تک دونوں دوستوں میں کشمکش ہوتی رہی، اور لوٹ کے مال کی تقسیم کا کوئی فیصلہ نہ ہو سکا

مگر جب دونوں سلطنتوں نے اس باہمی نزاع کا نتیجہ یہ دیکھا کہ عرب کی وطنی تحریک ترقی کر رہی ہے تو وہ تا اپنے مشترک فوائد کی خاطر عربوں کے خلاف متحد ہو گئے اور اپریل ۱۹۲۰ء میں بمقام [illegible] سان ریمو انھوں نے یہ تصفیہ کر لیا کہ عراق و فلسطین برطانیہ کے قبضہ میں رہیں اور شام [illegible] کے قبضہ میں۔ یہ تقسیم کسی طرح اس تقسیم سے مختلف نہ تھی جو ڈاکوؤں کے گروہ [illegible] بعد کیا کرتے ہیں، مگر یورپ کے مہذب ڈاکوؤں نے اس کو بھی حق اور انصاف [illegible] کی اور دنیا کو دھوکہ دینے کے لئے ظاہر کیا کہ یہ تینوں [illegible] جمعیت اقوام کی طرف [illegible] دیئے گئے ہیں، حالانکہ نہ کسی جمعیت اقوام کو یہ حق ہو سکتا تھا کہ کسی قوم کو بھیڑ بکریوں کی طرح [illegible] قوم کی ملک میں دیدے، نہ اس وقت تک جمعیت اقوام کا کوئی اجتماع ہوا تھا [illegible] متعلق کوئی فیصلہ کیا گیا تھا۔ بہر حال اس قرارداد کے مطابق شام فرانس کی ملک [illegible] جنرل گورو نے ایک لاکھ فوج کے ساتھ شامیوں کی قومی حکومت پر حملہ کر دیا اور انھیں [illegible] تلوار کے زور سے اطاعت و بندگی پر مجبور کیا جنھیں چار سال پہلے دوست بنایا گیا تھا [illegible] ترکوں کو شکست دیکر ملک فتح کیا گیا تھا جنھوں دو سال پہلے تک یقین دلایا گیا تھا [illegible] آزاد کرنے کے لئے جنگ کر رہے ہیں، جن سے جنگ کے بعد تک یہ وعدہ کیا جاتا تھا کہ [illegible] ملک پر خود تمھاری حکومت ہوگی۔"

دوسری طرف اہل عراق کو جو برطانی انتداب کا اعلان سنتے ہی [illegible] تلوار کے زور سے کچل دیا گیا جس زمین پر جابر ترکوں نے کبھی [illegible] تھی، اس پر نجات دہندہ سلطنت برطانیہ نے [illegible] زمین پر "ظالم" ترکوں نے سالانہ دو سو سے زیادہ [illegible] برطانیوں نے [illegible] موسم گرما ۱۹۲۰ء میں [illegible] اس وقت کیا گیا جب کہ انھیں عربوں سے یہ کہہ [illegible] ہمارے دشمن بنکر نہیں آئے بلکہ تم کو آزادی دلوانے [illegible]

[illegible] انتداب [illegible] جمعیت [illegible] کا پہلا عام اجتماع [illegible] میں ہوا۔

وہ تخت سے بعد برطانیہ نے ایک طرف نئے معاہدہ کی ظاہری حرمت برقرار رکھنے کے لئے اور دوسری طرف اس برطانی پبلک کو مطمئن کرنے کے لئے جو عراق میں دس کروڑ پونڈ سالانہ کے بیش اسراف سے سخت ناراض تھی، یہ ضروری سمجھا کہ عراق پر براہ راست حکومت کرنے کے بجائے ایک ایسی نام نہاد وطنی حکومت قایم کردی جائے جو جنرل ماڈ کے اعلان کے برعکس اہل عراق کی نہیں بلکہ اہل برطانیہ کی خواہش کی تابع ہو، اس غرض کے لئے اُس نے ۱۹۲۱ء کے موسم بہار میں اعلان کیا کہ اہل عراق کو خود اپنا بادشاہ منتخب کرنے کا اختیار ہے، لیکن اس اعلان کی تعمیل یوں کی گئی کہ اہل عراق کو انتخاب کا کوئی حق نہیں دیا گیا، ان کی خواہش کے برعکس فیصل بن حسین کو جو شام کے تخت سے محروم ہونے کے بعد کسی اور تخت کا خواہشمند تھا، اس شرط پر تخت عراق کے لئے نامزد کیا گیا کہ وہ برطانیہ کے زیر اثر رہ کر کام کریگا، اہل عراق کسی طرح فیصل کی بادشاہت پر راضی نہ تھے مگر برطانیہ نے زبردستی ان کی آواز کو دبایا، عراق کے بااثر لیڈر طالب پاشا (جس نے جنگ کے زمانہ میں برطانیہ کی عظیم الشان خدمات انجام دی تھیں) کو گرفتار کر کے لنکا میں قید کردیا، اور عراق کی بڑھتی ہوئی ناراضی کا دفع مارنے کے لئے ۲۳ اگست ۱۹۲۹ء کو ایسی حالت میں شاہ فیصل کی تخت نشینی کا اعلان کرادیا جب کہ فی الحقیقت "تخت" تیار بھی نہ تھا، اور شراب کے پیپے رکھکر ایک عارضی "تخت" بنالیا گیا تھا،

اس طرح فیصل کو عراق کا بادشاہ بنانے کے بعد برطانیہ نے اور اسی برطانیہ نے جو عراقیوں کو نجات دلانے کے لئے عراق گیا تھا، تخت شاہی کی قیمت طلب کی، وہ قیمت کیا تھی؟ وہ صرف یہ تھی کہ عراق کو ایک ایسا معاہدہ کرنے پر مجبور کیا گیا جس کی رو سے وہ بالواسطہ پورے طور پر برطانی اثر و اقتدار کے تحت آجاتا ہے، اور اس کی قسمت کا فیصلہ ہمیشہ کے لئے برطانیہ کے ہاتھ میں رہتا ہے، یہ معاہدہ عراقی قوم کو ایک لمحہ کے لئے بھی منظور نہ تھا مگر دنیا کو دھوکہ دینے کے لئے اس پر عراقی قوم کی رضامندی ثبت کرانے کا یہ انوکھا طریقہ ایجاد کیا گیا کہ اسے آدھی رات کو عراق کی مجلس وطنی میں پیش کیا گیا، ارکان مجلس کو بستروں سے اٹھا اٹھا کر پولیس کی معرفت بلوایا گیا، اور جبراً ان سے ووٹ لے کر اعلان کردیا گیا کہ عراقی پارلیمنٹ نے معاہدہ کی تصدیق کردی ہے۔

اب ہی ٹرکی کی دوسری تقسیم جس کے متعلق [illegible] میں روس سے سمجھوتہ ہوا تھا سو اس کو
بولشویک انقلاب کے باعث منسوخ کر دیا گیا، اور ایک دوسری اسکیم بنائی گئی جس میں روس
کے بجائے یونان کو ٹرکی کے ترکہ کا وارث قرار دیا گیا، اس اسکیم کے مطابق یونان نے مشرقی تھریس
اور سمرنا پر حملہ کیا اور ترکوں کو ان کے اصلی وطن کے بھی ایک بڑے حصہ سے محروم کر دیا، اس کے
ساتھ ہی برطانیہ، فرانس، اور یونان کی متحدہ فوجوں نے خاص شہر قسطنطنیہ پر بھی قبضہ کر لیا، اور
درۂ دانیال و باسفورس کے وہ راستے ترکوں سے چھین لئے جنھیں پہلے روس کو دینے کا وعدہ
کیا گیا تھا، یہ دوسری تقسیم بعد کو لوزان کانفرنس میں منسوخ ہو گئی لیکن اس تنسیخ میں انصاف
پسندی کے جذبہ کو کوئی دخل نہ تھا بلکہ حقیقۃً اس کی ذمہ داری محض ترکی تلوار پر تھی جس نے یونان
اور دول حلفا کو ترکی خاک سے نکل جانے پر مجبور کر دیا،

جنگ کے جائز مقاصد، یہ ان قوموں کے جنگی اعمال کی روداد ہے جو تہذیب مغرب کی
علمبردار ہیں، بلکہ حقیقۃً انھیں کی تہذیب کا نام مغربی تہذیب ہے۔ یورپ کے چند اہل بصیرت
فلسفیوں اور عالموں کو چھوڑ کر جنکا درحقیقت کوئی اثر نہیں ہے، باقی تمام انگلستان، فرانس،
اٹلی، جرمنی اور آسٹریا کی رائے عام ان اعمال کی موید تھی، اور اسی کی پرجوش مدد سے ان
سلطنتوں کے مدبرین اتنی بڑی جنگ کرنے میں کامیاب ہوئے، اس لئے ان کے تمام
طرز طریق کار کو دیکھ کر ہم یہ نتیجہ نکالنے میں حق بجانب ہیں کہ جنگ سے پہلے، جنگ کے دوران میں
اور جنگ کے بعد جو جو افعال "حق" اور "انصاف" کے نام سے کئے گئے، وہی دراصل
مغربی تہذیب میں "حق" اور "انصاف" کے معنی موضوع لہ ہیں، اور ایسے ہی حقوق کے
لئے تلوار اٹھانا مغربی تہذیب جائز رکھتی ہے،

اس معیار کے مطابق جنگ کے وہ مقاصد جو مغربی تہذیب میں جائز رکھے گئے ہیں،
حسب ذیل قرار پاتے ہیں:۔

۱- اپنی تجارت کو فروغ دینے کے لئے دنیا کی ثروت کا اجارہ حاصل کرنا،
۲- اگر کوئی حریف تجارت وصنعت کے میدان میں آگے بڑھ رہا ہو تو اس کو [illegible]
۳- اپنے دور دراز کے مقبوضات کے راستہ میں جو ممالک واقع ہوں انھیں اپنے زیر [illegible]

... دوسروں کی سلطنتوں کے حصے بخرے کرنا، اور کمزور قوموں کو غلام بنانا۔

۵۔ اگر کسی قوم سے دشمنی ہو جائے، خواہ کسی وجہ سے ہو، تو اسے مٹا دینا یا کم از کم اس کا زور توڑ دینا۔

ان اغراض کو جنھیں اکثر "مقدس حقوق" سے تعبیر کیا گیا ہے کسی توضیح و تشریح کی روشنی درکار نہیں ہے، ہر شخص کا ضمیر خود ان کے جواز و عدم جواز اور تقدس و عدم تقدس کا فیصلہ کر سکتا ہے۔ ممکن ہے کہ بعض حضرات اس طریق استدلال کو مبالغہ اور غلو پر مبنی قرار دیں، مگر ہماری سمجھ میں نہیں آتا کہ مغربی قوموں کے اجتماعی عمل کے سوا مغربی تہذیب اور کس چیز کا نام ہو سکتا ہے؟ مذہب قابل استناد ہو سکتا تھا، مگر نہ تو یورپین قومیں اس کو اپنی سیاست میں دخل دینے کی اجازت دیتی ہیں، اور نہ وہ خود سیاسی امور سے تعلق رکھنا پسند کرتا ہے، قانون کو بھی معتبر سمجھا جا سکتا مگر آپ سن چکے ہیں کہ وہ جنگ کے جائز اور ناجائز مقاصد سے کوئی بحث ہی نہیں کرتا۔ اب دونوں چیزوں کو الگ الگ کر دینے کے بعد ہم مغربی تہذیب کا عقیدہ کس سے دریافت کریں؟ کیا علمائے اخلاقیات سے دریافت کریں؟ کیا امن کا وعظ کہنے والے مفکرین سے دریافت کریں؟ کیا ان مٹھی کے چند مصنفوں اور اخبار نویسوں سے دریافت کریں جن کے قلم سے کبھی کبھی انسانیت اور انسانی اخوت کے دل خوش کن خیالات ٹپک پڑتے ہیں؟ ہمیں ان لوگوں سے استفتا کرنے میں تامل نہیں ہے، مگر ہم کو ان میں سے ہزار دو ہزار نہیں صرف ایک دو ہی ایسے آدمیوں کے نام بتا دیے جائیں جن کا کوئی قول مغربی اقوام کے لیے حجت کا حکم رکھتا ہو، اور جن کے خیالات پر تمام اہل مغرب یا ان کی اکثریت کا ایمان ہو، اگر کوئی ایسی متفق علیہ چیز مغرب میں موجود نہیں ہے تو ہمارے پاس مغربی قوموں کے معمول بہ طریقوں کے سوا اور کون سی چیز رہ جاتی ہے جس سے ہم جنگ کے متعلق مغربی قوموں کا اخلاقی عقیدہ معلوم کر سکیں؟

قیام امن اور قطع سلاح کی تجویزیں، جنگ کے مسئلہ میں یورپ کی نیک نیتی کو ثابت کرنے کے لیے ان کوششوں کا ضرور حوالہ دیا جائیگا، جو چند سال سے جنگ کو روکنے، دائمی امن قائم کرنے، آلات و اسلحہ کے استعمال پر قیود عائد کرنے، اور جنگی طاقتوں کو توڑ دینے یا حتی الامکان کم کر دینے کے متعلق کی جا رہی ہیں، لیکن ان کوششوں کی ظاہر فریب صورت سے قطع نظر کر

جب ہم ان کی حقیقت پر نگاہ ڈالتے ہیں تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ ان میں [illegible] جنگ و دولت [illegible]
بلکہ اسے پہلے سے بھی زیادہ بڑھا دینے کی خواہش پنہاں ہے،

تخفیفِ اسلحہ کی تجویز رسمی طور پر سب سے پہلے ۱۸۹۸ء میں پیش کی گئی تھی۔ اگست ۱۸۹۸ء میں زارِ روس کی جانب سے بڑی بڑی سلطنتوں کو ایک سرکلر بھیجا گیا تھا جس میں ایک بین الملی اجتماع کی ضرورت ظاہر کرتے ہوئے لکھا تھا کہ :-

"امن و صلح کا تحفظ بین الملی سیاست کا سب سے بڑا مقصد قرار پاتا ہے۔ اسی مقصد کے لئے بڑی بڑی سلطنتوں نے طاقتور اتحادات قائم کر رکھے ہیں۔ اسی امن کی ضمانت کے لئے انھوں نے اپنی فوجی طاقت کو اس قدر بڑھا دیا ہے کہ اس سے پہلے اتنی طاقت کبھی نہ دیکھی گئی تھی، اور وہ اسے برابر ترقی دیے جا رہی ہیں، اور اس کی خاطر کسی قربانی میں تامل نہیں کرتیں لیکن اس کے باوجود وہ شریف تر مقصد یعنی قیامِ امن کسی طرح حاصل نہیں ہوتا۔

روز افزوں مالی مصارف عام رفاہیت و خوش حالی کے منابع کو خشک کئے دے رہے ہیں، قوموں کی ذہنی و جسمانی طاقت ان کی محنت اور ان کا سرمایہ سب کچھ اپنے اصلی مصرف کے بجائے ایسے کاموں میں صرف ہو رہا ہے جن سے کوئی منفعت حاصل نہیں ہوتی۔ کروڑوں روپیہ تخریب کے ان آلات کی ساخت میں صرف ہو رہا ہے جو آج چاہے سائنس کے منتہائے کمال پر ہوں مگر کل اسی میدان میں کسی نئے انکشاف سے اپنی قدر و قیمت ضرور کھو دیں، اس کی بدولت قومی تہذیب، اقتصادی ترقی اور دولت کی پیداوار یا تو خطرہ میں پڑ گئی ہے یا اس کا نشو و نما رک گیا ہے،

مزید برآں جس نسبت سے ہر سلطنت کی فوجی قوت میں اضافہ ہوتا ہے اسی نسبت سے اس مقصد کا حصول بعید تر ہوتا جا رہا ہے جسے سلطنتیں حاصل کرنا چاہتی ہیں، اقتصادی مشکلات جو زیادہ تر فوجوں کے ناقابلِ برداشت حد تک بڑھ جانے سے پیدا ہوتی ہیں اور وہ دائمی خطرات جو آلات جنگ کی اتنی کثرت

میں مضمر ہیں، ہمارے موجودہ زمانہ کی ہتھیار بندصلح کو ایک جاں گسل بوجھ کی صورت میں تبدیل کر رہے ہیں، جس کا اٹھانا باشندوں کے لئے مشکل تر ہوتا جارہا ہے، پس یہ بالکل ظاہر معلوم ہوتا ہے کہ اگر یہ صورتِ حال قائم رہی تو وہ لازماً دنیا کو اسی مہلکہ کی طرف لیجائیگی جس سے بچنا مقصود ہے اور جس کے آلام کا محض تصور ہی انسانی فکر کے لئے بہت ہولناک ہے،،

یہ خیالات آج سے ۳۰ سال پہلے ایک ایسی سلطنت کی جانب سے ظاہر کئے گئے تھے جو خود جنگی طیاریوں اور جنگ آزمائی کے ارادوں میں سب سے پیش پیش تھی جس وقت دنیا میں ان خیالات کی اشاعت ہوئی تو ہر طرف سے ان کا خیر مقدم کیا گیا، مبارکباد کی صدائیں بلند ہوئیں، اور دنیا کی بہت سی سلطنتوں نے بین المللی کانفرنس کی دعوت پر لبیک کہا، چنانچہ دوسرے ہی سال ۱۸۹۹ء میں پہلی ہیگ کانفرنس منعقد ہوئی جس کے لائحہ عمل کی سب سے پہلی دفعہ یہ تھی کہ جلد سے جلد بری و بحری قوتوں کی روز افزوں ترقی کو روکا جائے لیکن جب کانفرنس کے مباحثات شروع ہوئے تو بہت جلد ہی یہ حقیقت منکشف ہوگئی، کہ سلطنتوں میں تخفیفِ اسلحہ کی طرف کوئی میلان نہیں ہے، مسٹر ہولس جو کانفرنس میں امریکہ کے نمائندے بنکر آئے تھے، اس رنگ کو ابتدا ہی میں سمجھ گئے تھے اور انھوں نے نہایت صفائی کے ساتھ یہ کہدیا تھا کہ:-

،، ہر شخص جو بھولپن کی بنا پر خلعِ سلاح کی تجویزوں سے توقعات وابستہ کئے بیٹھا ہے یا یہ امید رکھتا ہے کہ ایک بین المللی عدالت عالیہ ایک بین المللی پولیس کے ساتھ قائم ہوگی اور اس کے فیصلے دنیا پر نافذ کرائے جائیں گے اسکو آخر میں یقیناً مایوس ہونا پڑیگا،،

چنانچہ یہی ہوا، کانفرنس نے پہلے تو خلع سلاح یا تخفیفِ اسلحہ کی تجویز پر غور ہی کرنے سے اعراض کیا پھر جب اس پر زیادہ زور دیا گیا تو ہر سلطنت کی طرف سے اعتراضات کی بوچھار شروع ہوگئی آخر اس مسئلہ کو محض ایک ریزولیوشن پاس کر کے ختم کر دیا گیا، جس کے

ٹائمز مورخہ یکم اگست ۱۸۹۹ء

الفاظ یہ تھے :-

"یہ کانفرنس یہ رائے رکھتی ہے کہ فوجی مصارف کو جو اس وقت موجودہ دنیا پر ایک بھاری بوجھ ہیں کم کرنا نوع بشری کی اخلاقی و مادی بہبود کے لئے حد درجہ مطلوب ہے"

اس "رائے" اور "حد درجہ مطلوب" کی جو کچھ قیمت تھی وہ اس سے ظاہر ہے کہ پہلی ہیگ کانفرنس کے بعد سے دوسری ہیگ کانفرنس تک کسی ایک سلطنت نے بھی اس کا لحاظ نہ کیا اور جنگی قوتوں کی کمیت و کیفیت میں روز بروز اضافہ ہوتا چلا گیا۔ ۱۹۰۷ء میں جب دوسری ہیگ کانفرنس منعقد ہوئی تو اس کے ایجنڈا میں خلع سلاح کی تجویز کا ذکر تک نہ تھا، بلکہ تصریح کر دی گئی تھی کہ "ایسے مسائل کو ہاتھ نہ لگایا جائے گا جو بری و بحری قوی کی تحدید سے تعلق رکھتے ہیں" تاہم بعض مصالح کی بنا پر پہلی کانفرنس کے رزولیوشن کا اعادہ کر دینا مناسب سمجھا گیا، اور اس کے ساتھ یہ فقرہ بھی بڑھا دیا گیا :-

"اور چونکہ اس وقت (یعنی پہلی کانفرنس) کے بعد سے تقریباً ہر سلطنت کے فوجی مصارف میں کافی اضافہ ہوا ہے اس لئے یہ کانفرنس اعلان کرتی ہے کہ یہ امر خاص طور پر مطلوب ہے کہ سلطنتیں اس سوال پر دوبارہ سنجیدگی کے ساتھ غور کریں"

اس قرارداد کا منشا صرف اس قدر تھا کہ سلطنتیں خلع سلاح کے سوال پر بعض "غور کریں"، چنانچہ سلطنتوں نے بہت سنجیدگی کے ساتھ غور کیا اور جس نتیجہ پر پہنچیں وہ یہ تھا کہ اپنی جنگی طیاریوں کو اور زیادہ بڑھا دیں۔

جنگ عظیم سے تھوڑے عرصہ پہلے یورپ کے ارباب فکر میں پھر اس سوال پر بحث و مباحثہ کا سلسلہ شروع ہوا تھا کہ جنگ کو بجبر روکنے کی مناسب تدبیر کیا ہو سکتی ہے؟ اور بین الملی قانون کس حد تک ان کی اجازت دیتا ہے؟ لیکن ابھی ان سوالات پر گفتگو ہو ہی رہی تھی کہ جنگ چھڑ گئی، اور دنیا ایک دوسرے اور اہم تر سوال یعنی بقائے حیات کے سوال کو حل کرنے میں منہمک ہو گئی۔ اگرچہ بعض تحریکیں پست ... اب بھی اپنے گوشہ ہائے عزلت میں بیٹھے خلع سلاح

...نیع صنعت، تحدید کی تجویزوں پر کام ہو سکے جانب تھے... ...جنگ کو ہمیشہ کے لئے روکنے کے وسائل پر غور کرنے میں مشغول تھے، مگر عملی دنیا میں ہر آن ان کے خیالات کی تردید ہو رہی تھی، اور دنیا کے لوگوں کو ان کے افکار پر غور کرنا تو درکنار ان کو سننے کی بھی فرصت نہ تھی، تاہم ان کا اتنا اثر ضرور ہوا کہ حکومت امریکہ نے سرکاری طور پر اس تحریک کو اٹھانا قبول کر لیا، اور ۲۲ جنوری ۱۹۱۷ء کو صدر جمہوریہ امریکہ مسٹر ولسن نے سینٹ کے نام ایک طویل پیغام بھیجا جس میں منجملہ اور امور کے ایک یہ تجویز بھی تھی کہ:-

"فوجوں کے استعمال میں اعتدال کو ملحوظ رکھا جائے جس سے قوائے حرب محض قیام امن کا ذریعہ ہوں نہ کہ حملہ آور خود غرضانہ جبر و تشدد کا آلہ...
...... اگر ہر ملک میں زبردست سامانِ جنگ کی صنعت اور افواج کی ترتیب کا سلسلہ جاری رہے تو دنیا کی قوموں میں سکون و اطمینان کا احساس کبھی پیدا نہیں ہو سکتا، بری و بحری افواج اور آلاتِ جنگ کا مسئلہ نہایت اہم اور ضروری مسئلہ ہے، جو اقوام عالم اور نوع بشری کی آئندہ قسمت کے ساتھ گہرا تعلق رکھتا ہے"

۱۸۱۶ء کے بعد یہ دوسرا موقع تھا جبکہ ایک مغربی سلطنت کی جانب سے خلع سلاح کا مسئلہ باضابطہ چھیڑا گیا، لیکن اس مرتبہ یہ آواز پہلے سے بھی زیادہ بے معنی اور لغو تھی، کیونکہ جس سلطنت نے اسے بلند کیا تھا وہ خود جنگ میں شریک ہوئی اور اپنے عمل سے اس نے خود اپنے قول کی تردید کر دی۔

جمعیت اقوام

جنگ عظیم کے بعد فتحیاب مغربی سلطنتوں نے پریزیڈنٹ ولسن کے مشورے سے ایک انجمن قائم کی جس کو جمعیت اقوام (LEAGUE OF NATIONS) کا خطاب دیا گیا، اس انجمن کا اولین مقصد یہ قرار دیا گیا تھا کہ جنگ اور اسباب جنگ کو ختم کیا جائے، چنانچہ اسباب جنگ کے استیصال کے لئے اس نے ایک بین الملی محکمۂ عدلیہ قائم کیا تاکہ وہ سلطنتوں کے باہمی نزاعات کا تصفیہ کرے، اور خود جنگ کو روکنے کے لئے سلطنتوں کے درمیان ایک مفاہمت کی جس کا منشا یہ تھا کہ سلطنتیں اپنے باہمی نزاعات کو مصالحانہ طریقوں سے طے کیا کریں، اور اگر کوئی سلطنت اپنی اغراض کے لئے تلوار سے کام لے تو تمام سلطنتیں مل کر اس کو راہ راست پر لائیں،

اس مفاہمت کی دفعہ ۱۶ کے الفاظ یہ ہیں:-

"اگر جمعیت کے کسی رکن نے اس سمجھوتہ کی دفعہ ۱۲، ۱۳، ۱۵ کو پس پشت ڈال کر جنگ چھیڑ دی، تو اس کا یہ فعل یعنی جمعیت کے تمام دوسرے ارکان کے خلاف جنگ کا مترادف ہوگا، ارکان جمعیت اس مفاہمت کے مطابق عہد کرتے ہیں کہ وہ فوراً ہی اس عہد شکن سلطنت سے اپنے مالی و تجارتی تعلقات منقطع کر لیں گے اور اپنی رعایا کا بھی اسکی رعایا سے لین دین بند کر دیں گے، نیز وہ کوشش کریں گے کہ اس سلطنت کی رعایا کو دوسری سلطنتوں کی رعایا سے بھی تجارتی مالی، یا شخصی تعلقات نہ رکھنے دیں خواہ وہ سلطنتیں جمعیت کی ممبر ہوں یا نہ ہوں۔"

اس کے بعد دوسرے فقرے میں جمعیت کی مجلس منتظمہ کو یہ اختیار دیا گیا ہے کہ وہ اس مجرم سلطنت کی مزاج پرسی کرنے کے لئے اپنے ارکان سے جتنی بری و بحری فوج مناسب سمجھے طلب کرے، اور تمام ارکان کا فرض قرار دیا گیا ہے، کہ وہ اپنی مالی و جنگی قوتوں کو اس مجرم سلطنت کے خلاف استعمال کرنے کے لئے [illegible] کے سپرد کر دیں۔

یہ سمجھوتہ بظاہر جنگ کو روکنے کا نہایت موثر ذریعہ معلوم ہوتا ہے، لیکن حقیقت یہ ہے کہ یہ اسی جتھہ بندی کی زیادہ مہذب [illegible] بدولت ۱۹۱۴ء میں جنگ عظیم برپا ہوئی تھی [illegible] جتھہ بندی کے [illegible] نتائج دیکھ کر تمام یورپ اس سے متنفر ہو گیا تھا [illegible] تمام اسباب کا باعث سمجھے تھا، اس لئے مغربی سلطنتیں اس پرانے طریقے کو چھوڑنے پر مجبور ہوئیں، مگر [illegible] اغراض کا حاصل ہونا بھی ناممکن تھا، کیونکہ فرداً فرداً کسی سلطنت کا اتنا [illegible] نہیں ہو سکتا [illegible] کو مرعوب کر کے اپنے مطامع حاصل کرے، [illegible] مشترک اغراض کے لئے بہرحال یہ ضروری [illegible] کہ بڑی بڑی سلطنتیں متحد [illegible] ساتھ دنیا پر اپنی گرفت کو مضبوط رکھنے کی کوشش کریں [illegible] انھوں نے اسی جتھہ بندی کو ایک دوسری وضع و شکل میں اختیار کیا ہے، جس میں [illegible] اتحاد کے بجائے صلح کوشی و امن پروری کے [illegible] کاری روح بھری ہوئی ہے، جہاں تک [illegible] سلطنتوں [illegible] کا تعلق ہے جمعیت کا یہ سمجھوتہ

بہت کارآمد ہو سکتا ہے۔ اگر یونان اور بلغاریہ میں اختلاف ہو یا پولینڈ اور لتھونیا میں جھگڑا ہو جائے
تو جمعیت اقوام کے بڑے بڑے ارکان ایک دھمکی میں ان کو درست کر سکتے ہیں۔ اس طرح صرف
یہی نہیں ہوتا کہ چھوٹی چھوٹی لڑائیوں کا سلسلہ بند ہو سکتا ہے، بلکہ اس سے زیادہ بڑا فائدہ
یہ ہوتا ہے کہ جمعیت کے لیڈروں کا رعب و اثر بھی ساری دنیا پر قایم ہو جاتا ہے، اور وہ "خدائی
فوجدار" بن کر نظام عالم میں ترمیم و تنسیخ کرنے، طاقتوں کو گھٹانے بڑھانے، مرغوب قوتوں
کو ممنون کرنے اور غیر مرغوب قوتوں کو خوفزدہ کرنے کی خدمات بڑی خوبی کے ساتھ انجام دے سکتے
ہیں، لیکن اگر خود بڑی طاقتوں میں سے کوئی جمعیت کے سمجھوتے کی خلاف ورزی کر بیٹھے تو جمعیت
اس پر کسی قسم کی کارروائی کرنا تو درکنار، زبانی بازپرس کی بھی جرأت نہیں کر سکتی، اور اگر وہ
اس کی جرأت کرے بھی تو اس کا کوئی اثر نہیں ہو سکتا۔ فرض کرو کہ آج انگلستان جمعیت
کی سمجھوتے کی خلاف ورزی کر کے امن عام کے منافی کوئی جرم کرتا ہے، جمعیت کی کونسل
اس پر غور کرنے کے لئے مجتمع ہوتی ہے، تمام ارکان کے اتفاق سے مجرم کو تہدید کیجاتی ہے کہ
وہ ارتکاب جرم سے باز آئے ورنہ اس کے خلاف سخت کارروائی کی جائیگی، مگر مجرم جو دنیا
میں سب سے بڑی بحری قوت کا مالک ہے، اس کی کوئی پرواہ نہیں کرتا اور جو کچھ کرنا چاہتا ہے
کئے جاتا ہے، آخر جمعیت مجبور ہو کر اپنے ارکان سے درخواست کرتی ہے کہ وہ دولت
برطانیہ سے ہر قسم کے تجارتی، مالی، اور سفارتی تعلقات منقطع کرلیں، اور اپنی جنگی قوت سے
اس کو امتثال امر پر مجبور کریں، اب سوال یہ ہے کہ کیا دنیا کی تمام وہ سلطنتیں جو جمعیت کی
رکن ہیں، محض جمعیت کے حکم کی تعمیل میں اس بات پر آمادہ ہو جائیں گی کہ ان بیشمار
معاشی، سیاسی، تجارتی اور مالی مصالح کو قربان کر دیں جو انگلستان جیسی عظیم الشان
سلطنت سے وہ وابستہ رکھتی ہیں،؟ کیا دنیا کی آبادی کے ۱/۵ حصہ سے بقیہ ۴/۵ حصہ کے تعلقات
یکلخت منقطع ہو جائیں گے؟ کیا یورپ اور امریکہ کی بڑی بڑی سلطنتیں اپنے مخصوص مصالح کو
نظر انداز کر کے محض اس لئے ایک زبردست سلطنت کے مقابلہ میں جنگ کے نقصانات
برداشت کرنے پر راضی ہو جائیں گی کہ جمعیت اقوام ان سے ایسا کرنا چاہتی ہے؟ کوئی شخص
جو عملی سیاسیات سے ذرہ برابر بھی مس رکھتا ہو، ان سوالات کا جواب اثبات میں نہیں

دے سکتا اور جب کہ اسکا جواب اثبات میں ہے، تو ... [illegible] جمعیت [illegible]
سلطنتوں کو قابو میں رکھنے سے عاجز ہے۔ تا [illegible] امن عالم کو اصلی خطرہ انھیں بڑی سلطنتوں کی حرص [illegible]
یہ محض ایک مفروضہ صورت نہیں ہے، بلکہ گذشتہ ۸ سال میں اس کا [illegible] تجربہ کیا
ہے، جس روز سے جمعیت اقوام عالم وجود میں آئی ہے، اس کو ایک مرتبہ بھی یہ جرأت نہیں ہوا
کہ بڑی سلطنتوں میں سے کسی کے ظالمانہ افعال پر باز پرس کرے۔ دمشق میں فرانس نے
علانیہ قتل عام کیا اور جمعیت خاموش بیٹھی دیکھتی رہی [illegible] سی کی جانب سے شام کا [illegible]
فرانس کو انتداباً دیا گیا تھا، ریف کی چھوٹی سی قوم کو ہسپانیہ اور فرانس نے ملکر ہلاک کرد[illegible]
اور جمعیت ایک لفظ زبان سے نہ نکال سکی، اٹلی اور یوگوسلافیا کے مسئلہ میں جمعیت نے دخل
دینا چاہا، مگر اٹلی کی ایک دھمکی اس کا منہ بند کرنے کے لئے کافی تھی، برطانیہ نے عراق میں
خون کی ندیاں بہا دیں، مگر جمعیت نے پلٹ کر یہ بھی نہ پوچھا کہ جس ملک کو اس کے انتداب
میں دیا گیا ہے، اس کے ساتھ وہ کیا سلوک کر رہا ہے؟ پھر جمعیت کی پنچایت میں آج تک
جتنے ایسے مسائل پیش ہوئے ہیں جو چھوٹی اور بڑی سلطنتوں کے درمیان متنازع فیہ تھے
ان میں بھی ہمیشہ بڑی سلطنتوں کی جیت ہوئی، اور کبھی یہ نہ دیکھا گیا کہ کسی کمزور کو طاقتور کے
مقابلہ میں کامیابی نصیب ہوئی ہو، موصل کا مسئلہ ابھی بالکل تازہ ہے، اسکو محض برطانیہ کی
اقتصادی حرص کی خاطر جس طرح ترکی سے الگ کر کے عراق سے ملحق کر دیا گیا ہے، اس سے
یہ راز بالکل آشکارا ہو جاتا ہے کہ جمعیت اقوام دراصل دنیا کی طاقتور سلطنتوں کا ایک جتھا
ہے جس کو ان سلطنتوں نے زیادہ خوبصورتی کے ساتھ اپنی اغراض حاصل کرنے کے لئے
قایم کر رکھا ہے، اس جتھے کی قوت جن قوموں کے خلاف استعمال کی گئی ہے، [illegible]
ہے، ان میں ناراضی کے جذبات پیدا ہو گئے ہیں، اور وہ اپنے حقوق، بلکہ عین وجود کی حفاظت
کے لئے ایک دوسرا جتھا قایم کرنا چاہتی ہیں، تا کہ جب کبھی مغربی دول [illegible] قوت سے
ان کو دبانے کی کوشش کریں تو یہ بھی متحدہ قوت کے ساتھ ان کا جواب دے سکیں۔ یہ خواہش
اگر قوت سے فعل میں آگئی تو وہی دو مقابل کے جتھے پھر بنجائیں گے، جو جنگ عظیم سے پیشتر
تھے اور دنیا میں پھر ایک عالمگیر جنگ برپا ہوگی جو شاید پہلے سے بھی زیادہ مہلک ہو۔

[illegible] کی جدید تجویزیں

گذشتہ سات سال سے یورپ اور امریکہ میں خلع سلاح، تخفیف قوائے حربیہ اور تحریم جنگ کے مسائل بھی مختلف تجویزوں اور سرگرمی کے ساتھ زیر بحث ہیں، اور بہت سے خوش گمان لوگ ان کو یورپ کے حسن نیت کی دلیل سمجھ رہے ہیں، مگر واقعہ یہ ہے کہ اس تمام قیل وقال میں بھی حقیقت کا شائبہ تک نہیں ہے، چونکہ مغرب کے عام باشندے لڑتے لڑتے تھک گئے ہیں، اور ان کو اپنی اجتماعی اور خصوصیت کیساتھ تجارتی و صنعتی زندگی میں سکون کی سخت ضرورت ہے، اس لئے وہ کم از کم دل بہلانے کے لئے ایسی تجویزوں اور خیالی باتوں کو سننا پسند کرتے ہیں، جن سے سکون نہیں تو سکون کی موہوم توقع ہی قایم ہوجاتی ہے، ورنہ جہاں تک عمل کا تعلق ہے، ہمیں ان توقعات کے بر آنے کا کوئی سامان نہیں ہے، بلکہ گذشتہ سات آٹھ سال کے اندر مغربی ممالک میں وسائل جنگ کو جو ترقی نصیب ہوئی ہے، وہ اس سے پہلے کبھی نہیں ہوئی تھی حتی کہ ۱۴ء میں بھی نہ تھی جبکہ تمام یورپ جنگ کی تیاریوں میں منہمک تھا، جنگ عظیم کے بعد ۱۹۲۱ء میں پہلی مرتبہ جمہوریہ امریکہ نے اس مسئلہ کو چھیڑا اور اس کی تحریک سے نومبر ۲۱ء میں بمقام واشنگٹن ایک بین الملی کانفرنس منعقد ہوئی، اس کانفرنس کا مقصد بظاہر قوی حربیہ میں تخفیف کرنا تھا، مگر دراصل امریکہ، فرانس، جاپان اور اٹلی یہ چاہتے تھے کہ کسی طرح برطانیہ کی عظیم الشان بحری طاقت کو کم کیا جائے، کیونکہ ان سب ملکوں کی زندگی بحری تجارت پر منحصر ہے، اور جب تک برطانیہ سمندر کی لہروں پر حکمراں ہے اس وقت تک کوئی ملک اپنی تجارت کو محفوظ نہیں سمجھ سکتا، دوسری طرف برطانیہ کو یہ احساس تھا کہ اس کی زندگی کلیتہً بحری قوت کے تفوق پر منحصر ہے، اس لئے اس کی خواہش تھی کہ کوئی سلطنت اس کی برابری تک نہ پہونچ سکے، یہی باطنی کشمکش واشنگٹن کانفرنس کے مباحثات میں جاری رہی، ہر فریق دوسروں پر پابندیاں عائد کرنا چاہتا تھا، مگر جب خود اس کا اپنا سوال پیش آتا تو صاف کہدیتا تھا کہ ہماری جنگی پالیسی دوسروں کے اثر سے بالکل پاک ہے، نتیجہ یہ ہوا کہ واشنگٹن کانفرنس اس سے زیادہ کچھ نہ کر سکی کہ اس نے پانچ بڑی سلطنتوں کے درمیان بحری قوت کا تناسب مقرر کر دیا اور اس کے بعد اسی امریکہ نے جو تخفیف قوی بحریہ کا علمبردار بنکر اٹھا تھا ۵ نئے ڈریڈناٹ تعمیر کرنے اور نہر پانامہ کو جدید ترین آلات جنگ سے آراستہ کرنے کا تہیہ کر لیا

کی واشنگٹن کانفرنس میں تحت البحر کشتیوں کا مسئلہ بھی پیش ہوا۔ ان کشتیوں سے
اصلی خطرہ انگلستان کو ہے، کیونکہ اسی کی زندگی سب سے زیادہ بیرونی ممالک کی درآمد پر منحصر ہے
اور وہی سب سے زیادہ جنگی و تجارتی جہازوں کا مالک ہے۔ جنگ عظیم میں ان کشتیوں نے اسکی
بحری تجارت کو برباد کرکے جس طرح اس پر عرصۂ حیات تنگ کر دیا تھا، اس کا سبق برطانیہ
کو یاد تھا، اس لئے اس نے واشنگٹن کانفرنس میں اپنی ساری قوت اس کوشش میں صرف
کر دی کہ تحت البحر کشتیوں کا استعمال ممنوع قرار دیا جائے۔ دوسری طرف فرانس خصوصیت
کے ساتھ اس کا مخالف تھا۔ کیونکہ اسکی بحری قوت کمزور تھی۔ اور برطانیہ کے مقابلہ میں اسکے
پاس اپنی حفاظت کا سب سے بڑا ذریعہ یہی تحت البحر کشتیاں تھیں۔ اس کے نمایندوں نے
صاف طور پر کہہ دیا کہ یہ کشتیاں دراصل حملہ کا ذریعہ نہیں ہیں بلکہ مدافعت کا ذریعہ ہیں اور
وہ ممالک انھیں استعمال کرنے پر مجبور ہیں، جنکی بحری قوت کمزور ہو۔ آخر اس مسئلہ میں
امریکہ نے ایک توسط راہ نکالی جس پر فریقین متفق ہوگئے، اور یہ وہ تھی کہ حالت جنگ
میں غنیم کی تجارت کو برباد کرنے کے لئے تحت البحر کشتیوں کا استعمال ممنوع
قرار دیا گیا،

ایک اور میثاق زہریلی گیسوں کے استعمال کے متعلق بھی طے ہوا۔ اول اول ۱۸۹۹ء
کی ہیگ کانفرنس میں زہریلی اور دم گھونٹنے والی گیسوں کا استعمال ممنوع قرار دیا
گیا تھا، جس کی برطانیہ نے سخت مخالفت کی تھی، پھر ۱۹۰۷ء کی دوسری ہیگ کانفرنس
میں برطانیہ بمشکل اس پر راضی ہوگیا، مگر امریکہ آخر وقت تک مخالف رہا۔ جنگ عظیم
میں جرمنی اور اس کے حریفوں نے آزادی کے ساتھ ایک دوسرے کے خلاف ان گیسوں
کو استعمال کیا، اور جو کچھ قانونی بندشیں تھیں سب دول کے مشترک عمل سے ٹوٹ
گئیں، اس کے بعد واشنگٹن کانفرنس میں پھر پچھلی قیود کی تجدید کی گئی مگر دل سے
اب بھی کوئی سلطنت انکو قبول کرنے پر راضی نہ تھی جینوا کانفرنس کے فرنسیسی مندوب
ایم سارا (M. Sarraut) نے اس پر دستخط کرتے وقت یہ نوٹ
لکھ دیا کہ:-

"زہریلی گیسوں کے استعمال کو روکنے کی کوشش ناممکن العمل

معلوم ہوتی ہے"

مسٹر بالفور نے بھی برطانیہ کی طرف سے یہ تصریح کرنی ضروری سمجھی کہ:-

"یہ اقرار نامہ قوموں کو اس حفاظت کی ضرورت سے بے نیاز

نہیں کرتا جو ایک شریر دشمن کی جانب سے گیسوں کے استعمال کی صورت

میں پیش آتی ہے"

اسی بددلی کا نتیجہ ہے، کہ اب تک کسی سلطنت نے اس اقرار نامہ کی باقا

توثیق نہیں کی، اور قانونی حیثیت سے وہ اس وقت ایک بے معنی دستاویز ہے،

واشنگٹن کانفرنس کے بعد اپریل ۱۹۲۲ء میں مسٹر لائڈ جارج کی تحریک پر جنوا

ایک یان یورپین کانفرنس منعقد کی گئی، جس کا مقصد یہ بتایا گیا تھا کہ آیندہ دس سا

کے لئے دول متحارب ایک دوسرے پر حملہ نہ کرنے کا عہد کریں، اور تمام قومیں مل کر جنگ زد

ممالک کی تعمیر جدید کریں، لیکن اس کانفرنس میں امریکہ نے شرکت سے انکار کردیا، فرانس

نے ابتدا ہی میں اعلان کردیا کہ ہم اس کے فیصلوں کو تسلیم کرنے کی ذمہ داری نہیں

لیتے، ٹرکی کو سرے سے شرکت کی دعوت ہی نہیں دی گئی، روس کو بلایا گیا تو اس لئے کہ ا

دباؤ ڈال کر ان نقصانات کا تاوان ادا کرنے پر مجبور کیا جائے، جو انقلاب کے زمانہ میں روس

حدود کے اندر یورپین سلطنتوں کی املاک کو پہونچا ہے، اسکا نتیجہ یہ ہوا کہ کانفرنس ناکا

ہوئی اور جنگی طیاریوں میں کوئی کمی واقع نہ ہوئی،

جنوا کے بعد ھیگ میں ایک دوسری کانفرنس ہوئی، مگر اس کا بھی وہی حشر ہو

جو جنوا کانفرنس کا ہوا تھا، پھر ایک اور بین الملی کانفرنس لندن میں منعقد ہوئی، مگر

وہاں برطانیہ اور فرانس کے درمیان اتنا سخت اختلاف برپا ہوا کہ موسیو پوانکارے ترش رو

ہوکر کانفرنس سے اٹھ گئے، اور سیدھے پیرس چلدیئے، یہاں تک کہ تصویر کھنچوانے تک

کے لئے بھی نہ رکے،!

ستمبر ۱۹۲۵ء میں جمعیتِ اقوام نے تحدید قوی حربیہ اور تحریم جنگ کے مسئلہ کو

ہاتھ میں لیا، اور اس کی درخواست پر کونسل نے ایک ایسی مستقل موتمر تخفیف سلاح کے انعقاد کا راستہ صاف کرنے کے لئے ایک مجلس تحضیری (Preparatory Committee) مقرر کی، تاکہ وہ جملہ امور پر غور کرکے بتائے، کہ کس طرح اور کن اصول پر ایسی کانفرنس کو دعوت دیجاسکتی ہے؟ یہ کمیٹی سال بھر تک کوئی کام نہ کرسکی، ۲۴ ستمبر ۱۹۲۶ء کو جمعیت کے اجلاس عام نے کونسل سے سفارش کی کہ وہ کمیٹی کو ۱۹۲۷ء تک اپنا کام ختم کرنے کی تاکید کرے، تاکہ آٹھویں اجلاس عام سے پہلے بین الملی کانفرنس کو دعوت دی جاسکے۔ مگر اس مدت میں بھی کمیٹی نے کام ختم نہیں کیا، اور آج تک بس اس کے جلسے ہی ہوتے جاتے ہیں۔ چونکہ ابھی تک اس تحریک کا کوئی نتیجہ نہیں نکلا ہے، اس لئے کوئی رائے دینا قبل از وقت ہوگا، لیکن آثار بتاتے ہیں کہ اس کا بھی وہی حشر ہوگا، جو پہلے ایسی کوششوں کا ہوچکا ہے۔ اگر دول مغرب میں حقیقۃً خلع سلاح کی کوئی قلبی خواہش موجود ہوتی، تو وہ روس کی ان تجاویز کو قبول کرتے جو اس نے تخفیف قوی حربیہ کے متعلق پیش کی تھیں، کیونکہ اس مقصد کیجانب عملی اقدام صرف انھیں تجاویز سے ہوسکتا ہے لیکن دول میں سے کوئی ان کو قبول کرنے کے لئے تیار نہیں ہے، اور برطانیہ کے نمایندے لارڈ کشنڈن نے تو صاف کہدیا ہے کہ:-

"کامل خلع سلاح قوموں کو غارت گری لوٹ مار اور انقلاب کے خطرہ میں مبتلا کردے گا۔"

اس سے ظاہر اور باطن کا فرق صاف معلوم ہوجاتا ہے۔ زبان سے تو ہر قسم کی باتیں کہی جارہی ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ مغربی قومیں جنگ و خونریزی سے بیزار ہیں، امن و صلح کی قدرشناس ہیں، اور دل سے چاہتی ہیں کہ ابنائے نوع کی تباہی کا کھیل چھوڑ کر اپنے قدرتی حدود میں اپنی تعمیر و ترقی کے لئے سرگرم عمل رہیں۔ مگر حال یہ ہے کہ ان قوموں کے درمیان شدید عداوتیں پرورش پارہی ہیں، ان کے دلوں میں آتش فشاں مادے پک رہے ہیں، ان کی فوجیں تعداد اور قوت میں بڑھ رہی ہیں ان کے آلات جنگ روز بروز ترقی کررہے ہیں، اور ہر قوم اس کوشش میں لگی ہوئی ہے

کرینہ جنگ میں اپنے حریفوں سے زیادہ طاقتور ثابت ہو، اور تمام مخالف قوتوں کو مٹا کر اپنی برتری کا سکہ بٹھادے، اس رقابت و مسابقت کو دیکھ کر کون کہہ سکتا ہے کہ دول مغرب میں امن پسندی کا حقیقی میلان موجود ہے، اور جنگ جوئی سے وہ فی الواقع توبہ کر چکی ہیں؟ ۱۹۱۹ء کے میمورینڈم میں جس کا اوپر حوالہ دیا جا چکا ہے، برطانی وزیر اعظم مسٹر لائڈ جارج نے لکھا تھا کہ:۔

"جمعیت اقوام کی کامیابی کی اولین شرط یہ ہے کہ سلطنت برطانیہ ریاستہائے متحدہ امریکہ، فرانس، اور اٹلی کے درمیان ایک سمجھوتہ ہو جائے جس کے مطابق ان سلطنتوں میں جنگی جہازوں کی تعمیر اور فوجوں کی تکثیر و توفیر کی مسابقت بند ہو جائے، جب تک جمعیت کی مفاہمت پر دستخط کرنے سے پہلے یہ نہ ہوئے گا جمعیت محض ایک اضحوکہ اور ایک سوانگ رہے گی"

اس قول کے مطابق جمعیت اقوام ایک "اضحوکہ" اور ایک "سوانگ" ثابت ہو چکی ہے، آج دول کے درمیان توفیر قوی حربیہ کی مسابقت اسقدر تیزی کے ساتھ جاری ہے، کہ اس سے پہلے کبھی نہ تھی، آج مغربی دنیا جنگ و پیکار کے لئے اتنی طیار ہے کہ ۱۹۱۴ء میں بھی نہ تھی، آج مغربی تہذیب نے فوجوں کی کثرت، آلات و ادوات مہلکہ کی ترقی، دیوہیکل جنگی جہازوں کی صنعت، تباہ کن ہوائی جہازوں کی ساخت، زہریلی گیسوں اور غارت گر سامانِ جنگ کی تیاری سے انسانیت کو ہلاک و برباد کرنے کے لئے وہ سامان فراہم کیا ہے، جس کی نظیر سے پوری تاریخ عالم خالی ہے، ان حقائق کو دیکھ کر کون ہے جو امن پسندی کی بناوٹی باتوں اور صلح کوشی کی نمائشی کانفرنسوں سے دھوکہ کھائے گا؟

جنگ کا عملی پہلو

یہاں تک جو کچھ عرض کیا گیا اس کا تعلق مغربی جنگ کی معنوی حیثیت
سے تھا، اس پہلو میں آپ نے دیکھ لیا کہ جہاں تک جنگ کے اغراض و مقاصد کا تعلق ہے،
مغربی دنیا اپنی تمام ترقی تہذیب و تمدن کے باوجود اس نقطہ سے ایک انچ بھی آگے
نہیں بڑھی ہے، جس پر عہدِ تاریک کی غیر متمدن اور وحشی قومیں صدیوں پہلے قائم تھیں۔
وسائلِ جنگ میں تو بیشک انھوں نے ترقی کے آسمان کو جا لیا ہے، ان کی فوجوں
کی اعلیٰ ترتیب، ان کے سپاہیوں کی خوبصورت وردیاں، ان کے تجربوں کی بہترین
مہارتِ فن، ان کے آلاتِ حرب کی دلفریب سجاوٹ دیکھ کر کون ہے جس کی آنکھیں
خیرہ نہ ہو جائیں گی، مگر اس جنگ کے اندر جو روح کام کر رہی ہے، وہ اسی عہدِ وحشت
کی روح ہے، جس کی درندگی و بہیمیت، آلات و وسائل کی ترقی سے کم نہیں ہوئی بلکہ
پہلے سے بھی زیادہ خطرناک ہو گئی ہے۔ قدیم وحشیوں کی طرح ان جدید وحشیوں
کے پیش نظر بھی نہ کوئی بلند نصب العین ہے، نہ کوئی اعلیٰ مطمح نظر ہے، نہ کوئی ایسا
اخلاقی مقصد ہے جس کی بنا پر یہ اُن کے مقابلہ میں کسی سبقت و فوقیت کا دعویٰ کر سکیں۔
وہی حصولِ جاہ و مال، اور توفیرِ ثروت و توسیعِ اقتدار کی خواہش جو اب سے
چار ہزار برس پہلے کسی غیر متمدن قبیلہ کو جنگ پر ابھار سکتی تھی، وہی آج کل کی مہذب
قوموں کو بھی مردم کشی و خوں ریزی پر آمادہ کرتی ہے۔ تہذیب و تمدن کی ترقی سے
اخلاقی حالت میں کوئی ترقی نہیں ہوئی، البتہ اگر کوئی ترقی ہوئی ہے تو یہ کہ پہلے
ان ادنیٰ اور اسفل مقاصد کے لئے جتنی قوت استعمال کی جاتی تھی، اب اس سے
دس ہزار درجہ زیادہ شدید و ہولناک اور تباہ کن قوت استعمال کی جاتی ہے۔
ظاہر ہے کہ جب مقصد شرافت و پاکیزگی سے خالی ہے، تو طریقِ حصولِ مقصد

خواہ کتنا ہی ستھرا اور پاکیزہ تر ہو، اس سے کوئی عمل صلاحیت وصواب کے درجہ کو نہیں پہونچ
سکتا، تاہم اتمام حجت کے لئے ہمیں یہ بھی دیکھ لینا چاہئے کہ تہذیب مغرب نے اپنے اعمال
جنگ کو کن قوانین وضوابط سے منضبط کیا ہے؟ اور ان قوانین کی معنوی قوت اور عملی حیثیت
اسلامی قوانین کے بالمقابل کیسی ہے، اہل مغرب کا دعویٰ ہے کہ انھوں نے پرانے زمانہ
کے وحشیانہ طریقوں کو بدل کر جنگ کے نہایت مہذب طریقے اختیار کئے ہیں، اور جنگ کو
جو پہلے درندوں کے کھیل سے کچھ زیادہ مختلف نہ تھی، ایک مہذب کشمکش اور شریفانہ زور
آزمائی کی صورت میں تبدیل کردیا ہے، یہ دعویٰ اس بلند آہنگی کے ساتھ کیا گیا ہے، اور
اس کے ساتھ ظاہری شان وشوکت کا اتنا سامان ہے کہ ناواقف دنیا اسے سنکر بلا تامل
ایمان لے آتی ہے، مگر ہم اس کو امتحان کی کسوٹی پر کس کر دیکھنا چاہتے ہیں، کہ فی الواقع
کہاں تک درست ہے؟

بین الملی قانون کی حقیقت مغربی قوموں اور سلطنتوں کے باہمی معاملات اور
جنگ وصلح کے تعلقات پر جو قانون حاوی ہے، اسے اصطلاح میں بین الملی قانون
(INTER NATIONL LAW) کہا جاتا ہے، علمائے قانون نے اس کی مختلف
تعریفیں کی ہیں، مگر سب سے زیادہ جامع تعریف یہ ہے:۔

”وہ ایک رواج ہے، جس کی پابندی مہذب قومیں اپنے معاملات
میں اختیار کرتی ہیں“

اس رواج کو کسی بالاتر قوت نے وضع نہیں کیا ہے، کہ اسے اختیار کرنے پر یہ قومیں
مجبور ہوں، اور اسمیں ردوبدل کرنے کا انھیں اختیار نہ ہو، بلکہ اس کو خود انھوں نے اپنی
آسانی کے لئے وضع کیا ہے، اور واضع ہونے کی حیثیت سے انھیں کو یہ حق پہونچتا ہے، کہ جب
چاہیں اسے اپنے حسب منشا بنائیں، اور جب چاہیں، اسکو چھوڑ کر کوئی اور رواج یا قانون
وضع کریں، پس زیادہ صحیح یہ ہے کہ مغربی قومیں بین الملی قانون کی پیرو نہیں ہیں، بلکہ
بین الملی قانون ان کا پیرو ہے، اپنی آسانی کے لئے جو طریقہ وہ اختیار کریں وہی
قانون ہے، اور جس طریقہ کو وہ ترک کردیں وہ سرے سے قانون ہی نہیں ہے، آج

جن اصول کی پابندی پر مغربی قومیں متفق ہیں۔ وہ آج کا بین الملی قانون ہے، مگر ضروری نہیں ہے کہ وہ کل کا قانون بھی ہو۔ کل اگر یہ اصول بدل کر انھوں نے کچھ دوسرے اصول وضع کر لئے، تو یہ قانون منسوخ ہو جائے گا، اور وہ نئے اصول بین الملی قانون بنجائیں گے،

یہی وجہ ہے کہ بعض ممتاز علمائے مغرب کی رائے میں اس رواج کو لفظ قانون سے تعبیر کرنا ہی غلط ہے، آسٹن اپنی کتاب "حدود علم قانون کی تعیین" (Province of Jurisprudence Determined) میں لکھتا ہے:۔

"بین الملی قانون کی قوت کا انحصار محض رائے عام کی تائید پر ہے، اس لئے وہ صحیح معنوں میں قانون نہیں کہا جا سکتا ہے"

لارڈ سالسبری کہتا ہے:۔

"اس کو کوئی عدالت بزور نافذ نہیں کر سکتی اس لئے اسے لفظ قانون سے تعبیر کرنا گمراہ کن ہے"

۱۸۷۱ء میں امریکہ کے سپریم کورٹ نے ایک مقدمہ کا فیصلہ کرتے ہوئے یہ تصریح کی تھی کہ:۔

"بحری قانون بھی تمام بین الملی قوانین کی طرح مہذب ممالک کی مجموعی رضامندی پر قائم ہے، اور اگر نافذ العمل ہے، تو اس لئے نہیں ہے کہ کسی بالاتر قوت نے اسے وضع کیا ہے، بلکہ صرف اس لئے ہے، کہ اسے عموماً ایک ضابطۂ عمل کے طور پر قبول کر لیا گیا ہے"

لارڈ برکنھڈ اپنی کتاب قانون بین الملل (International Law) میں کہتا ہے کہ بین الملی قانون کا بقاء و استحکام صرف تین چیزوں پر ہے،

۱- قومی عزت کا لحاظ جو بین الملی رائے عام کے اثر سے پیدا ہوتا ہے (اگرچہ وہ اکثر ضروریات وقت کے اثر سے مرجھا جاتا ہے)

۲- اہم ترین قومی مقاصد کے سوا، چھوٹے چھوٹے مقاصد کے لئے جنگ کے نقصانات

برداشت کرنے پر آمادہ نہ ہونا،

۳۔ قوموں کا اس امر کو محسوس کر لینا کہ یہ طے شدہ قوانین ان کی اپنی آسانی کے لئے ہیں اور ان کا بقا انفرادی اطاعت پر منحصر ہے،

ایک دوسری جگہ برکنہیڈ لکھتا ہے:۔

"اصولاً بین المللی قانون کے احکام کی پشت پر رائے عام اور حکومت متعلقہ کے خود اپنے اختیاری تطوع سے زیادہ کوئی مجبور کن طاقت نہیں ہے"

ان اقوال سے ظاہر ہوتا ہے کہ بین المللی قانون محض چند قوموں کا ٹھہرایا ہوا ایک رواج ہے، جس کی نہ کوئی قانونی قیمت ہے، اور نہ مستحکم بنیاد،

بین المللی قانون کے عناصر ترکیبی اس قانون کی ترکیب میں مختلف عناصر شامل ہیں اور ان عناصر کی ترکیبی قدر و قیمت کے بھی مختلف مدارج ہیں، بعض عناصر وہ ہیں جنھیں وضع قانون میں صرف اخلاقی اثر حاصل ہے، بعض وہ ہیں جنکو اخلاقی اثر کے ساتھ ایک حد تک مادی اثر بھی حاصل ہے، اور بعض وہ ہیں جو صرف مادی اثر رکھتے ہیں، اور بسا اوقات ان کا اثر اخلاقی اثر کے خلاف واقع ہوتا ہے، آئندہ مباحث کو سمجھنے کے لئے بین المللی قانون کے ان ماخذ کی تشریح ضروری ہے،

(۱) پہلا ماخذ علمائے قانون کی آراء ہیں، گروٹیوس سے لیکر آج تک بین المللی قانون کے جتنے ماہرین گذرے ہیں، سب کے خیالات کتابوں میں موجود ہیں، اور قانون کی تدوین میں انھوں نے بڑا حصہ لیا ہے، لیکن ان کی آراء کی قانونی قیمت صرف اتنی ہے کہ پیچیدہ بین المللی مسائل میں ان سے مشورہ کر لیا جاتا ہے، باقی رہا فیصلہ تو اس کا ان پر ذرہ برابر بھی انحصار نہیں ہے، لارنیس اپنی کتاب اصول قانون بین المللل (Principles of International Law) میں لکھتا ہے:۔

"مختلف فیہ امور میں ان کے خیالات کا عزت کے ساتھ حوالہ دیا جاتا ہے، اور ان پر غور کیا جاتا ہے، لیکن وہ کسی حیثیت سے بھی فیصلہ کن

نہیں ہیں"

برنہیڈ لکھتا ہے:۔

"وہ کوئی قانون نہیں بناتے بلکہ ہم کو صرف یہ بتاتے ہیں کہ فی الوقت ان سلطنتوں کا عمل کس چیز پر ہے"

جسٹس گرے اپنے ایک فیصلہ میں لکھتا ہے:۔

"اس قسم کے مصنفین کی کتابوں سے عدالتوں میں جو حوالے دیئے جاتے ہیں ان کا منشا یہ بتانا نہیں ہوتا کہ قانون کیا ہونا چاہیئے، بلکہ صرف اس امر کی ایک معتبر شہادت پیش کرنا ہوتا ہے، کہ قانون فی الواقع کیا ہے"

چیف جسٹس کوک برن اپنے ایک فیصلہ میں لکھتا ہے:۔

"ان مصنفین کی آراء خود کوئی قانون نہیں بنا سکتیں البتہ مہذب اقوام کی رضامندی ان کو قانون کی حیثیت دے سکتی ہے"

ان مستند اقوال سے ثابت ہوتا ہے کہ قانون بین الملل کے ماہرین نے جو عظیم الشان کتابیں لکھی ہیں ان کو کوئی تشریعی قوت حاصل نہیں ہے،

(۲) دوسرا ماخذ بین المللی معاہدات ہیں۔ ان معاہدات کی دو قسمیں ہیں، ایک تقریری (Declaratory) دوسرے غیر تقریری (Non declaratory)

تقریری معاہدات وہ ہیں جنمیں تمام یا اکثر دول کی باہمی رضامندی سے کوئی مخصوص قاعدہ مقرر کردیا گیا ہو جیسے [illegible]ء کا معاہدہ وائنا [illegible]ء کا اعلان پیرس [illegible]ء و ۱۹۰۶ء کے معاہدات جنیوا [illegible]ء کا اعلان لندن ۱۸۹۹ء و ۱۹۰۷ء کے معاہدات ہیگ ۱۹۰۹ء کا اعلان لندن اور ۱۹۲۲ء کے معاہدات واشنگٹن، یہ معاہدات ان سلطنتوں کے لئے واجب العمل ہیں جو ان پر دستخط کردیں مگر ہر سلطنت کو حق ہے کہ جب چاہے بعض شرکائے معاہدہ کو مطلع کرکے ان کی ذمہ داری سے بری ہو جائے۔ ایسے معاہدات

لہ یہاں لفظ تقریری بمعنی توضیحی ہے مستعمل ہوا ہے نہ بمعنی مقررہ

سے کوئی نیا قانون وجود میں نہیں آتا، لارنس کے بقول لازمی طور پر یہ نہیں کہا جا سکتا کہ اس قسم کے معاہدات کوئی تشریعی عمل (Legislative act) ہیں، اب لیجیے دوسری قسم کے معاہدات، سو ان میں وہ مفاہمتیں شامل ہیں جو اقوامِ عالم کی کسی بڑی جماعت کے درمیان نہیں ہوئی ہیں، بلکہ دو یا زیادہ قوموں نے مل کر اپنے معاملات کی انجام دہی کے لئے انھیں طے کر لیا ہے، لارنس کہتا ہے :-

"یہ دوسری قسم کے معاہدات اس بات کی علامت نہیں ہیں کہ بین الملی قانون کیا ہے؟ بلکہ اس بات کو ظاہر کرتے ہیں کہ بین الملی قانون میں کیا نہیں ہے"

تشریعی اعتبار سے ان دونوں قسم کے معاہدات میں کوئی قوت نہیں ہے، تاہم بعض معاہدات ایسے ضرور ہیں جو اصولِ قانون وضع کرتے ہیں، مثلاً ہیگ کنونشن، جن میں اہل قتال اور غیر اہلِ قتال کے حقوق و فرائض کو متعین کیا گیا ہے، لیکن ان اصولِ قانون کا انحصار بھی دول کے متفقہ تعامل پر ہے، اگر کوئی بڑی سلطنت یا چند سلطنتیں مل کر ان کو توڑ دیں تو تمام سلطنتیں توڑ ڈالتی ہیں، اور قانون کی قبا میں ایک تار بھی باقی نہیں رہتا

(۳) تیسرا ماخذ بین الملی پنچایتوں اور عدالتہائے غنائم بحریہ (Prize courts) اور بین الملی کانفرنس کے فیصلے ہیں، یہ فیصلے درحقیقت کوئی قانون نہیں بناتے بلکہ صرف موجود الوقت قوانین کو پیش آمدہ حالات سے منطبق کرتے ہیں، اس لئے زیادہ سے زیادہ ان کو بین الملی قانون کی تشریح و تعبیر کہا جا سکتا ہے، اسمیں شک نہیں کہ بعض ایسے فاضل جج بھی گذرے ہیں، جنھوں نے وقتی مسائل کے فیصلوں میں قانون کے عام اصول بھی وضع کر دیئے ہیں، مثلاً لارڈ اسٹوویل، ایم پورتالیس، اور مسٹر جسٹس اسٹوری، کہ ان کو بین الملی قانون کے واضعین میں شمار کیا جاتا ہے، لیکن ان کے وضع کردہ اصول بھی آخر میں اپنی تنفیذ کے لئے جس چیز کے رہینِ منت ہیں، وہ سلطنتوں کی رضامندی ہی ہے،

(۴) چوتھا ماخذ وہ ہدایات ہیں جو مختلف سلطنتیں اپنی فوجوں کو دیتی ہیں، یہ ہدایات

ابتداءً ایک سلطنت کی طرف سے دی گئی تھیں، مگر بعد میں دوسری سلطنتوں نے ان کو پسند کر کے اپنے ہاں رائج کر لیا، اور رفتہ رفتہ وہی ایک بین الملی دستور العمل بن گئیں، ان ہدایات سے ایک قانون ضرور بنتا ہے، مگر وہ بین الملی واجبات کی بنیاد پر قائم نہیں ہے، بلکہ سلطنتوں کی انفرادی و اختیاری پسند پر قائم ہے، ہر سلطنت کو حق ہے کہ جب چاہے اس قانون کو بدل کر دوسرا قانون جاری کر دے،

بین الملی قانون کی ناپائداری | یہ وہ عناصر ہیں جنکے مجموعی اشتراک و امتزاج سے بین الملی قانون بنتا ہے، ان میں سے فرداً فرداً کوئی بھی ایسی تشریعی قوت نہیں رکھتا جو اقوامِ عالم کو پابند بنانے والی ہو، ظاہر ہے کہ جب ستون ہی کمزور ہیں تو جو عمارت ان پر کھڑی کی گئی ہے، وہ بھی بودی ہوگی، ان کی ترکیب سے جس قانون کا قصر تیار ہوا ہے، اس پر ایک تفصیلی نظر ڈالئے تو معلوم ہوگا کہ اس تعمیر میں خرابی کی بیشمار صورتیں مضمر ہیں، ہمیں ہر چیز کو سلطنتوں کے تفاہم پر موقوف رکھا گیا ہے، جس قاعدہ کو تمام یا اکثر سلطنتیں متفق ہو کر مان لیں وہی بین الملی قانون ہے، اور جس کو وہ نہ مانیں یا کچھ عرصہ تک مانتے رہنے کے بعد چھوڑ دیں وہ سرے سے کوئی قانون ہی نہیں ہے، اس طرح یہ قانون محض سلطنتوں کے سیاسی مصالح اور جہانبانی کے اغراض و مطامع کا آلۂ کار بنکر رہگیا ہے، جسے بنانے اور حسب منشا کام میں لانے اور حسب ضرورت ادلنے بدلنے کے تمام اختیارات سلطنتوں کے [illegible] مدبرین کو دیدیئے گئے ہیں، جو مطلب براری میں ہر جائز و ناجائز وسیلہ کو استعمال کرنے کے عادی ہیں، پھر اسمیں تاویل و تعبیر کی اتنی گنجائش، اختلاف [illegible] کے [illegible] اتنی لچک اور واجبات سے بری الذمہ ہونے کے لئے اتنی کشادگی رکھی گئی ہے کہ ہر سلطنت اپنی اغراض کے مطابق جب چاہے، اسے توڑ دے، اور وہ پھر بھی قائم کا قائم ہے، گویا خود قانون ہی نے اپنے اندر قانون شکنی کے لئے بھی کافی وسعت مہیا کر رکھی ہے،

حقیقت یہ ہے کہ یہ اوہن البیوت آج صرف اس لئے قائم ہے کہ سلطنتیں خود اپنی ضروریات کے لئے اس کو قائم رکھنا چاہتی ہیں ورنہ اگر آج وہ اپنی مختلف و متضاد سیاسی اغراض کے لئے اسکی وسعتوں اور کشادگیوں سے فائدہ اٹھانا شروع کر دیں تو بین الملی

قانون کا فلک بوس قصر آن کی آن میں پانی کے بلبلے کی طرح بیٹھ جائے،

میں اصلی قانون کا شعبۂ جنگ، لیکن اس قانون کا جو حصہ قانونِ جنگ سے موسو
کیاجاتا ہے، اسکی بنیاد قانونِ صلح سے بھی کمزور ہے، مغرب کا قانونِ جنگ حقیقۃً کسی اخلا
بنیاد پر قایم نہیں ہے، بلکہ صرف اس بنیاد پر قایم ہے، کہ سلطنتیں، خود اپنے آدمیوں کو وحشیا
اعمال سے بچانے اور خوفناک تکلیفوں سے محفوظ رکھنے کی خواہش مند ہیں، اسی غرض کیلئے
انھوں نے باہم ملکر یہ طے کرلیا ہے کہ جب کبھی ہم ایک دوسرے سے لڑیں گے، تو فلاں
فلاں قواعد کی پیروی کریں گے، مثال کے طور پر ۱۹۰۷ء کی ہیگ کانفرنس میں انھوں نے
ایک معاہدہ مرتب کیا جسمیں اسیرانِ جنگ کے لئے بیشمار رعایات اور آسائشیں مقرر کی گئی
تھیں، ان وسیع رعایتوں پر سلطنتوں کے متفق ہوجانے کی وجہ یہ نہیں تھی کہ وہ ان لوگوں کے سا
حسن سلوک کرنا اپنا اخلاقی فرض سمجھتی تھیں جو ان سے جنگ کرنے کے لئے آئیں بلکہ اس کی
اصلی وجہ صرف یہ تھی کہ ہر سلطنت خود اپنے سپاہیوں کے لئے اس بات کی خواہشمند تھی کہ
جب وہ دشمن کے ہاتھ گرفتار ہوں تو ان کو جذبۂ انتقام کی تسکین کا ذریعہ نہ بنایا جائے، اگر
آج کوئی سلطنت اس معاہدہ کو توڑدے اور اسیرانِ جنگ کے ساتھ وہی سلوک کرنے لگے جو
چھٹی صدی میں روم و ایران کی سلطنتیں کرتی تھیں، تو شاید کوئی مہذب سے مہذب سلطنت بھی
اس کے جواب میں معاہدات کو بالائے طاق رکھکر اسی وحشیانہ طریقہ کی پیروی میں تامل نہ
کریگی، یہی حال ان قوانین کا بھی ہے جو ہوائی جہازوں کی گولہ باری، پھٹنے والی گولیوں اور
زہریلی گیسوں کے استعمال، جنگی ہسپتالوں اور تیمارداروں کے احترام، اور ایسے ہی دوسرے
جنگی معاملات کے متعلق ہیں، ان کے بارے میں جتنے معاہدات ہیں، ان سب کی علت بھی
یہی ہے، کہ ہر سلطنت خود اپنی فوجوں اور شہری آبادیوں کو تباہی و ہلاکت سے محفوظ رکھنا
چاہتی ہے، ورنہ کسی فریق کی جانب سے خلاف ورزی ہونے کی صورت میں کوئی سلطنت بھی
ان قوانین کی پابندی پر آمادہ نہیں ہے،

جنگی قوانین کی معنوی صورت پس یہ قواعد و ضوابط جنکو جنگ کے مہذب "قوانین"
کہاجاتا ہے، دراصل قوانین نہیں ہیں بلکہ معاہدے ہیں، وہ صرف اس وقت نافذ ہوسکتے

ہیں جب تمام معاہد قومیں ان کو تسلیم کریں، اور ہر سلطنت صرف اسی وقت تک ان کی پابند رہ سکتی ہے جب تک دوسری سلطنتیں بھی ان کی پابند ہیں، جوں ہی کسی بڑی سلطنت یا چند سلطنتوں کے کسی مجموعہ نے ان کی خلاف ورزی کی، اور بس تمام دنیا کی مہذب سلطنتیں ان کی پابندی سے بری الذمہ ہو گئیں، ایسے قواعد کسی طرح قوانین سے موسوم نہیں کئے جا سکتے، قانون کی تعریف یہ ہے کہ ہر فرد فی حد ذاتہ اسکی پابندی پر مجبور ہو، بلا لحاظ اس کے کہ دوسرے افراد اسکی پابندی کریں یا نہ کریں، جس قانون میں ایک فرد کی پابندی دوسرے افراد کی پابندی پر موقوف ہو، وہ درحقیقت قانون نہیں معاہدہ ہے، اور معاہدہ خواہ کیسے ہی عمدہ قواعد وضوابط پر مشتمل ہو کسی تحسین وستائش کا مستحق نہیں ہو سکتا کیونکہ اس کے قواعد وضوابط معاہدین کی خودغرضی پر مبنی ہوتے ہیں، نہ کہ اخلاقی فرائض کے احساس پر،

یہ صرف ہمارا ہی خیال نہیں ہے، خود یورپ کے بڑے بڑے اہل دول اور علمائے قانون بھی یہی کہتے ہیں، مسٹر [illegible] (Barclay) اپنے ایک مضمون کے آخر میں لکھتا ہے:۔

"جنگ کے عمل کو منضبط کرنے کے لئے جو ضوابط بنائے گئے ہیں ان پر بہت زیادہ اعتماد نہیں کرنا چاہئے، جنگی ضروریات، جوش، اور ہیجان جذبات جو ہمیشہ حالتِ جنگ میں برسرکار آجاتے ہیں، ان بہتر سے بہتر قواعد کو بھی توڑ ڈالتے ہیں جنھیں ڈپلومیسی اپنی انتہائی ذہانت کے ساتھ وضع کر سکتی ہے، تاہم یہ قواعد اس رائے عام کی حالت کو ظاہر کرتے ہیں، جو مہذب قوموں میں وحشیانہ اعمال کے ارتکاب کی روک تھام کرتی ہے"[1]

جنگ عظیم سے کچھ عرصہ قبل جرمنی کے محکمہ جنگ کی جانب سے ایک کتاب شائع کی گئی تھی جسکا نام بری جنگ کے لئے جنگی ہدایات کی کتاب (Kriegsbrauch im Landkriege) تھا اس کے ابتدائی فقرات یہ ہیں:۔

[1] [illegible]

"قانونِ جنگ کوئی ایسا واجب العمل دستور نہیں ہے، جسے بین الملی قانون نے پیدا کیا ہو، بلکہ وہ محض ایک مراعات باہمی کا سمجھوتہ اور مطلق آزادیٔ عمل کی ایک تحدید ہے، جسے رواج اور مفاہمت، نیک طبعی اور ریاکاری نے مل جل کر پیدا کیا ہے، مگر جس کی پابندی کے لئے کوئی مجبور کن قوت بجز ایک قطعی خوفِ انتقام کے نہیں ہے"[1]

یہ "خوفِ انتقام" درحقیقت یورپ کے قوانینِ جنگ کا پشتیبان ہے، گذشتہ جنگِ عظیم میں جب سلطنتوں کے جوشِ انتقام نے اس خوفِ انتقام کو دلوں سے دور کردیا، اور بعض طاقتوں نے جوابی کارروائی کے خطرے سے بے پروا ہو کر ہیگ اور جنیوا کے قواعد و ضوابط کی خلاف ورزی شروع کردی تو دنیا نے دیکھ لیا کہ وہ تمام سلطنتیں جنھیں "مہذب قوانینِ جنگ" کے احترام کا دعویٰ تھا، دفعۃً قانون کی پابندی سے آزاد ہوگئیں، ہر گناہ جو ایک فریق نے کیا، اس کے مخالف فریق کے لئے ثواب بن گیا، ہر قانون شکنی جو ایک سلطنت نے کی، اسکی تقلید دوسری سلطنت کے لئے جائز ہوگئی، اور تمام یورپ نے مل کر ان قوانینِ جنگ کی دھجیاں اڑادیں جنھیں خود یورپ ہی نے سات برس پہلے ہیگ اور جنوا میں وضع کیا تھا، اگر یہ قوانین انفرادی احساس پر مبنی ہوتے تو کیا اسی طرح ان کے بخیئے بکھیرے جاتے؟

جنگی ضروریات کا غالب تر قانون | اس کے بعد ان قوانین میں جو کچھ جان باقی بچ جاتی ہے، اس کو جنگی ضروریات کا غالب تر قانون اور بھی مضمحل کر دیتا ہے، میدانِ جنگ کی وقتی ضروریات ہمیشہ ان قوانین سے ٹکراتی رہتی ہیں، اور ان کے مقابلہ میں کتابوں کے لکھے ہوئے اور صلح کانفرنس کے بنائے ہوئے قوانین کو ہمیشہ شکست نصیب ہوتی رہتی ہے، پروفیسر نیولڈ لکھتا ہے:۔

"قانونِ جنگ کے ضوابط میں قانون بین الملل کے دوسرے شعبوں کی بہ نسبت تناقض و اختلاف بہت زیادہ واقع ہوتا ہے، کیونکہ جنگی قوانین

[1] Kriegs branch . P. 2

اور جنگی ضروریات میں بآسانی تصادم ہوجایا کرتا ہے، اس بنا پر قانون جنگ کو بین الملّی قوانین میں شامل رکھنے کا نتیجہ صرف یہی ہوسکتا ہے کہ جو بے ثباتی و ناپائداری قانونِ جنگ کو حاصل ہے، وہی عام بین الملّی قوانین کو بھی حاصل ہوجائے[۱]،،

ایک دوسرے موقع پر یہی مصنف لکھتا ہے :-

،،عمومی حیثیت سے جنگ کا چلن ہمیشہ اور ہر موقع پر صرف ضروریات جنگ ہی کے تابع رہے گا نہ کسی اور چیز کے تابع، اس خود امدادی کی حالت میں جو قانونی ضابطے وضع کیے جائیں، انکی تدوین میں کامل اعتدال اور خاص خاص حدود کو ملحوظ رکھنا پڑیگا، اگر ان حدود کو ملحوظ نہ رکھا گیا تو قرین قیاس یہ ہے کہ قانونی قیود کلیتہً توڑ دیجائیں گی، اس خیال کی صداقت کو جنگ عظیم نے اچھی طرح ظاہر کر دیا ہے، لہذا آئندہ جو قوانینِ جنگ وضع کیے جائیں، ان میں اس کو ہمیشہ مدنظر رکھنا ضروری ہوگا[۲]،،

تمایش اور حقیقت کا فرق: جس وقت ہیگ کانفرنس میں قوانینِ جنگ وضع کیے جا رہے تھے، تو یورپ کے اہلِ سیاست پر نمائشی تہذیب کا اس قدر غلبہ تھا کہ انھوں نے اپنی قوموں کے حقیقی جنگی رجحانات و میلانات اور ان کی جنگی عادات کو نظر انداز کر کے اس قسم کے قوانین بنا لئے جو دیکھنے میں تو نہایت مہذب نہایت شاندار اور حد درجہ انسانیت پرور تھے، مگر فی الواقع ان کے فوجی گروہ ان کی پابندی کرنے کے لئے ہرگز راضی نہ تھے۔ جرمنی کے فوجی نمائندے مارشل بی برستائن نے کانفرنس کی ابتدا ہی میں یہ تنبیہ کر دی تھی کہ :-

،،جو بین الملّی قانون ہم بنانا چاہتے ہیں اسے صرف ایسی قواعد پر مشتمل ہونا چاہیے جنکی تعمیل جنگی نقطۂ نظر سے مخصوص احوال میں بھی ممکن ہو[۳]

۱ [illegible] ...ional Law after world war P. 9

۲ [illegible] documents 1. P 282 ۳ Ibid. P. 112

لیکن اس وقت اس تنبیہ کی پروا نہیں کی گئی، نتیجہ یہ ہوا کہ ہیگ کانفرنس کے چار
سال بعد پہلی مرتبہ جب طرابلس اور بلقان کی لڑائیوں میں ان قوانین کی عملی تنفیذ کا موقع آیا
تو ان کی علانیہ خلاف ورزی کی گئی، اور اس کے سال بھر بعد جنگ عظیم کے سیلاب نے تو تکلفات
تمام بند توڑ کر رکھ دیئے، یہ حال دیکھ کر یورپ کے اہل سیاست اور علمائے قانون کو عقل آئی اور انہوں
نے تسلیم کرنا شروع کیا کہ جنگ کو خیالی قوانین اور نمائشی ضوابط سے محدود کرنے کی کوشش
قطعاً بے سود ہے، اس کے بعد سے ان لوگوں نے جس قسم کے خیالات ظاہر کرنے شروع
کئے ہیں، ان سے معلوم ہوتا ہے کہ اب علمائے قانون کا میلان کس طرف ہے، ایک جرمن عالم
میکس ہوبر لکھتا ہے:۔

"مستقبل میں بین الملی قانون کے فن کا یہ فرض ہونا چاہئے کہ وہ تمام خیالی
اور مبہم قوانین سے میدان کو صاف کرکے یقینی حدود قائم کرے، بین الملی
قانون کی فوری اور وسیع ترقی کی خواہش اور امید سے مغلوب ہو کر ایسا نہ ہو
کہ وہ "ناتمامی" اور "غیر یقینیت"، سے مطمئن ہو جائے، اسکو سختی کے ساتھ ان تمام
ظاہر فریبیوں کو مٹا دینا چاہئے جنھیں ڈپلومیسی نے محض رائے عام کی تسکین خاطر
کے لئے بین الملی قانون کی ترقی کا بے معنی طلسم بنا کر کھڑا کر دیا تھا۔"

پروفیسر نیولڈ تو اس ناکامی سے یہاں تک متاثر ہوا ہے، کہ قانون جنگ کو بین الملی
قانون کی حدود سے کلیتہً خارج کر دینے کا مشورہ دیتا ہے، بلکہ اسے تو یہ بھی تسلیم کرنے
سے انکار ہے کہ جنگ فی الواقع قانون سے کوئی تعلق رکھتی ہے، یا اسکو کسی قانون سے محدود
مقید کرنا درست ہو سکتا ہے، وہ کہتا ہے:۔

"بین الملی قانون، مسئلہ جنگ سے تعرض کرنے میں اب تک اپنی اصلی
حد سے بہت تجاوز کرتا رہا ہے، جنگ کو قانونی حیثیت سے تعبیر کرنے کی
کوشش میں اسے یہ نظریہ قائم کرنا پڑا کہ جنگ ایک قانونی ارادہ ہے، اور
اس نظری بحث میں وہ اکثر اوقات حقائق کی حدود سے بہت دور نکل گیا،

ا DEVELOPMENT OF INTERNATIONAL LAW. P. 113

ان نظریین نے اس حقیقت کو نظر انداز کر دیا کہ قانون بھی جنگ پر حاوی نہیں ہوسکتا، اور نہ تمام حیثیات سے اس کو ضبط میں لاسکتا ہے، اس کی سیدھی سی وجہ یہ ہے کہ جنگ فی نفسہٖ قانون کی نقیض ہے، لڑائی میں قانونی ملحوظات نہیں، بلکہ جنگی ضروریات انسان کے لئے محرکِ عمل ہوا کرتی ہیں، اور یہ ایک واقعہ ہے کہ جنگ کوئی قانونی ادارہ نہیں ہے بلکہ قوت سے کام نکالنے کی کوشش ہے، وہ ایک کشمکش ہے، قوت کا استعمال ہے، اور اس حیثیت سے کہ وہ بجبر اپنا دعویٰ منوانے کے لئے لڑی جاتی ہے، خود امدادی کا فعل ہے۔ فن حرب میں جنگ کی یہی تعریف کی گئی ہے، اور اسی تعریف پر بین الملی قانون کو بھی قناعت کرنی چاہئے، اس تعریف سے قطع نظر کرنے کے باوجود یہ ظاہر ہوچکا ہے کہ جنگ بحیثیت مجموعی قانون کی حدود سے خارج ہے، اگرچہ اس کو مختلف صورتوں سے ضابطہ میں لانے کی کوششیں کی گئیں، اور ایک جدید قانونِ جنگ مدون بھی کر لیا گیا، مگر اصل واقعہ جوں کا توں رہا¹"

ایک اور ماہر قانون اے ہوروئس ([illegible]) لکھتا ہے:-

"قانون، طبیعتِ جنگ سے اس قدر بے لگاؤ ہے کہ جو بین الملی قانون حالتِ جنگ میں سلطنتوں کے تعلقات کو منضبط کرتا ہے، اس کی نوعیت محض بے ضابطہ (anarchical) ہے، بین الملی قانونِ جنگ اپنی عین فطرت کے لحاظ سے صرف ایک قرار داد باہمی کی کوشش ہے اور رہیگا²"

اسی رائے سے سیکس ہوبے نے بھی اتفاق کیا ہے، وہ کہتا ہے کہ:-

"جنگ عظیم سے پہلے ہی اس خیال نے جڑ پکڑنی شروع کر دی تھی کہ جنگ عہد وحشت کے باقیات میں سے ہے، اور قوانین جنگ کی غیر معمولی ترقی ایک قسم کی ڈھٹ بندی اور شعبدہ گری سے زیادہ نہیں ہے، کیونکہ

¹ Ibid. P. 7 ² Ibid. P. 9

وہ ہم کو حقیقت جنگ کے بارے میں دھوکہ دیتی ہے، اور سیاست کے اس اس بنیادی مسئلہ سے غافل کر دیتی ہے کہ ہمیں یا تو پر امن قانونی حالت قایم رکھنی چاہئے یا جبر و زور کی غیر قانونی حالت میں مبتلا ہو جانا چاہئے[1]"

ایک دوسرے موقع پر یہی مصنف لکھتا ہے:۔

"جنگ کو ایک قانونی ادارہ سمجھ کر اس کی کارروائیوں کو ایک عدالت کے مقدمہ کی طرح ضابطہ میں لانے کا تخیل بین الملّی قانون کی خطا ہے، جو روم اور قرون وسطیٰ کے تخیلات میں سے ہے[2]"

یہ ان لوگوں کے اقوال ہیں جو یورپ میں بین الملّی قانون کے مسلّم ماہر ہیں، ان کو اپنے مایۂ ناز قوانین جنگ کی کمزوری و ہیچ میرزی کا اعتراف کرتے ہوئے یقیناً اذیت ہوتی ہوگی، مگر جب مغرب کی پہلی بین الملّی جنگ ہی نے یہ ثابت کر دیا کہ اتنی محنتوں سے انھوں نے قانونِ جنگ کا جو عالیشان قصر تعمیر کیا ہے، وہ مکڑی کے جالے اور پانی کے بلبلے سے بھی زیادہ ناپائدار ہے، تو انھیں خوف پیدا ہو گیا کہ کہیں بین الملّی قانون کے اس شعبہ کی ناپائداری پورے بین الملّی قانون ہی کا اعتبار نہ کھو دے، اس لئے انھوں نے صاف صاف اعتراف کر لیا کہ جنگ کو کسی ضابطہ اور قانون کے تحت لانا سرے سے ممکن ہی نہیں ہے، جنگ اور قانون میں ایک فطری تناقض ہے، جنگ قانون کی عین طبیعت کے خلاف ہے، اور جنگ کا اصلی قانون وہ نہیں ہے جو ہیگ اور جنیوا میں مرتب کیا گیا ہے، بلکہ وہ ہے جسے میدانِ جنگ میں توپیں اور سنگینیں تدوین کرتی ہیں،

یہ ہے اس قانونِ جنگ کی حقیقت جسے بیسویں صدی کا مہذب قانون کہا جاتا ہے۔

فوجی اور قانونی گروہوں کا اختلاف | **اس نمائش اور حقیقت کے اختلاف**

[1] Development of International law. P. 8

[2] IBID. P. 112

کی اصلی وجہ یہ ہے کہ یورپ میں ابتدا سے دو مختلف نظریے کے گروہ ہیں، ایک گروہ
قانون اور سیاسی مدبرین کا ہے جو زیادہ تر نمایش و تصنع کی خاطر، اور کمتر لطیف احساسا
سے مغلوب ہو کر، جنگ کو اخلاقی حدود کا پابند بنانے اور اسے محض ایک مہذب مقا
صورت میں ڈھال دینے کی کوشش کر رہا ہے، اور دوسرا گروہ فوجی ہے، جس کے نزدیک
جنگ ایک خود امدادی (Selbsthilfe) کا فعل ہے، اور اس کو انسان تمام قانو
تدابیر میں ناکام ہو کر اختیار ہی اس لئے کرتا ہے کہ ہر ممکن طریقہ سے دشمن کو مغلوب کر
اپنا مقصد حاصل کرے، ان دونوں زوایائے نظر میں اصولی تباین ہے، ایک گرو
حصولِ مقصد کو اصل کار سمجھتا ہے، دوسرا تہذیب و اخلاق کو غالب رکھنے کا خواہشمند
ایک گروہ کی رائے میں قانون کو توڑ کر قانون ہی کی پابندی کرنا بے معنی ہے، دوسر
گروہ کے نزدیک قانون کی پابندی تہذیب کی خصوصیات سے ہے، اس لئے مہذب
انسانوں کو قانون شکنی بھی ایک قسم کی پابندئ قانون کے ساتھ کرنی چاہئے لیکن
اصولی اختلاف صرف فکر و خیال ہی کی حد تک محدود نہیں ہے، بلکہ دونوں کے دائرۂ عمل
بھی مختلف ہیں، قانونی و سیاسی گروہ کو بین الملی کانفرنسوں اور بین الدولی مجلسوں پر
حاصل ہے، اس لئے وہ اپنے اثرات سے کام لیکر صفحۂ کاغذ پر جنگ کو ایک خوشنما شکنجہ میں
خوب جکڑ دیتا ہے، مگر عرصۂ جنگ میں اس شکنجہ کی بندش کو قائم رکھنا اس کے بس کا کام
نہیں ہے، فوجوں کی قیادت و رہنمائی، جنگی محکموں کی تنظیم و ترتیب، قومی حربی تد
و نگرانی، اور حالتِ جنگ میں عمالِ جنگ کی سربراہی، کلیۃً فوجی گروہ کے ہاتھ میں
اس لئے جب جنگ کا موقع آتا ہے تو وہ اس خوشنما شکنجہ کا ایک ایک تار الگ کر کے
رکھ دیتا ہے، اور قانونی گروہ کے علی الرغم عمل کی دنیا میں وہ سب کچھ کرتا ہے جو بین
قانون میں ناجائز، مگر ضروریاتِ جنگ کے قانون میں جائز ہے،

ظاہر ہے کہ اصل اعتبار قول کا نہیں، بلکہ عمل کا ہے، کہنے والا کچھ کہا کرے ہمیں
یہ دیکھنا ہے کہ کرنے والا کیا کرتا ہے، ہمارے نزدیک مغرب کا اصلی قانون جنگ وہ
نہیں ہے جو کاغذوں میں لکھا ہوا ہے، بلکہ وہ ہے جس پر اہل مغرب حالتِ جنگ

ین عمل کرتے ہیں، اس لئے ہم اعتبار کے قابل قانونی گروہ کو نہیں بلکہ فوجی گروہ کو سمجھتے ہیں
جو دراصل واحد با اختیار گروہ ہے، قوانینِ جنگ کے متعلق اس گروہ کے جو کچھ خیالات ہیں،
ن کے مطالعہ سے اہلِ مغرب کا اصلی میلانِ طبع معلوم ہوتا ہے، اور وہ درحقیقت معلوم
کرنے کے قابل ہے،

یورپ کے مشہور ماہرِ حربیات کلاؤس وتس (Clausewitz) اپنی
کتاب (Vom Kriege) میں لکھتا ہے:-

"قوانینِ جنگ محض خود عائد کردہ قیود ہیں، تقریباً ناقابلِ ادراک، اور
مشکل سے قابلِ ذکر جنھیں اصطلاح میں "مروجاتِ جنگ" کہا جاتا ہے،
اب محبانِ انسانیت کے لئے اپنے خیال میں یہ سمجھ لینا بہت آسان ہے
کہ دشمن کو کسی بڑی خون ریزی کے بغیر نہتا اور مغلوب کر لینے کا ایک
دانشمندانہ طریقہ موجود ہے، اور یہی فنِ حرب کا مناسب مقصد ہے، لیکن یہ
خیال خواہ کتنا ہی دل خوش کن معلوم ہو حقیقۃً بالکل غلط ہے اور اس کو
جتنے جلدی دور کر دیا جائے اتنا ہی بہتر ہے، کیونکہ ایسی ایک خوفناک
چیز میں جیسی کہ جنگ ہے، رحم و کرم کی روح کو داخل کرنے سے جو خرابیاں
پیدا ہوتی ہیں، وہ اور بھی زیادہ بری ہیں .... خود جنگ کے
فلسفہ ہی میں نرمی و اعتدال کے اصول کو داخل کرنا ہی ایک غلطی ہے
.... جنگ دراصل ایک جبر اور زبردستی کا عمل ہے،
جس کا ارتکاب کسی قسم کے حدود و قیود کی پابندی قبول نہیں کر سکتا"[۱]

جرمنی کی کتابِ جنگ جس کا حوالہ اوپر دیا جا چکا ہے، ایک موقع پر ضروریاتِ جنگ کے
قانون کو اس طرح بیان کرتی ہے:-

"فوجی سپاہی کو تاریخ پر نظر ڈالنی چاہئے، وہ دیکھے گا، کہ ایک قسم
کی سختیاں بہرحال جنگ میں ناگزیر ہیں، اور بسا اوقات سچی انسانیت

۱؎ Vom Kriege i. Kap. i (3)

کا تقاضا یہی ہوتا ہے کہ ان کو بے دھڑک استعمال کیا جائے۔[1]

اسی کتاب میں ایک دوسرے موقع پر ہیگ کے مہذب قوانینِ جنگ اور ایسے ہی دوسرے سمجھوتوں کو "لطیف و رقیق جذبات کی ایک ایسی لہر" قرار دیا گیا ہے جو خود جنگ کی فطرت اور مقاصد سے بنیادی تناقض رکھتی ہے۔

امیر البحر آوبے (Admiral Aube) اپنے ایک مضمون میں لکھتا ہے:-

"جنگ کی تعریف ہم اس طرح کرتے ہیں کہ وہ حق کا اپیل ہے اس قوت کے خلاف جو اس حق سے انکار کرتی ہو، اس سے قدرتی طور پر یہ لازم آتا ہے کہ جنگ کا غالب مقصد یہ ہے کہ دشمن کو ہر ممکن طریقہ سے نقصان پہونچایا جائے، اور چونکہ ایک قوم کے وسائلِ ثروت در اصل جنگ کے اعصاب ہیں، اس لئے ہر وہ چیز جو دشمن قوم کی ثروت اور سب سے زیادہ اس کے وسائلِ ثروت پر ضرب لگاتی ہو، اس کا استعمال نہ صرف جائز بلکہ واجب ہے، قطع نظر اس سے کہ دنیا اس کو کس نظر سے دیکھتی ہو۔"[2]

ان اقوال سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ یورپ کے اخلاقیین و سیاسیین نے دنیا میں اپنی تہذیب کی نمایش کرنے کے لئے جو دلکش اور انسانیت پرور قوانینِ جنگ وضع کئے ہیں، ان کی عملی تنفیذ کا انحصار جس گروہ کی مرضی اور پسند پر ہے وہ ان قوانین کو کس قدر لغو اور مہمل سمجھتا ہے، اور ضروریاتِ جنگ کے مقابلہ میں ان کی پابندی سے کس قدر نفور ہے، ابتداءً قانونی گروہ اس کے خلاف اپنے دعوے تہذیب و انسانیت کی تائید میں جدوجہد کرتا رہا، مگر جب جنگِ عظیم میں فوجی گروہ نے اپنی قدرت و طاقت کو عملاً ثابت کر دیا، تو آخر اس تخیل پرست گروہ کو تلخ حقایق کے آگے سر ڈال دینی پڑی، اور اس نے بھی جنگ کے اسی نظریہ کو قبول کر لیا جسے عملی طاقت کے ساتھ فوجی گروہ نے پیش کیا تھا۔

---

[1] Kriegsbranch, P. 3

[2] Revue des Deux mondes (1882) P. 314

پروفیسر نویس ویسٹ لیک، ہوبرو غیرہ علمائے قانون کی زبان سے آپ اس اعتراف شکست کو سن چکے ہیں، آگے چل کر آپ یہ بھی دیکھیں گے کہ ان مادی حقایق کے زور سے دب کر جزئیات قانون میں کس کس طرح ترمیمیں کی گئیں،

مغرب کے قوانینِ جنگ

جہاں تک اصول کا تعلق تھا، ہم نے تہذیب مغربی کے بین الملی قانون اور اس کے شعبۂ جنگ کی حقیقت کو اچھی طرح واضح کر دیا ہے، یہ قانون کیا چیز ہے؟ بحیثیت ایک قانون کے اس کی قدر و قیمت کیا ہے؟ معنوی حیثیت سے وہ کیا وزن رکھتا ہے پھر خود اس کی اپنی نظر میں اس کے شعبۂ جنگ کا کیا مرتبہ ہے؟ اس میں جنگ کو اخلاقی حدود کا پابند بنانے کی قوت کہاں تک موجود ہے؟ اور عملی و نظری حیثیات سے جنگ کو ضبط و نظام کے تحت لانے میں وہ کس حد تک کارگر ہو سکتا ہے؟ ان سوالات کو اوپر کی مختصر بحث نے ایک حد تک صاف کر دیا ہے، اور اس سے یہ بات واضح ہو گئی ہے کہ جس چیز کو مغرب کا قانونِ جنگ کہا جاتا ہے وہ در اصل کوئی قانون ہی نہیں ہے،

اب ہم یہ دیکھنا چاہتے ہیں کہ یہ نام نہاد قانون جیسا کچھ بھی ہے، جنگ کی تحدید و تنظیم میں کہاں تک کامیاب ہوا ہے؟ اس نے جو حدود و ضوابط مقرر کئے ہیں وہ اسلامی قانون کے مقرر کردہ حدود کے مقابلہ میں کیسے ہیں؟ اس کے نمائشی اور اصلی قواعد میں کیا فرق ہے؟ مسئلۂ جنگ کے سلسلہ میں انسانی افکار کی جو ترقی اس سے ظاہر ہوتی ہے، وہ اسلامی قانون کے ساتھ کیا نسبت رکھتی ہے؟ اور اس نے فی الواقع انسانیت کی کتنی خدمت انجام دی ہے؟

قوانینِ جنگ کی تاریخ سترھویں صدی کی ابتدا تک یورپ قوانینِ جنگ کے تصور سے بھی خالی الذہن تھا، اصولاً اور عملاً جنگ کو اخلاقی حدود اور قواعد و ضوابط کی پابندیوں سے مستثنیٰ سمجھا جاتا تھا، اور محاربین کو ایک دوسرے کی ضرر رسانی کا مطلق

ور غیر محدود حق حاصل تھا۔ اس زمانہ کی لڑائیوں کے جو حالات تاریخوں میں [illegible]
معلوم ہو جاتا ہے کہ جب دو قومیں آپس میں لڑتی تھیں تو اپنے دشمن کو نقصان پہونچانے کے
لئے کسی بڑے سے بڑے ظلم اور ہولناک سے ہولناک جرم سے بھی دریغ نہ کرتی تھیں۔
صرف عملاً ہی نہیں بلکہ اعتقاداً بھی ان کے اندر اہل قتال وغیر اہل قتال کے امتیاز کا کوئی
احساس موجود نہ تھا۔ گروٹیوس جیسے اخلاق پرور مقنن کی بھی یہ رائے تھی کہ:۔

"قانون میں ان تمام لوگوں کو قتل کر دینا جائز ہے جو دشمن کے حدود میں
پائے جائیں۔ اسمیں عورتوں اور بچوں کا کوئی استثنا نہیں ہے۔ اور وہ اجنبی
باشندے بھی مستثنیٰ نہیں ہیں، جو ایک معقول مدت کے اندر دشمن کے علاقہ
کو نہ چھوڑ دیں۔"

یہ غیر محدود حق ۱۶۱۸ء تا ۱۶۴۸ء کی جنگ سی سالہ میں اتنی آزادی کے ساتھ استعمال کیا گیا تھا
کہ تمام یورپ تھرا اٹھا، اور اس کے دردناک وقائع نے یورپ کے ارباب فکر میں عام طور پر یہ خواہش
پیدا کر دی کہ جنگ کے اعمال پر کسی قسم کے اخلاقی حدود ضرور قائم ہونے چاہئیں۔ اس خواہش نے
سب سے پہلے ہالینڈ کے مقنن گروٹیوس (Grotius) کے ذہن میں راستہ پیدا کیا اور
اس سے قانون کی وہ مشہور تاریخی کتاب (De Jure Belli ac Pacis)
لکھوائی جو بین الملی قانون کی بنیاد سمجھی جاتی ہے، یہ کتاب ۱۶۲۵ء میں شائع ہوئی اور [illegible]
برگ یونیورسٹی کے نصاب میں داخل کیا گیا جس سے یورپ کے اہل علم میں ایک [illegible] حرکت
پیدا ہو گئی، اور مصنفین و مولفین نے اسی نئی راہ میں مغربی افکار کو ترقی دینی شروع کی۔ گروٹیوس
کے تقریباً نصف صدی بعد اس کے شاگرد پوفنڈارف [illegible] نے اپنی کتاب
(De Jure Naturae et Gentium) شائع کی اور اس کے بعد کتابوں کا ایک سلسلہ شروع ہوا
جس نے اٹھارھویں صدی تک پہونچ کر بین الملی قانون کے ایک پورے علم کی شکل
اختیار کی۔ ۱۷۸۹ء میں انگلستان کے مشہور مقنن جرمی بنتھم (Jeremy Bentham)
نے اس فن کا نام "بین الملی قانون" رکھا جس سے آج وہ دنیا میں مشہور ہے۔

[illegible] al Law P. 330

عملی حیثیت سے یورپ کی جنگ پر ان ترقی یافتہ افکار کا پہلا اثر ویسٹ فالیا (West-phalia) کی کانگریس میں رونما ہوا جبکہ یورپ کے مدبرین نے جنگ سی سالہ کے خاتمہ پر ۱۶۴۸ء میں گروٹیوس کی اس سفارش کو قبول کر لیا کہ:-

"جنگ میں بطور ایک شریفانہ رعایت کے (نہ کہ بطور ایک قانون کے) بچوں بوڑھوں، عورتوں، پادریوں، کاشتکاروں، تاجروں اور اسیرانِ جنگ کو قتل و غارت سے محفوظ رکھنا چاہئے"

یہ روشنی کی پہلی کرن تھی جو مسیح کی پیدائش کے ۱۶۴۸ برس بعد یورپ کے تاریک مطلع پر نمودار ہوئی۔ اس کے بعد لڑائیوں میں وحشیانہ حرکات کے ارتکاب کا وہ زور نہیں رہا جو جنگ سی سالہ میں دیکھا گیا تھا، لیکن جہاں تک فوجوں کے جنگی اخلاق کی عملی تحسین اور اعمالِ جنگ کی حقیقی اصلاح کا تعلق ہے، دوسو برس تک یورپ نے اس راہ میں کوئی ترقی نہیں کی حتیٰ کہ انیسویں صدی کے وسط میں ہندوستان کی جنگ آزادی (۱۸۵۷ء کے نام نہاد "غدر") کے موقع پر مغربی فوجوں نے وہ ہولناک مظالم کئے جنکے تصور سے بھی انسانی ضمیر کانپ اٹھتا ہے، جہاں تک ہمیں معلوم ہے، انیسویں صدی کے وسط تک یورپ میں قوانینِ جنگ کا کوئی ایسا ضابطہ موجود نہ تھا جسکو سلطنتوں نے منظور کیا ہو، یا جسکو یورپین فوجوں میں جنگی قانون کی حیثیت سے رائج کیا گیا ہو۔ مغربی قوموں میں سب سے پہلے امریکہ نے اس راہ میں اقدام کیا اور ۱۸۶۳ء میں اپنی فوجوں کے لئے ایک ہدایت نامہ (Manual of instructions) مرتب کیا جسکا مقصد جنگ کے زمانہ میں فوجوں کے طریق عمل کو منضبط کرنا تھا، اس کے بعد جرمنی، فرانس، روس، اور انگلستان نے بھی اپنی فوجوں کو اسی قسم کی ہدایات دینے کا سلسلہ شروع کیا اور رفتہ رفتہ یورپ کی تمام قوموں نے وہی طریقہ اختیار کر لیا جو ان سے تقریباً ۱۲ سو برس پہلے عرب کے "وحشی" ملک میں ایک امی پیغمبر اور اس کے امی خلفا نے رائج کیا تھا،

Bernard. Paper on growth of the laws of war in oxford essays for 1856. P.P. 100-104

اس کے ایک سال بعد ۱۸۶۴ء میں سوئٹزرلینڈ کی حکومت نے بمقام جنیوا ایک بین الملی اجتماع منعقد کیا جسمیں پہلی مرتبہ بیماروں، زخمیوں، اور محاربوں کے متعلق قوانین مرتب کئے گئے اور ۱۸۶۸ء میں ایک دوسری کانفرنس نے ان کے اندر توضیحات و تشریحات کے ساتھ بہت کچھ اضافہ کیا، لیکن قوانین جنگ کے اس شعبہ میں یورپ اس وقت تک ایک مکمل ضابطۂ قانون کا محتاج رہا، جب تک ۱۹۰۶ء میں جنوا کی تیسری بین الملی کانفرنس نے اس ضرورت کو پورا نہ کیا[ل]،

تباہ کن آلات واسلحہ کے استعمال کے بارے میں یورپ ۱۸۶۸ء تک تاریکی میں رہا، اس سال پہلی مرتبہ سینٹ پیٹرس برگ میں ایک بین الملی فوجی کمیشن مقرر کیا گیا جس نے دولِ مغرب سے سفارش کی کہ پھٹنے والے گولے (explosive Projectiles) جنکا وزن چار سو گرام سے کم ہو، اور پھٹنے والی گولیاں جو جسم میں پھیل جاتی ہیں، اور زہریلی گیسیں، جنگ میں استعمال نہ کیجائیں، اس سفارش کے مطابق ۲۹ نومبر ۱۸۶۸ء کو دولِ مغرب نے (باستثناء اسپین و امریکہ) ایک اقرارنامہ پر دستخط کردیئے،

اس کے بعد زار روس الکزنڈر دوم کی تحریک پر ۱۸۷۴ء میں بروسلز کانفرنس ہوئی، اور اس میں پہلی مرتبہ بری جنگ کے قوانین مرتب کئے گئے، لیکن کسی سلطنت نے ان کی توثیق نہیں کی، بلکہ جرمنی اور انگلستان نے تو ان کو ماننے سے صاف انکار کردیا،

بروسلز کی تجاویز ۲۵ برس تک بیکار پڑی رہیں، تاآنکہ ۱۸۹۹ء میں زار نکولس ثانی کی تحریک پر پہلی مرتبہ ہیگ کانفرنس منعقد ہوئی جسمیں دنیا کی ۲۶ سلطنتوں نے حصہ لیا، اور جنگ کے مختلف شعبوں کے متعلق حسب ذیل سمجھوتے اور اقرارنامے مرتب کئے :-

(۱) بین الملی نزاعات کے مسالمانہ تصفیہ کی تدبیر
(۲) جنگ کے قوانین ورسوم،

ل [illegible] by Birkenhead P. 207

(۳) بحری جنگ میں مرضی و مجروحین کے متعلق ان قوانین کی ترویج جو ۱۸۶۴ء کے جنیوا کنونشن میں منظور کئے گئے تھے،

(۴) پھٹنے والے گولوں کے متعلق سینٹ پیٹرسبرگ کے اقرارنامہ کی توثیق (یہ صرف پانچ سال کے لئے تھی)

(۵) پھٹنے والی گولیوں کے متعلق سینٹ پیٹرسبرگ کے اقرارنامہ کی توثیق،

(۶) زہریلی گیسوں کے متعلق سینٹ پیٹرسبرگ کے اقرارنامہ کی توثیق،

یہ کانفرنس اپنے کام کو مکمل نہ کرسکی اور ۸ سال تک قوانین جنگ کی مزید تدوین کا سلسلہ رُکا رہا، ۱۹۰۷ء میں امریکہ کے صدر مسٹر روزویلٹ اور زار نکولس ثانی کی تحریک پر دوبارہ ہیگ کانفرنس منعقد ہوئی، اور اُس کی کوشش سے یورپ کو پہلی مرتبہ ایک مکمل ضابطۂ قانون میسر آیا، اس مرتبہ ۱۸۹۹ء کے سمجھوتوں اور اقرارناموں میں ترمیم و اضافہ کرنے کے علاوہ حسب ذیل مزید سمجھوتے مرتب کئے گئے:۔

(۱) قرضوں کی وصولیابی میں قوت کے استعمال کی تحدید،

(۲) جنگ کی ابتدا کرنے کے لئے اعلانِ جنگ کا لزوم،

(۳) بّری جنگ میں غیرجانبداروں کے حقوق و فرائض،

(۴) حالتِ جنگ میں دشمن کے تجارتی جہازوں کی حیثیت،

(۵) تجارتی جہازوں کو جنگی جہازوں میں تبدیل کرنے کے متعلق قوانین،

(۶) ٹھیس لگنے سے خود بخود پھٹنے والی بحری سرنگوں کے استعمال کے متعلق قوانین،

(۷) حالتِ جنگ میں جہازوں کی گولہ باری کے متعلق قوانین،

(۸) بحری جنگ میں جہازوں کی گرفتاری کے متعلق قوانین،

(۹) بین الملّی محکمۂ غنائم بحریہ کی تشکیل،

(۱۰) بحری جنگ میں غیرجانبداروں کے حقوق و فرائض،

یہ کانفرنس اگرچہ ایک نہایت وسیع ضابطۂ قانون وضع کرنے میں کامیاب ہوگئی

مگر اس کا ضابطہ پھر بھی اس قابل نہ ہو تھا کہ اس کو مکمل کہا جا سکتا، کیونکہ اس کے بعد تحت البحر کشتیوں، ہوائی جہازوں، اور زہریلی گیسوں کے استعمال کے متعلق مزید قوانین کی ضرورت پیش آئی جسے ۱۹۲۲ء میں واشنگٹن کانفرنس نے پورا کیا، اور ابھی ہم نہیں کہہ سکتے کہ آیندہ پیش آنے والے مسائل کے متعلق اور کتنی کانفرنسوں کی ضرورت ہوگی،

اس مختصر تاریخ سے معلوم ہوتا ہے کہ مغربی دنیا کو ابھی مہذب قوانینِ جنگ سے آشنا ہوئے ۶۰ برس سے زیادہ زمانہ نہیں گذرا ہے، اور اگر ہم ابتدائی زمانۂ تکوین کو چھوڑ کر صرف اس عہد کو لیں جبکہ اس کے قوانینِ جنگ پایۂ تکمیل کو پہونچے، تو یوں کہنا چاہیے کہ جنگ کی تہذیب سے وہ آج سے ۲۰ سال پہلے تک ناآشنا تھی، اس کے مقابلہ میں اسلام کو دیکھو کہ وہ ساڑھے تیرہ سو برس سے اپنا ایک مکمل ضابطۂ قانون رکھتا ہے، اور جہاں تک اصول کا تعلق ہے، اس میں حذف و ترمیم یا اضافہ کرنے کے لئے آج تک کسی کانفرنس یا سمجھوتے یا قرارنامے کی ضرورت پیش نہیں آئی، مگر اس کے باوجود اس کے اصول بڑی حد تک وہی ہیں جنکو آج کی مغربی دنیا نے بعد از خرابی بسیار اختیار کیا ہے، اور بعض اصول ایسے بھی ہیں جن تک مغربی دنیا کی ابھی رسائی نہیں ہوئی ہے،

ہیگ کے سمجھوتوں کی قانونی حیثیت اوپر کے بیان سے ظاہر ہوتا ہے کہ ۱۹۰۷ء کی ہیگ کانفرنس کی کارروائی ان تمام سمجھوتوں اور قرارناموں پر حاوی تھی جو اس سے قبل دول کے درمیان ہوئے تھے، اس لئے جب مغرب کے قوانینِ جنگ پر تبصرہ کرنا ہو تو صرف دوسری ہیگ کانفرنس کے وضع اور توثیق کئے ہوئے معاہدات ہی پر تبصرہ کرنا کافی ہے،

لیکن اس تبصرہ کو شروع کرنے سے قبل یہ تحقیق کرنا ضروری ہے کہ اس کانفرنس کی آئینی حیثیت کیا تھی؟ اور اس کے سمجھوتے اور قرارنامے بحیثیت ایک قانون کے کیا وقعت رکھتے ہیں؟ اس کے لئے ہمیں خود ہیگ کے سمجھوتوں کی طرف رجوع کرنا چاہیے اور اس کی اسی تشریح پر اعتماد چاہیے جو مغرب کے ماہرین قانون نے کی ہے،

ان سمجھوتوں کی قانونی حیثیت متعین کرنے کے لئے پہلا امر تنقیح طلب یہ ہے کہ دول کس حد تک ان کی پابندی کے ذمہ دار ہیں؟ اس کے متعلق خود سمجھوتوں میں یہ تصریح

کر دی گئی ہے کہ دول حرف بحرف ان کی پابندی کرنے پر مجبور نہیں ہیں، بلکہ صرف اس امر کی ذمہ داری لیتی ہیں کہ اپنے قوانینِ جنگ میں ان کو ملحوظ رکھیں گی چنانچہ چوتھے ہیگ کنونشن متعلق بہ قوانین و رسومِ جنگ کی دفعہ اوّل کے الفاظ یہ ہیں:۔

"متعاقد طاقتیں اپنی مسلح بری فوجوں کے لئے ایسی ہدایات جاری کریں گی جو ان ضوابط سے مطابقت رکھتی ہوں گی جو بری جنگ کے قوانین و رسوم کے متعلق اس سمجھوتے کے ساتھ ملحق کئے گئے ہیں"

دوسرا سوال یہ ہے کہ ان قوانین کی حدودِ عمل کیا ہیں؟ اس کا جواب ہیگ کے سمجھوتوں سے ہمیں یہ ملتا ہے کہ یہ تمام سمجھوتے اور اقرار نامے صرف انھیں جنگوں میں نافذ ہوں گے، جن کے دونوں فریق ان سمجھوتوں اور اقرار ناموں کے متعاقدین میں سے ہوں، اگر کوئی ایک فریق غیر متعاقد ہو یا کسی متعاقد فریق کے ساتھ کوئی غیر متعاقد بھی شریکِ جنگ ہو گیا ہو تو ان سمجھوتوں پر عمل درآمد نہیں کیا جائیگا، اسی چوتھی ہیگ کنونشن کی دفعہ دوم کے الفاظ یہ ہیں:۔

"یہ قوانین صرف ان جنگوں میں قابلِ عمل ہوں گے جن کے فریقین اس سمجھوتے کے متعاقدین میں سے ہوں، اگر کوئی ایک فریق متعاقدین میں سے نہ ہو تو ان کا نفاذ نہ ہوگا"

اسی قسم کی ایک دفعہ ہر سمجھوتے کے آخر میں رکھی گئی ہے، جس سے یہ بات صاف ہو جاتی ہے کہ یہ تمام مہذب قوانین بطور ایک اخلاقی فرض کے اختیار نہیں کئے گئے ہیں بلکہ محض چند سلطنتوں کے باہمی من سمجھوتے ہیں، جن کی بنیاد صرف یہ ہے کہ وہ ایک دوسرے سے اس شرط پر شرافت و انسانیت کا سلوک کرنے کا وعدہ کرتی ہیں کہ ان کے ساتھ بھی ایسا ہی سلوک کیا جائے،

تیسرا سوال یہ ہے کہ یہ قوانین اپنے اندر وثاقت و لزوم کی قوت کس حد تک رکھتے ہیں، اس کے متعلق ہیگ کے سمجھوتے تصریح کرتے ہیں کہ کوئی سلطنت ان کی ہمیشہ پابندی کرتے رہنے پر مجبور نہیں ہے، بلکہ ہر وقت اپنی ذمہ داری سے سبکدوش ہو سکتی ہے، چنانچہ ہر سمجھوتے کے آخر میں ہمیں اس مضمون کی ایک دفعہ ملتی ہے کہ:۔

"متعاقدین میں سے اگر کوئی سلطنت اس سمجھوتے کی ذمہ داری سے سبکدوش ہونا چاہے تو وہ نیدرلینڈ کی گورنمنٹ کو اس کی اطلاع دیکر ایسا کر سکتی ہے نیدرلینڈ گورنمنٹ کا فرض ہوگا کہ کسی سلطنت کی جانب سے اس قسم کی اطلاع ملتے ہی تمام متعاقدین کو اسکی اطلاع دیدے، یہ اظہار برأت اس سلطنت کے حق میں اس وقت سے قابل تنفیذ ہوگا جبکہ نیدرلینڈ گورنمنٹ کو اطلاع پہونچنے پر ایک سال گذر چکا ہو"

ان دفعات کا مفہوم بالکل واضح ہے، لیکن مزید توضیح کے لئے ہم مسٹر جیمز براؤن سکاٹ کی وہ تصریحات یہاں نقل کرتے ہیں جو انھوں نے "مجموعۂ معاہدات ہیگ" کے مقدمہ میں کی ہیں، مسٹر اسکاٹ کارنیجی کے مشہور وقف بین الملی صلح میں شعبۂ قانون بین الملل کے ڈائرکٹر ہیں، اور امریکہ میں اس قانون کے بڑے ماہر سمجھے جاتے ہیں، وہ لکھتے ہیں:-

"ہیگ کانفرنس کو اکثر انسان کی پارلیمنٹ کہا جاتا ہے، مگر یہ کہنا غلط و گمراہ کن ہے، وہ اصطلاحی معنی میں پارلیمنٹ نہیں ہے اور اس کے اعمال صرف ان سلطنتوں پر اثر کرتے ہیں جنکی نمایندگی اسمیں ہوتی ہے۔ (x i)

اس وضع کی ایک جماعت جیسا کہ اس کا نام ظاہر کرتا ہے محض ایک کانفرنس ہے، وہ کوئی مجلس تشریعی نہیں ہے اس کے سمجھوتے محض سفارشات ہیں جو کانفرنس میں حصہ لینے والی حکومتوں سے کی گئی ہیں تاکہ وہ اپنے قوانین کے مطابق ان کو اختیار کرلیں،............ ہیگ میں کسی اقرارنامے پر کسی سلطنت کے نمایندے کا دستخط کر دینا اس سلطنت کے لئے کوئی قانونی ذمہ داری پیدا نہیں کرتا، البتہ چونکہ نمایندے اپنی سلطنتوں کی طرف سے سرکاری طور پر منتخب کئے گئے ہیں، اس لئے ان کا دستخط کرنا اس امر کی ایک اخلاقی ذمہ داری ان پر عاید کرتا ہے کہ ان اقرارناموں اور اعلانوں کو اپنی حکومتوں کے متعلقہ شعبوں کے پاس بھیجیں اور ان کو باقاعدہ منظور کر کے اپنے ملک میں قانونی قوت عطا کریں، یہ اقرارنامے صرف اسی وقت واجب العمل

ہو سکتے ہیں جب ان کی باضابطہ توثیق ہیگ میں داخل کر دی جائے۔"(×)

پروفیسر مارگن اپنی کتاب "جنگ، اس کا چلن، اور قانونی نتائج" (War its Conduct and legal results) میں لکھتا ہے :-

"یہ بات بالکل ظاہر ہے کہ ہیگ کی مفاہمتوں کا دائرہ اور ان کی تشریعی قوت ایک حد تک مشکوک و غیر معین ہیں، تاہم جن مفاہمتوں کو تمام متعاقد سلطنتوں نے منظور کر لیا ہے انھیں ہم تقریباً ایک عمومی ضابطۂ قانون سمجھ سکتے ہیں، اور ان کے مطابق متعاقد سلطنتوں کے جنگی اعمال کو مہذب قومیں جانچ سکتی ہیں"

ان تصریحات سے صاف معلوم ہو جاتا ہے، کہ ہیگ کے وضع کردہ قوانینِ جنگ قانونی نوعیت کے اعتبار سے کسی طرح بھی اسلام کے قوانینِ جنگ کا مقابلہ نہیں کر سکتے، اسلام کے قوانین تمام مسلمانوں کے لئے کلیۃً واجب العمل بنائے گئے ہیں، کسی مسلمان کو مسلمان رہتے ہوئے ان کی بندش سے نکلنے کا حق نہیں دیا گیا، یہ ضرور ممکن ہے کہ ایک شخص اسلام ہی کو چھوڑ دے اور اس طرح اسلام کے قانونِ جنگ کی پابندی سے بھی سبکدوش ہو جائے، مگر یہ جائز نہیں ہے، کہ کوئی شخص مسلمان رہتے ہوئے اسلام کے ان قوانین کی کم از کم اعتقادی اطاعت سے نکل جائے، یا ان قوانین کو اپنے حسبِ منشا بدل کر یا منسوخ کر کے کچھ دوسرے قوانین وضع کرے اور وہ نئے قوانین اسلام کے قوانین قرار دیئے جائیں، اہلِ مغرب کے قوانین کی طرح اسلام کے قوانین مسلمانوں کے وضع کردہ نہیں ہیں، بلکہ ایک بالاتر قوت نے ان کو وضع کیا ہے، اور مسلمانوں کے سامنے صرف اس لئے پیش کیا ہے کہ وہ اسکی اطاعت کریں، اب مسلمانوں کے لئے اسمیں صرف دو راہیں ہیں، اگر وہ مسلمان رہنا چاہیں اور اس بالاتر قوت کی حاکمیت کو تسلیم کرتے ہوں تو ان قوانین کو بھی تسلیم کریں، اور اگر ان کو تسلیم نہ کرنا چاہیں تو ناگزیر ہے، کہ وہ اس بالاتر قوت کو بھی تسلیم نہ کریں، اور اسلام کے دائرے سے نکل جائیں، اس کے سوا کوئی تیسری راہ مسلمانوں کے لئے نہیں ہے۔ بخلاف اس کے مغربی قوانینِ جنگ کے واضع خود اہلِ مغرب ہیں اس لئے ان کو حق ہے کہ جب تک چاہیں

اپنے بنائے ہوئے قوانین پر عمل کریں اور جب چاہیں ان کو منسوخ کرکے دوسرے قوانین وضع
کریں، اصولِ قانون کے لحاظ سے جب کبھی وہ ایسا کریں گے تو پہلا قانون بحیثیت ایک قانون
کے مردہ ہوجائے گا، اور دوسرا قانون اس کی جگہ لے لیگا، لیکن اگر مسلمان قومیں اسلام سے
بغاوت کرکے دس ہزار قوانین بھی وضع کریں تو ان میں سے کوئی بھی اسلام کا قانون نہ بن سکیگا
بلکہ اسلام کا قانون وہی رہے گا جو اللہ اور اس کے رسول نے وضع کردیا ہے،

ایک دوسری حیثیت سے بھی اسلام کے قوانینِ جنگ، مغربی قوانین پر اصولی فوقیت
رکھتے ہیں، اسلام نے اس قسم کی کوئی شرط نہیں رکھی ہے، کہ اس کے قوانین پر صرف اسی
حالت میں عمل کیا جائے جبکہ دوسرا فریق بھی ان کی پابندی کرے، جس زمانہ میں یہ قوانین
وضع کئے گئے تھے، اس وقت تو غیر مسلم سلطنتوں سے اس قسم کا کوئی سمجھوتہ ممکن ہی نہ تھا، بلکہ
اس کے برعکس غیر مسلم محاربین ہمیشہ مسلمانوں کے مقابلہ میں وحشیانہ طریقہ سے جنگ کرتے تھے
اور ان حرکات پر اس بات نے ان کو اور بھی زیادہ جری کردیا تھا، کہ مسلمانوں کا مذہب انکو
جواب میں ویسے ہی وحشیانہ افعال سے روکتا تھا، پس ان تمام حیثیات سے اسلام کا قانون
مغرب کے قانون پر بمراتب فوقیت رکھتا ہے، اور یہ ایسی حقیقت ہے جس سے کسی طرح انکار
نہیں کیا جاسکتا،

اب ہم اصولی مباحث چھوڑ کر فروعات کی طرف توجہ کرتے ہیں، اس سلسلہ میں ہم یہ
دیکھنے کی کوشش کریں گے، کہ مختلف جنگی امور کے متعلق جنگ میں کیا قوانین مقرر کئے گئے ہیں
اور مغربی قومیں ان کو کس حد تک قابلِ عمل تسلیم کرتی ہیں،

اعلانِ جنگ: جنگی مسائل میں پہلا مسئلہ یہ ہے کہ جنگ کس طرح شروع کیجائے؟ ابتدائی زمانہ
میں یہ عام طریقہ تھا کہ جنگ شروع کرنے سے قبل نقیبوں اور ایلچیوں کی معرفت دشمن کو اطلاع
دیدیجاتی تھی، اس زمانہ میں بین الملی قانون کے مصنفین بھی اعلان و انذار کی ضرورت پر بہت
زور دیتے تھے، بلکہ بعض کی تو یہ رائے تھی کہ اعلان کے بغیر حملہ کردینا درست نہیں ہے، لیکن بعد
میں ماہرینِ قانون کا میلان اس طرف ہوگیا کہ رسمی اعلانِ جنگ کی کوئی ضرورت نہیں ہے[1]،

[1] Lawrence P. 299

چنانچہ سلطنتوں نے بالعموم یہ دستور اختیار کر لیا کہ اعلانِ جنگ کے بغیر ہی مخاصمانہ کارروائیاں
شروع کر دیتی تھیں۔ تاریخ کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ ۱۷۰۰ء سے ۱۸۷۲ء تک یورپ میں ۱۲۰
لڑائیاں ہوئیں جن میں سے صرف دس لڑائیوں میں رسمی اعلانِ جنگ کیا گیا[۱]، ان میں بعض
لڑائیاں ایسی ہیں جو سفارتی تعلقات منقطع ہونے سے بھی قبل چھیڑ دی گئیں، مثلاً ۱۸۱۲ء
میں انقطاعِ تعلقات سے قبل امریکہ نے ان تمام انگریزی جہازوں کو گرفتار کر لیا جو اس کے
بندرگاہ میں موجود تھے، اور بلا اطلاع کینیڈا پر حملہ کر دیا، اسی طرح ۱۸۵۴ء میں برطانیہ نے بحرِ اسود
کے روسی بیڑے پر حملہ کر کے اسکو سباسٹوپول کی طرف بھگا دیا حالانکہ اس وقت تک دونوں
جانب کے سفراء واپس بھی نہ ہوئے تھے، اس کے بعد انیسویں صدی کے آخر میں یورپ نے پھر
طریقہ کی طرف رجوع کیا، اور جنگ سے قبل عام طور پر اعلانِ جنگ کیا جانے لگا، چنانچہ ۱۸۷۰ء
کی جنگ جرمنی و فرانس، ۱۸۷۷ء کی جنگ ترکی و روس، ۱۸۹۸ء کی جنگِ امریکہ و اسپین
اور ۱۸۹۹ء کی جنگ بوئر میں رسمی اعلان سے جنگ کی ابتدا ہوئی تھی لیکن بیسویں صدی کی ابتدا
میں روس اور جاپان کی جو جنگ ہوئی اسمیں کوئی اعلانِ جنگ نہیں کیا گیا، اور بلا اطلاع
جاپان نے روس پر حملہ کر دیا،

اس طرح یورپ میں بیسویں صدی کی ابتدا تک جنگ شروع کرنے کے متعلق کوئی
متعین قاعدہ نہیں تھا، سلطنتیں خود اپنی مرضی کے مطابق جب چاہتی تھیں دشمن پر اچانک
جا پڑتی تھیں، اور جب ضرورت ہوتی تو پہلے سے اعلانِ جنگ بھی کر دیتی تھیں، ۱۹۰۷ء کی
ہیگ کانفرنس میں پہلی مرتبہ اسکی ضرورت محسوس کی گئی کہ اس کے متعلق ایک قاعدہ
مقرر کر دیا جائے، چنانچہ ایک سمجھوتہ کیا گیا جسکی دفعات یہ ہیں:۔

دفعہ اوّل، دول متعاقدہ عہد کرتے ہیں کہ ان کے درمیان جنگ کی ابتدا اس وقت تک
نہیں ہوگی جب تک اس سے قبل ایک صریح تنبیہ نہ کر دیجائے، یہ تنبیہ خواہ اعلانِ جنگ کی
صورت میں ہو، جسمیں وجوہِ جنگ بتائی گئی ہوں، یا الٹی میٹم (= بلاغ اخیر) کی شکل میں جس

[۱] Hostilities without declaration of War by maurice P. 44, 45, 66. [۲] Birkenhead P. 1912

مشروط اعلانِ جنگ کیا گیا ہو۔

دفعہ دوم: حالتِ جنگ کے وجود میں آنے کی اطلاع جانبدار غیر جانبدار سلطنتوں کو بھیجی جائے اور جب تک ان کے پاس سے اس اطلاع کی رسید نہ آجائے جو ہمیشہ تار پر ہونی چاہیے اس وقت تک غیر جانبداروں کے بارے میں جنگی قوانین نافذ نہ ہوں تاہم غیر جانبدار سلطنتوں کو اطلاعنامۂ جنگ ہی کا انتظار نہ کرنا چاہیے جب کہ انھیں قطعی طور پر جنگ کے وقوع پذیر ہونے کا علم ہو چکا ہو۔[1]

یہ مہذب قانون آج سے صرف بیس اکیس سال قبل یورپ میں وضع ہوا ہے، اور یہ بھی صرف سمجھوتے کے شرکاء کے لئے ہے؟ لیکن اسلام میں ساڑھے تیرہ سو برس سے ایک ایسا ہی قانون موجود ہے کہ:-

وَاِمَّا تَخَافَنَّ مِنْ قَوْمٍ خِيَانَةً فَانْبِذْ اِلَيْهِمْ عَلٰى سَوَاءٍ (۸ : ۷) — جب تمہیں کسی قوم سے خیانت و بدعہدی کا خوف ہو تو ان کا معاہدہ برابری کو ملحوظ رکھ کر ان کی طرف پھینک دو۔

یہ قانون نہ تو متعاقدین کے ساتھ مخصوص ہے نہ اس کی ذمہ داری سے کسی مسلمان کو عذر براءت کا حق دیا گیا ہے، اور نہ اس کے واجب العمل ہونے سے کسی مسلمان کو کسی حال میں انکار کی جرات ہو سکتی ہے۔

اہلِ قتال اور غیر اہلِ قتال: دو قوموں میں حالتِ جنگ قائم ہونے کے بعد سب سے پہلا سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ محارب قوم کے افراد سے کس قسم کا سلوک کیا جائے۔ سترہویں صدی تک یورپ محارب (Belligerent) اور مقاتل (Combatant) کے فرق سے ناآشنا تھا، اس کے نزدیک ہر محارب مقاتل تھا، اس لئے اس کا قتل اور اس کی املاک کا سلب و نہب بالکل جائز تھا، عام اس سے کہ وہ عورت ہو، بچہ ہو، بڈھا ہو، بیمار ہو، یا دوسرے غیر مقاتل طبقات سے تعلق رکھتا ہو، اس کے بعد سے [illegible]

---

[1] Hague Convention (1907) III

[2] تشریح کے لئے دیکھو اس کتاب کا باب پنجم بعنوان "اعلانِ جنگ"۔

اور اٹھارہویں صدی میں بین الملی قانون کے جو مصنفین پیدا ہوئے، انھوں نے مقاتلین
اور غیر مقاتلین کے درمیان طبقات کے اعتبار سے فرق کرنے کی کوشش کی، لیکن کوئی
ایسی جامع تقسیم نہ ہوسکی جس پر سب کو اتفاق ہو، اور جسے حالتِ جنگ میں ملحوظ رکھا جا
ہو، انیسویں صدی میں اس سوال کو اس طرح حل کیا گیا کہ جو لوگ جنگی کارروائیوں میں حصہ
لیتے ہیں، وہ مقاتل ہیں، اور جو اسمیں حصہ نہیں لیتے، وہ غیر مقاتل ہیں لیکن یہ حل اس قدر
مجمل تھا کہ جزئیات وتفصیلات میں اس کا قائم رہنا مشکل تھا، اس کے بعد پھر یہ اصول
دیا گیا کہ صرف غنیم کی باقاعدہ افوج مقاتلین میں شمار کیجائیں گی، اور باقی سب طبقات غیر
مقاتلین میں داخل ہوں گے لیکن اس سے چند اور پیچیدہ مسائل پیدا ہوگئے، ڈاکٹر لوید
کے بقول "ایک ملک کے باشندوں کا یہ حق کہ وہ اپنے آبائی وطن
کی مدافعت کریں کسی معقول دلیل سے رد نہیں کیا جاسکتا"، اس لئے قدرتی طور پر یہ سوال
پیدا ہوتا ہے کہ اگر کسی ملک کے باشندے اپنے وطن کو بچانے کے لئے عام طور پر ہتھیار
لے کر کھڑے ہوجائیں اور بغیر کسی ضبط ونظام کے غنیم سے جنگ شروع کردیں، تو ان کی
حیثیت کیا ہوگی؟ آیا ان کو مقاتلین میں شمار کرکے وہی حقوق دیئے جائیں گے جو دشمن کی باقاعدہ
فوج کے لئے مقرر ہیں؟ یا انھیں غیر مقاتلین میں شمار کرکے قانونِ جنگ کے مطابق لٹیروں
اور قزاقوں میں شمار کیا جائیگا؟ مغربی جنگ کا قانون یہ ہے کہ غیر مقاتل (Non Com-
batant) اگر جنگی کارروائی میں حصہ لے تو اسکو نہ مقاتلین کی رعایات حاصل ہوں گی
اور نہ غیر مقاتلین کی یعنی وہ قید ہوگا تو قتل کیا جائیگا، زخمی ہوگا تو معالجہ اور تیمارداری سے
محروم رہے گا، اور اس کے ساتھ جنگ میں کسی قسم کے جنگی آداب ملحوظ نہ رکھے جائیں گے
اس قانون کی رو سے مقاتلین وغیر مقاتلین کے امتیاز کا یہ اصول ان قوموں کے لئے غیر
بربادی ومصیبت کا موجب ہوگا جو آزادی حاصل کرنے کے لئے یا اپنے وطن کی مدافعت
کے لئے محض جذبۂ حبِ وطن سے متاثر ہوکر لڑنے کھڑی ہوجاتی ہیں، اور کسی باقاعدہ
جنگی نظام میں منسلک نہیں ہوتیں،

۱۸۷۰ء کی جنگ میں جب فرانس نے اپنی عام آبادی کو بے ضابطہ جماعتوں

[illegible] صورت میں بھی [illegible] (Franc-Tireurs [illegible])
ان کو مقاتلین کے حقوق دینے سے انکار کر دیا تو بین الملی قانون کے سامنے یہ مسئلہ اپنی پوری اہمیت کے ساتھ آگیا، اور ۱۸۷۴ء کی بروسلز کانفرنس میں اس پر زبردست بحث کی گئی، آخر مقاتلین و غیر مقاتلین کے درمیان ایک قطعی امتیاز قائم کیا گیا، جس کی رو سے صرف وہی لوگ اہل قتال قرار دیئے گئے جو:-

(الف، ایک ایسے قائد کے زیر فرمان ہوں جو اپنے ماتحتوں کے افعال کا ذمہ دار ہو،

ب- ایسے مقرر امتیازی نشانات اپنے بدن پر لگائیں جنھیں فاصلہ سے پہچانا جا سکتا ہو،

ج- کھلم کھلا ہتھیار اٹھائیں،

د- جنگ میں قوانین و رسوم جنگ کی پابندی کریں[1].

اسی وجہ امتیاز کو ۱۸۹۹ء اور ۱۹۰۷ء کی ہیگ کانفرنسوں میں تسلیم کیا گیا، اور ہیگ کے ضوابط (Regulation) کی دفعہ دوم و سوم میں اس امر کی بھی تصریح کر دی گئی کہ:-

"اگر کسی غیر مفتوح علاقہ کے باشندے دشمن کی آمد پر اپنے وطن کی حفاظت کے لئے بلا کسی تنظیم کے ہتھیار لے کر کھڑے ہو جائیں تو انکو مقاتلین کے حقوق حاصل ہوں گے، بشرطیکہ وہ علانیہ ہتھیار اٹھائیں، اور قوانین و رسوم جنگ کی پابندی کریں،

محارب فریقین کی مسلح فوجیں مقاتلین و غیر مقاتلین دونوں پر مشتمل ہو سکتی ہیں غنیم کے ہاتھوں گرفتار ہونے کی صورت میں دونوں کو اسیرانِ جنگ کے حقوق حاصل ہوں گے"

اس طریقہ سے ایک سوال تو بیشک حل ہو گیا لیکن دوسرا سوال پھر بھی باقی رہا، ہتھیار اٹھانے کی ضرورت صرف آزاد قوموں کو ہی پیش نہیں آتی، بلکہ بعض وقت

[1] [illegible] State Papers [illegible] No. 1 (1875) PP 252-57

نیم آزاد اور غلام قوموں کو بھی اپنے غصب شدہ حقوق حاصل کرنے کے لئے پیش آیا کرتی ہے
آزادی و استقلال کے لئے جنگ کرنا ہر قوم کا حق ہے، اور اگر وہ ایک طاقتور دشمن سے خلاصی
حاصل کرنے کے لئے تلوار کی مدد حاصل کریں تو کسی دلیل سے ان کو مجرم قرار نہیں دیا جا سکتا
پس سوال یہ ہے کہ اگر کوئی قوم اپنی غلامی کی زنجیریں کاٹنے کے لئے جنگ کرے تو کیا اس کے
تمام افراد مجرم قرار دیئے جائیں گے؟ کیا ان کو اہل قتال کے حقوق نہیں دیئے جائیں گے؟
کیا ان کو قزاقوں اور لٹیروں کی طرح پکڑ پکڑ کر قتل کیا جائے گا؟

ان سوالات کو ہیگ کانفرنسوں نے حل کرنے کی کوئی کوشش نہیں کی ہے اور عملاً دول
غرب کا میلان اسی طرف ہے کہ ایسی قومیں نہ مقاتلین کے حقوق سے متمتع ہو سکتی ہیں، اور نہ
غیر مقاتلین کی رعایات سے۔ ان کی قسمت میں یہی لکھا ہے کہ انھیں توپوں اور بندوقوں
کا لقمہ بنایا جائے، ان کی آبادیوں کا قتل عام کیا جائے، اور ان کے افراد کو پکڑ پکڑ کر قتل
کر دیا جائے۔ ہندوستان کی شمالی مغربی سرحد میں برطانیہ نے، رلیف میں ہسپانیہ نے، اور
شام میں فرانس نے ہماری آنکھوں کے سامنے جو ہولناک مظالم کئے ہیں وہ اس بات
کا ثبوت ہیں کہ مغربی تہذیب کا قانون کسی قوم کے اس حق کو تسلیم نہیں کرتا کہ وہ حصول
استقلال کے لئے جنگ کرے۔

اہل قتال و غیر اہل قتال کے درمیان امتیاز کا یہ قاعدہ اس لحاظ سے بھی غلط ہے کہ
ہیں ان تمام لوگوں کو غیر اہل قتال قرار دیا ہے، جو جنگ میں ہتھیار نہیں اٹھاتے، اگرچہ
ب مغرب کو ایک عرصہ تک اس بات پر فخر رہا کہ انھوں نے دشمنی و مخاصمت صرف فوجوں
ب محدود کر دی ہے، اور غیر فوجی جماعتیں جنگ کے اثرات سے بالکل مستثنیٰ کر دی گئی ہیں۔

۵ مغربی سیاسیین نے غیر فوجی طبقوں کو جنگ کے اثرات سے محفوظ رکھنے کی ضرورت پر جو اس قدر زیادہ زور
ہے، اسکی اصلی وجہ یہ ہے کہ انھیں اپنی تجارت بہت زیادہ عزیز ہے، اور وہ چاہتے ہیں کہ ہر حالت میں اسکا سلسلہ
ی ہے چنانچہ ۱۹۰۷ء کی ہیگ کانفرنس نے بالفاظ صریح اس خواہش کا اظہار کیا تھا کہ سلطنتوں کو جنگ کے دوران میں اس امر کی
ی کوشش کرنی چاہئے کہ محاربین کے درمیان صنعتی و تجارتی تعلقات بدستور قائم رہیں۔ لیکن واقعہ یہ ہے کہ یہ خواہش نہ پوری ہو سکتی ہے اور نہ کبھی
ک کسی جنگ میں پوری ہوئی۔ جنگ عظیم کے واقعات نے ثابت کر دیا ہے کہ خود یورپین سلطنتیں اسکو پورا کرنے پر قادر نہیں ہیں،

لیکن آج خود وہی تسلیم کر رہے ہیں کہ فوجیت و غیر فوجیت کی بنا پر مقاتلین و غیر مقاتلین کا فرق کرنا
اصولاً غلط ہے، اور عملاً ناممکن ہے، اس بارہ میں ہم [illegible] بیان کرنے کی بجائے زیادہ
مناسب معلوم ہوتا ہے کہ خود ان یورپین مصنفین کے قول یہاں نقل کر دیں جنہوں نے
جنگ عظیم کے تجربات سے فائدہ اٹھا کر اس امر کو محسوس کر لیا ہے کہ مقاتلین و غیر مقاتلین کی
تفریق جس پر اب تک ان کو اس قدر ناز تھا کتنی بے بنیاد ہے۔

پروفیسر نپولڈ لکھتا ہے :-

"جدید تجارت نے ثابت کر دیا ہے کہ موجودہ تجارتی عہد میں جبکہ ملکوں کے [illegible]
غیر ملکوں میں پھیلے ہوئے ہوتے ہیں اور ادھر سے ادھر گردش کرتے رہتے
ہیں، یہ بالکل ناممکن ہے کہ جنگ محض متعلقہ حکومتوں کے فوجی اشخاص کی باہمی
لڑائی قرار دی جائے، اس نے ثابت کر دیا ہے کہ صرف محارب ممالک ہی میں
نہیں، بلکہ غیر محارب غیر جانبدار دنیا میں بھی کوئی شخص کسی نہ کسی صورت میں
ایک بڑی جنگ سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ مختلف اشخاص و افراد کے
درمیان آج زندگی کے تمام شعبوں میں ایسے پیچ در پیچ تعلقات پیدا ہو گئے
ہیں کہ کوئی شخص ایسی جنگ کے اثرات سے محفوظ نہیں رہ سکتا۔ ان اثرات
کو محدود رکھنے اور روکنے کی تمام کوششیں بیکار ثابت ہو چکی ہیں۔ یہ نظریہ
ایک بے معنی نظریہ ہے کہ جنگ محض سلطنتوں کا ایک معاملہ ہے اور جنگ کا
تمام کاروبار صرف فوجی اشخاص ہی سے تعلق رکھتا ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ اس
تجارت کے عہد میں جنگ دراصل قوموں کا معاملہ ہے جو اسکو اپنی تمام جسمانی
اور اقتصادی قوت سے چلاتی ہیں۔"[1]

آگے چل کر یہی مصنف کہتا ہے :-

"جنگ کا مقصد سلطنت کو مغلوب کرنے کے سوا اور کچھ نہیں ہوتا
اس لحاظ سے بیشک اس ضرر رسانی کا سلسلہ بند ہونا چاہئے جو اس مقصد

۱؎ Nippold. P. 114

کے لئے مفید نہ ہو۔ لیکن یہ یاد رکھنا چاہیئے کہ سلطنت صرف سپاہیوں سے آباد نہیں ہوتی، بلکہ عام باشندوں پر بھی مشتمل ہوتی ہے، اسی بنا پر مولٹکے (Moltke) نے اس نظریہ سے اختلاف کیا ہے، کہ "جنگ کا کام محض غنیم کی فوجی قوت کو ضعیف کرنا ہے" وہ کہتا ہے "برسرِ جنگ سلطنت کو اپنے تمام ذرائع، اپنے مالیات، ریل کی سڑکیں، غذر کے وسائل، حتیٰ کہ اپنا اخلاقی اثر بھی جنگ میں استعمال کرنا چاہیئے، اگر دشمن کے ارادہ کو زبردستی جھکانا ہی جنگ کا مقصد ہو تو یہ ضروری ہی نہیں بلکہ جائز ہو جاتا ہے، کہ وہ اپنے فوجی ذرایع نہ صرف مخالف فوج کے خلاف بلکہ غنیم کی تمام اقتصادی قوتوں کے خلاف بھی استعمال کرے............ اب چونکہ ایک سلطنت کی اقتصادی قوت، اشخاص و افراد کی قوت سے مرکب ہوتی ہے، اس لئے یہ ناگزیر ہے کہ افراد کی ذات و جائداد اور ان کے اقتصادی مفاد کو بھی اس حد تک جنگ کا ہدف بنایا جائے، جس حد تک کہ وہ جنگ کا مقصد حاصل کرنے کے لئے ضروری اور مفید ہو"[1]

ایک دوسری جگہ بھی مصنف لکھتا ہے:-

"سلطنتوں کو اقتصادی جنگ میں بھی اسی طرح ضروریاتِ جنگ کی پیروی کرنی چاہیئے، جس طرح وہ فوجی جنگ میں کرتی ہیں، دونوں صورتوں میں تمام وہ ذرایع جن سے غنیم کو مغلوب کرنے کی توقع ہو، استعمال کئے جانے چاہئیں، لہذا اقتصادی جنگ صرف مزاحمت فی التجارۃ تک ہی محدود نہ رہنی چاہیئے، بلکہ اس کو غنیم کی اقتصادی زندگی پر ایک مہلک ضرب لگانے کی کوشش کرنی چاہیئے، اور اس لحاظ سے اسمیں پرائیویٹ اشخاص (یعنی غیر مقاتلین) پر بھی ضرب پڑنی ناگزیر ہے"[2]

پروفیسر نیمیر (Neimeyer) اپنی کتاب "بحری جنگ کے قوانین و اصول"

---

[1] NIPPOLD. P. 121 [2] IBID. P. 122

یوں لکھتا ہے :-

"بحری جنگ میں دشمن قوم پر ہر ممکن ذریعہ سے حتی کہ انتہائی وحشیانہ ذرائع سے بھی زندگی دوبھر کر دینی چاہئے"[1]

برک ہارٹ (Burckhardt) لکھتا ہے :-

"یہ خوش آئند اصول کہ جنگ محض مسلح افواج کے درمیان کشمکش کا نام ہے، جس کا سول آبادی کے پرامن روابط پر کوئی اثر نہیں پڑتا، اپنے کو ایک خیالی بہشت ثابت کر چکا ہے، فوج نہ اپنے تئیں قوم سے جدا کر سکتی ہے اور نہ سلطنت سوسائٹی سے الگ ہو سکتی ہے، تمام نظریات کے علی الرغم جنگ ہمیشہ قوموں کے درمیان ہوا کرتی ہے کیونکہ آبادی کے تمام طبقات اس میں حصہ لیتے ہیں، اگرچہ ان سب کے ہتھیار مختلف ہوتے ہیں، جہاں تک سلطنت سے ان کا گہرا تعلق ہے، سلطنت اور اہلِ ملک میں کوئی تمیز قائم نہیں کیا جا سکتا، لہذا جنگ جس طرح دو فوجوں کے درمیان ایک فوجی کشمکش ہے، اسی طرح وہ دو قوموں کے درمیان ایک اقتصادی کشمکش بھی ہے"[2]

ایک دوسرے موقع پر بھی یہی مصنف لکھتا ہے :-

"سمندر کی تہ میں تجارت کو غرق کر دینا، آدمیوں کو ڈبو دینے سے بدرجہا زیادہ انسانیت پرور طریقۂ جنگ ہے، بلکہ زیادہ گہرا تجزیہ کرو تو دشمن کی فوجی قوت کو مغلوب کرنے کی کوشش ایسی حالت میں بالکل بے کار معلوم ہوگی، جبکہ دشمن کی اقتصادی قوت اتنی مضبوط ہو کہ وہ اسے ہتھیار رکھنے پر مجبور نہ ہونے دے، اسی وجہ سے یہ ناگزیر ہے، کہ ہر محارب فریق اپنے دشمن کی اقتصادی قوت برباد کر دینے کی کوشش کرے ....

ا۔ Prinzipier der seekriegrecht P17

۲۔ Nippold P 114

ایک سلطنت کی عسکری قوت دفاع اس کی اقتصادی قوت کے ساتھ
اس طرح گتھی ہوئی ہے کہ ان دونوں کو الگ نہیں کیا جا سکتا، اس کی صنعتی
زندگی جنگ جاری رکھنے میں اس کے لئے اتنی ہی مفید ہوتی ہے جتنی اس کے
سپاہی کی زندگی ہو سکتی ہے اس لئے کوئی محارب قوت دشمن کے اقتصادی
وسائل پر حملہ کرنے سے باز نہیں رہ سکتی، دشمن کی عام آبادی کو بھوکا مار دینا
خواہ کتنا ہی بے رحمی کا فعل ہو، مگر میری رائے میں یہ کوئی ممنوع طریقِ
جنگ نہیں ہے[1]"

ایک جگہ یہ مصنف پھر لکھتا ہے:-

"جنگ کو کلیۃً فوجی طبقہ تک محدود رکھنا بہت سے تخیل پسندوں کا مطمحِ نظر
ہے، وہ چاہتے ہیں کہ خشکی اور تری دونوں پر شخصی املاک محفوظ رہیں، محاربین
تک میں اموالِ تجارت کا لین دین جاری رہے، اور جنگ محارب فریقین
کی فوجی قوتوں کے درمیان ہو، نہ کہ محارب سلطنتوں کی عام رعایا کے
درمیان لیکن آج کوئی عملی آدمی اس تخیل کا پرستار نہیں ہے، صرف اسی
بنا پر نہیں کہ وہ حقیقت واقعیہ سے بہت دور ہے، بلکہ اس لئے بھی کہ یہ صراحۃً
ایک مصنوعی اور غیر فطری حالت ہے، صرف یہی نہیں بلکہ قدرتی طور پر
جنگی کارروائیوں سے متصل یا ہمسایہ ملکوں کی باہمی تجارت کو ضرب لگتی
ہے، بلکہ ویسے بھی یہ بات عقل و خرد کے بالکل منافی معلوم ہوتی ہے، کہ ایک
طرف ایک سلطنت اپنے ہزاروں نوجوانوں کو جنگ کی آگ میں جھونک رہی
ہو، اور دوسری طرف دشمن کو چین سے تجارت بھی کرنے دے، ایک طرف
وہ دشمن کے بندرگاہوں پر گولہ باری کرنے میں اپنی جان و مال قربان کر رہی
ہو، اور دوسری طرف اسکی درآمد و برآمد کا سلسلہ بھی جاری رہنے دے[2]"

ایک اور مصنف ایلتز باخر (Eltzbacher) لکھتا ہے:-

[1] Ibid P. 122 [2] Nicolson P. 133

"چونکہ دشمن کی فوجی قوت کی تعمیر میں دشمن قوم کی تمام ذات میں بہت گہری جمی ہوئی ہوتی ہیں اس لئے اس قوت کو تمام دشمن ذرائع سے الگ نہیں کیا جاسکتا ہے، اسی طرح ایک دشمن فوج کے خلاف جو جنگ شروع کی جاتی ہے وہ بس پوری دشمن قوم کے خلاف جنگ کی صورت اختیار کرلیتی ہے۔ اور جب جنگ اس منزل پر پہونچ جاتی ہے تو بین الاقوامی قانون اس کے پیچھے چھپنے پر مجبور ہوتا ہے، پہلے زمانہ میں جو یہ اصول تسلیم کرلیا گیا تھا، کہ جنگ محض دشمن کی فوجوں کے درمیان محدود رہنی چاہیئے اور محاربین کی عام آبادی تک چند مخصوص و متعین صورتوں کے سوا اس کے شدائد کو وسیع نہ ہونا چاہئے اس پر تمادی عارض ہوچکی ہے، موجودہ زمانہ کی جنگ نے اسکو دور پھینک دیا ہے وہ صرف انفرادی واقعات ہی میں نہیں توڑا گیا بلکہ اسے ہمیشہ کے لئے توڑ دیا گیا ہے، آیندہ جنگوں میں اسکا کوئی لحاظ نہ رکھا جائے گا کیونکہ ماضی کے ساتھ فنا ہونے والی چیز کا پھر اعادہ نہیں ہوا کرتا"[1]۔

ان طویل اقتباسات سے ثابت ہوتا ہے، کہ جنگ میں تمام غیر فوجی طبقوں کو غیر اہل قتال قرار دینا، ان کو جنگی کارروائیوں سے محفوظ رکھکر آزادی سے کاروبار کرنے دینا اور انھیں ان تمام رعایات سے جو غیر اہل قتال کے لئے مخصوص ہیں مستفید کرنا نہ صرف عملاً ناممکن ہے بلکہ اصولاً بھی غلط ہے، اسمیں شک نہیں کہ جنگ میں غیر فوجی طبقوں کو خاص طور پر ہدف بنانا اور ان کی اقتصادی زندگی برباد کرنیکی اس حیثیت سے کوشش کرنا کہ وہ بھی جنگ کے مقاصد میں ہے، یقیناً ایک زیادتی ہے، لیکن اس کے ساتھ ہی یہ بھی کچھ ضروری نہیں ہے کہ ان تمام لوگوں کو غیر اہل قتال کے حقوق دیئے جائیں جو دشمن کی جنگی طاقت کو تقویت پہونچانے میں اتنا ہی حصہ لیتے ہیں، جتنا فوجی طبقے لیتے ہیں،

اس لحاظ سے مغربی قانون نے اہل قتال وغیر اہل قتال کے درمیان تفریق کا جو خط کھینچا ہے، وہ کسی حیثیت سے بھی مستقیم نہیں ہے، ایک طرف وہ بہت سے ان طبقات

---

[1] Ibid, PP. 133-34

اہلِ قتال کے حقوق سے محروم کر دیتا ہے جو درحقیقت ان کے مستحق ہیں، اور دوسری طرف ان طبقات کو غیر اہلِ قتال کی رعایت دیتا ہے جو درحقیقت اس کے مستحق نہیں ہیں۔ اس افراط و تفریط کے درمیان اسلام نے ایک مستقیم خط کھینچ دیا ہے، جو اہلِ قتال و غیر اہلِ قتال کو ان کے پیشوں کے لحاظ سے تقسیم نہیں کرتا، بلکہ ان کی قابلیتِ جنگ کے اعتبار سے تقسیم کرتا ہے۔ اس نے محارب قوم کو "مقاتلہ" کے اصول پر تقسیم کیا ہے، جو لوگ عملاً مقاتلہ کرتے ہیں یا فطرت اور عادت کے اعتبار سے مقاتلہ کی قدرت رکھتے ہیں، وہ سب اہلِ قتال ہیں، اور جو فطرت اور عادت کے اعتبار سے مقاتلہ کی قدرت نہیں رکھتے، (مثلاً عورتیں، بچے، بوڑھے، بیمار، معذور اور فقرا وغیرہ) وہ سب غیر اہلِ قتال میں داخل ہیں، دشمن قوم کا ہر فرد جو مسلمانوں سے لڑنے آئے گا خواہ وہ باقاعدہ فوج سے تعلق رکھتا ہو، یا نہ رکھتا ہو، اسے بہر صورت مقاتل سمجھا جائیگا، اور وہ تمام حقوق اسے دیئے جائیں گے جو مقاتلین کے لئے مخصوص ہیں، (بشرطیکہ وہ غدر و عہد شکنی کا عادی مجرم نہ ہو) اسی طرح ہر وہ شخص جو جنگ پر قادر ہوگا اہلِ قتال میں شمار کیا جائے گا، اور اسے ضروریاتِ جنگ کے ماتحت (نہ کہ لازماً) شدائدِ جنگ سے دوچار ہونا پڑیگا، یہ ضرور ہے کہ اگر وہ امان مانگے تو اسے امان دیجائے گی، اگر وہ دار الحرب اور دار الاسلام کے درمیان پرامن طریقہ سے تجارت کرنی چاہے، تو مصالحِ جنگ کی رعایت سے اسکی بھی اجازت دیدیجائے گی، اگر وہ جنگی کارروائی سے محترز رہکر اپنے کاروبار میں مشغول رہے، تو اسکو غیر اہلِ قتال کی طرح مصئون و مامون بھی رکھا جا سکے گا، لیکن نوعیت کے اعتبار سے وہ اہلِ قتال ہی کے طبقہ میں شمار ہوگا، اور غیر مقاتلین کے حقوق محض رعایۃً دیئے جائیں گے، اہلِ قتال اور غیر اہلِ قتال کے درمیان تفریق کی یہی ایک قدرتی صورت ہے، اور ان دونوں انتہائی نقطوں کے درمیان یہی ایک متوسط نقطہ ہے جس پر جنگی اور قانونی گروہوں کا اجتماع ممکن ہے،

مقاتلین کے حقوق و فرائض محاربین کی یہ دو بڑی اقسام، یعنی اہلِ قتال و غیر اہلِ قتال اپنے حقوق و فرائض کے اعتبار سے مختلف قوانین کے تابع ہیں، اس لئے ہم ان دونوں سے الگ الگ بحث کریں گے، ان میں ترتیب کے اعتبار سے اہلِ قتال

مقدم ہیں،

جیسا کہ اوپر بیان کیا جاچکا ہے، یورپ میں اہل قتال کے حقوق کا کلی احساس انیسویں صدی کے دور آخر کی پیداوار ہے، اگرچہ اس سے بہت پہلے نظری حیثیت سے ان پر بحث و کلام کی ابتدا ہو چکی تھی اور شعور اجتماعی کی ترقی کیساتھ ساتھ بعض حقوق عملی دنیا میں بھی تسلیم کئے جاچکے تھے، لیکن کامل طور پر ان حقوق کے تسلیم و اعتراف کا دور بہت بعد شروع ہوا ہے، ۱۸۲۹ء تک سلطنتیں اس بارے میں کسی متعین قانون کو تسلیم کرنے پر آمادہ نہ تھیں، اور خود اپنے آپ کو اس امر کے فیصلہ کا مختار سمجھتی تھیں کہ کن محاربین کو وہ اہل قتال کے حقوق دیں اور کن کو نہ دیں، چنانچہ امریکہ کی خانہ جنگی (American civil War) میں حکومت متحدہ امریکہ نے صاف اعلان کر دیا تھا کہ:-

"ایک قوم خود ہی اس امر کا فیصلہ کرے گی کہ کب وہ محاربین کو اہل حرب کے حقوق دے، عام اس سے کہ وہ محاربین اس قوم سے ہوں جو اپنے آپ کو ایک ایسی حکومت سے آزاد کرانا چاہتی ہو جسے وہ ظالم سمجھتی ہے، یا وہ آزاد اقوام ہوں اور باہم ایک دوسرے سے برسر جنگ ہوں۔"

لیکن ہر قوم کا خود اپنے افعال کے لئے جج بن جانا کسی حال میں بھی متعین حقوق و فرائض پیدا نہیں کر سکتا، اور عملاً اس کا نتیجہ صرف یہی ہو سکتا ہے کہ سرے سے اہل حرب کے حقوق و فرائض ہی فنا ہو جائیں، اس مشکل کو اہل مغرب نے آخر محسوس کیا اور رفتہ رفتہ یہ اصول تسلیم کیا گیا کہ محاربین کو ہر حال میں حربیت (Belligerency) کے حقوق دیے جائیں گے، اور اس کا فیصلہ خود فریقین کے اختیار تمیزی پر نہ چھوڑا جائے گا۔

سب سے پہلے سینٹ پیٹرسبرگ میں ایک قاعدہ کلیہ وضع کیا گیا جس کے الفاظ یہ تھے:-

"جنگ میں سلطنتوں کو صرف اسی ایک جائز مقصد کے حصول کی کوشش کرنی چاہئے، کہ وہ دشمن کی فوجی قوت کو کمزور کر دیں، اور اس مقصد

Parliamentary Papers N. america 1872. (No. 2) P. 17 ؎

کے لئے صرف یہی کافی ہے کہ اس کے آدمیوں کی زیادہ سے زیادہ ممکن تعداد بیکار کردیجائے۔ اس سے بڑھکر ایسے اسلحہ استعمال کرنا جن سے بیکار کئے ہوئے آدمیوں کی تکالیف میں غیر ضروری اضافہ ہو، یا ان کی موت ناگزیر ہو جائے، اس مقصد پر تعدی کے حکم میں داخل ہوگا"

یہ ابتدائی قاعدہ تھا جو ۱۸۶۸ء میں وضع کیا گیا۔ اس کے چند سال بعد بروسیلز کانفرنس میں کچھ حقوق وفرائض بھی متعین کرنے کی کوشش کی گئی، لیکن انیسویں صدی کے خاتمہ تک اس موضوع پر کوئی ایسا قانون نہ بنایا جا سکا، جس کو تمام مغربی طاقتوں نے تسلیم کر لیا ہو۔ اس صدی کے اختتام پر جب پہلی ہیگ کانفرنس منعقد ہوئی تو اس نے یہ جامع اصول وضع کیا کہ:۔

"محاربین کا ایک دوسرے کو نقصان پہنچانے کے ذرائع استعمال کرنے کا حق غیر محدود نہیں ہے۔"

اس کے ساتھ ہی اس نے اہل قتال کے حقوق وفرائض بھی متعین کئے جنکو ضوابط ہیگ کی دفعہ ۲۳ میں اس طرح بیان کیا گیا ہے:۔

"مخصوص سمجھوتوں میں جن امور کی ممانعت کی گئی ہے، ان کے علاوہ حسب ذیل امور خصوصیت کے ساتھ ممنوع ہیں:۔

(الف) زہر یا زہریلے اسلحہ استعمال کرنا،

(ب) محارب قوم یا فوج کے کسی شخص کو دغا سے قتل یا زخمی کرنا،

(ج) ایسے دشمن کو قتل یا زخمی کرنا جس نے ہتھیار ڈال کر یا مدافعت کے تمام وسائل سے محروم ہو کر حریف کے اختیار تمیزی کے آگے اپنے آپ کو تسلیم کر دیا ہو،

(د) یہ اعلان کرنا کہ کوئی امان نہیں دیجائیگی،

(س) ایسے اسلحہ یا اشتعال پذیر مادے یا سامان استعمال کرنا جو حد سے زیادہ نقصان

لہ Hague Regulations art 22

پہونچانے والے ہیں،

(س) صلح کے پرچم، یا دشمن کے قومی پرچم، یا فوجی علامات یا وردی یا مفاہمت جنیوا کے مقرر کئے ہوئے امتیازی نشانات ناجائز طریقہ سے استعمال کرنا،

(ش) دشمن کی املاک تباہ کرنا بغیر اس کے کہ جنگی ضروریات کے لحاظ سے ایسا کرنا ناگزیر ہو،

اس اجمالی بیان سے یہ تو معلوم ہو گیا کہ اہلِ قتال کے حقوق و فرائض کی تعیین کب اور کس طرح ہوئی، اس کے بعد اب ہم خاص خاص حقوق و فرائض کا الگ الگ تذکرہ کریں گے،

قواعدِ حرب کی پابندی: اہلِ قتال کا سب سے بڑا فرض جس پر دوسروں کو بڑا اصرار رہا ہے یہ ہے کہ وہ فوجی ضبط و نظام کے پابند ہوں، اور قواعدِ حرب کو ملحوظ رکھیں جو محاربین بے ضابطہ جنگ کرتے ہیں، ان کے حقوقِ حربیت کو تقریباً تمام سلطنتوں نے تسلیم کرنے سے انکار کر دیا ہے، جرمن قانون میں ان کے لئے کم سے کم دس سال کی قید یا زیادہ سے زیادہ موت کی سزا مقرر ہے، امریکہ کے قانون کی ضمن چہارم دفعہ ۸۲ میں ان کو قزاق اور ڈاکو قرار دیا گیا ہے، اور ان کے لئے وہی سزا تجویز کی گئی ہے جو اس قسم کے مجرموں کو دی جاتی ہے، حربیت کے حقوق تو درکنار ان لوگوں کو انسانیت کے ابتدائی حقوق دینے سے بھی انکار کیا گیا ہے، چنانچہ ۱۸۹۹ء کی ہیگ کانفرنس میں برطانیہ نے سخت مطالبہ کیا کہ غیر مہذب وحشی قوموں کے مقابلہ میں ڈم ڈم کی گولیاں استعمال کرنے کی اجازت ہونی چاہئے، لارڈ پانسفوٹ نے جو برطانیہ کی نمائندگی کر رہے تھے، اپنی تقریر کے دوران میں بیان کیا تھا کہ ۱۸۹۸ء کی جنگِ چترال میں معمولی قسم کی گولیاں وحشی دشمن کے ہجوم کو روک نہیں سکیں، اور ڈم ڈم کی گولیاں ان لوگوں کو کچھ زیادہ نقصان نہیں پہونچاتیں جن پر وہ چلائی جاتی ہیں جن کے ذکر سے ایک یوروپین کا ضمیر کانپ اٹھتا ہے، جن کا مذہب قوموں

۱؎ [illegible], P. 226

کے خلاف استعمال کرنا کسی کو گوارا نہیں ہے، لیکن بے ضابطہ جنگ کرنے والی "غیر مہذب" قوموں کے خلاف اسی خلافِ انسانیت ہتھیار کو استعمال کرنا اس قدر ضروری اور جائز سمجھا جاتا ہے کہ ایک مہذب ترین یورپین سلطنت ہیگ کے اقرار نامہ پر دستخط کرنے سے انکار کر دیتی ہے، اور دستخط کرتی ہے تو اس وقت جبکہ اس اقرار نامہ کو صرف متعاقدین کی باہمی جنگوں تک محدود کر دیا جاتا ہے،

امان، اہلِ قتال کا پہلا اور بنیادی حق یہ ہے کہ جب وہ دشمن سے امان مانگیں تو انھیں امان دیجائے، سترھویں صدی تک یورپ میں امان دینے کا طریقہ مفقود تھا، انگلستان کی خانہ جنگی میں پارلیمنٹ نے آئرش لوگوں کو امان دینے سے قطعی انکار کر دیا تھا، اٹھارھویں صدی کے آخر تک محاربین کو حق تھا کہ ایک دوسرے کو امان دینے سے انکار کر دیں، چنانچہ ۱۷۹۴ء میں فرنچ کنونشن نے اعلان کر دیا تھا کہ انگریزی سپاہیوں کو امان نہیں دیجائے گی، لیکن انیسویں صدی میں اہلِ قتال کا یہ حق تسلیم کر لیا گیا کہ جب وہ امان طلب کریں تو ان پر کسی قسم کی دست درازی نہ کیجائے، اور ان کو اسیرانِ جنگ کے حقوق دیئے جائیں،

مگر یہ قانون صرف انھیں لوگوں کے لئے ہے جو میدانِ جنگ میں دشمن سے پناہ مانگیں[1]، باقی رہے وہ محاربین جو حالتِ جنگ شروع ہوتے وقت دشمن کے قبضہ میں ہوں، سو ان کے متعلق ابھی تک کوئی متعین قاعدہ موجود نہیں ہے، اٹھارھویں صدی تک عام قاعدہ تھا کہ ایسے لوگوں کو گرفتار کر لیا جاتا اور معمولی مجرموں کی طرح اختتامِ جنگ تک قید رکھا جاتا تھا، ۱۷۵۶ء میں پہلی مرتبہ انگلستان نے فرانس کے ساتھ یہ رعایت کی کہ جنگ کے آغاز میں جتنے فرانسیسی انکی حدود میں موجود تھے، ان کو اس شرط پر امان دیدی کہ وہ ایمانداری کے ساتھ ناطرفدار رہیں، اسی طرح ۱۷۹۴ء میں انگلستان اور ممالک متحدہ امریکہ کے درمیان اس قسم کا سمجھوتہ ہوا کہ ان کی باہمی جنگوں میں دونوں فریق ایک دوسرے کے آدمیوں کو اسی طرح امان دیا کریں گے، مگر ۱۸۰۳ء میں معاہدہ امینس (Amiens) کے ٹوٹنے پر نپولین نے پھر پچھلے

[1] موجودہ قانون نے میدانِ جنگ کی امان اور حالتِ جنگ کی امان میں فرق کیا ہے مگر میں نے اسلامی اصطلاح کے لحاظ سے ان دونوں کا لحاظ کرنا زیادہ مناسب سمجھا،

طریقہ کا اعادہ کیا، اور ان تمام انگریزوں کو گرفتار کر لیا جو فرانسیسی علاقہ میں موجود تھے۔ انیسویں صدی میں ایک دوسرا طریقہ اخراج کا بھی اختیار کیا گیا، اور ان تینوں طریقوں پر باوقات مختلف عمل درآمد ہوتا رہا۔ ۱۸۵۴ء کی جنگ کریمیا، ۱۸۹۷ء کی جنگ ترکی و یونان، [illegible]ء کی جنگ امریکہ و اسپین میں فریقین نے ایک دوسرے کے آدمیوں کو امان عطا کی۔ ۱۸۷۰ء کی جنگ جرمنی و فرانس میں تمام جرمن فرانسیسی علاقے سے نکال دیئے گئے۔ ۱۸۹۹ء کی جنگ بوئر میں جنوبی افریقہ کی دونوں جمہوریتوں نے انگریزوں کو حدود بلاد سے خارج کر دیا۔ [illegible] بیسویں صدی میں بھی اس کے متعلق کوئی قاعدہ نہ بن سکا۔ ۱۹۰۴ء کی جنگ روس و جاپان [illegible] ترکی و اطالیہ میں (کچھ عرصہ تک) فریقین نے امان عطا کی۔ [illegible] کی جنگ عظیم میں برطانیہ، فرانس اور اٹلی نے دشمن کے [illegible] تھے ایک خاص مدت کے اندر نکل جانے کا حکم دیدیا، اور جو لوگ نہ نکلے [illegible] میں رکھا، جرمنی اور آسٹریا نے غیر فوجی عمر کے لوگوں کو مستثنیٰ کر کے سب کو نظر بند [illegible] نے غیر فوجی عمر کے لوگوں کو نکال باہر کیا، اور فوجی عمر کے لوگوں کو نظر بند کر دیا [illegible] نے سب کو امان عطا کر دی،

اس کے متعلق ابھی تک کوئی قانون نہیں بنا ہے۔ مگر موجودہ زمانہ میں [illegible] کا عام رجحان یہ ہے کہ غیر فوجی عمر کے لوگوں کو ملک چھوڑ دینے کی مہلت دی جائے اور فوجی عمر کے لوگوں کو روک لیا جائے۔ بخلاف اس کے اسلام میں [illegible] سے یہ عام قانون موجود ہے کہ اہل حرب میں سے کوئی شخص اگر [illegible] رہنا چاہے یا آنا چاہے تو اسے امان دینی چاہیے، اور اگر وہ [illegible] جانا چاہے تو اسے بخیریت پہونچا دینا چاہیے۔ اس کے علاوہ اسلام نے مستامن کو [illegible] وسیع حقوق دیئے ہیں، ان کی گرد تک بھی ابھی مغرب کا بین الاقوامی قانون نہیں پہونچ سکا ہے۔[2]

[1] Birkenhead P. 197-98 [2] اس کی تفصیل کے لئے دیکھو اسی کتاب کا باب [illegible] عنوان "صلح و امان"۔

اسیرانِ جنگ۔ اسیران جنگ کے متعلق یورپ کے قوانین بہت مکمل ہیں، مگر پروفیسر لارنس کے بقول ان کے مکمل ہونے کی اصلی وجہ یہ ہے کہ ان کے بارے میں تمام سلطنتوں کے مفاد مشترک ہیں، ہر سلطنت خود اپنے سپاہیوں اور افسروں کی آسایش چاہتی ہے، اس لئے وہ محض بدلہ کے طور پر مخالف کے سپاہیوں اور افسروں کو بھی آسایش پہونچانے پر راضی ہوجاتی ہے[1]،

لیکن یہ مہذب قوانین بہت قریبی عہد کی پیداوار ہیں، سترھویں صدی تک یورپ میں اسیرانِ جنگ کو غلام بنانے کا دستور تھا، گروٹیوس نے اس طریقہ کے خلاف آواز بلند کی، اور عیسائی اقوام کو مشورہ دیا کہ وہ ایک دوسرے کو غلام بنا کر بیچنے کی بجائے اسیرانِ جنگ کو فدیہ لیکر چھوڑ دیا کریں، مگر ایک صدی تک اسکی سفارشات بے اثر رہیں، اٹھارہویں صدی کی ابتدا میں فدیہ اور مبادلہ اساریٰ کا طریقہ جاری ہوا، اور صدی کے اختتام تک سلطنتیں اس پر کاربند رہیں، ۱۷۸۰ء میں فرانس اور انگلستان کے درمیان مبادلہ اور مفادات کے متعلق جو معاہدہ ہوا تھا، اسمیں ایک سپاہی کی قیمت ایک پونڈ، اور ایک امیر البحر یا مارشل کی قیمت ۶۰ پونڈ یا ۶۰ سپاہی قرار دی گئی تھی، انیسویں صدی میں یورپ نے مفادات کا طریقہ بھی چھوڑ دیا، اور صرف مبادلہ کا طریقہ باقی رکھا، لیکن تہذیب کے اس شباب کے زمانہ میں بھی اسیرانِ جنگ کو قتل کرنے کا طریقہ بالکل موقوف نہیں ہوا تھا چنانچہ ۱۷۹۹ء میں مہذب یورپ کے سب سے بڑے جنرل نپولین بوناپارٹ نے یافا کی چار ہزار ترکی فوج کو جس نے جان بخشی کا وعدہ لیکر اطاعت قبول کی تھی، صرف اس عذر کی بنا پر قتل کرا دیا کہ وہ انھیں کھلانے کے لئے خوراک مہیا نہیں کرسکتا اور نہ مصر بھیجنے کا انتظام کرسکتا تھا، اس کے تقریباً ایک صدی بعد مغربی دنیا میں پھر اسی جرم کا ارتکاب کیا گیا جس کو ابھی تیس برس سے کچھ زیادہ زمانہ نہیں گذرا ہے، ۱۸۹۶ء میں کیوبا کے ہسپانوی کپتان جنرل ویلر (WEYLER) نے اسیرانِ جنگ کو باغی قرار دیکر قتل کرا دیا تھا، اور ہزاروں نہتے باشندوں کو پکڑ کر اس طرح قید کر دیا تھا کہ وہ مکھیوں اور مچھروں کی طرح بھوکے پیاسے مر گئے[2]،

[1] Allison History of Europe III, XXV
[2] War its conduct legal results

بہرحال یہ ایک واقعہ ہے کہ اسیرانِ جنگ سے متعلق ضابطہ قوانین [illegible]
وضع کئے گئے، [illegible]ء کی ہیگ کانفرنس نے ان کی توثیق کی، اور ۱۹۰۷ء کی دوسری ہیگ کانفرنس نے ان کو مکمل کر کے ایک بین الملّی قانون بنادیا، یہ قانون ہمیں معاہدۂ ہیگ نمبر ۴ کے ملحق ضوابط میں ملتے ہیں جنکا خلاصہ یہاں نقل کیا جاتا ہے۔

"دفعہ ۴، اسیرانِ جنگ محارب حکومت کے قبضۂ اختیار میں ہوں گے نہ کہ ان اشخاص کے قبضہ میں جنھوں نے ان کو گرفتار کیا ہو، ان سے انسانیت کا سلوک روا رکھنا چاہیئے، ان کے پاس اسلحہ، گھوڑوں اور جنگی کاغذات کے ماسوی جو اشیاء موجود ہوں وہ انھیں کی ملک رہیں گی،

دفعہ ۵، اسیرانِ جنگ کو عموماً نظر بند رکھنا چاہیئے لیکن اگر تحفظ کے لئے ناگزیر ہو تو قید بھی کیا جاسکتا ہے،

دفعہ ۶، قید کرنے والی حکومت اسیرانِ جنگ سے ان کے درجہ کو ملحوظ رکھکر کام لے سکتی ہے، (افسر ہر حال میں اس سے مستثنیٰ ہیں) بشرطیکہ وہ کام حد سے زیادہ نہ ہو اور جنگی اعمال سے اس کا کوئی تعلق نہ ہو، انھیں اس کام کا معاوضہ دیا جائے گا جو اسی شرح کے مطابق ہونا چاہیئے جس پر خود اس حکومت کے اسی درجہ کے آدمیوں کو دیا جاتا ہو،

دفعہ ۷۔ اسیرانِ جنگ جس حکومت کے قبضہ میں ہوں وہی ان کے گزارہ کی ذمہ دار ہوگی، خاص صورتوں کے ماسوی ان کے قیام کا بندوبست اسی پیمانہ پر ہونا چاہیئے جس پر خود گرفتار کرنے والی حکومت اپنے اسی درجہ کے ملازموں کے لئے کرتی ہو۔

دفعہ ۸، اسیرانِ جنگ ان قوانین کے تابع ہوں گے جو قید کرنے والی سلطنت میں نافذ ہوں، نافرمانی کا ہر فعل ان کے حق میں ایسی سختیوں کو جائز کر دیگا جو اس کے لئے ضروری ہوں، بھاگنے والے قیدی اگر اپنی فوج تک پہونچنے سے پہلے گرفتار ہو جائیں تو تادیبی (Disciplinary) سزا کے مستوجب ہوں گے، وہ اگر اپنی فوج میں پہونچنے سے پہلے دوبارہ گرفتار ہوں تو ان کو گذشتہ جرم کی سزا نہ دیجائے گی۔

دفعہ ۹، ہر اسیرِ جنگ کا فرض ہوگا کہ اگر اس سے اس کا نام و درجہ دریافت کیا جائے

تو وہ ٹھیک ٹھیک بتا دے، نہ بتانے یا غلط بتانے کی پاداش میں اسکی آسائشیں کم کردیجائینگی،

دفعہ ۱۰۔ اسیرانِ جنگ کو یہ وعدہ لے کر رہا کیا جا سکتا ہے کہ وہ جنگ میں پھر حصہ نہ لیں گے اگر کوئی اسیر اس طرح رہائی حاصل کرے تو اس کا فرض ہوگا کہ اپنا عہد پورا کرے، اس کی حکومت اسکو عہد شکنی پر مجبور نہ کریگی،

دفعہ ۱۱۔ کسی اسیر جنگ کو مشروط رہائی حاصل کرنے کیلئے مجبور نہ کیا جائیگا، اور نہ کوئی حکومت اس پر مجبور ہوگی کہ ہر حال میں کسی اسیر کی درخواستِ رہائی قبول کرلے،

دفعہ ۱۲۔ اگر کوئی اسیرِ جنگ مشروط رہائی حاصل کرنے کے بعد دوبارہ اسی حکومت کے خلاف لڑنے آئے تو اسے اسیرانِ جنگ کے حقوق حاصل نہ ہوں گے، اور گرفتار ہونے کی صورت میں اس پر مقدمہ چلایا جائیگا،

دفعہ ۱۳۔ جو غیر مقاتل لوگ کسی فوج کے ساتھ باضابطہ تعلق کے بغیر شامل ہوں، مثلاً نمایندگانِ جرائد وغیرہ ان کو گرفتار کر کے اسیرانِ جنگ کے طور پر رکھا جا سکتا ہے،

دفعہ ۱۴۔ دورانِ جنگ میں ہر سلطنت ایک محکمۂ اطلاعات قائم کرے گی، جو ہر قیدی کے متعلق سوالات کا جواب دیگا، تمام اسیرانِ جنگ کے متعلق ضروری معلومات فراہم رکھے گا، اور ان کی قومی حکومت کو وقتاً فوقتاً ان کے حالات سے مطلع کرتا رہے گا،

دفعہ ۱۵۔ اسیرانِ جنگ کی امدادی سوسائٹیاں جو اپنے ملک کے قانون کے مطابق قایم کی گئی ہوں، محارب فریقین کی جانب سے ہر قسم کی آسانیوں کی مستحق ہوں گی، ان کو اور ان کے ایجنٹوں کو نظر بندی اور قید کی حالت میں اسیروں تک پہونچنے اور اپنے فرائض انجام دینے کی اجازت ہوگی، بشرطیکہ وہ مقامی حکام کی ہدایات کے مطابق عمل کریں،

دفعہ ۱۶۔ محکمہ اطلاعات ڈاک کے محصول سے مستثنیٰ ہوگا، خطوط، منی آرڈر، اور قیمتی اشیاء، اور پارسل جو اسیرانِ جنگ کے نام یا ان کی جانب سے بھیجے جائیں ڈاک کے خرچ سے دونوں ملکوں میں مستثنیٰ ہوں گے، ان پر کسی قسم کی چنگی بھی نہ ہوگی، اور

نہ ریلوے کا محصول لگایا جائیگا۔

دفعہ ۱۷۔ گرفتار شدہ افسروں کو اسی شرح سے تنخواہ دیجائیگی جو قید کرنے والی حکومت اپنے اسی درجہ کے ملازموں کو دیتی ہو، یہ رقم آخر میں خود ان کی حکومت ادا کریگی۔

دفعہ ۱۸۔ قیدیوں کو اپنے مذہبی فرائض ادا کرنے کی آزادی ہوگی، وہ ان قواعد کے تحت جو ضبط و نظام کی خاطر مقرر کئے گئے ہوں اپنے مذہب کے کلیسا میں جا سکیں گے۔

دفعہ ۱۹۔ اسیران جنگ کی وصیتیں اسی طرح پوری کی جائیں گی جس طرح قومی فوج کے سپاہیوں کی کیجاتی ہیں، وفات پانے کی صورت میں ان کی تجہیز و تکفین اسی عزت کے ساتھ کیجائےگی جو ان کے ہم رتبہ قومی فوج کے ملازموں کی تجہیز و تکفین میں ملحوظ رکھی جاتی ہے،

دفعہ ۲۰۔ صلح ہونے کے بعد جہاں تک جلد ممکن ہوگا اسیران جنگ کا مبادلہ کیا جائے گا[1]،

ان قواعد کو اگر ضابطہ کی جزئیات سے مجرد کرکے محض اصول کے اعتبار سے دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ انھوں نے اسلام کے مقرر کئے ہوئے اصول پر کوئی خاص اضافہ نہیں کیا ہے[2]۔ مغربی قانون اسیران جنگ کو زیادہ سے زیادہ وہ آسائشیں بہم پہونچانا چاہتا ہے جو ایک سلطنت خود اپنے اسی درجہ کے سپاہیوں اور افسروں کو بہم پہونچاتی ہے، مگر پیغمبر اسلام (علیہ الصلوٰۃ والسلام) اور ان کے صحابہ (رضی اللہ عنہم) کا طرز عمل یہ ہے کہ انھوں نے اسیران جنگ کو اپنے سے بہتر کھانا کھلایا اور اپنے سے بہتر کپڑا پہنایا، حالانکہ دشمنوں کے ہاں ان کے اسیران جنگ کو روح فرسا جسمانی اذیتیں نصیب ہوتی تھیں، مغربی سلطنتیں اسیران جنگ کے خرچ کا ایک بڑا حصہ خود ان کی اپنی قوم سے وصول کرتی ہیں، مگر اسلام ایک حبہ بھی اس سے طلب نہیں کرتا، مغربی سلطنتیں ان کو صرف مبادلہ کی صورت میں رہا کرنے پر آمادہ ہوتی ہیں، مگر اسلام مبادلہ کے بغیر ہی ان کو بطریق احسان رہا کر دینا افضل سمجھتا ہے، تاہم بعض چیزیں ان میں اسلام سے زائد بھی نظر آتی ہیں، لیکن ان کے متعلق کوئی رائے قائم کرتے وقت اس حقیقت کو نظر انداز

[1] یہ قوانین صرف فوجیوں کے لئے ہیں، ابھی یہ امر مشتبہ ہے کہ آیا تطرفہ غیر فوجیوں کو بھی یہ حقوق دیئے جائیں گے یا نہیں۔

[2] مقابلہ کے لئے دیکھو اس کتاب کا باب پنجم، عنوان "اسیران جنگ"۔

نہ کرنا چاہیئے کہ ہر سلطنت دوسری سلطنت کے سپاہیوں کو یہ تمام رعایات اس معاہدہ کی بنا پر دینے کے لئے راضی ہوئی ہے، کہ اس کے سپاہیون کو بھی ایسی ہی رعایات دیجائینگی، بخلاف اس کے اسلام نے کسی معاہدہ اور سمجھوتہ کے بغیر ایسی حالت میں اسیران جنگ کو وہ رعایات دی تھیں جبکہ اسے اپنے مخالفوں سے کسی قسم کی رعایت حاصل ہونے کی امید نہ تھی، اس نے غزوۂ بدر کے قیدیوں پر اس زمانہ میں لطف و احسان کیا تھا جبکہ کفار قریش کے قبضہ میں بیسیوں مسلمان قیدی تپتی ہوئی ریت پر لٹائے جاتے تھے، آج کی طرح اس وقت ایسا کوئی سمجھوتہ اور معاہدہ ممکن نہ تھا، اس لئے اسیران جنگ کو زیادہ سے زیادہ وہی رعایات دیجا سکتی تھیں جو اسلام نے دیں، لیکن آج جبکہ اس بارے میں سمجھوتہ اور معاہدہ ممکن ہے، اسلام پچھلے قوانین پر ہرگز اصرار نہ کرے گا، وہ مسلمانوں کو غیر مسلموں کے ساتھ ہر ایسے معاہدہ کی اجازت دیتا ہے جسمیں مساوات کے ساتھ مراعات کا مبادلہ کیا گیا ہو،

مجروحین، مرضیٰ اور مقتولین، فوج کے مجروحوں اور بیماروں کے لئے سترھویں صدی تک یورپ میں کوئی خاص انتظام نہ تھا، غالباً سترہویں صدی میں پہلی مرتبہ جنگی ہسپتال قایم کرنے اور میدان جنگ میں فوری امداد کے لئے طبیب اور جراح رکھنے کا سلسلہ شروع ہوا، لیکن دشمنوں کے مجروحوں اور بیماروں کا احترام اور اس کے ہسپتالوں اور معالجوں کی مامونیت کا تخیل انیسویں صدی تک یورپ میں ناپید تھا، مجروح اور بیمار لوگ بسا اوقات قتل کر دیئے جاتے اور اکثر اوقات ان کو نہایت خستہ حالت میں مرنے کے لئے چھوڑ دیا جاتا تھا، ہسپتالوں کو فوجی حملوں سے مستثنیٰ نہ رکھا جاتا تھا، معالجوں اور تیمار داروں کو اسیران جنگ میں شمار کیا جاتا اور عام مقاتلین کی طرح وہ بھی قید کرلئے جاتے تھے، انیسویں صدی کے وسط تک بین الملی قانون کے ماہرین کے درمیان اسی مسئلہ میں اختلاف تھا کہ ڈاکٹروں اور تیمار داروں کو اسیران جنگ میں شمار کیا جائے یا نہیں[1]، امریکہ کی خانہ جنگی میں ریاستہائے متحدہ نے یہ امر جائز قرار دیا تھا کہ اگر غنیم کے ڈاکٹروں کی خدمات درکار ہوں تو انھیں پکڑ کر کام لیا جاسکتا ہے، غرض یہ کہ ۱۸۶۴ء تک یورپ مجروحوں اور مریضوں اور معالجوں کے متعلق مہذب قوانین سے نا آشنا تھا، اور پہلی مرتبہ اس وقت آشنا ہوا جب سوئٹزرلینڈ کے ایک مشہور محب انسانیت ہنری دونان (Henri Dunant) نے اس کو مہذب قوموں کے وحشیانہ اعمال پر متنبہ کرنے کے لئے ایک دردناک آواز بلند کی جون ۱۸۵۹ء میں فرانس اور سارڈینیا کی

لہ Lawrence. P. 348.

متحدہ افواج، اور اسٹریا کی فوج کے درمیان سولفرینو (Solferino) پر ایک زبردست معرکہ برپا ہوا
تھا، جسمیں علاوہ اور وحشیانہ حرکات کے مجروحین جنگ کے ساتھ اس قسم کا بیدردانہ برتاؤ کیا گیا کہ اس سے تمام یورپ
میں انسانیت کے لطیف جذبات متحرک ہو گئے، ہنری ڈوناں نے اس پر ۱۸۶۲ء میں ایک کتاب (A Memory of Solferino)
کے نام سے شایع کی جس سے یورپ کی رائے عام کو اس بات پر آمادہ کردیا، اور اکتوبر ۱۸۶۳ء میں سوئٹزرلینڈ کی حکومت نے ایک غیر سرکاری کانگریس بمقام جنیوا منعقد
کر کے اس امر پر غور کیا کہ آئندہ کے لئے جنگ میں زخمیوں اور بیماروں کی حفاظت کا کیا بندوبست کیا
جاسکتا ہے، اس کانگریس کے تجویز کردہ خطوط پر دوسرے سال جنیوا میں ایک باضابطہ بین الملی کانفرنس
منعقد ہوئی، اور اس نے بحث و مباحثہ کے بعد ایک سمجھوتہ تیار کیا جس پر ۲۲ اگست ۱۸۶۴ء کو تمام دول
(باستثنائے امریکہ) دستخط کر دیئے، اس سمجھوتہ میں فوجی ہسپتالوں اور ان کے کارکنوں کو ناطرفدار قرار دیا گیا،
ان کو جنگی قیدی بنانے یا ان کے شفاخانوں کو جنگی اعمال کا ہدف بنانے کی ممانعت کر دی گئی، اور بیمار
اور زخمیوں کے علاج اور تیمارداری کے کام میں مزاحمت کرنے کو ناجائز قرار دیا گیا، نیز اس میں زخمیوں
اور بیماروں سے متعلق ہر چیز کے لئے سفید زمین پر سرخ صلیب کا نشان تجویز کیا گیا تاکہ دور سے اسکو
دیکھ کر امتیاز کیا جاسکے، اور کسی ایسی چیز کو جنگی کارروائی کا نشانہ نہ بنایا جائے جس پر وہ نشان لگا ہو
ہو، اس کے ساتھ ہی ہر محارب فریق پر فرض کیا گیا کہ وہ اپنے زخمیوں کی طرح دشمن کے زخمیوں کا بھی
علاج کرائے اور آرام ہو جانے کے بعد یا تو ان سے جنگ میں دوبارہ حصہ نہ لینے کا وعدہ لیکر انھیں واپس کردے
یا بطور اسیران جنگ کے روک لے،

یہ سمجھوتہ متعدد حیثیات سے ناقص تھا، اور اسمیں سب سے بڑی کمی یہ تھی کہ ان قوانین کی خلاف ورزی
کرنے کو قابلِ سزا جرم قرار دینے کی کوئی سفارش نہیں کی گئی تھی، اس کمی کو پورا کرنے کے لئے ۱۹۰۶ء میں
دوبارہ جنوری میں ایک اور کانفرنس منعقد ہوئی، اور اس کا ایک ضمنی سمجھوتہ مرتب کیا جو ۳۳ دفعات پر مشتمل
تھا، پانچ دفعات بری جنگ کے متعلق اور ۹ دفعات بحری جنگ کے لئے، اس کانفرنس نے دول سے
سفارش کی کہ وہ اپنے قوانینِ جنگ میں اس سمجھوتہ کی دانستہ خلاف ورزی کو جرم مستلزم سزا قرار دیں
لیکن سلطنتوں نے اس سفارش کو قبول کیا اور نہ اس سمجھوتہ کی توثیق کی، اس لئے دوسری جنیوا کانفرنس
بالکل بے کار ثابت ہوئی،

۱۸۷۴ء کی برسلز کانفرنس نے پھر اس مسئلہ کو اپنے ہاتھ میں لیا مگر اسکی سفارشات کا حشر بھی وہی ہوا جو دوسری جنوا کانفرنس کا ہوا تھا، اس کے ۲۵ سال بعد ۱۸۹۹ء کی ہیگ کانفرنس میں دول نے یہ بات محسوس کی کہ انھیں مجروحوں اور بیماروں کے متعلق ایک مکمل ضابطۂ قانون کی ضرورت ہے، چنانچہ انھوں نے سوئٹزرلینڈ کی حکومت سے سفارش کی کہ وہ ایک تیسری جنوا کانفرنس منعقد کرکے اس کام کی تکمیل کرے، اس سفارش کے مطابق ۱۹۰۱ء، ۱۹۰۳ء اور ۱۹۰۴ء میں سوئٹزرلینڈ کی حکومت دولِ مغرب کو پیہم دعوتیں دیتی رہی مگر کسی طرف سے ہمت افزا جواب نہ ملا، آخر خدا خدا کرکے ۱۹۰۶ء کے موسمِ گرما میں یہ کانفرنس منعقد ہوئی، اور اس نے ۶ جولائی کو وہ سمجھوتہ مرتب کیا جو آج مغربی سلطنتوں کا معمول بہ قانون ہے،

اس کے بعد ۱۹۰۷ء کی ہیگ کانفرنس نے اسی سمجھوتہ کی بنیاد پر ایک اور سمجھوتہ کیا جس میں انھیں قوانین کو بحری جنگ پر منطبق کیا تھا، مگر کانفرنس میں شریک ہونے والی ۴۴ سلطنتوں میں سے ۷ نے اس کی توثیق نہیں کی جنمیں برطانیہ، اٹلی، یونان، بلغاریا، اور سردیا شامل ہیں، اس لئے یہ سمجھوتہ عملاً بیکار رہا اور اسی کا نتیجہ یہ ہوا کہ ۱۹۱۴ء کی جنگِ عظیم میں ہسپتالی جہاز آزادی کے ساتھ غرق کئے گئے،

ان تمام سمجھوتوں کا اصل الاصول صرف ایک ہے، اور وہ یہ کہ جو دشمن جنگ سے معذور ہو چکا ہو، اور جسکو زخم یا بیماری نے بیکار کردیا ہو، اسے کسی قسم کی ایذا پہونچانا انسانیت کے خلاف ہے، اسی اصل سے وہ فروعی قواعد نکلتے ہیں، جو ہسپتالوں اور ان کے کارکنوں کے متعلق جنوا اور ہیگ کے سمجھوتوں میں وضع کئے گئے ہیں، بلکہ ان کا ایک بڑا حصہ محض عملی جزئیات پر مشتمل ہے، جو ظاہر ہے کہ حالات اور طریقوں کے تغیر کے ساتھ ساتھ بدلتا رہتا ہے، اس لئے دیکھنے کی چیز صرف وہ اصل الاصول ہی ہے جسکو مغربی دنیا نے تو آج دریافت کیا ہے، لیکن اسلام ساڑھے تیرہ سو برس قبل دریافت کرچکا ہے، ظہورِ اسلام کے وقت ہسپتالوں اور شفاخانوں کا وہ نظام موجود نہ تھا جو آج ایک مکمل ادارہ کی صورت اختیار کرچکا ہے، اس لئے قدرتی طور پر وہ

۱؎ Hague Convention, Vol.

۲؎ Oppenheim, International Law vol II, p. 20 صفحہ

تفصیلات وضع نہیں کی گئیں جو ارتقاے تمدن کے ساتھ ساتھ تدریجاً پیدا ہوتی رہی ہیں۔ لیکن اس نے لا تجہز علی جریح (زخمی پر دست درازی نہ کرنا) کا اصول دیکر گویا دیا ہے اور یہ تعلیم دی ہے کہ ہر محارب کو دوسرے فریق کے اچھے یا برے عمل سے بے نیاز ہوکر خود اپنی ذاتی ذمہ داری کے طور پر زخمیوں اور ان تمام لوگوں کا احترام کرنا چاہئے جو زخمیوں کی طرح معذور ہوں۔

مہلک اشیاء کا استعمال جب سے جدید علوم حکمت نے جنگ کے لئے نئے نئے مہلک آلات و ادوات اختراع کرنے شروع کئے ہیں، یورپ میں ایک مسئلہ یہ بھی پیدا ہوگیا ہے کہ ان ہلاکت بار چیزوں کا استعمال روک دیا جائے۔ زہریلی گیسیں، پھٹنے والی گولیاں، آتش گیر مادے، اور ایسی ہی دوسری چیزیں انسانی اجسام پر جو ہولناک اثر پیدا کرتی ہیں، ان کو دیکھکر یورپ کا ضمیر ملامت کرنے لگتا ہے اور انسانیت پرور اخلاقیین کا ایک گروہ رائے عام کو بھڑکا کر ارباب سیاست پر دباؤ ڈالتا ہے کہ جنگ میں ایسے وحشیانہ آلات و ادوات استعمال نہ کریں مگر فوجی گروہ کو مقاصد جنگ کے حصول میں یہ چیزیں جو مدد دیتی ہیں، وہ اسے ہرگز اس بات کی اجازت نہیں دیتیں کہ وہ ان کا استعمال ترک کردیں۔ ان دونوں گروہوں کے درمیان ایک عرصہ سے کش مکش برپا ہے۔ اور اسکا علاج سیاسی مدبرین نے یہ سوچ رکھا ہے کہ اخلاقیین کو تو وہ بین الملّی کانفرنسیں منعقد کرکے اور ان میں انسانیت پرور قرار نامے تیار کرکے مطمئن کردیتے ہیں۔ اور فوجی گروہ کو آزادی کے ساتھ نہ صرف ان تمام چیزوں کے استعمال کی بلکہ ایسی ہی دوسری نئی نئی چیزیں ایجاد کرکے رائج کرنے کی اجازت دیدیتے ہیں۔

ان مہلک اشیاء میں سے بعض چیزیں جو بظاہر زیادہ وحشیانہ صورت رکھتی ہیں ان کو تو یورپ نے ایک عرصہ سے چھوڑ رکھا ہے۔ زہر کے بجھے ہوئے اسلحہ کا استعمال غالباً اٹھارہویں صدی سے بند ہے اور کانٹے، شیشے کے ٹکڑے، چاقو کے پھل، اور ایسی ہی دوسری چیزیں توپ میں بھر کر چھوڑنی بھی ایک صدی

لہ فقہ اسلامی میں استنباط احکام کا ایک متداول طریقہ یہ بھی ہے کہ خاص احکام کی علت پر قیاس کرکے ان کو تمام صورتوں پر عام کردیا جاتا ہے جنمیں وہ علت پائی جاتی ہے۔ مثلاً شراب میں حرمت کی علت سکر ہے، اس لئے ایسی ہر چیز حرام ہے جسمیں سکر موجود ہو۔ اسی قاعدہ کے مطابق چونکہ زخمی پر دست درازی نہ کرنے کا حکم اس لئے دیا گیا ہے، کہ وہ مقاومت سے معذور ہے، اس لئے اس سے یہ عام حکم نکلتا ہے، کہ ایسے دشمن پر جو مقاومت سے معذور ہو، دست درازی نہ کرنی چاہئے۔

سے ممنوع ہو چکی ہیں لیکن دوسری چیزیں جو اصلیت کے اعتبار سے ان کے مقابلہ میں بدرجہا زیادہ وحشیانہ ہیں، آج تک برابر استعمال ہو رہی ہیں، اور یورپ کی مہذب ترین سلطنتیں ان کے استعمال پر سب سے زیادہ مصر ہیں۔ ۱۸۶۸ء، ۱۸۹۹ء اور ۱۹۰۷ء کی کانفرنسوں میں تمام سلطنتوں نے یہ اصول تسلیم کیا کہ دشمن کو ایسا جسمانی نقصان نہ پہونچانا چاہیئے جو جنگ کے مقاصد میں کسی قسم کی مدد دیئے بغیر اسکی تکالیف میں غیر معمولی اضافہ کرتا ہو، چنانچہ اس اصول کے مطابق حسب ذیل اشیاء کا استعمال ممنوع قرار دیا گیا:۔

۱۔ اشتعال پذیر اور آتش گیر مادہ (Explosive or incendiary Projectiles) جنکا وزن ۱۴ اونس سے کم ہو،

۲۔ پھٹنے والی گولیاں جو جسم میں داخل ہو کر پھیل جاتی ہوں،

۳۔ زہریلی اور دم گھونٹنے والی گیسیں،

۴۔ بیلونوں اور ہوائی جہازوں سے پھٹنے والے گولے (Projectiles and Explosives)

ان میں سے نمبر ۴ کی قید کو تو دو سلطنتوں کے سوا کسی نے قبول نہیں کیا، اور وہ گویا پیدا ہوتے ہی مر گئی، نمبر ۳ کی قید ابتداءً صرف امریکہ اور انگلستان نے نامنظور کی تھی، مگر بعد میں تقریباً تمام مہذب سلطنتوں نے اسکی خلاف ورزی کی، یہاں تک کہ جنگِ عظیم میں سب نے مل کر اس کے پرزے اڑا دیے، جنگ کے بعد واشنگٹن کانفرنس میں دوبارہ اس بندش کو مضبوط کرنے کی کوشش کی گئی، اور ایک جدید میثاق لکھا گیا، لیکن آج تک کسی نے اس کی توثیق نہیں کی، دوسری قید کے متعلق ابھی تک ماہرینِ حرب میں اسی امر پر اختلاف ہے کہ پھٹنے والی گولی کی صحیح تعریف کیا ہے، پھر جب مسمّٰی کی تعیین ہی نہیں ہوئی تو اسم کی ممانعت کیا معنی؟ اب رہی پہلی قید، سو وہ صرف کاغذ ہی کی زینت ہے، اور عملی دنیا میں اس کا کوئی وجود نہیں ہے، جنگِ عظیم میں جملہ اقسام کے اشتعال پذیر اور آتش گیر مادے جس آزادی کے ساتھ استعمال کئے گئے ہیں اسکے بعد کوئی شخص ہیگ کانفرنس اور سینٹ پیٹرسبرگ کے اقرار ناموں کو یاد دلا کر اپنے تئیں سامانِ مضحکہ بنانے کی جرأت نہیں کر سکتا،

اس معاملہ میں اسلامی قانون نے کسی قسم کی تصریح نہیں کی ہے، اور اس کی وجہ یہ ہے کہ کسی خاص قسم کے ہتھیار یا سامانِ جنگ کے استعمال کو ممنوع قرار دینا محاربین کے باہمی سمجھوتے پر منحصر

اگر ایک محارب فریق ایک مہلک چیز استعمال کرتا ہے تو دوسرے فریق سے یہ [illegible]
چیز کو استعمال نہ کرے، اس پر ایسی کوئی پابندی عائد کرنا اس کے حق میں شکست کا قطعی فیصلہ کر دینا ہے، اس لئے
اسلام نے مسلمانوں کو ایسے ہتھیار اور طریق جنگ اختیار کرنے کی اجازت دی ہے جو ان کے زمانہ میں
رائج ہوں، اور اس کے ساتھ ان کو یہ اختیار بھی دیا ہے کہ اگر غیر قوموں سے کوئی ایسا سمجھوتہ ممکن ہو جس
کسی خاص طریقہ پر یا وسیلہ کو مساویانہ اصول پر ترک کیا جاسکتا ہو تو وہ اپنے وقتی مصالح کو دیکھ کر اسے
منظور کرلیں،

جاسوس، جاسوس کو کسی قانون نے پناہ نہیں دی ہے، دوسرے قوانین کی طرح مغربی قانون بھی اس کی
کوئی قانونی حیثیت تسلیم نہیں کرتا ضوابط ہیگ کی دفعہ ۳۰ میں اس نے جاسوس کو صرف یہ رعایت دی ہے
کہ اسے مقدمہ چلائے بغیر سزا نہیں دیجاسکتی، اور دفعہ ۳۱ کی رو سے اسکو دوسری رعایت یہ دی گئی ہے کہ
اگر وہ جاسوسی کرکے اپنی فوج میں واپس پہونچ جائے اور اس کے بعد گرفتار ہو تو سابق جاسوسی کی
بنا پر کوئی سزا نہیں دیجائے گی، ان دو رعایتوں کے ساتھ ہیگ کے ضوابط فوجی حکام کو پورا اختیار
دیتے ہیں، کہ جس شخص پر جاسوسی کا جرم ثابت ہو، اسکو جو چاہیں سزا دیں،

اس معاملہ میں اسلامی قانون بھی مغربی قانون سے مختلف نہیں ہے، دونوں صرف اس شخص
کو جاسوس قرار دیتے ہیں، جو خفیہ طریقہ سے دشمن کے علاقہ میں گھس کر اس کے اسرار کا تجسس کرتا ہے، وہ
جو شخص بغیر کسی دھوکہ اور فریب کے کھلم کھلا دشمن کے حالات معلوم کرنے کے لئے جائے، اسکو دونوں
جاسوس شمار نہیں کرتے، البتہ اسلامی قانون نے جاسوس کو وہ رعایات نہیں دی ہیں جو مغربی قانون
اس کو دیتا ہے، مگر یہ رعایات دراصل مراعات ہیں جو فریقین باہمی سمجھوتہ سے ایک دوسرے کے
جاسوسوں کو دیتے ہیں، چونکہ تمام سلطنتیں جاسوسوں سے کام لیتی ہیں، اور کوئی سلطنت نہیں چاہتی
کہ اپنے ایسے جاں نثار آدمیوں کو بالکل دشمن کے رحم پر چھوڑ دے، اس لئے انھوں نے مفاہمت کے
ساتھ انھیں، کچھ رعایات عطا کر دی ہیں، اور یہ ایسی رعایات ہیں جو اگر مسلمانوں کے جاسوسوں
کو حاصل ہوتی ہوں، تو اسلام بھی ان کے عوض محاربین کو یہی رعایات دے سکتا ہے۔

خدع فی الحرب جنگ میں خدع و فریب جائز ہے، فریڈرک اعظم کہتا ہے :-
"جنگ میں ایک شخص کبھی شیر کی کھال اوڑھتا ہے، اور کبھی لومڑی کی چادر"

گر دغا ت اس جگہ کامیاب ہوتی ہے جہاں محض قوت ناکام ہوتی ہے[1]"

مگر خدع اور دغا میں فرق ہے، کمین گاہوں میں بیٹھنا، دشمن کو بے خبر رکھکر خطرے کی جگہ کھینچ لا[نا]، غلط اطلاعات سے اس کو دھوکہ دینا، دکھاوے کی پیش قدمی اور دکھاوے کی پسپائی سے اس کو غلط فہمی [میں] ڈالنا، اس کو پسپائی کا دھوکہ دیکر اچانک جا پڑنا، یہ اور ایسی ہی تمام جنگی چالیں خدع میں داخل ہیں، اور ہر دشمن کا خود اپنا فرض ہے کہ ان کے مقابلہ کے لئے مستعد رہے، بخلاف اس کے دشمن کو خطرہ کی علا[مت] دکھا کر قریب تر بلانا اور اس پر حملہ کر دینا، صلح کی گفت و شنید کے بہانے سے سفید پرچم بلند کرنا اور پھر اس پر ٹوٹ پڑنا، فوجوں کی قیام گاہ اور میگزینوں پر وہ علم نصب کرنا جو ہسپتالوں کے لئے مقرر ہیں، عورتوں اور بچوں کو آگے کھڑا کر دینا اور ان کے پیچھے سے گولہ باری کرنا، یہ اور ایسی ہی دوسری حرکات دغا ہیں، اور ان کا ارتکاب کسی فوج کے لئے جائز نہیں ہے، لیکن بعض امور ایسے بھی ہیں جن کے متعلق یہ فیصلہ نہیں کیا جا سکتا کہ وہ دغا کے حکم میں داخل ہیں یا خدع کے حکم میں، مثلاً دشمن کا قومی پرچم یا اسکی فوجی وردی استعمال کرنا، بین الملی قانون کے علمائے نے جائز رکھا ہے، مگر فوجی گروہ اسکو ناجائز قرار دیتا ہے، جرمنی کے قانون میں یہ ایک ممنوع طریق جنگ ہے، اور امریکہ کا قانونِ جنگ اسے ایک ایسی "بے ایمانی" سے تعبیر کرتا ہے جسکا ارتکاب دشمن کو کسی رعایت کا مستحق نہیں رہنے دیتا[2]، پس درحقیقت خدع و فریب کے متعلق کوئی ایسا قانون نہیں بن سکتا جو جزئیات پر حاوی ہو، یہ سوال ایک قوم کے سپاہیانہ اخلاق سے تعلق رکھتا ہے اور ہر قوم اپنے احساسِ شرافت کی بنا پر خود ہی فیصلہ کر سکتی ہے، کہ کون سے اعمال اسکی شجاعت و بہادری کے منافی ہیں، اور کون سے نہیں ہیں، اسی لئے ہیگ کے ضوابط میں خدع کی کوئی تشریح نہیں کی گئی [بلکہ] صرف یہ لکھدیا گیا کہ خدع فی الحرب (RUSES OF WAR) اور دشمن کے متعلق اطلاعات حاصل کرنے کے وسائل کا استعمال جائز ہے[3]،

اس مسئلہ میں بھی اسلام کا قانون مغرب کے قانون سے متفق ہے، اس نے بھی خدع فی الحرب کو جائز قرار دیا ہے، اور تفصیلات کو علمائے عصر پر چھوڑ دیا ہے، تاکہ وقتی حالات کے مطابق وہ خود فیصلہ کریں کہ کون سی چیزیں خدع کی تعریف میں آتی ہیں، اور کون سی نہیں آتیں،

---

[1] KRIEGSBRAUCH IM LANDKRIEGE p. 43

[2] امریکہ کی جنگی ہدایات دفعہ ۱۰۱ تا ۱۰۲ [3] ضوابط ہیگ، دفعہ ۲۴

انتقام: ہیگ کے قوانین اور اس سے قبل یا بعد کے قوانین میں بھی انتقام کے متعلق کسی قسم کی تصریح نہیں کی گئی ہے، ہمیں مغربی سلطنتوں کے تسلیم کردہ قوانین میں سے کوئی یہ نہیں بتاتا کہ دشمن کی جانب سے تعدی ہونے کی صورت میں انتقام لینا جائز ہے یا نہیں؟ اور اگر جائز ہے تو کس حد تک؟ غالباً ہیگ کانفرنسوں میں اس نقطہ سے دانستہ اعراض کیا گیا ہے، کیونکہ فوجی گروہ اس کے متعلق تمام اختیارات اپنے ہاتھ میں رکھنا چاہتا ہے، شخصی طور پر بین الملی قانون کے بعض ماہرین نے اس کے حدود مقرر کرنے کی کوشش کی ہے، خصوصیت کے ساتھ پروفیسر ہالینڈ کی تجویز کردہ حدود اربعہ قانونی گروہ میں بہت مقبول ہیں[1] جن کا مفاد یہ ہے:۔

۱۔ جس جرم کا انتقام لینا ہو اس کی پہلے کافی تحقیق کر لی جائے،

۲۔ اس جرم سے جو نقصان پہونچا ہو اس کی تلافی کسی اور صورت سے ممکن نہ ہو، اور نہ اصل مجرم کو سزا دینی ممکن ہو،

۳۔ مخصوص حالات کے سوا، ہر انتقامی کارروائی فوج کے سپہ سالار اعظم کی اجازت سے کی جائے،

۴۔ انتقام کسی حال میں اصل جرم کی نسبت سے زیادہ نہ ہو،

لیکن یہ سب علمائے قانون کی شخصی آرا ہیں، جنکو جنگی گروہ نے کبھی تسلیم نہیں کیا، بخلاف اس کے جنگِ عظیم کا تجربہ یہ بتاتا ہے، کہ اس مسئلہ میں بین الملی تعامل یہ ہے کہ وہ ہر زیادتی جو ایک فریق کی طرف سے کیجائے، دوسرے فریق کے لئے بھی ویسی ہی زیادتیوں کو جائز کر دیتی ہے، مثال کے طور پر اسیرانِ جنگ کو اذیت پہونچانا، ہسپتالی جہازوں پر حملہ کرنا، تجارتی جہازوں کو غرق کرنا، غیر محفوظ آبادیوں پر گولہ باری کرنا، زہریلی گیسین، اور پھٹنے والی گولیاں استعمال کرنا قوانین جنگ کی رو سے جائز ہے، مگر جنگ عظیم میں ہر فریق نے دوسرے فریق پر یہ الزام رکھکر ان تمام حرکات کا ارتکاب کیا، کہ ان کی ابتداء در اصل اسکی طرف سے ہوئی ہے،

اس مسئلہ میں اسلام کا قانون بالکل صاف ہے، وہ کہتا ہے:۔

جزاء سیئۃ سیئۃ مثلہا فمن عفا و اصلح فاجرہ علی اللہ انہ لا یحب الظالمین،	بدی کا بدلہ بدی ہے اسی کے مثل، اور جو معاف کرے، اور اصلاح کرے تو اس کا اجر اللہ کے ذمہ ہے، کیونکہ وہ

[1] Hallana, Laws of war on land Pd: ...

(۲:۱۲۶)	ظالموں کو پسند نہیں کرتا،
وان عاقبتم فعاقبوا بمثل ما عوقبتم به ولئن صبرتم لهو خیر للصابرین	اگر تم سزا دو تو اتنی ہی سزا دو جتنی تمھیں تکلیف دی گئی ہے، اور صبر کرو تو یہ صابروں کے لئے زیادہ بہتر ہے،
فمن اعتدیٰ علیکم فاعتدوا علیہ بمثل ما اعتدیٰ علیکم واتقوا اللہ (۲:۱۹۴)	جو کوئی تم پر زیادتی کرے تم بھی اس پر اتنی ہی زیادتی کرو جتنی اس نے کی ہے، مگر اللہ سے ڈرتے رہو،
وقاتلوا فی سبیل اللہ الذین یقاتلونکم ولا تعتدوا ان اللہ لا یحب المعتدین (۲:۱۹۰)	اللہ کی راہ میں ان لوگوں سے جنگ کرو جو تم سے جنگ کرتے ہیں مگر حد سے نہ بڑھ جاؤ، کیونکہ اللہ حد سے بڑھنے والوں کو پسند نہیں کرتا،

ان آیات میں اول تو انتقام نہ لینے اور صبر کرنے کو زیادہ بہتر قرار دیا گیا ہے، اور مجبوری کی حالت میں اسکی اجازت بھی دی گئی ہے، تو اس شرط کے ساتھ کہ انتقام اسی حد تک ہو جس حد تک زیادتی کی گئی ہے اور اس میں تقوی کو ملحوظ رکھا جائے اور کسی حال میں شریعت کی حدود سے قدم نہ بڑھایا جائے تقوی اور عدم اعتدی سے مراد یہ ہے کہ جو افعال شریعت میں فی نفسہ حرام و ناجائز ہیں، ان کا ارتکاب کسی حال میں نہ کیا جائے۔ مثلاً اگر دشمن کے سپاہی ہمارے ملک میں گھس کر ہماری عورتوں کی بے حرمتی کریں یا ہمارے مقتولوں کا مثلہ کریں تو ہمارے لئے اس کے جواب میں ان کی عورتوں سے زنا کرنا اور ان کے مقتولوں کا مثلہ کرنا جائز نہیں ہے، یا مثلاً وہ دوران جنگ میں ہماری عورتوں کو، بڈھوں، زخمیوں، اور بیماروں کو قتل کریں تو ہمیں ان کے اس فعل کی پیروی نہیں کرنی چاہئے، بخلاف اس کے اگر وہ ہمارے خلاف زہریلی گیسیں استعمال کریں، یا ہم پر پھٹنے والے بم پھینکیں، تو ہمیں پورا حق ہے، کہ اسی طاقت اور خاصیت کے آلات جنگ ان کے خلاف استعمال کریں،

غیر مقاتلین کے حقوق و فرائض، مقاتلین کے باہمی معاملات کا ذکر ہو چکا اب ہم ان قوانین کی طرف توجہ کرتے ہیں جو مقاتلین اور غیر مقاتلین کے باہمی معاملات سے تعلق رکھتے ہیں،

جیسا کہ اس سے پہلے بیان کیا جا چکا ہے، یورپ میں غیر مقاتلین کے حقوق کا احساس بہت مدت میں پیدا ہوا ہے، نظری حیثیت سے تو اسکی ابتدا اٹھارہویں صدی میں ہو گئی تھی، لیکن عملی حیثیت سے انیسویں صدی کے وسط تک کوئی ایسا قانون جنگ موجود نہ تھا، جو ان کے احترام کی تاکید کرتا ہو

الجزائر میں فرانس نے، قندھار و دہلی میں انگلستان نے، "ورجنگ جزیرہ نما (... war"

میں افواج متحدہ نے جس آزادی کے ساتھ غیر مقاتلین کا قتل عام کیا اس سے عہد وحشت کی یاد تازہ ہو گئی تھی۔

یوں تو علمائے قانون گروٹیوس کے عہد سے ان کے حقوق کی تعیین پر زور دیتے رہے ہیں مگر پہلی مرتبہ ۱۸۷۴ء میں بروسلز کانفرنس نے شروع کیا، ۱۸۹۹ء کی ہیگ کانفرنس نے اس میں اضافے کیے، اور ۱۹۰۷ء کی ہیگ کانفرنس نے اسکو مکمل کیا۔ لہٰذا غیر مقاتلین کے متعلق مغربی تہذیب کے قوانین کی عمر زیادہ سے زیادہ ۸۵ سال قرار دی جا سکتی ہے۔

اس حدیث العہد قانون نے غیر مقاتلین کے حقوق و فرائض کی تعیین نہایت وسیع پیمانہ پر کی ہے اور جزئیات و فروع کے احاطہ میں بہت کافی غلو سے کام لیا ہے لیکن اس کے ساتھ ساتھ یورپ میں جنگ کے جو جدید طریقے اور اصول پیدا ہوئے ہیں، انکی بدولت مقاتلین و غیر مقاتلین کے درمیان فرق و امتیاز تقریباً ناممکن ہو گیا ہے، اور یہ کہنا کسی طرح مبالغہ نہیں ہے کہ آج کل کی جنگ غیر مقاتلین کے حق میں عہد وحشت کی جنگ سے زیادہ خطرناک ہے، اس حقیقت کو خود یورپ کے ماہرین قانون تسلیم کرتے ہیں، چنانچہ لارڈ برکن ہیڈ اپنی کتاب "بین الملی قانون" میں لکھتے ہیں:۔

"بد قسمتی سے گذشتہ جنگ عظیم جس طریقہ پر لڑی گئی ہے، وہ بلا شبہ ریب یہ ظاہر کرتا ہے کہ سول آبادی اور مسلح افواج کے درمیان تمیز کرنے کا ترقی یافتہ اصول اب نیست و نابود ہونے کے خطرہ میں ہے"

اس کی ایک بڑی وجہ تو یہ ہے کہ فرق و امتیاز جن قوانین کی بنیاد پر قائم کیا گیا ہے، وہ خود ہی بے بنیاد ہیں، جیسا کہ گارنر اپنی کتاب "بین الملی قانون اور جنگ عظیم" میں لکھتے ہیں:۔

"۱۹۰۷ء کے ہیگ کنونشن کی دفعات کو جب ہم ۱۹۱۴ء کی جنگ عظیم کے واقعات سے مقابلہ کر کے دیکھتے ہیں تو ہمیں اس امر واقعہ کو یاد رکھنا ضروری ہوتا ہے کہ جنگ عظیم کے تمام شرکاء نے اس کنونشن کی توثیق نہیں کی تھی، لہٰذا یہ امر بہت مشکوک تھا کہ آیا اس کنونشن کے وضع کردہ قوانین سب کے لیے واجب العمل بھی تھے یا نہیں"

International Law P. 203

International law and The world war PP 16-18

لیکن اس کی اصلی وجوہ کچھ اور ہیں جنھیں پروفیسر روپن ہاکم نے اپنی عالمانہ کتاب بین الملی قا
میں بیان کیا ہے، اسکی تحقیق کے مطابق موجودہ عہد کی جنگ میں مقاتلین اور غیر مقاتلین کے امتیاز
کے مٹ جانے کی علت چار چیزوں میں پوشیدہ ہے:-

(۱) جبریہ بھرتی کے طریقہ کی اشاعت، اور ایک قوم کی پوری آبادی کا جنگی خدمت میں اس طرح شریک ہونا کہ مضبوط جسم کے لوگ میدان پر چلے جائیں، اور ان کی جگہ عورتیں اور کمزور مرد، سامانِ جنگ بنانے اور دوسرے فرائض ادا کرنے میں مشغول ہوجائیں

(۲) ہوائی جہازوں کا استعمال، جو صرف قلعوں اور جنگی استحکامات ہی پر نہیں، بلکہ مواصلت اور حمل ونقل کے خطوط کو بھی برباد کرنے کے لئے کیا جاتا ہے،

(۳) شوروی حکومتوں کا ان لوگوں کی رائے کی پابندی سے آزاد ہونا جو دراصل ان کو منتخب کرتے ہیں،

(۴) دشمن پر اقتصادی دباؤ ڈالنے اور اس کے وسائلِ ثروت برباد کرنے کی جنگی اہمیت[1]،

پس موجودہ زمانہ کی "تہذیب" جنگ میں غیر مقاتلین کے حقوق محفوظ نہ رہنے کی وجہ صرف یہی نہیں ہے کہ مغرب کے قوانینِ جنگ کی بنیاد کمزور ہے، بلکہ اسکی اصل وجہ یہ ہے کہ اس زمانہ کی جنگ جن وسائل اور جن طریقوں سے لڑی جاتی ہے، ان میں غیر مقاتلین کو مقاتلین سے ممتاز کرنا، اور ان کے امتیازی حقوق کا احترام ملحوظ رکھنا ناممکن ہو گیا ہے،

تاہم ان اصولی نقائص کے باوجود ہمیں دیکھنا چاہئے کہ مغربی قانون نے غیر مقاتلین کے لئے کیا حقوق و فرائض مقرر کئے ہیں، اور وہ بذات خود کیا قیمت رکھتے ہیں؟

غیر مقاتلین کا اولین فرض، غیر مقاتلین کا اولین فرض جس کا ہر محارب دشمن مطالبہ کرتا ہے، یہ ہے کہ وہ جنگی کارروائیوں میں کسی قسم کا حصہ نہ لیں، جس وقت ان کے سامنے دشمن نمودار ہو تو ان کو فیصلہ کر لینا چاہئے کہ آیا وہ جنگ میں حصہ لیں یا نہ لیں، اگر وہ جنگ میں حصہ لینے کا فیصلہ کریں تو ان کو اپنی قومی فوج میں باقاعدہ شریک ہو جانا چاہئے، اور اگر وہ حصہ نہ لینا چاہیں تو اپنے کاروبار میں امن

[1] Lawrence P. 34

طریقہ سے مشغول رہنا چاہیے، ان میں سے جو لوگ [illegible] طریقہ سے جنگ میں حصہ لیں گے انکو نہ تو مقاتلین کے حقوق حاصل ہوں گے اور نہ غیر مقاتلین کے، یعنی انکے ساتھ رحم کا برتاؤ نہیں کیا جائیگا، انکو کسی حال میں امان نہیں دیجائیگی، اور انھیں گرفتار ہونے کی صورت میں اسیرانِ جنگ کا رتبہ بھی نہیں دیا جائیگا۔

اسی مسئلہ میں اسلامی قانون اس حد تک تو بین الملی قانون سے متفق ہے کہ جو غیر مقاتلین جنگ میں حصہ لیں گے انھیں وہ حقوق حاصل نہ رہیں گے جو غیر مقاتلین کے لئے مخصوص ہیں لیکن اسلام اس سے متفق نہیں ہے کہ ان کو مقاتلین کے حقوق بھی نہ دیئے جائیں، وہ ہر اس شخص کو جو مقاتلہ کرے مقاتلین کے حقوق دیتا ہے، البتہ ایسی حالت میں وہ ان کے ساتھ کوئی رعایت نہیں کرتا جب کہ وہ مقاتلہ کے ساتھ غدر اور دغا بھی کرتے ہوں مثلاً کوئی عورت اگر خفیہ طریقہ سے مسلمانوں کے پانی میں زہر ملائے تو وہ یقیناً قتل کی جائے گی، یا کوئی شخص مسلمانوں کی پناہ میں آکر انھیں دھوکہ سے نقصان پہونچائے تو اس پر ہرگز رحم نہ کیا جائے گا۔ قبائل عکل و عرینہ کے لوگوں نے یہی کیا تھا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی پناہ میں آکر رہے اور دھوکہ سے آپ کے چرواہے کو قتل کرکے اونٹ ہانک لے گئے، اس لئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو مقاتلین و غیر مقاتلین دونوں کے حقوق سے محروم کردیا، اور انھیں ڈاکو اور رہزن قرار دیکر سخت عبرتناک سزا دی۔

غیر مقاتلین کا ایک فرض یہ بھی ہے کہ جب دشمن کی فوج ان کے علاقہ سے گذر رہی ہو، اور ان سے رہنمائی کا مطالبہ کرے تو وہ اس کو صحیح راستہ بتا دیں، اگر وہ وسائل حمل و نقل طلب کرے تو وہ خاص اس کی خدمت کے لئے دیدیں، اور اس کے جنگی اعمال میں کسی قسم کی مزاحمت نہ کریں، اس کے خلاف عمل کی صورت میں حملہ آور فوج کو سخت سزا دینے کا حق حاصل ہے۔

اس مسئلہ میں اسلامی اور مغربی قوانین متفق ہیں۔

غیر مقاتلین کی عصمت ان فرائض کے مقابلہ میں غیر مقاتلین کا ایک بنیادی حق یہ ہے کہ انکو جنگ میں قتل و غارت سے محفوظ رہنا چاہیے۔ اگرچہ حالات جنگ میں بعض اوقات ان کا بھی [illegible] کی زد میں آجانا ناگزیر ہے، مثلاً ایک جنگی مقام پر گولہ باری ہو رہی ہو، اور اس میں عورتیں اور بچے بھی ہوں تو ان کا بچنا غیر ممکن ہوگا، یا مثلاً ایک ریل گاڑی میں مقاتلین اور غیر مقاتلین سفر کر رہے ہوں

Lawrence P. 345

[اور دشمن ان پر پڑے تو ممکن ہے کچھ غیر مقاتلین بھی مارے جائیں گے، لیکن اس طرح نادانستہ اور احیاناً جنگ کی زد میں آجانے سے ان کی صیانت کے بنیادی اصول پر کوئی اثر نہیں پڑتا، قانون کی رو سے حملہ آور فریق کا یہ فرض ہے کہ وہ جان بوجھ کر اپنی جنگی کارروائیوں کا رخ غیر مقاتلین کی طرف نہ پھیر دے، اور جہاں تک ممکن ہو ان کو بچانے کی کوشش کرے۔[1]

اس معاملہ میں بھی اسلامی قانون اور مغربی قانون باہم متفق ہیں، اسلامی قانون نے غیر مقاتلین پر محض دانستہ حملہ کو ممنوع قرار دیا ہے، باقی رہی یہ صورت کہ جنگی اعمال کے دوران میں نادانستہ ان پر بھی ضرب لگ جائے، سو اس پر کوئی مواخذہ نہیں ہے، چنانچہ طائف کے محاصرہ میں جب دبابہ اور منجنیق وغیرہ قلعہ شکن آلات استعمال کئے گئے تو یہ سوال پیدا ہوا کہ ان کی سنگ باری سے شہر کے غیر اہل قتال کو بھی نقصان پہونچنا ممکن ہے، مگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس بنا پر ان کے استعمال کو جائز رکھا، کہ اس کا اصل مقصد فصیل توڑنا تھا غیر مقاتلین کو ہدف بنانا مقصود نہ تھا۔

غیر محفوظ آبادیوں پر گولہ باری۔ غیر مقاتلین کا حق مامونیت تسلیم کرنے کے بعد یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ جنگی عمل میں اس کو کس طرح ملحوظ رکھا جائے؟ اس مسئلہ میں جنگی اور قانونی گروہوں کے درمیان بہت بڑا اختلاف ہے، اور اب خود قانونی گروہ کی رائے بھی جنگی گروہ کی رائے سے مغلوب ہوتی جا رہی ہے، اگر لڑائی دست بدست ہو، یا دو مقابل فوجوں کے درمیان ہو تو غیر مقاتلین کو تلوار کی زد سے محفوظ رکھا جا سکتا ہے، لیکن جہاں میلوں کے فاصلہ سے گولہ باری ہو رہی ہو، اور خصوصیت کے ساتھ جہاں غنیم کے کسی شہر کو فتح کرنا مقصود ہو، وہاں غیر مقاتلین کو ہلاک جنگ سے محفوظ رکھنے کی کیا صورت ہے؟ اس سوال کا جواب قانونی گروہ یہ دیتا ہے کہ گولہ باری کے حق پر قیود عاید کرنی چاہئیں، اور جنگی گروہ کہتا ہے کہ کسی قسم کے قیود عاید نہ کرنی چاہئیں، انیسویں صدی کے وسط میں ان کی حفاظت کا یہ طریقہ وضع کیا گیا تھا کہ گولہ باری سے قبل غیر مقاتلین کو مہلت دینی چاہئے کہ وہ شہر چھوڑ کر چلے جائیں، ۱۸۷۰ء کی جنگ میں جرمنی نے ایک دو مقامات پر اس تجویز کی تعمیل بھی کی، مگر بعد میں فوجی گروہ نے بالاتفاق فیصلہ کیا، کہ اس قسم کی مہلت دینا جنگی مصالح کے بالکل خلاف ہے، چنانچہ جب جرمن فوجوں نے پیرس پر گولہ باری کی شروع کی، تو غیر مقاتلین کو نکلنے کی اجازت نہیں دی، بلکہ بالفاظ صریح یہ کہہ دیا کہ اس موقع پر شہر میں غیر مقاتلین کا

[1] Lawrence P. 345

موجود رہنا ہی مطلوب ہے، تاکہ غنیم فاقہ کی مصیبت میں مبتلا ہوکر شہر کو ہمارے حوالہ کردے، اس کے تھوڑے عرصہ بعد امیر البحر آؤبے (M. le. Contre Amiral Aube) کا وہ مشہور مضمون شائع ہوا جس نے فوجی گروہ میں بڑی مقبولیت حاصل کی، اس نے جنگ میں غنیم کے وسائل ثروت کو برباد کرنے کی ضرورت پر بہت زور دیا، اور یہاں تک لکھدیا کہ:-

"آئندہ جنگ میں ہمیں توقع رکھنی چاہئے کہ مسلح بیڑے اپنی قوت تخریب کا رخ ساحلی شہروں کی طرف پھیر دیں گے، خواہ وہ شہر قلعہ بند ہوں یا نہ ہوں خواہ وہ وسائل مدافعت رکھتے ہوں یا نہ رکھتے ہوں، وہ ان کو جلائیں گے، تباہ کریں گے اور کم از کم اتنا ضرور کریں گے کہ پوری بے دردی سے ان سے فدیہ وصول کریں گے"[1]

اس کے چند سال بعد ۱۸۸۸ء میں انگلستان کے بحری بیڑے کی مصنوعی جنگ ہوئی جس میں منجملہ اور کارروائیوں کے ایک یہ بھی تھی کہ ساحلی آبادیوں پر حملے کئے گئے، اور ان سے فدیہ وصول کیا گیا، اس پر پروفیسر ہالینڈ نے سخت اعتراض کیا، اور لندن ٹائمز میں مسلسل مضامین لکھے جن سے یہ سوال پھر چھڑ گیا کہ آیا شہری آبادیوں پر گولہ باری کرنی جائز ہے یا نہیں؟ قانونی گروہ کی رائے یہ تھی کہ یہ فعل ناجائز ہے، مگر امارت بحریہ کے اعلیٰ افسروں نے اس کو بالکل جائز قرار دیا اور ۱۸۸۸ء میں امیر البحروں کی ایک کمیٹی نے بالاتفاق اس کے حق میں رپورٹ دی۔[2]

۱۸۹۹ء میں جب پہلی ہیگ کانفرنس منعقد ہوئی تو یہ مسئلہ از سر نو پیش ہوا، اس وقت کانفرنس پر قانونی گروہ کا غلبہ تھا، اور جنگی گروہ بھی سلطنتوں کے سیاسی مصالح کا لحاظ کرکے خاموش ہو گیا تھا، اس لئے بری جنگ کے ضوابط میں گولہ باری کے حق پر قیود عاید کی گئیں، اور ۱۹۰۷ء کی کانفرنس میں بحری جنگ پر بھی ان قیود کو وسیع کر دیا گیا، یہ قیود حسب ذیل ہیں:-

(۱) ایسے شہروں، قریوں، بستیوں، اور عمارتوں پر گولہ باری کرنا یا کسی دوسرے ذریعہ سے حملہ کرنا ممنوع ہے، جو غیر محفوظ ہوں (ضوابط ہیگ، دفعہ ۲۵)

ایک حملہ آور فوج کے امیر پر لازم ہے، کہ گولہ باری شروع کرتے وقت حتی الوسع

---

[1] Revue des Deux Mondes 1882 PP. 314-46

[2] Birkenhead, International law P. 228

آبادی کے حکام کو متنبہ کر دینے کے وہ تمام ذرائع استعمال کرے جو اس کے اختیار میں ہوں۔ الا اس صورت میں کہ فوری حملہ ناگزیر ہو (دفعہ ۲۶)

گولہ باری اور قلعہ گیری کے موقع پر تمام ممکن طریقوں سے ایسی عمارتوں کو جو مذہبی یا علوم وفنون یا خیراتی اغراض کے لئے وقف کی ہوئی ہوں، اور تاریخی یادگاروں ہسپتالوں اور ایسے مقامات کو جہاں زخمی اور بیمار رکھے گئے ہوں، بچانے کی کوشش کرنی چاہیئے، بشرطیکہ وہ عمارات اس وقت جنگی اغراض کے لئے استعمال نہ کیجارہی ہوں" (دفعہ ۲۷)

اسی طرح بحری جنگ کے قوانین کے متعلق دوسری ہیگ کانفرنس کی مفاہمت نمبر ۹ میں گولہ وقلعہ گیری پر حسب ذیل قیود عائد کی گئیں :-

دفعہ اول، غیر محفوظ شہروں، بندرگاہوں، قریوں، بستیوں، اور عمارتوں پر قوائے بحریہ کا گولہ باری کرنا ممنوع ہے، کسی بندرگاہ پر صرف اس وجہ سے گولہ باری نہیں کیجا سکتی کہ اس کے پاس خود بخود تصادم سے پھٹنے والی تحت البحر سرنگیں (Automatic Submarine Contact mines) لنگر انداز ہیں[1]۔

دفعہ دوم، فوجی کارخانے، فوجی یا بحری محکمے، اسلحہ خانے، سامانِ جنگ کے گودام، ایسے کارخانے یا انجن جو غنیم کی فوج یا بیڑے کے کام آسکتے ہوں، اور بندرگاہ میں ٹھہرے ہوئے جنگی جہاز، اس ممانعت میں داخل نہیں ہیں، بحری قوت کا کمانڈر ابتداءً نوٹس دینے اور کافی عرصہ انتظار کرنے کے بعد ان کو برباد کر سکتا ہے، اگر دشمن خود ان کو برباد نہ کردے، ایسے حالات میں اگر کچھ ناگزیر نقصان پہونچے تو وہ اس کا ذمہ دار نہیں ہے۔ اگر جنگی اسباب کی بنا پر فوری کارروائی ضروری ہو، اور دشمن کو کوئی مہلت نہ دیجا سکتی ہو تو شہر کے غیر محفوظ حصہ کی حرمت ملحوظ رکھنی چاہیئے، اور کمانڈر کو کوشش کرنی چاہیئے کہ شہر کو کم سے کم ممکن نقصان پہونچے،

[1] اس دفعہ کے آخری فقرہ سے برطانیہ، فرانس، جاپان اور جرمنی نے اختلاف کیا ہے۔

دفعہ سوم۔ اگر مقامی حکام کسی بحری قوت کے باقاعدہ مطالبہ [illegible]
سامانِ رسد و مایحتاج مہیا نہ کریں تو انکو مناسب مہلت دینے کے بعد غیر محفوظ بندرگاہ
شہر، گاؤں، بستی، یا عمارت پر گولہ باری کیجا سکتی ہے،

دفعہ چہارم، مالی نذرانہ ادا کرنے کی پاداش میں کسی غیر محفوظ مقام پر گولہ باری نہیں
کی جاسکتی،

دفعہ پنجم، جب کوئی بحری قوت کسی شہر پر گولہ باری شروع کرے تو اس کے کمانڈر
کو پوری کوشش کرنی چاہئے کہ جہاں تک ممکن ہو، مقدس عمارات و عمارات موقوفہ
برائے علوم وفنون و امورِ خیریہ، اور تاریخی یادگاروں و ہسپتالوں، و ان مقامات
کو جہاں زخمی اور بیمار رکھے جاتے ہوں ضرر نہ پہونچے بشرطیکہ انہیں جنگی غرض
کے لئے استعمال نہ کیا جارہا ہو، اس شہر کے باشندوں کو چاہئے کہ اس قسم کی عمارات
کو ایسی مرئی علامات سے ممتاز کریں جو بڑے بڑے مستطیل اضلاع پر مشتمل ہوں و جنہیں
بشکل قطر دو رنگ کے مثلث بنائے جائیں، اوپر کا مثلث سیاہ اور نیچے کا سفید۔

دفعہ ششم، اگر فوجی حالات اجازت دیں تو گولہ باری کرنے سے قبل حملہ آور قوت
کے کمانڈر کو چاہئے کہ مقامی حکام کو متنبہ کرنے کی پوری کوشش کرے"۔

یہ قیود فی نفسہ نہایت ناقص ہیں، ان کا سب سے پہلا نقص یہ ہے کہ ان میں غیر محفوظ مقام کی
کوئی تعریف و تحدید نہیں کی گئی، ان سے بالکل نہیں معلوم ہوتا کہ کن مقامات کو غیر محفوظ قرار
دیا جائیگا، اور کن چیزوں کے موجود نہ ہونے کے باعث وہ غیر محفوظ سمجھے جائینگے، دوسرا نقص یہ ہے
کہ گولہ باری کرنے سے قبل اہل شہر کو متنبہ کرنے کا معاملہ کلیۃً حملہ آور فوج کے کمانڈر پر چھوڑ دیا گیا
ہے، یہاں تک کہ اسکو یہ بھی اختیار ہے کہ اگر چاہے تو متنبہ نہ کرے، تیسرا نقص یہ ہے کہ ایک طرف
مقدس عمارات اور علمی و تاریخی یادگاروں کی حرمت کی تاکید کی گئی ہے اور دوسری طرف یہ شرط
بھی لگادی گئی ہے کہ وہ جنگی اغراض کے لئے استعمال نہ کیجارہی ہوں، اس سے ایک حملہ آور فوج
کا کمانڈر ہر وقت یہ بہانہ کرسکتا ہے کہ اس کے علم میں وہ عمارات جنگی اغراض کیلئے استعمال
کی جارہی تھیں لہذا وہ ان پر گولہ باری کرنے کا مستحق تھا، لیکن ان کی سب سے بڑی کمزوری یہ ہے کہ

ان میں حملہ آور فوج کو ایسی حالت میں غیر محفوظ آبادیوں کو تباہ کرنے کا حق دیدیا گیا ہے جبکہ ان
باشندے اس کے لئے سامانِ رسد و مایحتاج مہیا کرنے سے انکار کر دیں، اس ایک بات نے ان
تمام قیود کو بے معنی کر دیا ہے، کیونکہ ایک حملہ آور فوج کے لئے یہ بالکل آسان ہے کہ جب وہ کسی
محفوظ" آبادی پر حملہ کرنا چاہے تو اس سے اتنا سامانِ رسد طلب کرے جسے وہ کسی حال میں ادا
کر سکتی ہو اور جب وہ ادا نہ کرے تو اس پر گولہ باری شروع کر دے، اگرچہ مفاہمت نمبر ۹ کی دفعہ سوم
کے دوسرے فقرے میں یہ توضیح بھی کر دی گئی ہے کہ سامانِ رسد کا مطالبہ اس مقام کے وسائل کی
مناسبت سے ہونا چاہئے، مگر سوال یہ ہے کہ مقامی وسائل کی "مناسبت" کا فیصلہ کون کریگا؟
اگر حملہ آور فوج کی رائے میں ایک خاص مقدار کا مطالبہ اس مقام کے لئے مناسب ہو اور مقامی
حکام کے نزدیک وہ مناسب نہ ہو تو ایسی صورت میں کون سی عدالت یہ فیصلہ کرنے آئے گی کہ
فریقین میں کس کا قول صحیح ہے؟

لیکن ان نقائص کے باوجود فوجی گروہ نے ان قیود سے علانیہ اختلاف کیا ہے، گولہ باری
سے قبل دشمن کو متنبہ کرنے اور مہلت دینے کے متعلق وہ کہتا ہے کہ "ایسا کرنا قیمتی وقت کو کھو دینے
کا ہم معنی ہے"[1]، سامانِ رسد کا مطالبہ مقامی وسائل کی مناسبت ملحوظ رکھکر کرنے کی جو شرط لگائی
گئی ہے، اس کے متعلق یہ گروہ کہتا ہے کہ وہ "نظری حیثیت سے بہت خوب ہے، مگر اس پر عمل کرنا
ناممکن ہے"[2]۔ سب سے زیادہ یہ کہ اس گروہ کے نزدیک گولہ باری کے موقع پر غیر مقاتلین کی رعایت
کرنا صرف یہی نہیں کہ غیر ضروری ہے، بلکہ انکو خاص طور پر ہدف بنانا جنگی مصالح کے عین مطابق
ہے، چنانچہ وہ کہتا ہے، کہ:-

"گولہ باری کے وقت محصورین میں عورتوں، بچوں، اور دوسرے غیر مقاتلین
کا موجود ہونا ہی جنگی نقطۂ نظر سے مطلوب ہے، کیونکہ صرف اسی صورت سے
معاصر فوج محصورین کو خوف زدہ کر کے تسلیم پر جلد سے جلد مجبور کر سکتی ہے"[3]

یہ خیالات صرف زبان و قلم ہی سے ظاہر نہیں کئے گئے، بلکہ عمل میں بھی ہیگ کانفرنس

---

[1] Kriegsbrauch, P. 19 [2] Kriegsbrauch, P. 62

[3] Kriegsbrauch P. 21

کی مقرر کردہ قیود کا تار و پود بکھیر دیا گیا۔ ۱۹۰۷ء کی ہیگ کانفرنس کے بعد یورپ میں پہلی جنگ اٹلی اور ترکی کے درمیان ہوئی، اور اس میں اٹلی نے شہر بیروت پر گولہ باری کر کے غیر محفوظ شہری آبادی کے ایک حصہ کو تباہ کر دیا، اس کے بعد دوسری جنگ دول متحدہ بلقان اور ترکی کے درمیان ہوئی تو اور تھریس و مقدونیہ میں غیر مقاتلین کو علانیہ قتل و غارت کیا گیا۔ تنہا مغربی تھریس کے متعلق تحقیق ہوا ہے کہ وہاں ....۲۵ہ مسلمان غیر مقاتلین تلوار کے گھاٹ اتارے گئے۔[1] اس کے بعد جب ۱۹۱۴ء میں یورپ کی مہذب ترین سلطنتوں کے درمیان جنگ عظیم برپا ہوئی تو یہ تمام قیود بیک جنبش توڑ دی گئیں گویا کہ وہ قایم ہی نہیں ہوئی تھیں۔ برکن ہیڈ اپنی کتاب بین الاقوامی قانون میں لکھتا ہے کہ:۔

"جنگِ عظیم سے قبل محفوظ اور غیر محفوظ آبادیوں کے درمیان جو امتیاز قائم کیا گیا تھا، جنگِ عظیم نے اس کا تار و پود بکھیر دیا ہے۔ اب سرے سے محفوظ و غیر محفوظ کی تعریف و تحدید ہی میں بہت بڑا اختلاف پیدا ہو گیا ہے، اور جنگ کے بعد سے آج تک ان کے درمیان حد بندی و نشانِ امتیاز قایم کرنے کی کوئی خاص کوشش بھی نہیں کی گئی ہے۔"[2]

اس سلسلہ میں سب سے زیادہ جس چیز نے ہیگ کی قیود کو مٹانے میں حصہ لیا ہے وہ ہوائی جہازوں کا جنگی استعمال ہے، ہوائی جہاز دراصل اس معنی میں کوئی آلہ جنگ ہی نہیں ہے کہ اس سے جنگ کے مقصد کی طرف کوئی اقدام ہوتا ہو۔ جنگ کا اصلی مقصد غنیم کی فوجی قوت کو توڑنا اور غنیم کے زیادہ سے زیادہ علاقہ پر قبضہ کر لینا ہے، لیکن ہوائی جہاز یہ دونوں کام نہیں کر سکتا۔ البتہ وہ صرف اتنا کر سکتا ہے کہ فضائے آسمانی سے عام آبادیوں پر بلا امتیاز گولے برسائے، عورتوں، بچوں، بیماروں اور بوڑھوں سمیت سب کو برباد کر دے، شہروں اور قصبوں کو بم برسا کر تہس نہس کر دے، اور دشمن قوم کو اس حد تک خوف زدہ اور پریشان کر دے کہ وہ جنگ سے جی چرانے لگیں، اور اس طرح وہ دشمن کی معنوی قوت توڑ دے۔ جنگِ عظیم سے قبل قانونی گروہ اس طریق جنگ کو [illegible] سمجھتا تھا مگر جب

---

[1] "بمبئی کرانیکل" مورخہ ۱۳ر جولائی ۱۹۲۲ء میں مسٹر [illegible] کا مقالہ ملاحظہ ہو۔

[2] Birkenhead. P. 226

میں جب یہ ایک عام اور معمول بہ طریقِ جنگ بن گیا، تو خود قانونی گروہ کے نقطۂ نظر میں بھی تغیر واقع ہوگیا۔ اور وہ اس کو ایک ناگزیر طریقہ سمجھنے لگا، چنانچہ ایلتسز باخر اپنی کتاب (Handbuch des Völkerrecht) میں لکھتا ہے کہ:۔

"جنگی کاروائی کی بہت سی اقسام ایسی ہیں، جو صرف اس بنا پر جائز ہیں کہ ان کا مدعا غنیم کی قوتِ جنگ کی معنوی بنیاد کو پراگندہ کرنا ہوتا ہے، (غیر محفوظ ساحلی شہروں پر گولہ باری بھی اسی قسم کی جائز کارروائیوں میں سے ہے، کیونکہ اس سے غنیم کی اقتصادی زندگی پریشان ہوجاتی ہے اور اس کے علاوہ دشمن کی رعایا میں ایک خاص قسم کی خوفِ زدگی پیدا ہوجاتی ہے) .... اسی دلیل کی بنا پر ہوائی جہازوں سے بم گرانے پر بھی کوئی پابندی عائد نہ ہونی چاہیئے، ان حملوں کے مسئلہ میں مستحکم یا محفوظ مقامات اور غیر مستحکم یا غیر محفوظ مقامات کے درمیان کوئی امتیاز قائم کرنا بے سود ہے، کیونکہ اکثر حالات میں کسی مقام پر بم اس لئے نہیں گرائے جاتے کہ اسے فتح کیا جائے، بلکہ ان سے محض دشمن کی اقتصادی زندگی کو پراگندہ کرنا، اور دشمن قوم میں ہراس اور جنگ سے بیزاری پیدا کرنا مقصود ہوتا ہے، اور یہ مقصد انھیں گولوں سے حاصل ہوتا ہے جو غیر مستحکم مقامات پر گرائے جاتے ہیں[۱]"

جنگِ عظیم کے بعد خاص طور پر ہوائی جہازوں کی گولہ باری کے لئے حدود مقرر کرنے کا سوال پیدا ہوا، اور یورپ و امریکہ کی رائے عام نے زور دیا کہ اس کے لئے قواعد و ضوابط مقرر کئے جائیں، چنانچہ ۱۹۲۲ء میں واشنگٹن کانفرنس نے اس غرض کے لئے ایک کمیشن مقرر کیا جسمیں برطانیہ، فرانس، اٹلی، ہالینڈ، جاپان اور امریکہ کے نمایندے شامل تھے، انھوں نے بہت کچھ غور و خوض کے بعد ۱۹۲۳ء میں چند سفارشات پیش کیں جنکا خلاصہ یہ ہے:۔

(۱) ہوائی جہازوں سے گولہ باری کرنا صرف اس صورت سے جائز ہے کہ ان کے ہدف فوجی مقامات ہوں، فوجی مقامات سے مراد ہیں، قوائے حرب، جنگی کارخانے، جنگی گودام، جنگی محکمے اور عملے، آلات و ادوات جنگ بنانے والے کارخانے، خطوطِ

[۱] Nippold, P. 124

ذرائع رسل و رسائل جو جنگی اغراض کے لئے مستعمل ہوں،

(۲) ان فوجی مقامات پر بھی ایسی حالت میں گولہ باری نہیں کرنی چاہیے جبکہ وہ ایسی جائے وقوع میں ہوں جہاں شہری آبادی کو نقصان پہنچائے بغیر ان پر ضرب نہ لگائی جا سکتی ہو،

(۳) ایسی بستیاں اور عمارتیں جو عین حلقۂ جنگ میں واقع ہوں، اور جن کے متعلق یہ یقین کرنے کی وجہ موجود ہو، کہ ان میں اجتماعِ افواج ہوا ہے، ہوائی گولہ باری کیلئے جائز ہدف بن سکتی ہیں، مگر حلقۂ جنگ سے باہر کسی آبادی پر گولہ باری نہیں کی جا سکتی اس لحاظ سے ہر وہ گولہ باری جس کا مقصد شہری آبادیوں کو پریشان کرنا اور شخصی املاک کو برباد کرنا ہو، ممنوع ہے،

(۴) جو ہوائی جہاز راں آلۂ ہبوط (Parachute) کے ذریعہ جان بچا رہا ہو اس پر حملہ کرنا ممنوع ہے[1]،

مگر یہ قوانین اب تک محض زیب قرطاس ہی ہیں کسی سلطنت نے ان کو تسلیم کر کے اپنی کتاب آئین میں داخل نہیں کیا ہے[2] اور صرف یہی نہیں بلکہ ابھی یہ بھی مشکوک ہے کہ جنگ میں ان کی پابندی کی بھی جا سکتی ہے، یا نہیں؟ چنانچہ برکن ہیڈ لکھتا ہے :-

"ان مجوزہ قوانین پر جن کا مقصد ہوائی گولہ باری کو منضبط کرنا ہے ان کی فیاضانہ روح کے باعث بہت کچھ نکتہ چینی کی گئی ہے، یہ بات نہایت مشتبہ ہے، کہ اگر ان کو منظور کر لیا جائے تو آیا کسی ایسی جنگ میں ان کی پابندی کی بھی جا سکتی ہے جس میں اس سے زیادہ بڑے پیمانہ پر ہوائی قوتیں استعمال کی جائیں جتنا تصور ۱۹۱۸ء کے خاتمہ پر کیا جا سکتا تھا[3]"۔

اس مفصل بحث سے یہ بالکل صاف ظاہر ہو جاتا ہے کہ مغربی قانون جنگ میں محفوظ و غیر محفوظ آبادیوں کا جو امتیاز قائم کیا گیا ہے، اور غیر محفوظ آبادیوں کے لئے جو حقوق مقرر کئے گئے

---

[1] Birkenhead P. 226-227

[2] ... 205 ...

[3] Birkenhead, P. 227

وہ محض ایک فریب نظر ہیں، اور عملاً مغربی قانون اپنے دامن میں اس ایک نظریہ سے زیادہ کوئی تہ
نہیں رکھتا کہ "غیر مقاتلین کی جان و مال قابلِ احترام ہے"، رہا اس کا حقیقی احترام، تو وہ آج اسی قدر مفقود
ہے، جس قدر گروٹیوس کے زمانہ میں تھا،

عنوۃً فتح ہونے والے شہروں کا حکم غیر مقاتلین کے حقوق کی بحث میں ایک دوسرا اہم سوال یہ ہے
کہ جب کوئی شہر پوری طرح مقابلہ کرنے کے بعد بزورِ شمشیر فتح ہو تو اس کے باشندوں کے ساتھ کیا سلوک
کیا جائیگا، قدیم زمانہ میں ایک فوج کا یہ قدرتی حق تھا کہ جس شہر کو وہ عنوۃً فتح کرے اسکے باشندوں کو
تہ تیغ کر دے، یورپ میں بھی زمانۂ قریب تک یہ دستور موجود تھا چنانچہ اسپین کے خلاف متحدہ نیدرلینڈس
(United netherlands) کی بغاوت اور اس کے بعد پیش آنے والی مذہبی لڑائیوں
میں فریقین نہایت آزادی سے ایک دوسرے کے شہروں میں گھس کر قتلِ عام کرتے تھے، اگرچہ جنگ
سی سالہ کے بعد اس فعل کو یورپ کے ضمیر نے ظلم سے تعبیر کرنا شروع کر دیا تھا، لیکن انیسویں صدی کے
وسط تک وہ ممنوع نہ تھا، چنانچہ ڈیوک آف ولنگٹن کی رائے میں کسی شہر کے محافظین اگر عنوۃً مغلوب
ہوں تو انھیں امان کا حق نہ تھا، جنگ جزیرہ نما میں فرانس نے متعدد مرتبہ محصور شہر کے لوگوں کو د
کہ اگر انھوں نے مزاحمت جاری رکھی، تو ان کا قتلِ عام کیا جائے گا، چنانچہ کیوڈاڈ روڈریگو (Ciudad Rodrigo)
اور باڈاجوس (Badajos) اور سان سیباسٹیان (San Se-
bastian) کی فتح کے بعد فی الواقع فرانسیسی فوجوں نے قتل و غارت کا بازار گرم کیا، ۱۸۲۸ء
کی جنگ ترکیہ و روس میں جب روسی فوجیں اسمٰعیل میں داخل ہوئیں، تو انھوں نے بھی مقاتلین و
غیر مقاتلین سب کو تلوار کے گھاٹ اتارا، ۱۸۳۰ء میں جب فرانس نے الجزائر کا دارالحکومت
قسطنطینہ فتح کیا تو تین دن تک اسکی فوجیں قتل و غارت میں مشغول رہیں، ۱۸۵۷ء میں جب انگریز
فوجوں نے دلی فتح کیا تو آزادی کے ساتھ شہر میں قتلِ عام کیا، اور مفتوح شاہی خاندان کے افر
کا بھی احترام ملحوظ نہ رکھا، اس زمانہ تک یورپ میں کوئی ایسا قانون نہیں تھا، جسمیں اس فعل کو
ممنوع قرار دیا گیا ہو، ۱۸۷۴ء کی بروسلز کانفرنس نے بیشک یہ قرار دیا تھا کہ کسی کو فتح کرنیکے

Bernard, growth of the Despatches 2nd series
1193-94
Laws of war P. 111, Note

فوجوں کو لوٹ مار کے لئے آزاد نہیں چھوڑنا چاہیے، مگر جیسا کہ معلوم ہے اس کانفرنس کے مقرر کردہ قوانین
کی کسی سلطنت نے توثیق نہیں کی اس لئے اس کو دول یورپ کی کتاب آئین میں داخل ہونے کا شرف
حاصل ہی نہیں ہوا، پس یورپ میں پہلی مرتبہ اس فعل کو جس چیز نے ممنوع قرار دیا وہ ۱۹۰۷ء کے ضوابط ہیگ
میں جنگی دفعہ ۲۸ عنوۃً فتح ہونے والے شہروں کو لوٹنے اور غارت کرنے کی ممانعت کرتی ہے، مگر یہ غلط
بھی یہ طریقہ بند نہیں ہوا ہے، چنانچہ ۱۹۱۹ء اور ۱۹۲۲ء میں یورپ کی مہذب ترین سلطنتوں نے [illegible]
یونانی فوجوں نے سمرنا اور تھریس میں داخل ہو کر غیر مقاتل شہری آبادیوں کے ساتھ جو بدسلوکیاں کی ہیں وہ ثابت
کرتا ہے کہ بیسویں صدی کے عہدِ تہذیب میں بھی عہدِ وحشت کی یادگار ابھی تک باقی ہے، تاہم جہاں
تک نظری حیثیت کا تعلق ہے یورپ کو آج سے صرف ۳۰ سال قبل فاتحانہ داخلہ کا وہ مہذب طریقہ
دریافت کرنے کی توفیق ہوئی ہے، جسے آج سے ۱۳۴۰ سال قبل رسول عربی (فداہ ابی و امی) نے
فتح مکہ کے موقع پر پیش کیا تھا،

احتلال اور اس کے قوانین

احتلال ایک جدید اصطلاح ہے اور اس کا تخیل بھی جدید ہے
عہدِ قدیم میں تو جب ایک سلطنت کسی ملک پر قابض ہو جاتی تھی، تو وہ ملک اس کی جائز ملک ہو جاتا
تھا، اسلامی قانون میں بھی کسی ملک کا مفتوح ہو جانا یہ معنی رکھتا تھا کہ وہ دار الاسلام بن گیا، اور اس کی
رعایا کو ذمیوں کے حقوق حاصل ہو گئے، لیکن جدید بین الملّی قانون کی رو سے ایک ملک کا غنیم
کے تصرف میں آجانا یہ معنی نہیں رکھتا کہ وہ باضابطہ اسکی سیادت میں آگیا، بلکہ جس وقت تک حکومت
سابقہ سے باقاعدہ صلحنامہ ہو کر اس کے حقوقِ ملکیت فاتح کو منتقل نہ ہو جائیں، اس وقت تک
وہ صرف اس کے انتظام میں رہتا ہے، اور اس کو اصطلاح میں احتلال [illegible]
سے تعبیر کیا جاتا ہے، اس احتلال کے تحت جو علاقہ واقع ہوتا ہے اس کے باشندے نہ تو عملاً
اپنی سابقہ حکومت کی رعیت ہوتے ہیں، نہ اصولاً اپنی موجودہ حکومت کی رعایا بنتے ہیں، بلکہ وہ ایک
غیر قانونی فوجی حکومت کے تحت مغلوب و مقہور قوم کی حیثیت سے زندگی بسر کرتے ہیں، ۱۹۰۷ء
کے ضوابطِ ہیگ نے اس مقہوریت کی حدود مقرر کرنے کی کوئی کوشش نہیں کی ہے، اور نہ یہ طے
کیا ہے کہ حکومت محتلہ اپنے حاکمانہ اختیارات کس حد تک وسیع کر سکتی ہے، اور کس حد تک
نہیں کر سکتی، البتہ اس نے چند قوانین مقرر کر دیئے ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ علاقہ محتلہ میں

حکومت رہ باشندوں کے حقوق و فرائض کیا ہیں، ذیل میں ہم ان قوانین کو نقل کرتے ہیں:-

(۱) جبکہ لشکرِ احتلال کے ہاتھ میں حکومت کے اختیارات باقاعدہ منتقل ہو جائیں تو وہ اپنے تمام ممکن وسائل سے امن عام کو محفوظ رکھنے اور قایم کرنے کی کوشش کریگا اور حتی الامکان ان قوانین کو ملحوظ رکھے گا، جو اس ملک میں پہلے سے نافذ ہونگے"

(دفعہ ۴۳)

یہ دفعہ حکومتِ احتلال کے لئے صرف ایک عام پالیسی وضع کرتی ہے، اور در اصل ایک بے معنی دفعہ ہے، سابقہ قوانین کو برقرار رکھنے یا نہ رکھنے کے لئے "حتی الامکان" کی جو حد اس نے مق[illegible] کی ہے، وہ بالکل مبہم ہے، اور اس سے حکومت احتلال کو اختیار حاصل ہوجاتا ہے، کہ وہ علاقۂ محتلہ میں بالکل اسی طرح اپنے قوانین نافذ کرے جس طرح باضابطہ سیادت قایم ہونے کی صورت میں وہ کرے گی، کیونکہ وہ بآسانی کہہ سکتی ہے، کہ سابقہ قوانین برقرار رکھنا ہی اس کے "امکان" میں نہیں ہے، پس اس دفعہ سے احتلال، اور باضابطہ سیادت میں بہت کم فرق باقی رہجاتا ہے

(۲) ایک محاربِ فریق کے لئے ممنوع ہے کہ اپنے زیر احتلال علاقہ کے باشندوں کو دوسرے فریق کی فوج یا اس کے ذرایع و وسائل کے متعلق معلومات بہم پہونچانے پر مجبور کرے"، (دفعہ ۴۴)

اس دفعہ کو جرمنی، جاپان، روس، اور اسٹریا ہنگری نے اسی وقت مسترد کردیا تھا، فو[illegible] گروہ کو اس پر سخت اعتراض ہے کیونکہ وہ جنگی مصالح کے لئے اپنے وسائل استخبار پر کسی قسم کی پابندی قبول کرنے کے لئے طیار نہیں ہے، جرمنی کی "کتاب جنگ" میں اس پر جو تنقید کی گئی ہے، اس کے الفاظ یہ ہیں:-

"ایک ملک کے باشندوں کو خود اپنی قومی فوج، اسکی جنگی حرکات، اس کے وسائل اور اس کے فوجی اسرار کے متعلق معلومات بہم پہونچانے پر مجبور کرنا یقیناً ایک نہایت سخت کارروائی ہے، اس قسم کی کارروائی کو تمام قوموں کے مصنفین کی ایک بڑی اکثریت قابلِ ملامت قرار دیتی ہے، لیکن اس کے باوجود کوئی جنگی

قانداً ہمیشہ اس سے احتراز کرنے کا اہتمام نہیں کر سکتا۔ بیشک وہ جب بھی [illegible]
تو افسوس کے ساتھ کرے گا، مگر جنگ کی دلیل بسا اوقات اس کو اس ذریعہ سے
استفادہ کرنے پر مجبور کر دیگی،،[1]

آگے چل کر پھر لکھا ہے:۔

،، ایک شخص کو خود اپنے ملک کی ضرر رسانی، اور خود اپنی قومی فوج کی شکست
میں آسانی پیدا کرنے پر مجبور کرنا، انسانی حیات کے لئے خواہ کتنا ہی تکلیف دہ ہو
مگر کوئی محارب فوج، جو غنیم کے ملک میں پڑی ہوئی ہو، اس ذریعہ استحصال سے
اجتناب نہیں کر سکتی،،[1]

یہ خیالات صرف جرمن محکمہ جنگ ہی کے لیے نہیں ہیں بلکہ تمام یورپ کا فوجی [illegible]
رکھتا ہے، اور جہاں تک ہمیں معلوم ہے، آج تک کسی جنگ میں ضوابط ہیگ کی دفعہ [illegible]
درآمد نہیں کیا گیا،

(۳) ایک محارب سلطنت کے لئے ممنوع ہے کہ وہ اپنے دشمن کی رعایا کو خود
اس کی اپنی قوم کے خلاف جنگی اعمال میں حصہ لینے پر مجبور کرے، خواہ وہ جنگ سے
قبل اس کے ملازم ہی کیوں نہ رہ چکے ہوں،، (دفعہ ۲۳)

پروفیسر مارگن کے بقول یہ دفعہ صرف ایک عمومی بیان اصول ہی کی حیثیت [illegible]
اور جزئیات و تفصیلات میں حکومتوں کو خود یہ فیصلہ کرنے کا اختیار دیتی ہے کہ [illegible]
پالیسی وضع کریں[2]، اور یہ ظاہر ہے کہ جہاں حکومتوں کو یا در اصل ان کی فوجوں [illegible]
وہاں اس قسم کا ،، عمومی بیان اصول،، بالکل بیکار ثابت ہوتا ہے، اور فوجیں وہی [illegible]
جو جنگی ضروریات کے لحاظ سے وہ اپنے لئے ضروری سمجھتی ہیں چنانچہ جنگ عظیم [illegible]
عمل سے پورا پورا فائدہ اٹھایا گیا اور محارب سلطنتوں نے ایک دوسرے کی رعایا [illegible]
مواصلات ہی میں کام کرنے پر مجبور نہیں کیا بلکہ خندقیں کھودنے اور فوجوں کے عقب [illegible]

---

[1] Kriegsbrauch P. 48

[2] War its Conduct and legal results

تنبیہ ... کا کام بھی ... زبردستی ان سے لیا۔

(۴) علاقۂ محتلہ کے باشندوں کو دشمن سلطنت کی وفاداری کا حلف اٹھانے پر مجبور کرنا ممنوع ہے (دفعہ ۴۵)

(۵) خاندانی عزاز و حقوق، اور جان و مال اور مذہبی عقائد کا احترام ملحوظ رکھنا لازمی ہے اور شخصی املاک کو ضبط کرنا ممنوع ہے (دفعہ ۴۶)

(۶) غارت گری حسب ضابطہ ممنوع ہے، (دفعہ ۴۷)

یہ تینوں دفعات ایک "عمومی بیانِ اصول" کی حیثیت رکھتی ہیں، اور درحقیقت ان کی تشریعی قیمت نہیں ہے۔

(۷) اگر علاقۂ محتلہ میں حکومتِ احتلال وہ محصولات و واجبات اور محاصل براہ داری وصول کرے جو حکومت کے نفع کے لئے عائد کئے جاتے ہیں، تو اسکو حتی الامکان وہاں کے رائج الوقت قواعدِ تشخیص اور شرح کے مطابق ایسا کرنا چاہیے، نیز علاقۂ محتلہ کے نظامِ حکومت کا خرچ اسی پیمانہ پر ادا کرنا اسکا فرض ہے، جو وہاں کی جائز حکومت ادا کرتی تھی۔ (دفعہ ۴۸)

(۸) اگر ان محصولات کے علاوہ حکومتِ احتلال علاقۂ محتلہ کے باشندوں پر کچھ اور مالی نذرانوں کا بوجھ ڈالے تو یہ صرف فوج یا اس علاقہ کے نظم و نسق کے لئے ہونا چاہیے (دفعہ ۴۹)

(۹) کسی نذرانہ کی تحصیل ایک تحریری حکم کے بغیر نہیں کیجا سکتی، جو ایک کمانڈر انچیف کی ذمہ داری پر جاری کیا گیا ہو، اس قسم کے نذرانے صرف اس صورت سے وصول کئے جا سکتے ہیں کہ وہ اس ملک کے قواعدِ تشخیص و شرحِ محصولات کے مطابق ہوں، ہر ایسے نذرانے کے لئے ایک باقاعدہ رسید دیجانی چاہیے (دفعہ ۵۱)

(۱۰) میونسپلٹیوں اور عام باشندوں سے عملی خدمات یا اجناس کی شکل میں

رسد طلب نہیں کیجا سکتی، سوائے اس کے کہ فوج احتلال کے لئے اسکی ضرورت ہو، یہ مطالبہ ملک کے وسائل کی نسبت سے متناسب ہونا چاہیئے، اور وہ اس نوع کا نہ ہونا چاہیئے کہ اسکو پورا کرنا اس ملک کے باشندوں کے خود اپنے وطن کے خلاف جنگ میں حصہ لینے کا ہم معنی ہو جہانتک ممکن ہو ایسے نذرانوں کی نقد قیمت ادا کی جائے اور اگر یہ ممکن نہ ہو تو ایک رسید دینی چاہئے اور بعد میں جسقدر جلد ممکن ہو یہ رقم ادا کر دینی چاہیئے " (دفعہ ۵۲)

(۱۱) ایک فوج احتلال صرف ان املاک پر قبضہ کر سکتی ہے جو مملکت سے تعلق رکھتی ہوں، اور جنگی اغراض کے لئے استعمال کی جا سکتی ہوں، البتہ تمام آلات و ادوات جو خشکی یا تری یا ہوا میں خبر رسانی یا نقل و حرکت کے لئے استعمال کیجاتی ہوں، اور تمام اسلحہ خانے اور سامان جنگ کے گودام خواہ وہ شخصی ملک ہی کیوں نہ ہوں، بے تکلف ضبط کئے جا سکتے ہیں مگر صلح ہونے کے بعد انھیں واپس کر دینا ضروری ہے " (دفعہ ۵۳)

ان تمام دفعات میں حکومت احتلال کے حقوق قبض و تصرف اور استفادہ و استعمال پر پابندیاں عائد کرنے کی کوشش کی گئی ہے، اور علاقہ محتلہ کے باشندوں کو [illegible] دست برد سے محفوظ کر دیا گیا ہے، لیکن فوجی گروہ بالاتفاق ان تمام قیود کو [illegible] کرتا ہے، اور اپنی جنگی ضروریات کے مطابق مفتوح علاقہ سے تمام ممکن [illegible] پر مصر ہے، اس گروہ کے خیال کی ترجمانی جرمنی کی "کتاب جنگ" میں اس طرح کی گئی ہے:

"جنگی ضرورت کے موقع پر ہر قسم کی ضبطی، ہر قسم کی مستقل یا عارضی استعمال ہر قسم کا استعمال، ہر قسم کی ضرر رسانی اور تخریب جائز ہے"[1]

ملک کے وسائل اور اس کی قوت برداشت کو ملحوظ رکھنے کے متعلق اس کی رائے یہ ہے کہ:-

"یہ تناسب کا نظریہ بس نظریہ کی حیثیت سے تو بہت خوب ہے مگر اسکو عمل میں لانا بہت مشکل بلکہ محال ہے"[2]

---

[1] Kriegsbrauch P. 53

[2] [illegible] 52

اس معاملہ میں کلاؤ سوتز (Clausewitz) کی رائے جنگی گروہ میں بہت مقبول ہے۔ وہ فوجوں کی ضروریات کے لئے ہر ایسی چیز کو بے چون وچرا استعمال کرنا جائز رکھتا ہے، جو مفتوح ملک میں ہاتھ آئے، اور اس کے لئے صرف مقامی حکام پر دباؤ ڈالنے ہی کو کافی نہیں سمجھتا بلکہ عام آبادی کو خوف زدہ کر کے اسے ہر مطلوب چیز حوالہ کر دینے پر مجبور کر دینا بھی ضروری سمجھتا ہے۔ وہ کہتا ہے:۔

"اس وسیلۂ استغلال کی کوئی حد نہیں ہے، سوائے اس کے کہ مفتوح ملک بالکل مفلس اور قلانچ ہو جائے، اور اس میں ایک حبہ ادا کرنے کی بھی قوت نہ رہے"[۱]

یہاں بھی فوج گروہ کی رائے حسب معمول قانونی گروہ کی تدابیر پر غالب آگئی ہے اور ہم دیکھتے ہیں کہ کسی جنگ میں ہیگ کے مہذب قوانین احتلال پر عملدرآمد نہیں ہوتا،

"(۱۲) کسی قسم کی عام تعزیر خواہ وہ مالی ہو یا دوسری قسم کی، ایسے اعمال پر عاید نہیں کی جا سکتی، جن کا ارتکاب پرائیویٹ اشخاص نے انفرادی طور پر کیا ہو" (دفعہ ۵۰)

جنگ عظیم میں یہ قید بھی کالعدم ہو گئی، کیونکہ محاربین نے اپنے زیر تصرف و احتلال علاقوں میں نہایت آزادی سے پوری پوری آبادیوں پر تعزیری جرمانے عائد کئے اور ایسے مواقع پر اس طریق تنبیہ و تادیب کو اکثر استعمال کیا گیا، جبکہ خاص مجرم کا سراغ نہ مل سکا[۲]،

غارت گری و تباہ کاری، سترھویں صدی تک یورپ میں عام دستور تھا کہ جب ایک فوج دشمن کے ملک میں پیش قدمی کرتی تھی، تو ہر چیز کو تباہ کرتی چلی جاتی تھی، دشمن کا حق غارت گری و تباہ کاری اس زمانہ میں غیر محدود تھا، انیسویں صدی کے وسط تک ہمیں اس حق کے استعمال کی مثالیں ملتی ہیں، چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ ۱۸۱۳ء میں ریاستہائے متحدہ امریکہ نے کینیڈا کے متعدد گاؤں جلا دیئے، اور اس کے جواب میں ۱۸۱۴ء میں انگریزوں نے واشنگٹن

[۱] Vom Kriege Bk. VI. Kap. 14 Pt. 3

[۲] Openheim vol. II. P. 170

کی عمارتوں کو تباہ کیا، ۱۸۳۷ء میں فرانسیسی فوجوں نے الجزائر میں عام تباہی پھیلائی۔ ۱۸۵۷ء میں انگریزی فوجوں نے کان پور، لکھنؤ اور دلی کے علاقوں میں آتش زنی، لوٹ مار، اور قتل و غارت کا عام بازار گرم کیا، اور جنگ کریمیا سے قبل روس اور ترکی کی جتنی جنگیں ہوئیں، ان میں روسی فوجیں ہمیشہ ترکی علاقہ میں پیش قدمی کرتے وقت عام تباہی پھیلاتی رہیں، تاہم نظری حیثیت سے اس حق کو محدود کرنے کا تخیل سترہویں صدی میں پیدا ہو چکا تھا، چنانچہ گروشیس نے یہ قاعدہ کلیہ وضع کیا تھا کہ:۔

"صرف اس حد تک تباہ کاری جائز ہے جس سے ایک قلیل عرصہ میں دشمن صلح کی درخواست کرنے پر مجبور ہو جائے۔"

اس کے بعد اٹھارہویں صدی میں واٹل (Vattel) نے یہ قاعدہ کلیہ وضع کیا کہ دشمن کے ملک میں عام تخریب و تباہ کاری تین صورتوں میں جائز ہے:۔

۱۔ جبکہ ایک ظالم اور وحشی دشمن کے وحشیانہ اعمال کا سلسلہ بند کرنا مقصود ہو۔
۲۔ جبکہ اپنے سرحدی خط کو محفوظ کرنے کے لئے ایک سدِ راہ بنانی مقصود ہو۔
۳۔ جبکہ ایک میدانی کارروائی یا محاصرہ کے لئے اسکی ضرورت ہو۔

انیسویں صدی کے اواخر میں مغربی افکار نے تہذیب کی جانب کچھ اور ترقی کی، اور یہ عام اصول وضع کیا گیا کہ:۔

"صرف اسی قدر تباہ کاری جائز ہے جس قدر جنگی ضروریات کے لحاظ سے ناگزیر ہو۔"

لیکن بیسویں صدی کے یورپین مصنفین اور ماہرین جنگ کا میلان اس طرف ہے کہ جنگی ضروریات کے لحاظ سے ہر قسم کی تباہ کاری جائز ہے، اور جس تباہ کاری کا مقصد محض تباہ کاری ہو وہ حرام ہے۔ لارنس اپنی کتاب "اصول قانون بین الملل" میں لکھتا ہے۔

"قوانین جنگ ایک شہر کے مضافات کو تباہ کر دینا جائز رکھتے ہیں، بشرطیکہ

ا De jure belli ac pacis, quoted by Lawrence
۲ Principles of International Law, p. 519 — Droit des gens, III, pp. 167-8

کو ان میں پناہ لینے سے روکا جائے، یا توپ خانے کی کارروائی کے لئے میدان صاف کیا جائے، اس غرض کے لئے عمارتیں توڑی جا سکتی ہیں، درخت کاٹے جا سکتے ہیں، بلکہ پسپائی کے لئے رستہ صاف رکھنے کی غرض سے گاؤں بھی جلائے جا سکتے ہیں مگر یہ کارروائی صرف اس صورت میں ہونی چاہیے جبکہ فوری اغراضِ جنگ کے لئے ایسا کرنا بےحد ضروری ہو۔[1]

پروفیسر ویسٹ لیک (Westlake) لکھتا ہے:۔

"غنیم کے ملک میں عام تباہی صرف اس وقت جائز ہے جبکہ زیرِ عمل جنگی کارروائی کی کامیابی کے لئے ایسا کرنا ضروری ہو"[2]

جرمنی کی کتاب جنگ اس مسئلہ میں یہ فیصلہ دیتی ہے کہ:۔

"بلا ضرورت تو ذرہ برابر تباہ کاری بھی ناجائز ہے لیکن اگر ضرورت آپڑے تو بڑی سے بڑی تباہ کاری بھی جائز ہے"[3]

یہاں آکر مغربی قانون ایک حد تک اسلامی قانون سے مل جاتا ہے، اسلامی قانون بھی یہی ہے کہ کسی شہر کی تسخیر یا کسی اور فوجی کارروائی کے لئے تخریب کی ضرورت ہو تو وہ جائز ہے مگر صرف اس حد تک کہ ایسا کرنا اس کارروائی کی کامیابی کے لئے ناگزیر ہو،

اسکی تفصیل اس کتاب کے باب پنجم بعنوان "تباہ کاری کی ممانعت" میں گذر چکی ہے، لیکن مسئلہ کے ایک پہلو میں اسلام اور مغربی قانون کے درمیان اختلاف ہے، اسلام مہذب اور غیر مہذب دشمن میں کوئی تمیز نہیں کرتا، اس کے نزدیک غیر مہذب دشمن کی فصلیں تباہ کرنا اور بستیاں اجاڑنا بھی ویسا ہی ظلم ہے، جیسا کہ مہذب دشمن کی بستیوں اور کھیتوں کو غارت کرنا ہے، بلکہ درحقیقت اسلامی قانون جس زمانہ میں وضع ہوا تھا اس زمانہ میں "مہذب دشمن" کا تو کہیں وجود ہی نہ تھا، ہر طرف غیر مہذب ہی غیر مہذب تھے اگر مغربی قانون ان دونوں

---

1 Chapters on The Principles of International Law P 441
2 Principles of International Law P 261
3 Bir Kenhead Principles of International Law P 230

قسم کے دشمنوں میں امتیاز کرتا ہے، اس کے نزدیک تباہ کاری کے لئے جب [illegible] "مہذب" دشمن کے لئے ہے، رہا بیچارہ "غیر مہذب" تو اس کو تباہ و برباد کرنے کا حق مہذب قوموں کے لئے محدود ہے، پروفیسر لارنس صاف تصریح کرتا ہے:-

"وحشی یا نیم وحشی قوموں سے جنگ کرتے وقت واٹل (Vattel) کے پہلے استثناء پر عمل کیا گیا ہے، عام طور پر یہ فرض کیا گیا ہے کہ وحوش و بربرہ کے مواشی کو ہانک لیجانا، ان کی فصلوں کو تباہ کردینا، ان کے جھونپڑوں اور جھونپڑیوں میں آگ لگا دینا، ان کے نفوس پر نہایت وسیع اثر پیدا کرتا ہے، اگر یہ تباہ کاری [illegible] کے ذریعہ کیجائے، اور اس کے ناگہانی نتیجہ کے طور پر بہت سے باشندے بھی ہلاک ہو جائیں تو اس سے ایسا گہرا اور پائدار اثر پیدا ہوگا کہ اس قوم کے بقیۃ السیف افراد کے دلوں میں سفید فام انسان کے عدل و طاقت کے برقرار رہنے والے احساس کا نشوونما پانا یقینی ہے۔"[1]

غیر جانبداروں کے حقوق و فرائض، اب مغربی قوانین جنگ میں صرف ایک غیر جانبداری کا قانون رہ گیا ہے، جس کا ذکر کرنا باقی ہے، اس پر تبصرہ کرنے کے بعد ہم اس حصہ باب کو ختم کردیں گے،

غیر جانبداری کی تاریخ، مغربی اقوام میں غیر جانبداری کا تصور بہت قریبی عہد کی پیداوار ہے، اب سے دو صدی قبل تک ان کے ذہن میں اس کا کوئی تصور نہیں تھا، یا اگر تھا تو وہ غیر مکمل تھا، یہی مغربی زبانوں میں اس مفہوم کو ادا کرنے کے لئے کوئی لفظ بھی موجود نہ تھا، گروشیوس اس کو لفظ "میڈی" (Medii) سے ادا کرتا ہے، اور بائنکرشوک اس کے لئے لفظ "غیر معاند" ([illegible]) وضع کرتا ہے، سترہویں صدی کے آخر میں جرمن اور انگریزی زبانیں لفظ "نوترال" (Neutral) اور نیوٹرل (Neutral) سے پہلی مرتبہ آشنا ہوئیں، اور اٹھارہویں صدی کے وسط میں واٹل نے اسکو بین الملی قانون میں رواج دیا، سولہویں اور سترہویں صدی تک یورپ میں غیر جانبداری کی حالت کو ناممکن اور خطرناک سمجھا جاتا تھا، اور عملاً اس کا کوئی

---

[1] Lawrence, P. 241-42

صحیح مفہوم ہی نہ تھا. فلارنس کا مدبر میکیاویلی (Machiavelli) ایک حکمراں کے لئے ضروری قرار دیتا ہے، کہ جب اس کے ہمسایوں میں کبھی لڑائی ہو تو وہ ایک نہ ایک فریق کے ساتھ شریک ہوجائے، اس کے ایک صدی بعد گروٹیوس بھی یہ مشورہ دیتا ہے، کہ ایک حکمراں کو محارب فریقین میں سے اس کا ساتھ دینا چاہئے جسکو وہ حق پر دیکھے، اور اسکی مخالفت کرنی چاہیے جو ناحق پر ہو، البتہ جب یہ تمیز مشکل ہوجائے کہ کون حق پر ہے اور کون ناحق پر، تو اس صورت میں اسکو "دونوں سے یکساں سلوک کرنا چاہئیے، عملی حیثیت سے بھی اٹھارہویں صدی کے خاتمہ تک غیر جانبداروں کے حقوق و فرائض کچھ نہ تھے، محارب قوتیں لڑتے لڑتے ان کے حدود میں بے تکلف تجاوز کرجاتی تھیں، اور غیر جانبدار طاقتیں بھی جس فریق سے ہمدردی رکھتیں اسکو امداد پہونچانے میں دریغ نہ کرتی تھیں، قانون کے اس شعبہ میں حقوق و فرائض اور حدود و قیود مقرر کرنے کی ابتدا ۱۷۹۴ء سے ہوئی جبکہ امریکن کانگریس نے پہلی مرتبہ امریکن رعایا کے لئے ان محاربین کی جنگی خدمت کرنا ممنوع قرار دیا جس سے حکومتِ امریکہ برسرِ جنگ نہ ہو، اس کے بعد اس شعبہ میں قانون سازی کا سلسلہ برابر جاری رہا، یہاں تک کہ ۱۸۱۸ء میں غیر جانبداروں کا ایک پورا ضابطہ قانون وضع ہوگیا، ۱۸۱۹ء میں برطانیہ عظمی نے امریکہ کی تقلید کی، اور کانگریس کے بنائے ہوئے قوانین اپنی کتاب آئین میں منتقل کرلئے، اس کے بعد دوسری سلطنتوں نے بھی اسی قسم کے قوانین اپنے ہاں رائج کئے، اور انیسویں صدی کے اندر تمام مغربی سلطنتوں میں غیر جانبداری کے قوانین بن گئے، تاہم صحیح معنوں میں غیر جانبداری کا بین الملّی قانون ۱۹۰۷ء کی ہیگ کانفرنس میں وضع کیا گیا، کیونکہ اسی میں پہلی مرتبہ دولِ مغرب نے مل کر غیر جانبداروں کے حقوق و فرائض متعین کئے۔

موجودہ زمانہ میں غیر جانبداروں کی حیثیت، لیکن یہ عجیب بات ہے کہ بیسویں صدی میں غیر جانبداری کا قانون پایۂ تکمیل کو پہونچا اور بیسویں ہی صدی میں اس پر سکراتِ موت بھی طاری ہوگئی، دوسری ہیگ کانفرنس کو قانون سازی کا کام ختم کئے ابھی سات سال بھی نہ ہوئے تھے کہ یورپ میں عالمگیر جنگ شروع ہوئی، اور اس نے غیر جانبداری کے پورے

ا؎ Lawrence, P. 475-7

قانون کی دھجیاں اڑادیں، ۱۹۱۴ء کی جنگ عظیم میں غیر جانبداروں کا کوئی حق ایسا نہ تھا جو
کے ساتھ پامال نہ کیا گیا ہو، انکی زمینوں پر تجاوز کیا گیا، ان کے جہاز ڈبوئے گئے، ان کی تجارت
برباد کی گئی، ان کی تلاشیاں لی گئیں، ان کو گرفتار کیا گیا، غرض یہ کہ ان کے ساتھ وہ سب کچھ
کیا گیا، جو محاربین کے ساتھ کیا جاتا ہے، حتیٰ کہ یہ امر بھی مشکوک ہوگیا کہ آیا فی الواقع غیر جانبداروں
کا کوئی حق بھی ہے یا نہیں، پھر اسی پر بس نہیں خود غیر جانبداری کی حقیقت بھی بڑی حد تک مشکوک
ہوگئی، چونکہ جنگ اب صرف فوجی جنگ نہیں رہی ہے، بلکہ اس سے زیادہ اقتصادی جنگ
ہوگئی ہے، اس لئے یہ سوال پیدا ہوگیا ہے کہ جو طاقت دشمن کے ساتھ تجارتی تعلقات رکھتی
ہو، اسکو مایحتاج بہم پہونچاتی ہو، اور اسکی اقتصادی زندگی کے لئے بقا و استحکام کے وسائل فراہم
کرتی ہو، کیا وہ فی الواقع غیر جانبدار ہے؟ اور کیا وہ جائز طور پر اپنے اس کام کے لئے آزادانہ
حقوق کا مطالبہ کرسکتی ہے؟ اس مسئلہ نے غیر جانبداری کی عین بنیاد پر ایک کاری ضرب لگائی
ہے، اور یہ واقعہ ہے کہ بین الملی قانون اب تک یہ فیصلہ نہیں کرسکا ہے کہ ان جدید مسائل کی
روشنی میں غیر جانبداروں کے کیا فرائض مقرر کرے، اور ان کو کیا حقوق دلوائے۔

یہ حالات کا ایک مبالغہ آمیز تخمینہ نہیں ہے، بلکہ ٹھیک یہی خیالات ہیں جو بین الملی قانون
کے علماء کو پریشان کئے ہوئے ہیں، پروفیسر ہولڈ نے اپنی کتاب "بین الملی قانون کا ارتقاء
جنگ عظیم کے بعد" میں اس پر تفصیل سے بحث کی ہے، اور اکابر علمائے قانون کے خیالات
سے استشہاد کیا ہے، ذیل میں ہم اس سے الینسٹر باخر کے خیالات نقل کرتے ہیں وہ لکھتا ہے:

"موجودہ جنگ نے غیر جانبداروں کی حیثیت بہت زیادہ خراب کردی ہے،
ان کے بہت سے حقوق پر اس کثرت سے ساتھ دست درازی کی گئی ہے کہ
اب مشکل ہی سے یہ خیال کیا جاسکتا ہے کہ وہ فی الواقع قانون میں موجود بھی
ہیں یا نہیں؟ چونکہ اب وہ ضرورت سے زیادہ پامال ہوچکے ہیں، اس لئے آئندہ
جنگوں میں انکو زیادہ عرصہ تک تسلیم نہیں کیا جائیگا، حق اور لغت کے نئے
عقائد نے پرانے حقوق کو الگ پھینکدیا ہے، اور جو رخنہ پڑ گیا ہے اسکی
تلافی ہے، پہلے قوانین، اور خصوصاً اقرارنامہ پیرس کے قانون بحری کی دفعہ ۲

کو بین الملّتی قانون میں جو پوزیشن حاصل تھی، اس پر اب ایک انقلابی تشکیل جدید کے عمل نے ایک نئے غیر نوشتہ قانون کو مسلط کر دیا ہے، اور یہ ایسا قانون ہے جو غیر جانبدار حکومتوں کی زندگی پر بہت زیادہ گہرے حملوں کو جائز رکھتا ہے[۱]"

آگے چل کر یہ مصنف پھر لکھتا ہے:-

"دنیا میں عالمگیر جنگوں کا دور شروع ہو چکا ہے، اور ہر بڑی طاقت کو یہ یقین رکھنا چاہئے کہ وہ ان میں ضرور کھینچی جائیگی، بین الملّتی قانون، آخر الامر بڑی قوموں کی خواہش ہی پر قایم ہے، کیونکہ ان کی مدد کے بغیر بین الملّتی قانون کا کوئی حکم قائم نہیں رہ سکتا، لہٰذا ایسے زمانہ میں جبکہ غیر جانبداروں کا ناقابلِ تعدی ہونا، بڑی قوموں کی اکثریت کو ایک ناگوار قید معلوم ہو رہا ہے، اگر بین الملّتی میں بھی غیر جانبداروں کی پوزیشن روز بروز خراب ہوتی جائے تو کچھ جائے تعجب نہیں ہے[۲]"

اس بیان سے معلوم ہو جاتا ہے کہ مغربی قانون میں حیادت و غیر جانبداری کی حیثیت کیا ہے، اب ہم غیر جانبداری کے قانون کی تفصیلات و جزئیات پر نظر ڈال کر دیکھیں گے کہ یہ قانون من حیث ہو قانون کس حد تک مکمل اور پائدار ہے، اور اسلامی قانون کے مقابلہ میں اسکی کیا حیثیت ہے،

محاربین کے فرائض غیر جانبداروں کے متعلق، ہیگ کی مفاہمت ۵ اور ۱۳ کی رو سے بری اور بحری جنگ میں غیر جانبداروں کے متعلق محاربین کے جو فرائض مقرر کئے گئے ہیں، وہ حسب ذیل ہیں:-

(۱) غیر جانبدار سلطنت کے حدود میں کسی قسم کی جنگی کارروائی نہ کیجائے،

(۲) محاربین کے لئے ممنوع ہے کہ اپنی فوجیں یا سامانِ جنگ و سامانِ رسد غیر جانبدار علاقہ سے گزار کر لیجائیں،

(۳) غیر جانبدار علاقہ کو جنگی تیاریوں کے لئے "قاعدہ" (Base) نہیں بنایا جا سکتا

---

[۱] Ibid. P. 146 [۲] Nippold. P. 145

وہاں فوجوں کو آراستہ کرنا یا جنگی قوتوں کو مرتب کرنا یا ایسی ہی دوسری کارروائیاں کرنا ممنوع ہے۔

(۵) غیر جانبدار علاقہ یا پانی میں گھس کر دشمن کو گرفتار کرنا یا اس پر حملہ کرنا حقوقِ غیر جانبداری پر تعدی ہے، جس سے احتراز واجب ہے،

(۶) محاربین کا فرض ہے کہ ایک غیر جانبدار سلطنت اپنے فرائضِ غیر جانبداری ادا کرنے کے لئے جو قوانین وضع کرے انکی وہ پابندی کریں،

(۷) اگر کبھی دانستہ یا نادانستہ کسی غیر جانبدار سلطنت کے حقوق پر تعدی ہوجائے تو تعدی کرنے والے فریق کا فرض ہے کہ اسکی تلافی کرے،

یہ تمام فرائض فروع ہیں، اس ایک اصل کی کہ "غیر جانبدار سلطنت کے حدود مقدس و ناقابلِ اعتدا ہیں"، اور یہ اصل بعینہٖ اسلام میں موجود ہے، اسلامی قانون کے اصول میں سے ایک یہ بھی ہے کہ جس قوم سے دولت اسلامیہ کی مسالمت ہو، اور جو جنگ میں اسلام اور مسلمانوں کے خلاف کسی قسم کا حصہ نہ لے اس کے حدود پر کسی قسم کا تجاوز نہیں کیا جاسکتا، اگر دشمن لڑتے لڑتے اس کے ملک میں جا پہونچے تو اسکا تعاقب نہیں کیا جاسکتا، دشمن کے جو افراد اس کے ملک میں مقیم ہوں ان پر کوئی حملہ نہیں کیا جاسکتا، بلکہ مجموعی طور پر دورانِ جنگ میں اس کے افراد سے یا اس کے حدودِ سلطنت سے ہر قسم کا تعرض قطعاً حرام ہے[1]،

غیر جانبداروں کے فرائض محاربین کے متعلق

جدید بین الملی قانون غیر جانبداروں پر محارب فریقین کے متعلق جو فرائض عاید کرتا ہے وہ حسب ذیل ہیں:۔

(۱) کسی محارب فریق کو جنگ میں مسلح امداد نہ دینا، اور فریقین کے ساتھ یکساں سلوک کرنا،

یہ غیر جانبداری کا بنیادی فرض ہے، اور اس کے عین مفہوم میں اسطرح داخل ہے کہ غیر جانبداروں کا تصور اس چیز کے تصور کے بغیر ذہن میں قائم ہی نہیں ہوسکتا،

(۲) محاربین میں سے کسی کو یا دونوں کو آلاتِ جنگ اور روپیہ فراہم نہ کرنا،،

اس کا مطلب یہ ہے کہ دورانِ جنگ میں ایک غیر جانبدار سلطنت کو کسی محارب کے ہاتھ اسلحہ و آلاتِ جنگ فروخت نہ کرنے چاہئیں، اور نہ اسے قرض دینا چاہئے، لیکن یہ امر مشکوک

[1] تفصیل کے لئے دیکھو اس کتاب کا باب پنجم، عنوان "غیر جانبداروں کے حقوق"،

ہے کہ اس فرض کے حدود عمل کیا ہیں؟ اسلحہ و آلاتِ جنگ کی فروخت کا ایک طریقہ تو یہ ہے کہ ایک سلطنت خاص طور پر ایک محارب فریق سے معاملہ کرے "اور دوسرا طریقہ یہ ہے کہ وہ اپنے ذخائرِ حرب کا عام نیلام کرے جسمیں دوسرے خریداروں کی طرح محاربین کے ایجنٹ بھی ہوں، پہلا طریقہ تو بالاتفاق ممنوع ہے، لیکن دوسرے طریقہ کے ممنوع ہونے میں اختلاف ہے اور ایسی نظائر موجود ہیں کہ بڑی بڑی سلطنتوں نے اسکو جائز رکھا ہے، چنانچہ ۱۸۷۰ء کی جنگِ جرمنی و فرانس کے زمانہ میں حکومت امریکہ نے اپنے ذخائرِ حرب کا نیلام کیا اور اس میں سے حکومتِ فرانس کے ایجنٹوں نے ایک بہت بڑی مقدار خرید کر فرانس بھیجی جو جنگ میں کام آئی، اس پر جب اعتراض اٹھا تو امریکہ کی مجلس الشیوخ نے تحقیقات کے لئے ایک کمیٹی مقرر کی، اور اس کمیٹی نے یہ رپورٹ کی کہ "اگر خود حکومت فرانس کا رئیس بھی خریداروں میں موجود ہوتا تو اس کے ہاتھ سامان بیچنا ناجائز نہ ہوتا، کیونکہ نیلام، عام تھا اور محاربین کے درمیان کوئی امتیاز نہ تھا" اس فیصلہ سے جائز اور ناجائز میں بہت ہی کم فرق رہجاتا ہے، اور وہ فائدہ باقی نہیں رہتا جس کے لئے غیر جانبداروں پر یہ فرض عاید کیا گیا ہے،

اس فرض کا دوسرا حصہ جو روپیہ کی امداد سے متعلق ہے، اسکی بھی دو صورتیں ہیں، ایک یہ سلطنت خود کسی محاربِ فریق کو قرضہ یا عطیہ دے، دوسری صورت یہ ہے کہ غیر جانبدار سلطنت کی رعایا اسکو امداد دے، پہلی صورت بالاتفاق ممنوع ہے، مگر دوسری صورت میں اختلاف ہے اور عام تعامل یہی ہے کہ غیر جانبدار سلطنتوں کے صرافہ سے محاربین نہایت آزادی کے ساتھ قرض حاصل کرتے ہیں، ۱۸۹۴ء کی جنگِ چین و جاپان، ۱۹۰۴ء کی جنگِ روس و جاپان، ۱۹۱۱ء کی جنگ اٹلی و ترکی اور ۱۹۱۲ء کی جنگِ بلقان میں فریقین نے غیر جانبدار سلطنتوں کی رعایا سے نہایت آزادی کے ساتھ قرضوں اور عطیوں کی صورت میں امداد حاصل کی، ۱۸۲۳ء میں حکومتِ انگلستان نے ماہرینِ قانون بین الاقوام سے یہ سوال کیا تھا کہ "آیا ایک غیر جانبدار سلطنت کے فرائض میں یہ بھی داخل ہے کہ وہ اپنی رعایا کو محاربین کی مالی اعانت سے باز رکھے؟ اس کے جواب میں لارڈ لینڈہرسٹ (Lyndhurst) نے لکھا کہ "مصنفین کا اجماع اس پر ہے کہ

Wharton, International Law of the united states P 391

یہ حق غیر جانبداری کے نواقض میں سے نہیں سمجھا[1] ، اس طرح بین الملی قانون نے قوم اور حکومت میں امتیاز پیدا کر کے حکومت کو تو غیر جانبداری کے احترام کا مکلف قرار دیا ہے مگر قوم کو پوری آزادی دی ہے کہ محاربین میں سے کسی ایک یا دونوں کے ساتھ جنگ میں تعاون کرے، ظاہر ہے کہ اس صورت سے یہ فرض بالکل بے معنی ہو جاتا ہے، کیونکہ ایک سلطنت کے مالی و اقتصادی وسائل جب محاربین کی خدمت کے لئے وقف ہوں تو غیر جانبداری کا عدم و وجود برابر ہے،

(۴) محاربین کی فوجوں کو اپنے علاقہ سے نہ گذرنے دینا،

یہ فرض بہت بعد کی پیداوار ہے، سلطنتوں کا عمل اور مصنفین کی آراء دونوں کا میلان بیسویں صدی تک اس جانب رہا ہے کہ محاربین کو راستہ دینا جائز ہے، سترھویں صدی کا مصنف گروٹیوس لکھتا ہے کہ " محاربین کو غیر جانبدار علاقہ سے فوج گذارنے کا حق پہونچتا ہے، اور اگر یہ حق دینے سے بلا کسی معقول وجہ کے انکار کیا جائے تو اسے بجبر بھی حاصل کیا جا سکتا ہے[2] "

اٹھارہویں صدی کا مصنف واٹل لکھتا ہے کہ " محارب اپنے غیر جانبدار ہمسایہ سے اپنی فوجوں کے لئے راستہ مانگ سکتا ہے، لیکن شدید ضرورت کے بغیر اسکو جبراً حاصل نہیں کر سکتا[4] "
وہٹن (WHEATON) جس کی کتاب " بین الملی قانون " ۱۸۳۶ء میں شایع ہوئی ہے، اس حق کو تسلیم کرتا ہے، مگر غیر جانبدار سلطنت کی مرضی کے خلاف اسے حاصل کرنے کو جائز نہیں رکھتا[2] ، میننگ (Manning) جس کی کتاب " قانون اقوام " ۱۸۳۹ء میں شائع ہوئی ہے اس قسم اجازت دینے کو غیر جانبداری کے نواقض میں شمار نہیں کرتا، بشرطیکہ دونوں فریقوں کو یکساں اجازت دیجائے[3] ، البتہ ہال (Hall) جو ۱۸۸۰ء کا مصنف ہے اسکو ناجائز قرار دیتا ہے، اور اس کے قریب العہد مصنفین بھی اس کے عدم جواز کے قائل ہیں۔

یہی حال سلطنتوں کے تعامل کا ہے، ۱۸۱۵ء میں آسٹریا نے جنوب مشرق فرانس پر

---

1. Halleck, International Law P. 110, 195-197
2. International law P 437 3. Lawrence, P. 525
4. Law of Nation, ch.11

حملہ کرنے کے لئے سوئزرلینڈ کے علاقہ سے زبردستی راستہ حاصل کیا[1]، ۱۸۴۶ء میں میکسیکو کی فوجوں
نے امریکہ کے علاقہ میں گھس کر اپنے دشمنوں سے جنگ کی[2]، اسی سال جنگ ترکی و روس میں حکومت
روس نے حکومت رومانیا سے سمجھوتہ کیا کہ وہ روسی فوجوں کو یوروپین ترکی پر حملہ کرنے کے لئے
رومانوی علاقہ سے گذرنے کی اجازت دیدے، چنانچہ دورانِ جنگ میں تقریباً پانچ لاکھ روسی
فوج رومانوی علاقہ سے گذری اور اس نے رومانیہ کی ریلوے، اور خطوطِ مواصلات کو آزادی
کے ساتھ استعمال کیا[3]، سب سے بڑی روشن مثال ہمارے موجودہ عہد کی ہے، ۱۹۱۴ء کی جنگ عظیم
میں جرمنی نے بلجیم سے زبردستی راستہ حاصل کیا، اور حکومتِ بلجیم کی مزاحمت کے باوجود جرمن فوجیں
بلجیکی علاقہ سے گذریں، اگرچہ اس آخری فصل کو غیر جانبداری کے حقوق پر صریح اعتداء سے تعبیر
کیا جاتا ہے، لیکن واقعات کی رفتار بتا رہی ہے کہ آیندہ جنگ میں جب بھی طاقتور سلطنتوں
کے سامنے موت وحیات کا نازک مسئلہ پیش ہوگا تو وہ کمزور ہمسایہ سلطنتوں کو راستہ دینے پر
ضرور مجبور کریں گی، اس لئے یہ قیاس غلط نہیں ہے کہ بین الملی قانون اب پھر اس نظریہ
کی طرف رجوع کرنے والا ہے، جو ہال سے پہلے کے مصنفین پیش کرتے رہے ہیں،

(۴) محاربین کو اپنے حدود میں جنگی مہمیں طیار کرنے یا جنگی جہاز آراستہ کرنے کی
اجازت نہ دینا،

یہ فرض غیر جانبداری کے ضمنی فرائض میں سے ہے، اور غالباً پہلی مرتبہ ۱۸۷۱ء کے
معاہدۂ واشنگٹن سے پیدا ہوا ہے، اس سے قبل غیر جانبدار سلطنتوں کے حدود میں جنگی طیاریوں
کی مثالیں بکثرت ملتی ہیں،

(۵) اپنی رعایا کو محاربین کی فوج میں بھرتی ہونے سے روکنا،

یہ فرض بھی غیر جانبداری کے ضمنی فرائض میں سے ہے، اور اس کے مفہوم میں داخل
ہے، لیکن مغرب میں اسکا تصور بہت قریبی عہد سے تعلق رکھتا ہے، ۱۷۹۳ء کی جنگ انگلستان

---

[1] Wheaton, International law P.P 418 - 419

[2] Wheaton International law of the U.S.A. PP 397

[3] Fyffe Modern Europe; II; 497

(فرانس میں امریکہ کے باشندے بکثرت فرانسیسی فوج میں جاجاکر بھرتی ہوئے، یونان کی جنگ آزادی
میں لارڈ بائرن کی زیر قیادت سینکڑوں انگریزوں نے ٹرکی کے خلاف جاکر جنگ کی، ۱۸۷۶ء کی بغاوت
سرویا میں روسی رعایا کے ہزارہا افراد ٹرکی کے خلاف لڑنے گئے، سوئٹزرلینڈ تو ۱۸۵۹ء تک تو عد
بھرتی کا میدان بنا رہا، اور محارب سلطنتیں ہمیشہ اس سے رنگروٹ حاصل کرتی رہیں، انیسویں صدی
کے آخری ایام میں غیر جانب داری کے قانون کا یہ شعبہ پایہ تکمیل کو پہونچا اور ماہرین قانون
بین الملل نے بالاتفاق یہ فتویٰ دیا کہ اس قسم کی بھرتی کی اجازت دینا غیر جانبداری
کے لئے ناقض ہے،

یہ ان فرائض کا خلاصہ ہے جو بین المللی قانون غیر محاربین پر عاید کرتا ہے، ان کی تفصیلات
میں جو کچھ کمزوریاں ہیں، وہ صفحات بالا میں بیان کی جاچکی ہیں، تاہم ان سب کا اصل الاصول صرف
ایک فرض ہے اور وہ یہ کہ "غیر جانبدار قوم کو جنگ میں کسی فریق کی معاونت نہ کرنی چاہئے، اور نہ ایسا
فعل کرنا چاہئے جو معاونت کی حد تک پہونچتا ہو،" یہ اصل الاصول بعینہٖ اسلام کے قانون میں موجود
ہے، اسلامی قانون میں غیر جانبدار کی تعریف یہ ہے کہ الذی لم یظاھر علینا احداً ولم ینقصنا
شیئاً، یعنی وہ ہمارے خلاف کسی کی مدد نہ کرے اور نہ ہمارے (حق میں) کوئی کمی کرے۔ اس اصل سے
فروع خود نکالی جاسکتی ہیں، ہر وہ فعل جو "مظاہرۃ" اور "نقص" کی تعریف میں آتا ہو، غیر جانبداری کیلئے
ناقض ہے، اور اس سے احتراز کرنا غیر جانبدار کا فرض ہے،

آخری تبصرہ

یہ باب اُمید سے زیادہ طویل ہوگیا ہے لیکن اسے ختم کرنے سے پہلے ضروری ہے کہ پچھلے مباحث
پر ایک آخری تبصرہ کرکے واضح کردیا جائے کہ اسلامی قانون کس حیثیت سے مغربی قوانین پر ترجیح
کا حق رکھتا ہے، اگر گذشتہ اوراق آپکے ذہن میں محفوظ ہیں تو مباحث کو دوبارہ نقل کرنے کی حاجت
نہیں صرف وجوہ ترجیح کی طرف اشارہ کردینا کافی ہے،

اولاً، بین المللی قانون فی الحقیقت کوئی "قانون" ہی نہیں ہے، وہ اپنے اصول و فروع

لے تفصیل کے لئے دیکھو اس کتاب کا باب پنجم، عنوان: غیر جانبداروں کے حقوق۔

کے لحاظ سے کلیتہً سلطنتوں کی مرضی کے تابع ہے، وہ جس طرح چاہتی ہیں اپنے مصالح و اغراض
کے مطابق اسکو بناتی اور بدلتی ہیں، اور جس چیز کو سب یا چند بڑی سلطنتیں پسند نہیں کرتیں، وہ اجزاء
قانون ہی نہیں رہ سکتی، اس طرح در اصل قانون یہ فیصلہ نہیں کرتا کہ دول کا طرزِ عمل کیا ہونا چاہیے
بلکہ دول خود یہ فیصلہ کرتی ہیں کہ قانون کیا ہونا چاہیے؟ بخلاف اس کے اسلام کا قانون صحیح مع
میں ایک "قانون" ہے، اسکو ایک بالاتر قوت نے وضع کیا ہے، مسلمانوں کو اسمیں حذف و ترمیم کا
کوئی حق نہیں دیا گیا، وہ صرف اس لئے وضع کیا گیا ہے کہ جو اسلام کے متبع ہوں وہ اسکی بے چون و
چرا پابندی کریں، اور جو اسکی پابندی نہ کریں وہ قانون شکن اور نافرمان قرار دیئے جائیں، اہل مغرب
اگر اپنے بین الملی قانون کی خلاف ورزی کریں تو وہ سرے سے قانون ہی نہیں رہتا، لیکن مسلمان
اگر سب ملکر بھی اسلام کے خلاف عمل کریں تب بھی اسلامی قانون بجائے خود قایم رہتا ہے،

ثانیاً، بین الملی قانون کا وہ شعبہ جس کو قانونِ جنگ کہا جاتا ہے، اصل بین الملی قانون
سے بھی زیادہ ناپائدار اور ناقابلِ اعتماد ہے، ضروریاتِ جنگ سے اسکا ہر وقت تصادم ہوتا
رہتا ہے، اور وہ ہمیشہ اسکو مغلوب کرتی رہتی ہیں، پھر فوجی اور قانونی گروہوں کے اختلافات
اسکو اور بھی زیادہ کمزور کر دیتے ہیں، ایک چیز جسکو قانونی گروہ قانون میں داخل کرتا ہے، فوجی گروہ اسی کو
خارج کر دیتا ہے، ایک مہذب قاعدہ جسکو قانونی گروہ وضع کرتا ہے، فوجی گروہ اسی کو قبول کرنے سے انکار
کر دیتا ہے، اور چونکہ عمل کی تمام قوتیں فوجی گروہ کے ہاتھ میں ہوتی ہیں اسلئے کتابوں میں لکھا ہوا قانونِ جنگ کتابوں میں
دھرا رہتا ہے اور اصلی قانونِ جنگ وہ ہوتا ہے جسکو فوجیں خود اپنے عمل سے میدانِ جنگ میں وضع کرتی ہیں، اسکے
مقابلہ میں اسلام کا قانونِ جنگ پورے اسلامی قانون کی طرح ایک پختہ اور ناقابلِ تغیر قانون
ہے، اسمیں جنگی ضروریات کی رعایت ملحوظ رکھکر جو قواعد و ضوابط مقرر کر دیئے گئے ہیں انکو اب
کوئی نہیں بدل سکتا، کسی اسلامی فوج یا جنرل کو یہ حق نہیں دیا گیا کہ اسمیں کسی قسم کی ترمیم و
تنسیخ کرے، یا اسکی کسی چیز کو ماننے سے انکار کرے،

ثالثاً، بین الملی قانونِ جنگ کی بنیاد لڑنے والوں کی باہمی مفاہمت پر رکھی گئی ہے، چند
سلطنتیں آپس میں ملکر طے کر لیتی ہیں کہ جب ہم آپس میں لڑیں گے تو فلاں فلاں قواعد کی
پابندی کریں گے، اس مفاہمت میں جو قومیں شریک نہیں ہیں ان سے جنگ ہونے کی صورت

میں اس قانون پر عمل نہیں ہوگا، جو قومیں اس مفاہمت سے الگ ہو جائیں، وہ بھی اس قانون کے حدود سے نکل جائیں گی، اور انھیں بھی مہذب قوموں کے مہذب سلوک کا استحقاق باقی نہیں رہیگا، یہی نہیں بلکہ خود مفاہمت کے شرکا میں سے بھی اگر کوئی مفاہمت کی خلاف ورزی کرتا ہے تو باقی شرکا اس سے بری الذمہ ہو جاتے ہیں، اور آخر الامر اس قانون شکنی سے خود قانون ہی بدل جاتا ہے، اس طرح یہ قانون کسی اخلاقی فرض کے احساس پر قائم نہیں ہے، بلکہ محض مبادلہ اور باہمی مراعات پر قائم ہے، ایک فریق جنگ دوسرے فریق جنگ سے اس لئے مہذب سلوک نہیں کرتا کہ اسے بذاتِ خود ایسا کرنا چاہئے، بلکہ اس شرط کے ساتھ کرتا ہے کہ اگر اس کے ساتھ مہذب سلوک کیا گیا تو وہ بھی مہذب سلوک کریگا، اور اگر نہ کیا گیا تو نہیں کریگا یہ مفاہمت اسلام میں نہیں ہے، اس نے جو قوانین وضع کئے ہیں، انکی پابندی ہر مسلمان ہر حال میں مجبور ہیں، خواہ غیر مسلم اس کے معاوضہ میں انکے ساتھ مہذب سلوک کریں یا نہ کریں اسلامی قانون کسی مسلمان کا یہ حق تسلیم نہیں کرتا کہ وہ کسی حال میں انکی پابندی سے بری الذمہ ہو جائے جسے مسلمان رہنا ہے اسکو بہر حال اس قانون کی سیادت تسلیم کرنا ہے،

رابعًا، مغرب کے مہذب قوانین کو وجود میں آئے آج نصف صدی سے زیادہ عرصہ نہیں گذرا ہے، حالانکہ اسلامی قانون ساڑھے تیرہ سو برس سے دنیا میں تہذیب کا علم بلند کئے ہوئے ہے، اتنے بڑے تفاوتِ زمانی کے باوجود، جہاں تک اصول کا تعلق ہے مغربی قانون نے اسلامی قانون پر ایک حرف کا اضافہ نہیں کیا ہے، اور فروع میں بھی ان عملی جزئیات کو مستثنیٰ کرکے جن کا تعلق ہر زمانہ کے وقتی حالات سے ہے، اسلامی قانون سے مغربی قانون کسی طرح بڑھا ہوا نہیں ہے، بلکہ اکثر پہلوؤں سے اسلام اب بھی مغربی قانون کے مقابلہ میں فوقیت رکھتا ہے؛

خامسًا، مغربی تہذیب نے انسان کو چند عملی قوانین کا پابند بنا کر آزاد چھوڑ دیا ہے کہ اپنی قوت کو جہاں چاہے اور جس غرض کے لئے چاہے، استعمال کرے، وہ اس سے صرف یہ مطالبہ کرتی ہے کہ جب کسی کو مارے تو فلاں طریقوں سے مارے، اور فلاں طریقوں سے نہ مارے باقی رہا یہ سوال کہ کس غرض کے لئے مارے اور کس کے لئے نہ مارے، اس سے وہ کوئی تعرض

نہیں کرتی، اور جہاں تک مہذب قوموں کا عمل بتاتا ہے، اس سے ہم یہ نتیجہ اخذ کر سکتے ہیں کہ مغربی تہذیب ملک گیری، توسیع تجارت، حصول مال وجاہ، جہانگیرانہ لوٹ مار، غرض تمام حیوانی خواہشات کے لئے جنگ کرنا جائز رکھتی ہے، بخلاف اس کے اسلام اپنے پیرؤں کو صرف لڑنے کے مہذب طریقوں ہی کا پابند نہیں بناتا بلکہ ان کو یہ بھی بتاتا ہے کہ فلاں فلاں مقاصد کے لئے تم جنگ کر سکتے ہو، اور فلاں مقاصد کے لئے نہیں لڑ سکتے، اس مسئلہ کو اس نے انسان کی اپنی ذاتی پسند پر نہیں چھوڑا ہے، بلکہ اسکو مخصوص اخلاقی حدود کا پابند بنا دیا ہے، جن سے نکلنے کا اسکو حق نہیں دیا،

یہ وجوہ ہیں جنکی بنا پر اسلام کا قانونِ جنگ، مغرب کے قانون کے مقابلہ میں زیادہ صحیح، زیادہ مفید، زیادہ معقول، اور زیادہ مضبوط ہے،

(یہاں یہ اعتراض ہو سکتا ہے کہ مغرب کے معاملہ میں تو تم مغربی قوموں کے عمل کو دیکھتے ہو مگر اسلام کے معاملہ میں مسلمانوں کے عمل کو نہیں دیکھتے بلکہ محض اسلامی قانون کو دیکھتے ہو، لیکن گذشتہ مباحث کو بغور دیکھنے سے یہ اعتراض خودبخود رفع ہو جاتا ہے، واقعہ یہ ہے کہ اسلامی قانون اور مسلمانوں کا عمل دو بالکل الگ چیزیں ہیں، اور قانون سازی میں مسلمانوں کے عمل کو کوئی دخل نہیں ہے، اس لئے جب قانون کے حسن و قبح پر بحث ہو تو عمل کا سوال قدرتی طور پر خارج از بحث ہونا چاہئے، برعکس اس کے مغربی قانون اور مغربی قوموں کا عمل دو مختلف چیزیں نہیں ہیں، صرف یہی نہیں کہ قانون سازی میں ان قوموں کے عمل کو خاص دخل حاصل ہے، بلکہ اوپر یہ ثابت کیا جا چکا ہے کہ جہاں تک قانونِ جنگ کا تعلق ہے، مغربی قوموں کا عمل آگے آگے چلتا ہے، اور قانون کو اسکی پیروی کرنی پڑتی ہے، اس لئے ہم مغرب کے معاملہ میں عمل کو مقدم رکھنے پر مجبور ہیں)

غلط نامہ

افسوس ہے کہ کتاب کے بعض حصوں میں بکثرت غلطیاں رہ گئی ہیں اس لئے ناظرین پڑھنے سے پہلے اس غلط نامے کے مطابق ان کی اصلاح کرلیں :-

صفحہ	سطر	غلط	صحیح	صفحہ	سطر	غلط	صحیح
۱	۳	اگرچہ	اگر	۳۱	۱۳	قبضہ کریں	قبضہ کرینگے
۱	۱۱	چین وآرام	عیش وآرام	۳۱	۲۱	اگرتم کمزور نہ تھے	اگرتم کمزور ہی تھے
۲	۹	اگر	مگر	۳۶	۷	ڈگڑ بگڑ	ڈگر ڈگر
۳	۴	زیادہ سے زیادہ یہ کہ	×	۴۶	۸	فانظرھم	قاتلوھم
۳	۱۵	گرفتار کیا گیا	گرفتار کیا گیا تھا ،	۴۷	۱۲	قتل کے جائینگے	قتل کئے جائینگے
۲	۱۶	منسوب کئے گئے	منسوب کئے گئے تھے	۴۷	۱۶	کوبنا	کوابنا
۴	۴	کی گئی ہے ،	کی گئی	۴۹	۳	خار	غار
"	"	گاندھی	مہاتما گاندھی	۴۹	۱۰	اخراب	احزاب
۷	۱۱	ان میں سے ایسے ہیں	ان میں سے بہت ایسے ہیں	۵۱	۱۱	قاعدہ	باقاعدہ
۸	۶	تحیہ وسلام	تحیۃ وسلام	۵۱	۲۲	پکڑ منگایا	پکڑوا منگایا
۱۵	۴	مجتنب کہنے میں	مجتنب رکھنے میں	۵۲	۵	عزنیوں	عُرینوں
۱۶	۲۱	بدویں	بدرویں	۵۳	۷	بیت کم	بنکم
۲۵	۱۸	غلامی میں ہی	غلامی میں بھی	۵۳	۲۱	لسی حال	کسی حال
۲۶	۱۹	آگے جھکانے پر	آگے سر جھکانے پر	۵۶	۵	آعلوا اللہ	بہ علوا اللہ
۲۹	۱	اکثر لوگ	مگر اکثر لوگ	۵۸	۵	جبّلی	جبلی
۳۰	۷	ضعف	یہ ضعف	۶۱	۲۰	تفرلط	تفریط
۳۱	۹	اور اللہ کے غضب سے	اللہ کے غضب سے	۶۲	۳	یا اسرائیل کے	یا اسمٰعیل کے

صفحہ	سطر	غلط	صحیح	صفحہ	سطر	غلط	صحیح
۶۶	۱۰	حب وہ	جب وہ	۱۱۹	۱۵	چاہتا ہے	چاہتا
۶۷	۶	مصحون	مصلحون	۔۔	۔۔	مجبور کر دیتا ہے	مجبور کر دیتا
۶۷	۱۲	اِن بری	اُن بری	۱۲۰	۲۰	والابجاء	والالجاء
۶۷	۲۰	دافقون	منافقون	۱۲۲	۷	قبوکرے	قبول کرے،
۸۹	۸	مقر کیا ہے	مقرر کیا ہے	۱۲۸	۸	دیگا	دے
۹۰	۶	جزیہ ایک ٹری رقم	جزیہ کی ایک بڑی رقم	۱۳۱	۱۳	تنقید	تنفیذ
۔۔	۔۔	مخلصین	محصلین	۔۔	۱۵	قیود کی	قیود کو
۹۲	۱۵	دنیاوی	دنیوی	۔۔	۱۹	صرف لیے	صرف اس لئے
۹۲	۱۸	فائدے محروم	فائدے سے محروم	۔۔	۲۱	اخلاقی واعظ اور معلم	معلم محض اخلاقی واعظ
۹۴	۵	انگریزی تہذیب	انگریزی سلطنت میں	۱۳۲	۶	موعظت سے	موعظت ہی سے
۹۵	۷	وہ	بلکہ وہ	۔۔	۷	اور اسے	بلکہ اسے
۱۰۵	۴	ابوموسی شعری	ابوموسیٰ اشعری	۔۔	۲۰	برائی	برا ئی
۔۔	۱۲	دنیادی	دنیوی	۔۔	۵	ہے ولون سے	ہے تو دلوں سے
۱۰۶	۶	باختیار	بااختیار	۱۳۷	۱۱	ایام الحرب	ایام العرب
۔۔	۱۷	پڑانی	پُرانی	۱۳۹	۹	بن ذھل	بنی ذھل
۱۰۹	۹-۱۰	سب اعتراض ہیں جوہر نہیں،	سب اعراض ہیں جوہر نہیں ہیں،	۱۴۲	۱۱	جنگ کے محرکات اور غنیمت کا شوق	جنگ کے محرکات ا غنیمت کا شوق
۱۱۲	۲۲	نفضیل	تفصیل	۱۴۳	۴	اعزامن	اغرامن
۔۔	۔۔	ایڈورڈگین	ایڈورڈ گبن	۱۴۴	۱۹	پہونچ	پہونچ کر
۱۱۳	۱۰	کیجذمت ۔	کی خدمت	۱۴۵	۸	نہ کی جاوے	نہ کیجائے
۱۱۶	۹	مَن	مِن	۔۔	۹	وارہے	وررہے

صفحہ	سطر	غلط	صحیح	صفحہ	سطر	غلط	صحیح
۱۴۵	۱۹	نافربانی	نافرمانی	[illegible]	[illegible]	[illegible]	[illegible]
۱۴۷	۳	حساس بن مرہ	جساس بن مرہ	۱۶۲	۲۲		
״	۲۳	آغانی	اغانی	۱۶۳	۹	[illegible] خصوصیت	[illegible]
۱۴۸	۲۳	ہے	ہے	۱۶۵	۲	کے وحشیانہ	کی وحشیانہ
۱۴۹	۲	ہے ہیجان ہوجاتا ہی	وہ بے جان ہوجاتا ہے	״	۸	اپامیا	فامیا
״	۱۴	سموال بن عادیہ	سموأل بن عادیا	״	۱۱	کیپیڈوسیا	کیپیڈوسیا [illegible]
״	۱۶	ہم سے	ہم میں سے	״	۱۲	سیلی تین	[illegible]
۱۵۰	۱۱	حیروا	خیّروا	۱۶۶	۱۴	پنجے	[illegible]
۱۵۱	۵	بخطبة	بخطة	۱۶۷	۲۳	[illegible]	[illegible]
״	۸	کبشہ بن معدیکرب	کبشہ بنت معدیکرب	۱۶۸	۴	جب سنتے ہیں	جب ہم سنتے ہیں
״	״	بنی زبیر	بنی زبید	۱۶۹	۲	انسان کے جان	انسان کی جان
״	۲۲	بلند ترین	بلند تر	۱۷۰	۸	بدی کے	بدی کی
۱۵۲	۲۳	متفطرس	متغطرس	۱۷۰	۲۰	سخی	سختی
۱۵۳	۱۳-۱۵	خیف الریح	فیف الریح	״	۲۱	زمین پر	زمین میں
״	۱۴	بخیف الریح	بفیف الریح	۱۸۱	۹	دفع	وقع
״	۲۲	منذر بن امراؤالقیس	منذر بن امرئ القیس	״	۲۳	فتوح البلدان	[illegible]
۱۵۵	۱۰	حسبون سے	سیئون سے			ص ۴۷	[illegible]
״	۲۲	سلیک بن سکہ	سلیک بن سلکہ				[illegible]
۱۵۷	۲	پیش آئے ہین	پیش کئے ہیں				[illegible]
۱۵۸	۲۰	نشیب	تشیب	۱۸۲	۱۲	انا	اب
۱۵۹	۱۹	شام کے وقت قدیم	شام کے قدیم	۱۸۴	۲۳	پیغمبرتے	پیغمبرنے

صفحہ	سطر	غلط	صحیح
۱۸۵	۲	لاتعلہوا	لاتعلموا
۱۸۶	۱۴	جڑھ کرآئے	چڑھ کرآئے
〃	۱۹	اٹھاوے	اٹھائے
۱۹۰	۱۲	بڑے سابڑا	بڑے سے بڑا
۱۹۱	۱۳	وقعل جعلتم	وقل جعلتم
۱۹۴	۱۳	لم ینقضوکم	لم ینقصوکم
〃	〃	اورتمہارے	اور نہ تمہارے
〃	۱۸	وان استنصہ وکم	وان استنصروکم
۱۹۵	۱۱	معاہدۂ برابری کو	معاہدہ برابری کو
〃	۱۸	کہلا بھیجا	کہلا بھیجا جائے
۱۹۸	۵	کپڑا نہ رہے	کپڑے نہ رہے
۱۹۹	۳	کافروں	کافروں
〃	۸	صفحہ ۳۷	صفحہ ۱۹۸
۲۰۰	۱۸	صفحہ ۳۷	صفحہ ۱۹۹
۲۰۲	۱	کے	کی
۲۰۳	۳	رائج تھا	رائج ہو جاتا
〃	۸	یہی کہا	یہی کیا
۲۰۴	۲۱	تہایہ	نہایہ
۲۰۸	۲	ابراہیم النحعی	ابراہیم النخعی
۲۱۴	۸	آراضی	اراضی
〃	۲۱	قرار دیا گیا ہے	قرار دیا گیا

صفحہ	سطر	غلط	صحیح
۲۱۵	۲	پڑتی تھی	پڑی تھی
〃	۹	آراضی	اراضی
〃	۱۴	نے	فے
۲۱۶	۳	Shoils	Spoils
۲۱۸	۱	Nationlity	Nationality
〃	۹	نہ کیا جائیگا	نہ لیا جائیگا
۲۱۹	۵	علاوکم	علادکم
۲۲۱	۴	تہذیب قوموں	مہذب قوموں
۲۲۲	۱۱	صلحنامہ	صلح نامے
〃	۱۹	ان کے	×
۲۲۷	۱۸	نام نشان	نام ونشان
۲۲۸	۵	ان کے املاک	ان کی املاک
۲۲۹	۱	غلام بنائیے	غلام بنائے لے
〃	۳	بدل گئی ؎	بدل گئی
〃	۲۲	؎	لہ
۲۳۰	۱۳	کے حاصل	کے جملہ حقوق حاصل
〃	۱۹	تعین	تعیین
〃	۲۱	توسط الحال	متوسط الحال
۲۳۰	۲۳	کتاب لخراج	؎ کتاب الخراج
۲۳۱	۲۰	عبداللہ بن عمرؓ	عبیداللہ بن عمرؓ
۲۳۲	۲۳	۲۰۹	۱۰۹

صفحہ	سطر	غلط	صحیح	صفحہ	سطر	غلط	صحیح
۲۴۳	۱۴	ناقص	ناقض				
۲۴۴	۲	والخنائیر	والخنزیر	۲۸۳	۲۰	حرص وجاہ	حرصِ جاہ
〃	۱۰	دالحدود	والحدود	۲۸۵	۸	آگیاں	اگیاں
۲۴۵	۴	اس کو	ان کو	۲۸۷	۲۱	لوگوں	لوکوں
〃	۱۸	رفق	رفق کی تاکید کی گئی ہے	۲۸۹	۲	شوؤن	شؤن
۲۴۷	۴	یوڈدا	یودھا	۲۹۰	۱	ہیں دوسرے ذرائع اختیار کرنا چاہئیں	دوسرے ذرائع اختیار کرنے چاہئیں
۲۵۱	۹	شئ"	شئ	۲۹۱	۱۵	اسوقت	اس میں
۲۵۵	۹	جنازہ	جنازے	۲۹۲	۱۵	مگر	تاہم
۲۵۶	۵	ادنیٰ صرار	ادنیٰ ضرر	〃	۲۳	India	in India
۲۵۸	۲۰	لہ	لے	۲۹۳	۱۹	مفتوح قوموں کے ساتھ	مفتوح قوموں کے ساتھ برتاؤ
۲۶۳	۹	وہ خود اپنے آپ کو	دوسرے اس کو	۲۹۴	۱۵	شود	شودر
〃	۱۱	ماخذ	مآخذ	۲۹۵	۵	نورانی	روحانی
۲۶۴	۵	بحث کرنے سے	بحث کرنے میں	۳۰۱	۲۳	۱۱	۱۱۱ ۱۲۷
۲۶۵	۲۴	Griffth	Griffith	۳۰۲	۹	کیا سکتا	کیا جا سکتا
۲۶۹	۱۳	آریہ وروں	آریہ ورن	۳۰۴	۴	آریہ، دسیو، دویج،	آریہ۔ دسیو دویج۔
۲۷۳	۲	حریقوں	حریفوں			شودر	شودر
۲۷۸	۱۴	سرگرھوں	سوگرھوں	۳۰۷	۲۳	ریبوں امریکہ	ریبوںِ امریکہ
۲۸۱	۲۴	The series	The East Series	۳۱۱	۲۲	بنی اسرائیل میں	بنی اسرائیل میں سے
۲۸۲	۲	نے لگا	ہونے لگا	۳۱۳	۱۱	ایک	یہ ایک
۲۸۴	۳	یرک	ترک	〃	〃	اسی طرح	اس طرح
〃	۹	انسان	انسانوں	۳۱۵	۱۹	سیہ	سیٹھ

سطر	غلط	صحیح	صفحہ	سطر	غلط	صحیح
۲۳	۱-P.76 ۲ے الیضاً	۳ے الیضاً ج ۱ ص ۲۶م	۳۵۲	۷	اپنا گناہ	اپنے گناہ
۳	دھالی	دھاکی	"	۲۲	دین مسیحی کو الگ الگ	دین مسیحی کو ایک الگ
۲۱	دوسرے جون	دوسری جون	۳۵۴	۱۱	Pilata	Pilate
۱۷	جھٹ	جھوٹ	"	۲۳	ابتدائی	ابتداء
۲۲	بھکھاری	بھکاری	۳۵۷	۱۹	فراغ حوصلگی	فراخ حوصلگی
۹	تعریف	تعلیم	۳۶۰	۲۳	Melman	Milman
۱۸	مبتلا کرنے کیلئے اور	مبتلا کرنے کے لئے ہیں	۳۶۲	۱۹	البیریا	الّیریا
۱۱	مسائل	وسائل	"	۲۳	Reu	Rev
۷	اس دینا	اس کو دینا	۳۶۵	۲	مقتدین	معتقدین
۹	حمایت	حمایت	۳۶۷	۷	کی جانب	کی خاطر
۵	اخلاق و مادی	اخلاقی و مادی	۳۶۸	۱۷	پڑ جائیں	پڑ جائے
۱۱	ہم تک پہنچتی	ہم تک پہونچی	۳۶۹	۱۴	جب کہ	جنہیں
	کون ہے فکر کرکے	کون ہے جو فکر کرکے	۳۷۱	۱۳	نا جائز ہے	جائز ہے
	طیاری کریں	طیاری کرے	۳۷۲	۲۳	(کتاب کا جرمن نام غلط لکھا گیا ہے صحیح نام یہ ہے :-	Yotes und lebendes völkerrec-ht.
	قبول کرتی ہے	قبول کرتا ہے				
	سمجھتی	سمجھتا				
۱	مستحق	متحقق	۳۷۴	۱۱	۱۹۰۸ء	۱۹۰۸ء تک
۱	"محنت"	"لعنت"	۳۷۵	۲۲	۱۹۰۷ء	۱۹۰۷ء تک
۱۱	رہنمائی کرتا ہے	رہنمائی کرتا ہے	۳۷۶	۱۷	فرانس نے	فرانس سے
۱	صہیوں	صہیون	"	۲۳	سرویا کا	سرویا کو
۱۰	نجھادنے	بجھا دے	۳۷۷	۱۶	سلطنتوں کا	سلطنتوں کی

صفحہ	سطر	غلط	صحیح
۳۷۷	۲۰	Sixle Bour-bon	Sixle of Bour-bon
۳۷۹	۱۴	اوٹلی	اور اٹلی
〃	۱۸	جس نے	جس میں
۳۸۰	۱۱	میں سے تھے	میں سے بھی
۳۸۲	۱۲	نفت	نفط
۳۸۳	۱۲	مثلاً	عملاً
۳۸۹	۴	گروہ میں	گروہ
۳۹۰	۱۸	تحت آجاتا ہے	تحت آجاتا ہے
۳۹۲	۱۱	الگ الگ کردینے	الگ کردینے
۳۹۵	۸	سلاح کا	سلاح کی
۳۹۶	〃	حملہ آور	حملے اور
۴۰۱	۱۱	یہ وہ	وہ یہ
۴۰۶	۴	ماتحت میں	مقابلہ میں
〃	۲۱	مغربی قومی	مغربی قومیں
۴۰۹	۴	ان سلطنتوں	سلطنتوں
۴۱۱	۴	انفرادی واقتیاری	انفرادی اختیارو
		پسند	پسند
۴۱۳	۹	رخلاقی فرائض	اخلاقی فرائض
〃	۲۱	جرمن کتاب کا نام یہاں اور آگے متعدد	Kriegsbrau ch imland Kriege

صفحہ	سطر	غلط	صحیح
		مقامات پر غلط چھپ گیا ہے اس کی یوں تصحیح پڑھیے	
۴۱۶	۲۱	ارادہ	[illegible]
۴۲۰	۵	یورپ کے	یورپ کا
〃	۱۷	داخل کرنا ہی	داخل کرنا
۴۲۳	۱۷	ہائیڈبرگ	ہائیڈلبرگ
۴۲۵	۹	explosire	explosive
۴۳۰	۴	ان کی	ان کے
۴۳۴	۱۵	مغربی جنگ کا قانون	مذکورۂ بالا قانون سے
		یہ ہے	یہ جواب دیتا ہے
〃	۱۰	امتیاز کا یہ اصول	امتیاز کا جو اصول قائم کیا گیا وہ
〃	۲۰	موجب ہوگا	موجب ہوگئی
۴۳۵	۱۵	بلکہ	بغیر
۴۳۸	۵	غدر کے وسائل	غذا کے وسائل
۴۳۹	۱۵	موقع پر بھی	موقع پر
۴۴۸	۱۸	کیویا	کیوبا
〃	۲۲	انگریزی کتاب کا نام غلط لکھا گیا ہے صحیح نام یہ ہے:-	War its conduct and legal results
۴۴۹	۱	۱۹۱۴ء	۱۸۷۴ء

سطر	غلط	صحیح	صفحہ	سطر	غلط	صحیح
۲۴	پہنچنے سے پہلے	پہنچنے کے بعد	۴۶۳	۵	اسی مسئلہ میں	اسی مسئلے میں
۱۴	Soveni	Sovenir	۴۶۴	۱۸	کسی قسم کے	کسی قسم کی
۸	دول	دول نے	۴۶۵	۵	تحزیب	تخریب
۲۴	لیکن سلطنتوں	لیکن نہ تو سلطنتوں	۴۶۸	۲۰	معاصر	محاصر
	نے	نے	۴۷۲	۱۸	قسطنطنیہ	قسنطینہ
۱۱	اس نے	اس کی	״	۱۹	دلی فتح کیا	دلی فتح کی
۲	لا عجھرن	لا تجھرن	״	۲۱	کسی کو	کسی شہر کو
۱۱	نہیں دیتیں	نہیں دیتی	۴۷۵	۹	کے لئے نہیں ہیں	کے نہیں ہیں
۲	مأدہ	مأدے	۴۸۱	۱۸	Ne Nostes	Non Hostes
۱۷	جائز ہے	ناجائز ہے	۴۸۴	۹	بین الملی	بین الملی قانون
۲۱	سیئۃً سیئۃً	سیئۃٍ سیئۃٌ	۴۸۵	۱۸	غیر جانبداروں	غیر جانبداری
۱	رودین ہائم	اوپن ہائم	۴۸۸	۸	آخری فصل	آخری فعل
۸	مواصلت	مواصلات	״	۲۲	Wheaton	Wharton
۱۲	تہذیب	مہذب	۴۹۱	۱۲	تسلیم کرتا ہے	تسلیم کرتی ہے

فہرستِ ماخذ

ا۔ عربی

تفاسیر:

(۱) تفسیر ابن کثیر حافظ ابن کثیر،
(۲) تفسیر جامع البیان ابن جریر طبری،
(۳) تفسیر کبیر امام رازی،
(۴) تفسیر کشاف امام زمخشری،
(۵) فتح البیان نواب صدیق حسن خان،

احادیث و شروح:

(۱) جامع صحیح امام بخاری،
(۲) فتح الباری ابن حجر،
(۳) صحیح مسلم،
(۴) جامع ترمذی،
(۵) سنن ابی داؤد،
(۶) سنن نسائی،
(۷) سنن ابن ماجہ،
(۸) موطا امام مالکؒ،

کتبِ فقہ:

(۱) ردّ المحتار،
(۲) درالمختار،
(۳) بدائع الصنائع کاشانی،

(۴) کتاب الخراج قاضی ابو یوسف،

(۵) برہان شرح مواہب الرحمٰن،

(۶) عنایہ و فتح القدیر ابن ہمام،

تاریخ و رجال و سیر

(۱) تاریخ الرسل والملوک طبری،

(۲) تاریخ الکامل ابن اثیر،

(۳) فتوح البلدان بلاذری،

(۴) طبقات کبیر ابن سعد،

(۵) اسد الغابہ فی معرفۃ الصحابہ ابن اثیر جزری،

(۶) سیرت ابن ہشام،

(۷) تاریخ یعقوبی بغدادی،

۲- اردو

(۱) ترجمۂ تورات،

(۲) ترجمۂ انجیل،

(۳) ینابیع المسیحیت، خواجہ کمال الدین،



انگریزی ماخذ

(1) History of Persia by Sykes.
(2) Decline and fall of the Roman Empire, by Gibbon.
(3) Byzantine Empire, by Foord
(4) Eearly days of Christianity by Ferrar
(5) Constantine the great by Rev. Cutts
(6) Sprit of Islam by Ameer Ali
(7) Introduction to the study of Hinduism by Guru Parsad Sen.
(8) Religious Systems of the world by Lyall
(9) Translation of Rigveda by Griffith
(10) „ Samaveda „
(11) „ Yajurveda „
(12) „ Atharvaveda „
(13) Indo Aryans by Rajendra Lal Mitra
(14) Encyclopaedia of Religions
(15) Gita by B. G. Tilak
(16) „ K. T. Telang (Sacred Books of the East Series
(17) Manu Translated by Sir William Jones
(18) „ „ Burnell
(19) History of Aryan Rule in India by Havel
(20) Cambridge History of India
(21) Vedic Index of names and subjects
(22) Indian Caste System by Wilson
(23) Vedic India by Ragozin
(24) Buddhist suttas by Rhys Davids
(25) Buddhism as a Religion by Hackman
(26) Vinaya Texts by Rhys Davids
(27) Buddhim in Translations by Warren
(28) Dialogues of Buddha by Rhys Davids
(29) Buddha and his Religion by Sant Hilaire
(30) Buddhist India by Rhys Davids
(31) Early History of India by Smith

(32) Commentary on the Holy Bible, by Rev. Dummellow
(33) History of Christianity by milman
(34) Encyclopaedia Biblica
(35) History of the Jews by milman
(36) Encyclopaedia Brittannica
(37) Jewish Encyclopaedia
(38) International Law by Lawrence
(39) „ „ Birkenhead
[40] „ „ Oppenheim
[41] Development of International law after the worlwar by Pro. Nippold
[42] Province of Jurisprudence determined by Austin
[43] Austria's peace offer by Prince Sixte of Buorbon
[44] Russia's Foreign relations by Baron S. A. Korff
[45] Growth of the laws of War by B rnard
[46] Hague Conventions by Scott.
[47] Hostilities without declaration of War by Maurice.
[48] War its conduct and legal results, by Dr. Baty and prof. morgen.
[49] History of Europe by Allison
[50] Laws of war on land, by Holland
[51] International law and the world war, by Garner
[52] International law, by Halleck
[53] „ „ Wheaton
[54] International law of United States by Wharton
[55] Laws of nations, by manning.
[56] Modern Europe by Eyffe.

جرمن ماخذ

(ان کتابوں سے استفادہ کرنے میں مجھے میرے جرمن استاد ہر البرٹ نے مدد دی ہے جس کا میں شکر گذار ہوں)

[1] Kriegs branch in land Kriege.
[2] Vom Kriege
[3] Prinzipien des see Kriegesrecht.